معارف القرآن

3

تصنیف

حضرت مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب حفظہ اللہ

ناشر: جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

معارف الفرقان

سورۃ البقرہ آیت ۱۴۲ تا اختتام سورۃ البقرہ

جلد 3

تصنیف

استاذ العلماء شیخ الحدیث والتفسیر

حضرۃ مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب مدظلہ

سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور بانی ومہتمم جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

ادارہ آبِ حیات ٹرسٹ لاہور غوث گارڈن 2 جی ٹی روڈ مناواں لاہور کینٹ

رابطہ نمبر: 0300-0321-9458876

☼ سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور ☼ پرنسپل جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور
☼ سابق شیخ الحدیث جامعہ مفتوحہ لاہور ☼ سابق شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ آب حیات لاہور ☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ شان دار لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ تحفہ خواتین لاہور ☼ ماہ نامہ صدائے جمعیت لاہور
☼ امیر جمعیت تحفظ اسلام پاکستان ☼ صدر ادارہ آب حیات ٹرسٹ
☼ متولی جامع مسجد عارفی مناواں لاہور ☼ خطیب ٹاؤن ھال لاہور

ضابطہ

نام کتاب۔۔۔

معارف الفرقان جلد ③

تحویل قبلہ اور یہود کی موشگافی	۷	کون کون سی چیزیں کھانا حرام ہیں؟	۷۰
امت محمدیہ معتدل امت ہے	۹	اعمال صالحہ اور اخلاق عالیہ	۹۰
تحویل قبلہ میں نبوی خواہش کی تکمیل	۱۴	قصاص کے احکامات	۹۷
یہود و نصاریٰ، آپ ﷺ کی پہچان	۱۷	وصیت کی اہمیت، وصیت کے اقسام	۹۹
اہمیت قبلہ اور مقصد بعثت پیغمبر ﷺ	۱۹	روزہ کی اہمیت اور تاریخی حیثیت	۱۰۵
ذکر و شکر	۲۴	مسافر اور مریض کے لیے روزہ	۱۱۷
صبر و صلاۃ کے ساتھ مدد خواہی	۲۶	روزے کا مقصد	۱۲۰
شہداء اور حیات انبیاء کرام علیہم السلام	۲۷	نزول قرآن کریم	۱۳۲
اہل ایمان کی آزمائش	۳۱	دعا کی اہمیت و فضیلت	۱۳۴
صابرین کی صفت اور اس پر انعام	۳۴	روزہ کے کچھ مزید احکامات	۱۳۹
صفا و مروہ شعائر اللہ ہیں	۳۷	باطل طریقوں سے اموال کھانا	۱۴۷
کتمان علم اور کفر کی سزا	۳۷	اسلامی تقویم اور رویت ہلال	۱۵۲
اللہ وحدہ لاشریک ہے	۴۰	جہاد کا حکم اور جہاد کی چند شرطیں	۱۶۳
اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل	۴۰	حرمت والے مہینے، زیادتی کا جواب	۱۷۳
مشرکین کا معبودن باطلہ سے تعلق	۵۶	انفاق فی سبیل اللہ، ہلاکت سے بچاؤ	۱۷۴
اہل عرب کا خود ساختہ حلال و حرام	۶۰	حج اور عمرہ کے احکامات	۱۷۶
تقلید محمود اور تقلید مذموم	۶۵	حج کے مہینے اور حج کے چند احکام	۱۸۵
کافر سن سکتے ہیں سمجھ نہیں سکتے	۶۸	تجارت اور حج	۱۸۸
اکل حلال اور ادائے شکر کا حکم	۶۹	وقوف عرفات	۱۹۱

ایام منیٰ میں ذکر اللہ، طلب دنیا	۱۹۲	لغو قسم کھانے کا حکم	۲۸۴
منیٰ میں دو یا تین دن کا قیام اور ذکر	۲۰۱	بیویوں سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھانا	۲۸۵
شیریں گفتار منافقین کا عملی کردار	۲۰۶	طلاق یافتہ عورت کی عدت	۲۸۹
صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ کی جانفروشی	۲۰۹	نکاح، طلاق اور خلع کا شرعی حکم	۲۹۰
اسلام میں پورے داخل ہونے کا حکم	۲۱۰	طلاق کی شرعی حیثیت	۲۹۲
حق قبول نہ کرنے پر سخت وعید	۲۱۹	خلع لینے کی مذمت	۲۹۸
ناشکر گزار یہودی، نعمتوں کی تبدیلی	۲۲۱	تیسری طلاق کے بعد کیا ہو گا؟	۲۹۹
کفار کے لیے حیات دنیا کی دلکشی	۲۳۲	تین طلاق، اس کے بعد کے احکام	۳۰۱
تاریخ انسانی کا عروج وزوال	۲۴۱	مطلقات (طلاق یافتہ) کے احکامات	۳۱۸
دین کی خاطر ابتلاء وآزمائش	۲۵۳	مطلقہ کو بلاوجہ شادی سے نہ روکو	۳۲۲
مال کہاں اور کن پر خرچ کیا جائے؟	۲۵۷	بچوں کو دودھ پلانے کے احکام	۳۲۵
فرضیت جہاد	۲۶۰	بیوہ (جس کا خاوند فوت ہو گیا) عدت کا حکم	۳۳۲
حرمت والے مہینوں میں قتال	۲۶۵	بیوہ کو صریح پیغام نکاح دینا ممنوع	۳۳۵
ایمان، ہجرت، جہاد اور رحمت خداوندی	۲۷۱	مہر اور متاع کے احکام	۳۴۰
شراب، جوا اور انفاق	۲۷۳	صلوٰۃ الوسطیٰ کی حفاظت کا حکم	۳۴۲
یتیم کے ساتھ بھلائی، مال کی حفاظت	۲۷۶	نماز خوف کیسے ادا کی جائے؟	۳۴۵
مشرکہ اور مشرک سے شادی	۲۷۷	مطلقہ عورتوں کے حقوق	۳۴۶
ماہواری میں عورتوں سے علیحدگی	۲۸۰	مطلقہ عورتوں کو فائدہ پہنچانا	۳۴۸
میاں بیوی کا خصوصی ملاپ	۲۸۲	موت کا ڈر، گھروں کو چھوڑنے والے	۳۴۹
قسموں کے لیے اللہ کا نام تختہ مشق	۲۸۳	جہاد فی سبیل اللہ	۳۵۱

رضائے خداوی کی خاطر صدقہ، خیرات	۳۵۲	پاکیزہ اور حلال راہ حق میں خرچ	۴۵۱
قصہ طالوت، جالوت اور داؤد علیہ السلام	۳۵۶	شیطانی اور رحمانی عہد و پیمان	۴۵۴
حضرت داؤد علیہ السلام کی شجاعت و بسالت	۳۴۷	حکمت عطیہ خداوندی ہے	۴۶۱
فضائل انبیاء کرام علیہم السلام	۳۷۶	نذر کی شرعی حیثیت	۴۶۷
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت	۳۸۱	صدقات سے کچھ گناہ مٹ جاتے ہیں	۴۷۰
قیامت سے پہلے پہلے کچھ کرلو	۳۹۰	اللہ کی رضاجوئی کے لیے خرچ کرنا	۴۷۴
فضائل و تفسیر آیۃ الکرسی	۳۹۶	اللہ کا کام کرنے والوں پر خرچ کرنا	۴۷۹
من ذاالذی یشفع عندہ الا باذنہ	۴۱۲	شب و روز خرچ کرنے کی فضیلت	۴۸۵
وسع کرسیہ السماوات والارض	۴۱۷	سود اور تجارت میں فرق	۴۸۸
دین میں جبر و اکراہ نہیں ہے	۴۲۱	سود کی تباہی اور صدقات کا بڑھنا	۵۱۱
فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ	۴۲۵	ادائے زکوٰۃ اور سودی نظام	۵۱۶
اندھیرے سے اُجالے تک	۴۲۷	سود، اللہ و رسول اللہ سے اعلان جنگ	۵۱۹
نمرود بادشاہ کا قصہ	۴۲۸	تنگ دست کو مہلت دینا	۵۲۶
دو مسلمان اور دو کافر بادشاہ	۴۲۹	اللہ کی بارگاہ میں پیشی اور اعمال کی جزا	۵۲۹
حضرت عزیر علیہ السلام کا قصہ	۴۳۱	مداینت، کتابت اور شہادت کی اہمیت	۵۳۲
ابراہیم علیہ السلام کا دلی اطمینان کیسے ہوا؟	۴۴۱	عورت کی شہادت، فقہاء کے نظریات	۵۴۸
اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اجر	۴۴۳	رہن، تحریر اور گواہی	۵۵۵
مخیر حضرات کی تعریف و احتیاط	۴۴۴	دل میں اٹھنے والے خیالات، محاسبہ	۵۵۹
متلاشیان رضائے خداوندی کی مثال	۴۴۸	رسول اللہ اور اہل ایمان کا ایمان	۵۶۰
بڑھایا، اولاد کمزور اور سرمایہ تباہ	۴۴۹	طاقت کے مطابق وزن ڈالا جاتا ہے	۵۶۵

تحویل قبلہ اور یہود کی موشگافی

سوال جب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی ﷺ کو قبلہ بدلنے کا حکم دیا تو یہود اور نصاریٰ کے بے وقوف لوگوں نے اس وقت کیا کہا تھا؟ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کا کیا جواب دیا؟ اس آیت کی روشنی میں تفسیر بیان کیجیے۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ {۱۴۲} البقرۃ

جواب ترجمہ: بے وقوف لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ تھے، کہہ دو مشرق اور مغرب اللہ ہی کا ہے وہ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

یہود اور نصاریٰ کے بے وقوف لوگوں نے یہ کہا تھا کہ نبی ﷺ اور اہلِ ایمان کو بیت المقدس سے کس چیز نے ہٹا دیا ہے؟ جس کی طرف یہ منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ جواب دیا کہ انہیں بتا دیں کہ مشرق اور مغرب تو اللہ ہی کا ہے۔ قرآن نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے

زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بیوقوفوں سے مراد یہاں مشرکین عرب ہیں، مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سفہاء سے یہاں یہودی علماء مراد ہیں، سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سفہاء سے یہاں منافقین مراد ہیں۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی لیکن خود آپ ﷺ کی چاہت یہ تھی کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ شریف ہو۔ چنانچہ اب حکم آ گیا اور آپ ﷺ نے عصر کی نماز اس کی طرف ادا کی۔ آپ ﷺ کے ساتھ کے نمازیوں میں سے ایک شخص کسی اور مسجد میں پہنچا، وہاں جماعت رکوع میں تھی اس نے ان سے کہا اللہ کی قسم میں نبی ﷺ کے ساتھ مکہ کی طرف نماز پڑھ کر ابھی آ رہا ہوں۔ جب ان لوگوں نے سنا تو اسی حالت میں وہ کعبہ کی طرف گھوم گئے، اب بعض لوگوں نے یہ کہا کہ جو لوگ اگلے قبلہ کی طرف نمازیں پڑھتے

ہوئے شہید ہو چکے ہیں ان کی نمازوں کا کیا حال ہے۔ تب یہ فرمان نازل ہوا کہ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ اللہ تمہارے ایمان کو ضائع نہ کرے گا۔ (بخاری)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر آسمان کی طرف نظریں اٹھاتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے منتظر تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

تو مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جو لوگ قبلہ کی تبدیلی سے پہلے فوت ہو گئے ان کا معاملہ کیا ہو گا؟ اس پر یہ آیت نازل کی گئی کہ اللہ ان کے اعمال کو ضائع نہیں کرے گا اور ان کی نمازوں کی طرف سے اطمینان ہوا۔

شان نزول: اب بعض بیوقوف اہل کتاب نے قبلہ کے بدلے جانے پر اعتراض کیا، جس پر یہ آیتیں سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ نازل ہوئیں، شروع ہجرت کے وقت مدینہ شریف میں آپ کو بیت المقدس کی طرف نمازیں ادا کرنے کا حکم ہوا تھا۔ یہود اس سے خوش تھے لیکن آپ کی چاہت اور دعا قبلہ ابراہیمی کی تھی، آخر جب یہ حکم نازل ہوا تو یہودیوں نے جھٹ سے اعتراض جڑ دیا، جس کا جواب ملا کہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے ہیں۔

مگر بہترین لوگ، بہترین قیادت وہی ہے جو اللہ کے سامنے سرنگوں ہو جائے، اپنے کو اور اپنے پیروکاروں کو اپنے پروردگار کے آستانۂ عالیہ پر جھک جانے کی تلقین کرے، اس کے قول و فعل اور عمل سے یہ چیز عیاں ہو کہ یہ شخص اللہ کی کامل درجے میں بندگی بجا لاتا ہے، یہاں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چاہت ہی نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کی طرف سے اللہ کے اشارے پر اپنے کو کاربند کرنا بھی دکھائی دیتا ہے، اس لیے مسلم امہ اسی بات کو مد نظر رکھ کر کامل طریقے سے اللہ کی بندگی کرے۔

امت محمدیہ معتدل امت ہے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلاَّ لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلاَّ عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللهُ وَمَا كَانَ اللهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللهَ بِالنَّاسِ لَرَؤُوفٌ رَّحِيمٌ {۱۴۳} البقرۃ

جواب ترجمہ: اور اسی طرح تو (اے مسلمانو!) ہم نے تمہیں ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم (دنیا کے) لوگوں پر گواہ بنو اور تم پر (تمہارا) رسول گواہ بنے۔ اور (اے پیغمبر!) جس قبلے پر تم (پہلے) تھے اسے تو ہم نے اسی لئے رکھا تھا تاکہ ہم ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرنے والے ہیں ان لوگوں سے الگ کر دیں جو الٹے پھر جانے والے ہیں اور قبلے کا بدلا جانا (سب ہی پر) شاق ہوا مگر ان لوگوں پر نہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کر دے، وہ تو لوگوں پر بڑا ہی شفیق (اور) ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت مبارکہ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں ابراہیم علیہ السلام کے قبلے کی طرف پھیرا، ہم نے تمہارے لیے اس قبلے کو اس لیے چنا تاکہ تمہیں بہترین امت بنائیں اور تمہیں دوسری امتوں پر گواہ بنائیں، اس لیے وہ سب تمہاری شان، آن اور فضیلت کو تسلیم کرتے ہیں۔

وسط کے معنی یہاں پر بہتر اور عمدہ کے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے کہ قریش نسب کے اعتبار سے وسط عرب ہیں اور کہا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں وسط تھے یعنی اشرف نسب والے تھے اور صلوٰۃ وسطیٰ یعنی افضل تر نماز جو ہے وہ عصر ہے اور چونکہ تمام امتوں میں یہ امت بھی بہتر، افضل اور اعلیٰ تھی اس لئے انہیں شریعت بھی کامل، راستہ بھی بالکل سیدھا ملا اور دین بھی بہت واضح دیا گیا جیسے

ارشاد فرمایا هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ [الحج: ۷۸] اس اللہ نے تمہیں چن لیا اور تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں کی، تم اپنے باپ ابراہیم کے دین پر ہو اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے، اس سے پہلے بھی اور اس میں بھی تاکہ رسول ﷺ تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا

يُدْعَى نُوحٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُقَالُ لَهُ: هَلْ بلَّغتَ؟ فَيَقُولُ: نَعَمْ. فَيُدْعَى قَوْمُهُ فَيُقَالُ لَهُمْ: هَلْ بَلَّغَكُمْ؟ فَيَقُولُونَ: مَا أَتَانَا مِنْ نَذِيرٍ وَمَا أَتَانَا مِنْ أَحَدٍ، فَيُقَالُ لِنُوحٍ: مَنْ يَشْهَدُ لَكَ؟ فَيَقُولُ: مُحَمَّدٌ وَأُمَّتُهُ قَالَ: فَذَلِكَ قَوْلُهُ: وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا (احمد)

نوح علیہ السلام قیامت کے دن بلائے جائیں گے اور ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے میرا پیغام میرے بندوں کو پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے کہ ہاں اللہ پہنچا دیا تھا۔ ان کی امت کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا نوح علیہ السلام نے میری باتیں تمہیں پہنچائی تھیں وہ صاف انکار کریں گے اور کہیں گے ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، نوح علیہ السلام سے کہا جائے گا تمہاری امت انکار کرتی ہے تم گواہ پیش کرو یہ کہیں گے کہ ہاں محمد ﷺ اور آپ کی امت میری گواہ ہے یہی مطلب اس آیت مبارکہ کا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں بلایا جائے گا تو تم ان کے لیے گواہی دو گے کہ انہوں نے تیرا دین ان لوگوں تک پہنچایا تھا، پھر میں تم پر گواہی دوں گا کہ یہ سچ کہتے ہیں۔ (بخاری ترمذی، نسائی)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ

يَجِيءُ النَّبِيُّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ [وَمَعَهُ الرَّجُلُ وَالنَّبِيُّ] وَمَعَهُ الرَّجُلَانِ وَأَكْثَرُ مِنْ ذَلِكَ فَيُدْعَى قَوْمُهُ، فَيُقَالُ [لَهُمْ] هَلْ بَلَّغَكُمْ هَذَا؟ فَيَقُولُونَ: لَا فَيُقَالُ لَهُ: هَلْ بَلَّغْتَ قَوْمَكَ؟ فَيَقُولُ: نَعَمْ. فَيُقَالُ [لَهُ] مَنْ يَشْهَدُ لَكَ؟ فَيَقُولُ: مُحَمَّدٌ وَأُمَّتُهُ فَيُدْعَى بِمُحَمَّدٍ وَأُمَّتِهِ، فَيُقَالُ لَهُمْ: هَلْ بَلَّغَ

هَذَا قَوْمَهُ؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ فَيُقَالُ: وَمَا عِلْمُكُمْ؟ فَيَقُولُونَ: جَاءَنَا نَبِيُّنَا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرَنَا أَنَّ الرُّسُلَ قَدْ بَلَّغُوا فَذَلِكَ قَوْلُهُ عَزَّ وَجَلَّ: {وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا} (مسند احمد)

قیامت کے دن ایک نبی آئیں گے اور ان کے ساتھ ان کی امت کا ایک ہی آدمی ہو گا اور ایک نبی آئیں گے تو ان کے ساتھ ان کی امت کے صرف دو ہی شخص ہوں گے اور کوئی نبی آئیں گے جن کے ساتھ ان کی امت کے اس سے زیادہ لوگ بھی ہوں گے، چنانچہ اس نبی کی امت کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا اس نبی نے تمہیں تبلیغ کی تھی؟ وہ انکار کریں گے، نبی سے کہا جائے گا تم نے تبلیغ کی؟ وہ کہیں گے ہاں، کہا جائے گا تمہارا گواہ کون ہے؟ وہ کہیں گے کہ محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی امت، پس محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی امت بلائی جائے گی ان سے یہی سوال ہو گا کہ کیا اس پیغمبر نے تبلیغ کی؟ یہ کہیں گے ہاں، ان سے کہا جائے گا کہ تمہیں کیسے علم ہوا؟ یہ جواب دیں گے کہ ہمارے پاس ہمارے نبی آئے اور آپ نے خبر دی کہ انبیاء علیہم السلام نے تیرا پیغام اپنی اپنی امتوں کو پہنچایا۔ یہی مطلب ہے اللہ عزوجل کے اس فرمان کا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا

أَنَا وَأُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى كَوْمٍ مُشْرِفِينَ عَلَى الْخَلَائِقِ، مَا مِنَ النَّاسِ أَحَدٌ إِلَّا وَدَّ أَنَّهُ مِنَّا، وَمَا مِنْ نَبِيٍّ كَذَّبَهُ قَوْمُهُ إِلَّا وَنَحْنُ نَشْهَدُ أَنَّهُ قَدْ بَلَّغَ رِسَالَةَ رَبِّهِ عَزَّ وَجَلَّ میں اور میری امت قیامت کے دن ایک اونچے ٹیلے پر ہوں گے، تمام مخلوقات کے سامنے ہوں گے اور سب کو دیکھ رہے ہوں گے اس روز تمام دنیا تمنا کرے گی کہ کاش وہ بھی ہم میں سے ہوتے، جس جس نبی کی قوم نے اسے جھٹلایا ہے ہم اللہ کی بارگاہ میں گواہی دیں گے کہ ان تمام انبیاء علیہم السلام نے حقِ رسالت ادا کیا تھا۔ (تفسیر طبری، ابن کثیر، ابو بکر مردویہ)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم بنی سلمہ (ایک قبیلے کا نام) کے ایک آدمی کے

جنازے میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ موجود تھے، جنازے کو دیکھ کر لوگ کہنے لگے یارسول اللہ! یہ بڑا نیک آدمی تھا۔ بڑا متقی پارسا اور سچا مسلمان تھا اور بھی بہت سی تعریفیں کیں، آپ ﷺ نے فرمایا، تم یہ کس طرح کہہ رہے ہو؟ اس شخص نے کہا یارسول اللہ! چھپی ہوئی باتوں کا علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن ظاہری طور پر تو اس کی ایسی ہی حالت تھی آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے لیے جنت واجب ہو گئی، پھر بنو حارثہ کے ایک شخص کے جنازے میں تھے لوگ کہنے لگے یارسول اللہ! یہ برا آدمی تھا، بڑا بد زبان اور کج خلق تھا، آپ ﷺ نے اس کی برائیاں سن کر پوچھا، تم کیسے کہہ رہے ہو؟ اس شخص نے بھی یہی کہا کہ چھپی باتیں تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، ہاں البتہ بظاہر یہ ایسا ہی تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے لیے واجب ہو گئی۔ (حاکم، ابن کثیر ج ۱)

ایک جنازہ گزرا تو لوگوں نے اس کی برائی کی، ایک جنازہ گزرا تو لوگوں نے اس کی تعریف کی، آپ ﷺ نے وَجَبَتْ وَجَبَتْ فرمایا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال پر آپ ﷺ نے یہی الفاظ فرمانے کے بعد اس امت کے لیے تین بار فرمایا أَنْتُم شُهَدَاءُ اللهِ فِي الأَرْضِ أَنْتُم شُهَدَاءُ اللهِ فِي الأَرْضِ أَنْتُم شُهَدَاءُ اللهِ فِي الأَرْضِ تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو، تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو، تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے اس امت کی یوں تعریف کی، فرمایا الْمَلَائِكَةُ شُهُودُ اللهِ فِي السَّمَاءِ وَأَنْتُم شُهُودُ اللهِ فِي الأَرْضِ فرشتے آسمانوں پر اللہ کے گواہ ہیں اور تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔ (تفسیر در منثور سیوطی)

اس امت کے مرنے والے مسلمان پر جب دو قریبی پڑوسی گواہی دے دیں تو اس پر اللہ فرشتوں کو گواہ بنا کر معافی کا اعلان کر دیتے ہیں، مَا مِن مُسلِمٍ يَمُوتُ فَيَشْهَدُ لَهُ رَجُلَانِ مِن جِيرَانِه الأدنين فَيَقُولَانِ اللَّهُمَّ لَا نَعلَمُ إِلَّا خَيراً إِلَّا قَالَ اللهُ لِلْمَلَائِكَةِ: اشْهَدُوا أَنِّي قَد قَبِلتُ شَهَادَتَهُمَا وَغَفَرتُ مَا لَا يَعلَمَانِ جو مسلمان مر جاتا ہے، پھر اس کے لیے اس کے پڑوسیوں میں سے دو قریبی پڑوسی گواہی دے دیں، وہ یوں کہیں کہ اے ہمارے اللہ! ہم تو اس میں

خیر اور بھلائی ہی جانتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہتے ہیں کہ تم گواہ رہو میں نے ان دونوں کی گواہی کو قبول کر لیا ہے اور اس چیز کو بھی میں نے معاف کر دیا ہے جو وہ نہیں جانتے۔ (در منثور)

جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کو جمع کرے گا تو سب سے پہلے جس شخص کو بلایا جائے گا وہ حضرت اسرافیل علیہ السلام ہوں گے، اللہ اسرافیل علیہ السلام سے پوچھیں گے، تو نے میرا عہد وپیمان پہنچادیا تھا؟ اسرافیل علیہ السلام عرض کریں گے، ہاں، میرے رب! میں نے تیرا عہد وپیمان جبریل علیہ السلام کو پہنچادیا تھا۔ اسرافیل علیہ السلام کے اس فرمانے پر جبریل علیہ السلام کو بلایا جائے گا، جبریل علیہ السلام سے پوچھا جائے گا، کیا تجھے اسرافیل علیہ السلام نے میرا پیغام پہنچادیا تھا؟ جبریل علیہ السلام کہیں گے، ہاں، پہنچادیا تھا۔ اس پر اسرافیل علیہ السلام کو جانے دیا جائے گا۔

اللہ جبریل علیہ السلام سے پوچھے گا، کیا تو نے میرا پیغام پہنچادیا تھا؟ جبریل علیہ السلام کہیں گے، ہاں، میں نے رسولوں کو تیرا پیغام پہنچادیا تھا، اس پر پھر رسولوں کو بلایا جائے گا، ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تمہیں جبریل علیہ السلام نے پیغام پہنچادیا تھا؟ رسول کہیں گے، ہاں پہنچادیا تھا، اس پر جبریل علیہ السلام بھی چلے جائیں گے، پھر رسولوں سے پوچھا جائے گا، کیا تم نے میرا پیغام پہنچادیا تھا؟ رسول کہیں گے، ہاں ہم نے امتوں تک تیرا پیغام پہنچادیا تھا۔ اس پر امتوں کو بلایا جائے گا، پھر ان سے پوچھا جائے گا، کیا رسولوں نے میرا پیغام تم تک پہنچادیا تھا؟ اس سوال پر امتوں میں سے کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو کہیں گے کہ رسولوں نے تیرا پیغام نہیں پہنچایا تھا، کوئی کہیں گے کہ جی ہاں، رسولوں نے تیرا پیغام پہنچایا تھا، اس پر رسول کہیں گے، ہمارے پاس ان کے خلاف گواہ موجود ہیں۔

اللہ ان سے پوچھے گا، ان کے خلاف تمہارے پاس کون گواہ ہے؟ رسول کہیں گے، ہمارے پاس ان کے خلاف امت محمدیہ گواہ ہے۔ چنانچہ پیغمبروں کے اس فرمان کے بعد امت محمدیہ کو بلایا جائے گا، امت محمدیہ سے پوچھا جائے گا، کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ رسولوں نے امتوں تک میرا پیغام پہنچادیا تھا؟ امت محمدیہ کہے گی، ہاں، رسولوں نے تیرا پیغام امتوں کو پہنچادیا تھا۔ امت محمدیہ

کی گواہی پر باقی امتیں کہیں گی، ہمارے خلاف وہ گواہی کیسے دے سکتے ہیں جنہوں نے ہمارا زمانہ پایا ہی نہیں تھا؟ اللہ امت محمدیہ سے پوچھے گا، تم ان کے خلاف کیسے گواہی دے رہے ہو؟ جب کہ تم نے ان کا زمانہ پایا ہی نہیں تھا؟

امت محمدیہ کہے گی، اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف عظیم الشان رسول بھیجا تھا، تو نے ہماری طرف عظیم الشان کتاب نازل کی تھی، تو نے اس کتاب میں ہمارے لیے یہ سب کچھ بیان کیا تھا، کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے ان تک تیرا پیغام پہنچایا تھا، اس لیے جو فرمان تو نے ہماری طرف بھیجا تھا ہم اس کو سامنے رکھتے ہوئے گواہی دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، یہ لوگ سچ کہتے ہیں۔ (الزہد ابن المبارک، ابن جریر، در منثور ج ۱)

صرف آخرت میں ہی اس امت کو اس قدر امتیازی شان نہیں ملے گی بلکہ اللہ نے اس امت کو امت وسط کے ساتھ ساتھ امت مھدات (ہدایت یافتہ) بھی بنایا ہے، حمادون (رب کی بہت زیادہ حمد وثناء کرنے والے بنایا ہے، خیر امت (بہترین) بنایا ہے، اسی کے لیے آخری نبی آئے، اسی کو آخری کتاب دی گئی، اسی کو آخری امت بنایا گیا، یہ سارے اعزازات اور تمغے اسی امت کی کلغی پر سجتے ہیں۔

تحویل قبلہ میں نبوی خواہش کی تکمیل

سوال ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کیا بیان فرمایا ہے؟

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ (۱۴۴) وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ (۱۴۵) البقرۃ

جواب ترجمہ: ہم دیکھ رہے ہیں آپ کا آسمان کی طرف بار بار منہ اٹھانا پس ہم آپ کو ضرور ضرور متوجہ کر دیں گے ایسے قبلہ کی طرف جس سے آپ راضی ہوں گے، سو آپ پھیر دیجیے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف، اور جہاں کہیں بھی تم لوگ ہو سو اپنے چہروں کو مسجد حرام کی طرف متوجہ کیا کرو۔ اور بلاشبہ جن لوگوں کو کتاب دی گئی وہ ضرور جانتے ہیں کہ بلاشبہ یہ حکم حق ہے ان کے رب کی طرف سے ہے۔ اور اللہ غافل نہیں ان کاموں سے جن کو تم کرتے ہو۔ اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی اگر تم ان کے پاس ہر قسم کی نشانیاں لے آؤ تب بھی یہ تمہارے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے۔ اور نہ تم ان کے قبلے پر عمل کرنے والے ہو، نہ یہ ایک دوسرے کے قبلے پر عمل کرنے والے ہیں اور جو علم تمہارے پاس آچکا ہے اس کے بعد اگر کہیں تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کر لی تو اس صورت میں یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا۔

شان نزول: حضرت نبی کریم ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ وَدِدْتُ أَنَّ اللّٰهَ صَرَفَنِي عَنْ قِبْلَةِ الْيَهُودِ إِلَى غَيْرِهَا وَكَانَ يُرِيدُ الْكَعْبَةَ، لِأَنَّهَا قِبْلَةُ إِبْرَاهِيمَ، فَقَالَ لَهُ جِبْرِيلُ: إِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ مِثْلُكَ لَا أَمْلِكُ شَيْئًا فَسَلْ رَبَّكَ أَنْ يُحَوِّلَكَ عَنْهَا إِلَى قِبْلَةِ إِبْرَاهِيمَ ثُمَّ ارْتَفَعَ جِبْرِيلُ وَجَعَلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُدِيمُ النَّظَرَ إِلَى السَّمَاءِ رَجَاءَ أَنْ يَأْتِيَهُ جِبْرِيلُ بِمَا سَأَلَهُ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالَى هَذِهِ الْآيَةَ (اسباب النزول)

میرا دل چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود کے قبلہ سے ہٹا کر میرے لیے کوئی دوسرا قبلہ مقرر فرما دے اور مقصد یہ تھا کہ کعبہ شریف قبلہ مقرر ہو جائے کیونکہ وہ قبلہ ابراہیمی ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں بھی تو آپ کی طرح ایک بندہ ہوں، کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا، آپ اپنے رب سے سوال کریں کہ وہ آپ کو قبلہ ابراہیمی کی طرف رخ کرنے کا حکم فرما دے۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام اوپر چڑھ گئے اور رسول اللہ ﷺ برابر اس امید میں آسمان کی طرف نظر فرماتے رہے کہ جبریل علیہ السلام آپ کی خواہش کے مطابق حکمِ خداوندی لے کر نازل ہوں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم مدینہ شریف میں آنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں سولہ مہینے بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کو پورا کرتے ہوئے بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (اسباب النزول)

وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ: اہل کتاب نے دھوکہ دینے کے لیے کہا تھا۔ يَا مُحَمَّدُ عُدْ إِلَى قِبلَتِنَا نُؤمِنُ بِكَ وَنَتَّبِعُكَ (کہ اے محمد! ہمارے قبلہ کی طرف واپس آجاؤ۔ ہم تم پر ایمان لے آئیں گے اور تمہارے قبلہ کا اتباع کرلیں گے)۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں طرف کی امید کو ختم فرمادیا کہ نہ وہ آپ کے قبلہ کا اتباع کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلہ کی طرف متوجہ ہوں گے، یہود کا قبلہ بیت المقدس ہے اور نصاریٰ نے اپنا قبلہ جہت مشرق کو تجویز کرلیا تھا، حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آسمان کی طارف اٹھائے جانے تک کبھی بھی مشرق کی طرف منہ کرکے نماز نہیں پڑھی ان کا قبلہ وہی تھا جو بنی اسرائیل کا قبلہ تھا یعنی بیت المقدس۔ (روح المعانی ص ۱۱ ج ۲)

وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ: (اہل کتاب یہود و نصاریٰ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کا اتباع کرنے والے نہیں ہیں) علامہ محمود آلوسی بغدادی لکھتے ہیں کہ اس میں یہود و نصاریٰ کے الحاد اور تصلب فی الہویٰ کو بیان فرمایا ہے مطلب یہ کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ مخالفت اور عناد صرف آپ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے خود آپس میں بھی ان کی مخالفت اور عناد کا یہی حال ہے۔ (روح)

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ: آپ پاس کے اللہ کی طرف سے علم آگیا اور یہ یقین ہے کہ یہ صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے اور یہ معلوم ہوگیا کہ یہ لوگ خواہشوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، انہیں حق قبول کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اس بالفرض اگر آپ نے ان کی خواہشوں کا اتباع کرلیا تو آپ ان لوگوں میں شمار ہوجائیں گے جو ظلم کرنے والے اور حق کو چھوڑ کر ناحق کی طرف جانے والے ہیں اس طرز بیان میں اتباع ہویٰ سے بچنے کی بہت زیادہ تاکید ہے

اور یہ بتایا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے گناہ صادر ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ اتباع ہویٰ اور ارتکاب گناہ ظالموں کا شیوہ ہے اور حضرت انبیاء کرام علیہم السلام ہر ظلم سے محفوظ اور معصوم ہیں۔ (روح المعانی)

یہود و نصاریٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ پہچانتے تھے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقاً مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ{۱۴۶}الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ{۱۴۷}البقرۃ

جواب ترجمہ: وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی تھی وہ اسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بیشک کچھ لوگ ان میں سے حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں، حق ہے آپ کے رب کی طرف سے سو آپ ہرگز شک کرنیوالوں میں سے نہ ہو جائیں۔

علماءِ اہل کتاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی باتوں کی سچائی کو اس طرح جانتے تھے، جس طرح باپ اپنے بیٹوں کو پہچانے، یہ ایک مثال تھی جو مکمل یقین کے وقت عرب دیا کرتے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے پوچھا أَتَعْرِفُ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا تَعْرِفُ وَلَدَكَ ابْنَكَ، قَالَ: نَعَمْ وَأَكْثَرَ، نَزَلَ الْأَمِينُ مِنَ السَّمَاءِ عَلَى الْأَمِينِ، فِي الْأَرْضِ بِنَعْتِهِ فَعَرَفْتُهُ، وَإِنِّي لَا أَدْرِي مَا كَانَ مِنْ أَمْرِهِ

کیا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی جانتا ہے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتا ہے؟ جواب دیا ہاں بلکہ اس سے بھی زیادہ، اس لئے کہ آسمانوں کا امین فرشتہ زمین کے امین شخص پر نازل ہوا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح تعریف بتادی تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور پھر پروردگار عالم نے ان کی صفتیں بیان کیں جو سب کی سب آپ میں موجود ہیں، پھر ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی برحق ہونے

میں کیا شک رہا؟ ہم آپ ﷺ کو بیک نگاہ کیوں نہ پہچان لیں؟ بلکہ ہمیں اپنی اولاد کے بارے میں شک ہے اور آپ ﷺ کی نبوت میں کچھ شک نہیں، غرضیکہ جس طرح لوگوں کے ایک بڑے مجمع میں ایک شخص اپنے لڑکے کو پہچان لیتا ہے اسی طرح نبی کریم ﷺ کے اوصاف جو اہل کتاب کی آسمانی کتابوں میں ہیں وہ تمام صفات آپ ﷺ میں اس طرح نمایاں ہیں کہ بیک نگاہ ہر شخص آپ ﷺ کو جان جاتا ہے۔

ایک روایت میں تو عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے یہاں تک فرمایا کہ میں اپنے بچے کو بچوں میں کھیلتے ہوئے دیکھ کر جس طرح پہچان لیتا ہوں، آپ ﷺ کو اس سے زیادہ پہچان لیتا ہوں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ وہ کیسے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ عمر! وہ اللہ کی طرف سے حق ہیں، ان کی شان ہماری کتابوں میں بیان کی گئی ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ ہماری عورتوں نے کیا کیا، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو کہا وَفَّقَكَ اللهُ يَا ابْنَ سَلَامٍ اے ابن سلام! اللہ نے تجھے توفیق عطا فرمادی ہے۔ (در منثور ج ۱)

مدینہ منورہ کے بعض وہ اہل کتاب جو مسلمان ہوگئے تھے، وہ بھی نبی کریم ﷺ کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح وہ اپنی اولادوں کو پہچانتے تھے وہ کہتے تھے کہ وَاللهِ لَنَحْنُ أَعْرَفُ بِهِ مِنَّا بِأَبْنَائِنَا مِنَ الصِّفَةِ وَالنَّعْتِ الَّذِي نَجِدُهُ فِي كِتَابِنَا وَأَمَّا ابْنَاؤُنَا فَلَا نَدْرِي مَا أَحْدَثَ النِّسَاءُ (تفسیر در منثور ج ۱ ص ۳۵۶)

اللہ کی قسم ہم اپنی اولادوں سے زیادہ آپ ﷺ کو پہچانتے ہیں، صفت اور شان کے لحاظ سے، جو ہم اپنی کتابوں میں موجود پاتے ہیں، ہمیں اپنی اولادوں کے بارے میں علم نہیں کہ ہماری عورتوں نے کیا کیا؟ تفسیر کبیر میں ہے کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ہمیں شک ہے کہ ہو سکتا ہے ہمارے بچے کی ماں نے خیانت کی ہو، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے سر کا بوسہ لیا۔

جاننے، پہچاننے کے باوجود وہ آپ ﷺ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے، وہ آپ ﷺ کی کتاب پر ایمان نہیں لائے، وہ آپ ﷺ کی پیروی پر تیار نہ ہوئے، وہ آپ ﷺ کی پیٹھ زمین پر لگانے کی ہمہ وقت کوشش کرتے تھے، مقامی آبادی کے ساتھ مل کر وہ ریشہ دوانیاں کرتے تھے، آپ ﷺ کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے، اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ اللہ نے ان کے مقدر میں ہدایت قبول کرنا نہیں لکھا تھا، دوسرا بغض اور عناد نے انہیں اندھا اور بہرہ کر دیا تھا اس لیے حق کو دیکھ سن نہیں سکتے تھے۔

وَإِنَّ فَرِيقاً مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ: اہل کتاب کے دو گروہ تھے ایک وہ جو ایمان لے آئے تھے جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان کے پیروکار اور ایک گروہ ان میں وہ تھا جو اپنے کفر پر ڈٹا ہوا تھا، ان میں سے جو لوگ ایمان لے آئے تھے ان کے بارے میں یہ فرمان نہیں ہے کہ وہ حق کو پوشیدہ رکھتے تھے، یہ فرمان ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنے کفر پر یقینی طور پر جمے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے کی یہاں مذمت کی ہے کہ یہ جاننے کے باوجود حق چھپاتے ہیں، کیونکہ دین کا اظہار اگر ممکن ہو تو اسے چھپانا ممنوع ہے، اب جس چیز کو پوشیدہ رکھتے تھے اس بارے میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت محمد ﷺ کے معاملے کو پوشیدہ رکھنا ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد قبلہ کے معاملہ کو پوشیدہ رکھنا ہے۔

الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ: علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق اپنی جگہ ثابت اور متحقق ہے اور ظاہر و باہر ہے اس میں کسی کو کچھ بھی شک کرنے کی گنجائش نہیں، صیغہ نہی کا ہے لیکن مقصود اخبار ہے، حق میں شک کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔ (روح المعانی)

اہمیت قبلہ اور مقصد بعثت پیغمبر ﷺ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا إِنَّ اللَّهَ عَلَى

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ {۱۴۸} وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ {۱۴۹} وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ {۱۵۰} كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ {۱۵۱} البقرۃ

جواب ترجمہ: اور ہر جماعت کے لیے ایک جہت ہے، جس کی طرف وہ اپنا رخ کرنے والے ہیں۔ لہٰذا تم نیک کاموں کی طرف آگے بڑھو، جہاں کہیں بھی تم ہو گے اللہ تعالیٰ تم سب کو لے آئے گا۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور جس جگہ سے بھی آپ باہر جائیں تو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔ اور بلاشبہ یہ ضرور حق ہے آپ کے رب کی طرف سے، اور اللہ غافل نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔ اور جس جگہ سے بھی آپ باہر جائیں اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر دیجیے۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو سو اپنے چہرے اس کی طرف پھیر لو، تاکہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔ سوائے ان کے جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا۔ لہٰذا تم ان سے ڈرو اور مجھ سے ڈرو تاکہ میں پوری کر دوں تم پر اپنی نعمت اور تاکہ تم ہدایت پر رہو۔ جیسا کہ ہم نے بھیجا تمہارے اندر ایک رسول جو تم میں سے ہے وہ تلاوت کرتا ہے تم پر ہماری آیات اور تمہیں پاکیزہ بناتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تم کو وہ چیزیں سکھاتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا: اس میں لکل کا مضاف الیہ محذوف ہے۔ اَیْ لِکُلِّ اَھْلِ مِلَّۃٍ أَوْ جَمَاعَۃٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْیَھُوْدِ وَ النَّصَارٰی یعنی ہر مذہب اور ملت اور ہر جماعت کا عبادتوں میں اپنا رخ الگ ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ خواہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کر دیا گیا ہو۔ خواہ لوگوں نے کوئی جہت اپنے طور پر مقرر کر لی ہو پھر اگر نبی اکرم خاتم الانبیاء ﷺ کے لیے قبلہ ابراہیمی مقرر کر دیا گیا جو

دوسروں کے قبلہ سے مختلف ہے تو اس میں اعتراض اور تعجب کی کیا وجہ ہے۔ اور یہ معنی بھی لیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا رخ مختلف بلاد و اَمصار اور مختلف آفاق و اطراف میں مختلف ہوتا ہے۔ چار جہات (مشرق مغرب جنوب شمال) میں سے کوئی جہت بھی مسلمانوں کا قبلہ نہیں ہے بلکہ ان کا قبلہ کعبہ ہے اور کعبہ شریف کو رخ کرنے سے مختلف علاقوں کے لوگ مختلف جہات کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ رخ سب کا کعبہ شریف ہی کی طرف ہے کوئی مشرق کو رخ کیے ہوئے ہے کوئی مغرب کی طرف نماز پڑھتا ہے کسی کا قبلہ جنوب اور کسی کا قبلہ شمال کی طرف ہے۔ (روح المعانی ص ۳ ج ۲، بحوالہ انوار البیان)

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ: اے مومنو! ان کاموں کی طرف آگے بڑھو اور پہل کرو جن میں دارین میں سعادت حاصل ہو قبلہ کا استقبال بھی امر خداوندی کے مطابق کرو اور اس کے سوا دیگر احکام الٰہیہ میں بھی بڑھ چڑھ کر عمل کرو۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ الخیرات سے نمازیں مراد ہیں جب نماز کا وقت مامور بہ ہو جائے تو نماز کی طرف لپکنے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ (انوار البیان)

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: یعنی تم جہاں کہیں بھی ہو جس خطہ زمین میں ہو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی جزا دینے کے لیے تم سب کو جمع فرمائے گا، فرمانبرداری اور اعمال صالحہ کی اچھی جزا ملے گی اور برے کاموں کی سزا ملے گی، لہٰذا فرصت کو غنیمت جانیں اور موت اور حشر نشر سے غافل نہ ہوں اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے، زندگی بخشنا موت دینا جمع کرنا جزا دینا سب اس کے لیے آسان ہے۔ (انوار البیان)

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: اللہ تعالیٰ نے مسجد حرام کی طرف رخ کرنے کا حکم ان آیتوں میں تین مرتبہ دہرایا ہے، اس سے ایک تو حکم کی اہمیت اور تاکید جتلانی مقصود ہے، دوسرے یہ بھی بتانا ہے کہ قبلے کا رخ کرنا صرف اس حالت میں نہیں ہے جب کوئی شخص بیت اللہ کے سامنے موجود ہو، بلکہ جب مکہ مکرمہ سے نکلا ہوا ہو تب بھی یہی حکم ہے اور کہیں دور چلا جائے تب بھی یہ فریضہ ختم نہیں ہوتا، البتہ یہاں اللہ تعالیٰ نے سمت کا لفظ استعمال فرما کر اس طرف بھی اشارہ

کر دیا ہے کہ کعبے کا رخ کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان کعبے کی سو فیصد سیدھ میں ہو بلکہ اگر سمت وہی ہے تو کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم پورا ہو جائے گا اور انسان اس معاملے میں اتنا ہی مکلف ہے کہ وہ اپنے بہترین ذرائع استعمال کر کے سمت صحیح متعین کر لے ایسا کر لینے کے بعد اس کی نماز ہو جائے گی۔ (توضیح القرآن للعثمانی)

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ: اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بیت المقدس قبلہ تھا، یہودی یہ حجت کرتے تھے کہ دیکھو ہمارا دین برحق ہے، اسی لے یہ لوگ ہمارے قبلے کو اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور مشرکین مکہ یہ بحث کرتے تھے کہ مسلمان اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا متبع کہتے ہیں مگر انہوں نے ابراہیمی قبلے کو چھوڑ کر ان سے سنگین انحراف کر لیا ہے، اب جبکہ قبلے کی تبدیلی میں جو مصلحت تھی وہ حاصل ہو گئی اور اس کے بعد مسلمان ہمیشہ کے لئے کعبے کو قبلہ قرار دے کر اس پر عمل پیرا ہوں گے تو ان دونوں کی حجتیں ختم ہو جائیں گی، البتہ وہ کٹ حجت لوگ جنہوں نے اعتراض کرتے رہنے کی قسم ہی کھا رکھی ہے ان کی زبانیں کوئی نہیں روک سکتا، لیکن مسلمانوں کو ان سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے، انہیں اللہ کے سوا کسی سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ (توضیح القرآن للعثمانی)

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبے کی تعمیر کے وقت دو دعائیں کی تھیں، ایک یہ کہ ہماری نسل سے ایسی امت پیدا فرمایئے جو آپ کی مکمل فرمانبردار ہو اور دوسری یہ کہ ان میں ایک رسول بھیجئے اللہ تعالیٰ نے پہلی دعا اس طرح قبول فرمائی کہ امت محمدیہ کو معتدل امت قرار دے کر پیدا فرمایا، اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس طرح ہم نے حضرت ابراہیم کی دعا قبول کرتے ہوئے تم پر یہ انعام فرمایا کہ تمہیں معتدل امت بنا کر آئندہ کے لیے انسانیت کی رہنمائی تمہیں عطا کر دی، جس کی ایک اہم علامت یہ بھی ہے کہ ہمیشہ کے لئے کعبے کو قبلہ بنا دیا گیا ہے، اسی طرح ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری دعا قبول کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے درمیان بھیج دیا ہے، جو انہی خصوصیات اور فرائض منصبی کے حامل ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

ان کے لئے مانگے تھے۔

ان میں سے پہلا فریضہ تلاوت آیات ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی آیات کو تلاوت کرنا بذات خود ایک مقصد اور ایک نیکی ہے، خواہ تلاوت آیات بغیر سمجھے کی جائے، کیونکہ قرآن کے معنی کی تعلیم آگے ایک مستقل فریضے کے طور پر بیان کی گئی ہے، دوسرا مقصد قرآن کریم کی تعلیم ہے، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم کے بغیر قرآن کریم کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا ممکن نہیں ہے اور یہ کہ صرف ترجمہ پڑھ لینے سے قرآن کریم کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ اہل عرب عربی زبان سے خوب واقف تھے، انہیں ترجمہ سکھانے کے لئے کسی استاذ کی ضرورت نہیں تھی۔

تیسرے آپ کا فریضہ یہ بتایا گیا ہے کہ آپ حکمت کی تعلیم دیں، اس سے معلوم ہوا کہ حکمت و دانائی اور عقلمندی وہی ہے جو آنحضرت ﷺ نے تلقین فرمائی، اس سے نہ صرف آپ کی احادیث کا حجت ہونا معلوم ہوتا ہے بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگر آپ کا کوئی حکم کسی کو اپنی عقل کے لحاظ سے حکمت کے خلاف محسوس ہو تو اعتبار اس کی عقل کا نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کی سکھائی ہوئی حکمت کا ہے۔

چوتھا فریضہ یہ بتایا گیا ہے کہ آپ لوگوں کو پاکیزہ بنائیں اس سے مراد آپ کی عملی تربیت ہے، جس کے ذریعے آپ ﷺ نے صحابہ کرام کے اخلاق اور باطنی صفات کو گندے جذبات سے پاک کر کے انہیں اعلیٰ درجے کی خصوصیات سے آراستہ فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن و سنت کا صرف کتابی علم بھی انسان کی اصلاح کے لئے کافی نہیں ہے، جب تک اس نے اس علم کو اپنی زندگی میں نافذ کرنے کی عملی تربیت نہ لی ہو۔

آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو اپنی صحبت سے سرفراز فرما کر ان کی تربیت فرمائی، پھر صحابہ نے تابعین کی اور تابعین نے تبع تابعین کی اسی طرح تربیت کی اور یہ سلسلہ صدیوں سے اسی طرح چلا آتا

ہے، باطنی اخلاق کی اسی تربیت کا علم علم احسان یا تزکیہ کہلاتا ہے اور تصوف بھی در حقیقت اسی علم کا نام تھا اگرچہ بعض نااہلوں نے اس میں غلط خیالات کی ملاوٹ کر کے بعض مرتبہ اسے خراب بھی کر دیا، لیکن اس کی اصل یہی تزکیہ ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے یہاں فرمایا ہے اور ہر دور میں تصوف کی اصل حقیقت کو سمجھ کر اس پر عمل کرنے والے ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ (توضیح القرآن)

ذکر و شکر

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ {۱۵۲} البقرہ

جواب ترجمہ: سو تم مجھ کو یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو، اور میری ناشکری نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ حکم دے رہے ہیں کہ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا، امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بندوں کو جو اللہ کی طرف سے حکم ہے کہ تم مجھے یاد کرو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میری اطاعت، میری فرمانبرداری کے ساتھ مجھے یاد رکھو میں تمہیں اس پر اجر و ثواب دے کر یاد کروں گا، دل سے زبان سے اللہ کو یاد کرنا یہ بھی یاد ہے اور فرمانبرداری اور اطاعت میں لگنا یہ بھی یاد ہے، اللہ کے خوف سے گناہوں کو چھوڑ دینا یہ بھی یاد ہے، ہر وہ شخص جو اللہ کی فرمانبرداری میں مشغول ہو وہ ذکر کرنے والا ہے، زبان سے یاد کرنے کی بھی بہت زیادہ فضیلت ہے۔

ایک حدیث حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ أَنَا مَعَ عَبْدِي حَيْثُمَا ذَكَرَنِي وَتَحَرَّكَتْ بِي شَفَتَاهُ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرے اور میری یاد میں اس کے ہونٹ حرکت کریں (بخاری)

دوسری حدیث قدسی میں یوں ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي، وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي، فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي، وَإِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ، وَإِنْ

تَقَرَّبَ إِلَيَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ بَاعًا، وَإِنْ أَتَانِي يَمْشِي أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً (بخاری) میں اپنے بندہ کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرے سو اگر اس نے مجھے تنہائی میں یاد کیا تو میں بھی اسے تنہا یاد کروں گا اور اگر وہ مجھے جماعت میں یاد کرے تو میں اسے ایسی جماعت میں یاد کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے بہتر ہے۔ (یعنی عالم بالا کے درباری فرشتوں کے سامنے)۔

مسلم شریف کی روایت میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ للهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ مجھے جن چیزوں پر سورج طلوع ہوتا ہے ان سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لیے سبحان اللہ وبحمدہ کے کلمات پسند فرمائے ہیں۔ (مسلم) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيمِ وَبِحَمْدِهِ کہا تو اس کے لیے جنت میں کھجور کا ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔ (ترمذی) نبی کریم ﷺ نے فرمایا دو کلمے زبان پر ہلکے پھلکے ہیں، بروز محشر ترازو میں بھاری ہوں گے اور رحمٰن کے ہاں پسندیدہ ہیں وہ کلمے سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيمِ ہیں۔ (بخاری) نبی کریم ﷺ نے ایک صحابی کے سوال پر ارشاد فرمایا کہ ہر وقت زبان اللہ کے ذکر سے تر رکھو۔ (ترمذی)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور دل ہی دل میں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ پڑھ رہے تھے، نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا کہ اے عبد اللہ بن قیس! کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتاؤں؟ تو ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ ہاں بتائیں تو آپ ﷺ نے فرمایا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ (مسلم) نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو لوگ کسی جگہ بیٹھ کر اللہ کی یاد میں مصروف ہو جاتے ہیں انہیں فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان پر رحمت چھا جاتی ہے اور ان پر اطمینان اترتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں یاد فرماتا ہے۔ (مسلم)

وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ: اللہ فرماتے ہیں کہ میری یاد میں سرشار رہو اور میری بیش بہا نعمتوں اور

نوازشات پر میری شکر گزاری بھی کرو، ناشکری نہ کرو، اللہ تعالیٰ نے ذکر کے بعد شکر کو اس طرح ذکر فرمایا کہ گویا دونوں ضروری چیزیں ہیں، انسان انفس وآفاق میں جب گہرائی سے دیکھتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ رب العالمین کی نعمتیں کس قدر پھیلی اور بکھری ہوئی ہیں، ایک انسان اپنی ذات میں ہی غور وفکر کرے تو اسے اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی اس پر کتنی اور کس قدر کرم نوازی ہے، سورۃ الرحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے انفس وآفاق کی نشانیاں بتا بتا کر، نعمتیں گنوا گنوا کر فرمایا کہ اس ذات کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے، ایک مقام پر ارشاد فرمایا کہ جو لوگ شکر گزاری کرتے ہیں میں عطایا ونوازشات میں اضافہ کروں گا، کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس پر اللہ کی ہزاروں کروڑوں نعمتیں نہ ہوں مگر ان میں وہی اللہ کے قدر دان بندے ہیں جو اس کی نعمتوں کی شکر گزاری کرتے ہیں اور ایسے بندے بہت ہی تھوڑے ہوتے ہیں جو اپنے پروردگار کی نعمتوں کے شکر گزار ہوتے ہیں۔

صبر وصلاۃ کے ساتھ مدد خواہی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ {۱۵۳} البقرہ

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مخالفین اسلام اور دشمنان دین کی طرف سے مسلمانوں کو جا اور بے جا تکلیفیں اور اذیتیں دی جاتی تھیں، تحویل قبلہ کے موقع پر بھی مخالفین کی زبان درازیاں ہو رہی تھیں، ایسے میں اہل اسلام اور صاحبان ایمان وایقان کو صبر اور نماز کے ساتھ اللہ سے مدد چاہنے کی ہدایت کی جا رہی ہے، اپنی دینی ضروریات اور دنیوی احتیاجیوں کی تکمیل کے لیے صبر اور نماز بہت ہی عمدہ وسائل اور ذرائع ہیں، یہی دو اعمال اللہ کے قریب کرنے اور اللہ کی معرفت میں اہم مقام دلانے میں بہترین زاد راہ اور توشہ ہیں۔

صبر: صبر لغت میں روکنے کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اپنی خواہشات نفسانیہ کو روکو کیونکہ جہنم ان

ہی سے ڈھکی ہوئی ہے اور اپنے نفس کو جانی اور مالی مشقتوں اور سختیوں پر روکو کیونکہ جنت ان ہی سے گھری ہوئی ہے۔ نیز بری مجالس سے یکسوئی اور ذکر و طاعت پر نفس کو مجبور کرو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے خلوت کی فضیلت میں فرمایا ہے کہ مسلمان کا عمدہ مال بکریاں ہیں کہ انہیں لے کر کسی پہاڑ کی چوٹی میں چلا جائے اور فتنوں سے اپنے دین کو بچائے۔ (بخاری، تفسیر مظہری)

وَالصَّلٰوۃِ: (اور نماز سے) صبر میں اگرچہ نماز بھی داخل ہوگئی تھی لیکن نماز کے مہتم بالشان اور اُمّ العبادات اور معراج مؤمن ہونے کی وجہ سے اسے خاص طور پر جداگانہ ذکر فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نماز دین کا ستون ہے۔ (مسند الفردوس) انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نماز مؤمن کا نور ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبادت گذاروں کے درجات کی انتہاء اور بازگشت نماز کی حقیقت ہے اور نماز کی کثرت سے درجات میں ترقی ہوتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ: (بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) اللہ کے صبر کرنے والوں کے ساتھ ہونے کے معنی مفسرین نے یہ بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مدد اور نصرت اور قبول دعا سے صابروں کے ساتھ ہے۔ (مظہری

شہدا اور حیاتِ انبیاء کرام علیہم السلام

سوال اس کی کیا دلیل ہے کہ جو لوگ راہ خدا میں مارے جاتے ہیں وہ شہید ہیں؟

جواب قرآن حکیم بتاتا ہے **وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ** {۱۵۴} البقرۃ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ مرے ہوئے ہیں (وہ مردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شہیدوں کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ ایسی زندگی میں ہیں جسے تم نہیں سمجھ سکتے انہیں حیاتِ برزخی حاصل ہے اور وہاں وہ کھاتے پیتے ہیں۔۔ حدیث میں ہے **اِنَّ اَرْوَاحَ الشُّھَدَاءِ فِی**

حَوَاصِلِ طَيْرٍ خُضْرٍ تَسْرَحُ فِي الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ ثُمَّ تَأْوِي إِلَى قَنَادِيلَ مُعَلَّقَةٍ تَحْتَ الْعَرْشِ، فَاطَّلَعَ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ اطِّلَاعَةً، فَقَالَ: مَاذَا تَبْغُونَ؟ فَقَالُوا: يَا رَبَّنَا، وَأَيُّ شَيْءٍ نَبْغِي، وَقَدْ أَعْطَيْتَنَا مَا لَمْ تُعْطِ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ؟ ثُمَّ عَادَ إِلَيْهِمْ بِمِثْلِ هَذَا، فَلَمَّا رَأَوْا أَنَّهُمْ لَا يُتْرَكُونَ مِنْ أَنْ يَسْأَلُوا، قَالُوا: نُرِيدُ أَنْ تَرُدَّنَا إِلَى الدُّنْيَا، فَنُقَاتِلَ فِي سَبِيلِكَ، حَتَّى نُقْتَلَ فِيكَ مَرَّةً أُخْرَى، لِمَا يَرَوْنَ مِنْ ثَوَابِ الشَّهَادَةِ، فَيَقُولُ الرَّبُّ جَلَّ جَلَالُهُ: إِنِّي كتبتُ أَنَّهم إِلَيْهَا لَا يَرْجِعُونَ (مسلم)

شہیدوں کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے قالب میں ہیں اور جنت میں جس جگہ چاہیں چرتی چگتی اڑتی پھرتی ہیں، پھر ان قندیلوں میں آکر بیٹھ جاتی ہیں جو عرش کے نیچے لٹک رہی ہیں ان کے رب نے ایک مرتبہ انہیں دیکھا اور ان سے دریافت کیا کہ اب تم کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا اللہ ہمیں تو تونے وہ دے رکھا ہے جو کسی کو نہیں دیا پھر ہمیں کس چیز کی ضرورت ہو گی؟ ان سے پھر یہی سوال ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ اب ہمیں کوئی جواب دینا ہی ہو گا تو کہا اللہ ہم چاہتے ہیں کہ تو ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج، ہم تیری راہ میں پھر جنگ کریں پھر شہید ہو کر تیرے پاس آئیں اور شہادت کا دگنا درجہ پائیں، رب جل جلالہ نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا یہ تو میں لکھ چکا ہوں کہ کوئی بھی مرنے کے بعد دنیا کی طرف پلٹ کر نہیں جائے گا۔ (مسلم شریف)

مسند احمد کی ایک اور حدیث میں ہے کہ نَسَمَةُ الْمُؤْمِنِ طَائِرٌ تَعْلَقُ فِي شَجَرِ الْجَنَّةِ، حَتَّى يُرْجِعَهُ اللَّهُ إِلَى جَسَدِهِ يَوْمَ يَبْعَثُهُ مومن کی روح ایک پرندے میں ہے جو جنتی درختوں پر رہتی ہے اور قیامت کے دن وہ اپنے جسم کی طرف لوٹ آئے گی۔ (مسند احمد) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مومن کی روح وہاں زندہ ہے لیکن شہیدوں کی روح کو ایک طرح کی امتیازی شرافت، کرامت، عزت اور عظمت حاصل ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں یہ تو سب کو معلوم ہے کہ

اسلامی روایات کی رو سے ہر مرنے والے کو برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے، جس سے وہ قبر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مومن و کافر یا صالح و فاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیاتِ برزخی کے مختلف درجات ہیں، ایک درجہ تو سب کو عام اور شامل ہے کچھ مخصوص درجے انبیاء علیہم السلام و صالحین کے لئے مخصوص ہیں اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے۔ (معارف القرآن)

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے شہید کہتے ہیں اور اس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے لیکن اس کی موت کو دوسرے مردوں کی سی موت سمجھنے کی ممانعت کی گئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو برزخی حیات میں اور مردوں سے ایک گونہ امتیاز ہے اور وہ امتیاز یہ ہے کہ اس کی یہ حیات آثار میں اوروں سے قوی ہے جیسے انگلیوں کے اگلے پوروے اور ایڑی اگرچہ دونوں میں حیات ہے اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں لیکن انگلیوں کے پوروں میں حیات کے آثار احساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں۔

اسی طرح شہداء میں آثار حیات عام مردوں سے بہت زیادہ ہیں حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلاف معمولی مردوں کے اس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچا ہے کہ اس کا جسم باوجود مجموعہ گوشت و پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا اور مثل جسم زندہ کے صحیح سالم رہتا ہے جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں پس اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو احیاء کہا گیا اور ان کو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی ممانعت کی گئی مگر احکام ظاہرہ میں وہ عام مردوں کی طرح ہیں ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے اور ان کی بیویاں دوسروں سے نکاح کر سکتی ہیں اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں یہاں تک کہ سلامت جسم کے علاوہ اس حیات برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی ان کی ازواج دوسروں کے نکاح میں نہیں آسکتیں۔

پس اس حیات میں سب سے قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں پھر شہداء پھر اور معمولی مردے البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء وصالحین رحمۃ اللہ علیہم بھی اس فضیلت میں شہداء کے شریک ہیں سو مجاہدۂ نفس میں مرنے کو بھی معنی شہادت میں داخل سمجھیں گے اس طور پر وہ بھی شہداء ہوگئے یا یوں کہا جاوے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام قرون کے اعتبار سے ہے شہداء کے ہم مرتبہ دوسرے لوگ صالحین وصدیقین کے اعتبار سے نہیں۔

اور اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو خاک خوردہ پایا ہو تو سمجھ لے کہ ممکن ہے اس کی نیت خالص نہ ہو جس پر مدار ہے قتل کے شہادت ہونے کا اور صرف قتل شہادت نہیں ہے اور اگر فرضاً ایسا شہید خاک خوردہ پایا جاوے جس کا قتل فی سبیل اللہ اور اس کا جامع شرائط شہادت ہونا دلیل قطعی تواتر وغیرہ سے ثابت ہو (جس کا شبہ صاحب روح المعانی کو ہو گیا ہے) تو اس کی وجہ میں کہا جاوے گا کہ حدیث میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام وشہدا کے جسم کو زمین نہیں کھاتی یعنی مٹی ان کے جسم کو خراب نہیں کر سکتی اجزاء ارضیہ مٹی وغیرہ کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ان کے جسم کا متاثر ہو کر فنا ہو جانا پھر بھی ممکن ہے کیونکہ زمین میں اور بھی بہت سی اقسام وانواع کی دھاتیں اور ان کے اجزاء اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں اگر ان کی وجہ سے کسی شہید کا جسم متاثر ہو جائے تو اس آیت کے منافی نہیں۔

چنانچہ دوسرے اجسام مرکبہ مثل اسلحہ وادویہ واغذیہ واخلاط واجسام بسیطہ مثل آب وآتش وباد کی تاثیر انبیاء علیہم السلام کے اجساد میں بھی ثابت ہے اور شہداء کی حیات بعد الممات انبیاء علیہم السلام کی حیات قبل الممات سے اقویٰ نہیں اور بعض حصہ ارض میں بعض اجزاء غیر ارضیہ بھی شامل ہو جاتے ہیں جس طرح دوسرے عناصر میں بھی مختلف عناصر شامل ہو جاتے ہیں سو اگر ان اجزائے غیر ارضیہ سے ان کے اجساد متاثر ہو جاویں تو اس سے ان احادیث پر اشکال نہیں ہوتا جن میں حرمت اجساد علی الارض وارد ہے۔

اور ایک جواب یہ ہے کہ امتیاز اجسادِ شہداء کے لئے یہ کافی ہے کہ دوسری اموات سے زیادہ مدت تک ان کے اجساد خاک سے متاثر نہ ہوں گو کسی وقت میں ہو جاویں اور احادیث سے یہی امر مقصود کہا جاوے کہ ان کی محفوظیت اجساد کی خارق عادت ہے اور خرق عادت کی دونوں صورتیں ہیں حفظ مؤبد اور حفظ طویل اور چونکہ عالم برزخ حواس یعنی آنکھ کان، ناک، ہاتھ وغیرہ سے مدرک نہیں ہوتا اس لئے لَا تَشْعُرُوْنَ فرمایا گیا کہ تم ان کی حیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ (بیان القرآن)

اس بیان سے معلوم ہوا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی قبر والی زندگی شہدا کی شہادت کے بعد والی زندگی سے زیادہ قوی ہے، امت مسلمہ کا اجماعی عقیدہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں، صحیح حدیث شریف میں بھی یہ مضمون موجود ہے، حضرت امام بیہقی رحمہ اللہ نے حیات الانبیاء پر باضابطہ ایک کتاب تحریر فرمائی ہے، عصر حاضر کے علماء کرام میں مولانا محمد سرفراز خان صاحب رحمہ اللہ نے تسکین الصدور، علامہ خالد محمود رحمہ اللہ نے مقام حیات تحریر فرمائی ہے، جس میں حیات الانبیاء سے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

حیات انبیاء کرام علیہم السلام پر امت مسلمہ کے جید علماء کرام کا اجماع ہے، برصغیر میں حنفی مسلک کے لوگوں کی اکثریت ہے، یہاں کے علماء کرام بھی حیات انبیاء کرام علیہم السلام کے قائل ہیں اور یہی عقیدہ متواتر چلا آیا ہے۔

اہلِ ایمان کی آزمائش

سوال اہلِ ایمان کو کیسے کیسے آزمائش میں ڈالا جاتا ہے؟ اس آیت کی روشنی میں واضح کریں

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمَوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ {۱۵۵} البقرۃ

جواب ترجمہ: اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) بشارت سنادو۔

علامہ کیلانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر تیسیر القرآن میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں یہ خطاب مسلمانوں سے ہے، خوف سے مراد وہ ہنگامی صورت حال ہے جو جنگ احزاب سے پہلے ہر وقت مدینہ کی آزاد چھوٹی سی ریاست کے گرد منڈلاتی رہتی تھی۔

ایک دفعہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کاش آج رات کوئی میرا پہرہ دے تاکہ میں سو سکوں، یہ سن کر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مسلح ہو کر آگئے اور کہا، یارسول اللہ! میں پہرہ دیتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو جائیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح آرام فرمایا۔ (بخاری)

اور ایک رات اہل مدینہ ایک خوفناک آواز سن کر گھبرا گئے، پھر وہ اس آواز کی طرف روانہ ہوئے تو دیکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے واپس آرہے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پہلے ہی اس آواز کی جانب روانہ ہو گئے تھے اور خبر معلوم کر کے آرہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے کہا ڈرو نہیں، ڈرو نہیں۔ (بخاری، کتاب الجہاد،)

مولانا کیلانی رحمہ اللہ اس کے بعد لکھتے ہیں اور اس دور میں مسلمانوں کی معاشی تنگ دستی کا حال درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

① ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے صفہ والوں میں ستر آدمی ایسے دیکھے جن کے پاس چادر تک نہ تھی یا تو فقط تہبند تھا یا فقط کمبل، جسے انہوں نے گردن سے باندھ رکھا تھا، جو کسی کی آدھی پنڈلیوں تک پہنچتا اور کسی کے ٹخنوں تک، جسے وہ اپنے ہاتھ سے سمیٹتے رہتے، اس ڈر سے کہ کہیں ان کا ستر نہ کھل جائے۔ (بخاری، باب نوم الرجال فی المسجد)

② حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: میرے بھانجے ہم پر ایسا وقت گزر چکا ہے کہ ہم ایک چاند دیکھتے، پھر دوسرا چاند، پھر تیسرا چاند یعنی دو دو مہینے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، عروہ نے کہا: خالہ! پھر تمہاری گزر کس چیز پر ہوتی تھی؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: انہی دو کالی چیزوں یعنی کھجور اور پانی پر، اتنا ضرور تھا کہ چند انصاری لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسائے

تھے جن کے پاس بکریاں تھیں، وہ آپ کے لیے بکریوں کا دودھ تحفہ کے طور پر بھیجا کرتے جس سے ہم آپ ﷺ کو بھی پلاتے۔ (بخاری۔ کتاب الھبۃ و فضلھا)

③ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی آل پر آپ کی وفات تک ایسا زمانہ نہیں گزرا کہ انہوں نے مسلسل تین دن پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہو۔ (بخاری، کتاب الاطعمہ)

④ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملے تو ان سے کہا کہ قرآن پاک کی آیت: وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (۸)سورۃ الانسان) مجھے پڑھ کر سناؤ، وہ اپنے گھر میں گئے اور یہ آیت مجھے پڑھ کر سنائی اور سمجھائی، آخر میں وہاں سے چلا، تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ بھوک سے بے حال ہو کر اُوندھے منہ گر پڑا، اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ میرے سرہانے کھڑے ہیں، آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھایا اور پہچان گئے کہ بھوک کے مارے میرا یہ حال ہے، آپ مجھے گھر لے گئے اور میرے لیے دودھ کا پیالہ لانے کا حکم دیا، میں نے دودھ پیا، پھر فرمایا ابو ہریرہ! اور پی، میں نے اور پیا۔ پھر فرمایا: اور پی۔ میں نے اور پیا حتیٰ کہ میرا پیٹ تن کر سیدھا ہو گیا۔

پھر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملا اور اپنا حال بیان کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میری بھوک دور کرنے کے لیے ایسے شخص کو بھیج دیا جو آپ سے اس بات کے زیادہ لائق تھے، اللہ کی قسم! میں نے آپ سے جو نسی آیت پڑھ کر سنانے کو کہا تھا، وہ مجھے آپ سے زیادہ یاد تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے، اللہ کی قسم! اگر میں اس وقت تمہیں گھر لے جا کر کھانا کھلاتا تو سرخ اونٹوں کے ملنے سے بھی زیادہ خوشی ہوتی۔ (بخاری، کتاب کلوا من طیبات مارزقناکم)

⑤ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں پہلا عرب ہوں جس نے اللہ کی راہ میں تیر چلایا اور ہم نے اپنے تئیں اس وقت جہاد کرتے پایا جب ہم کو حبلہ اور سمر (کانٹے دار درخت) کے پتوں کے سوا اور خوراک نہ ملتی، ہم لوگوں کو اس وقت بکری کی طرح سوکھی مینگنیاں آیا کرتیں جن میں تری نام کی کوئی

چیز نہ ہوتی۔ (بخاری، کتاب الرقاق)

⑥ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم چھ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک لڑائی کو نکلے، سواری کے لیے ہم سب کے پاس ایک ہی اونٹ تھا اور باری باری اس پر سوار ہوتے اور چلتے چلتے ہمارے پاؤں پھٹ گئے اور میرے تو پاؤں پھٹ کر ناخن بھی گر پڑے، اس حال میں ہم پاؤں پر چیتھڑے لپیٹ لیتے، اسی لیے اس لڑائی کا نام غزوہ ذات الرقاع (چیتھڑوں والی لڑائی پڑ گیا۔ (بخاری، کتاب المغازی باب غزوۃ ذات الرقاع)

⑦ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ نے ایک لشکر سمندر کے کنارے بھیجا جس میں تین سو آدمی اور سردار ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تھے، ہمارا راشن ختم ہو گیا تو ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ سب لوگ اپنا اپنا بچا ہوا راشن ایک جگہ جمع کریں، یہ سارا راشن کھجور کے دو تھیلے تھے، ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اس سے تھوڑا تھوڑا کھانے کو دیتے رہے، جب وہ بھی ختم ہو گیا تو ہمیں روزانہ صرف ایک کھجور کھانے کو ملا کرتی۔ وہب نے جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا! بھلا ایک کھجور سے کیا بنتا ہو گا؟ جابر رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ وہ ایک کھجور بھی غنیمت تھی، جب وہ بھی نہ رہی تو ہمیں اس کی قدر معلوم ہوئی، پھر ہم سمندر پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بہت بڑی مچھلی ٹیلے کی طرح پڑی ہے، سارا لشکر اٹھارہ دن اس کا گوشت کھاتا رہا، جب ہم چلنے لگے تو ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اس کی دو پسلیاں کھڑی کی جائیں وہ اتنی اونچی تھیں کہ اونٹ پر کجاوہ کسا گیا تو وہ ان کے نیچے سے نکل گیا۔ (بخاری۔ کتاب المغازی باب غزوۃ سیف البحر)

خوف کے علاوہ فاقہ، جان و مال اور پھلوں میں خسارہ یہ سب ایسی صورتیں ہیں جو اسلام کی راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پیش آتی رہیں۔ اسی لیے انہیں صبر اور نماز سے مدد لینے کی ہدایت کی گئی۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

صابرین کی صفت اور اس پر انعام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے،

الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (۱۵۶) أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن

رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۱۵۷) البقرۃ

جواب ترجمہ: جن کی صفت یہ ہے کہ جب پہنچے ان کو کوئی مصیبت تو وہ کہتے ہیں کہ بیشک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مصیبت زدوں اور پریشان حال لوگوں سے فرمایا کہ وہ صبر و نماز سے دستگیری چاہیں، پھر ان کو بشارت سنائی گئی کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، ان صابرین کی یہاں ایک صفت یہ بیان کی گئی کہ جب انہیں کوئی مصیبت، دکھ، تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بے ساختہ اپنی زبانوں پر یہ ایمانی وایقانی کلمات دہراتے دکھائی دیتے ہیں کہ اگر یہ دکھ اور تکلیف پہنچی تو کیا ہوا، ہم تو اللہ ہی کی طرف سے آئے ہیں اور اسی پروردگار کی طرف واپس لوٹ جانے والے ہیں، جب ہم بندے اس عالی ذات کے ہیں تو پھر اس کے فیصلوں پر ہم دل وجان سے راضی ہیں، ہم اس کے رب ہونے پر راضی ہیں، ہم اس کے لکھے فیصلوں کو تسلیم کرتے ہیں، جو اس نے ہمیں دیا وہ اسی کا دیا ہے اور جو اس نے واپس لے لیا وہ بھی اسی کا ہے، وہ ہمارا مالک ہے ہم اس کے مملوک ہیں، وہ معبود ہے اور ہم عبادت بجالانے والے ہیں، ہمیں اس کے کسی فیصلے پر اعتراض نہیں ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی صبر وثبات کا نمونہ تھی، وہ مکہ کی پر پیچ وادیوں میں مظالم برداشت کرتے رہے، گھر سے بے گھر ہوئے، دیس سے بے دیس ہوئے مگر کسی بھی مرحلہ پر حرف شکایت زبان پر نہیں لائے، نبی کریم ﷺ کی اجتماعی زندگی ہو یا انفرادی زندگی تمام ہی اپنے پیروکاروں کے لیے نمونہ ہے، ایک ماڈل ہے، آپ ﷺ کو جب اطلاع ملی کہ ان کا نواسہ دنیا سے جا رہا ہے، جان کنی کے عالم میں ہے، نبی کریم ﷺ نے اس اطلاع دینے والے کے ہاتھ سلام بھیجا اور زبان مبارک سے یہ الفاظ رواں تھے کہ إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ، وَلَهُ مَا أَعْطَى، وَكُلٌّ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى، فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ جو کچھ اللہ نے لے لیا وہ اللہ ہی کا ہے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے وہ بھی اللہ ہی کا ہے، ہر چیز اس کے ہاں ایک وقت مقررہ لیے ہوئے ہے، اس لیے صبر کرو اور اس مصیبت پر ثواب کی امید رکھو۔ (بخاری)

نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف سے ایک مسلمان کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ مرد ہو یا عورت ہو انہیں جو بھی تکلیف پہنچ جائے اور اس کو بعد میں یاد کرے اگرچہ اس کو عرصہ دراز گزر چکا ہو اور اس وقت پھر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو پھر اسی جیسا اجر عطا فرماتے ہیں جیسا کہ اس دن عطا فرمایا تھا جس دن اس کو مصیبت پہنچی تھی۔ (مسند احمد، بیہقی، مشکوٰۃ المصابیح)

أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ: لفظ صلوات صلاۃ کی جمع ہے صلاۃ رحمت کو کہتے ہیں اور صلوٰت کے ساتھ لفظ رحمت بھی مذکور ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ لفظ رحمت بطور تاکید کے لایا گیا ہے۔

مفسر بیضاوی رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف لفظ صلاۃ کی نسبت ہو تو اس سے تزکیہ اور مغفرت مراد ہوتی ہے اور اس کی جمع لانے میں اس کی کثرت پر اور اس کی مختلف انواع پر تنبیہ فرمائی اور رحمت سے مراد لطف اور احسان ہے۔

أُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ: کہ صابرین جو مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھتے ہیں یہ لوگ اللہ کی قضا پر دل اور زبان سے رضامندی ظاہر کرکے اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھ کر حق اور ثواب کی راہ پانے والے ہیں۔ (بیضاوی)

حضرت ابو ہریرۃ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تب بھی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھے۔ کیونکہ یہ بھی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت ہے۔ (مشکوٰۃ عن شعب الایمان)

حضرت ابن عباس رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھا تو اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کی تلافی فرمادیں گے اور اس کی آخرت اچھی کریں گے اور اسے ضائع شدہ چیز کے بدلہ اچھی چیز عطا فرمائیں گے۔ (انوار البیان)

صفا و مروہ شعائر اللہ ہیں

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ {۱۵۸} البقرۃ

جواب ترجمہ: بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ سو جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے اس پر اس بات میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ ان دونوں کے درمیان آنا جانا کرے اور جو شخص خوشی سے کوئی کام کرے تو اللہ تعالیٰ قدر دان ہے جاننے والا ہے

صفا اور مروہ مکہ مکرمہ میں دو پہاڑیاں ہیں، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اہلیہ حضرت ہاجرہؓ کو اپنے دودھ پیتے صاحبزادے اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ چھوڑ کر گئے تو حضرت ہاجرہؓ پانی کی تلاش میں ان پہاڑیوں کے درمیان دوڑی تھیں، حج اور عمرے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان سعی کرنا واجب قرار دیا ہے، اگرچہ سعی واجب ہے مگر یہاں "کوئی گناہ نہیں" کے الفاظ اس لئے استعمال فرمائے گئے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں یہاں دو بت رکھ دئے گئے تھے جو اگرچہ بعد میں ہٹا لئے گئے مگر بعض صحابہ کو یہ شک ہوا کہ شاید ان پہاڑیوں کے درمیان دوڑنا جاہلیت کی نشانی ہونے کی وجہ سے گناہ ہو، آیت نے یہ شک دور کر دیا۔ (توضیح القرآن)

کتمانِ علم اور کفر کی سزا

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے،

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ {۱۵۹} إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ {۱۶۰} إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ

لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ {۱۶۱} خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ {۱۶۲} (البقرۃ

جواب ترجمہ: بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں ان چیزوں کو جو ہم نے نازل کیں جو واضح چیزیں ہیں اور ہدایت کی باتیں ہیں بعد اس کے کہ ہم نے اس کو لوگوں کیلئے کتاب میں بیان کیا یہ چھپانے والے وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت فرماتا ہے اور ان پر لعنت بھیجتے ہیں لعنت کرنے والے۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور بیان کیا سو یہ وہ لوگ ہیں جن کی توبہ میں قبول کروں گا۔ اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا ہوں رحیم ہوں۔ بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور وہ اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر تھے سو وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا، اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

شان نزول: یہ آیت علماء اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی، جنہوں نے آیت رجم کو چھپایا اور آنحضرت ﷺ کی صفات کو (جو توریت شریف میں پڑھتے آئے تھے) پوشیدہ رکھا۔ تفسیر درمنثور میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر انصار نے بعض علماء یہود سے توریت کی بعض باتیں دریافت کیں تو انہوں نے بتانے سے انکار کر دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اہل کتاب کا ذکر ہے جنہوں نے حسد کی وجہ سے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اور آپ ﷺ کی نعت کا کتمان کیا (یعنی اس بات کو چھپایا کہ توریت شریف میں آپ ﷺ کی بعثت کا ذکر ہے اور آپ کی نعت اور صفت جو توریت شریف میں مذکور تھی اس کو بھی پوشیدہ رکھا) حالانکہ وہ یہ سب کچھ اپنے پاس لکھا ہوا پاتے تھے۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام پر جو کھلی آیات واضحہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھیں جن میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ بھی تھا اس کو اہل کتاب نے چھپایا اور پوشیدہ رکھا، پھر فرماتے ہیں کہ اَلْهُدٰى کا عطف ہے اَلْبَيِّنَات پر اور اس سے عمومی طور پر ہدایت کی سب

چیزیں مراد ہیں۔ جن میں حضرت خاتم النّبیین ﷺ پر ایمان لانا اور آپ ﷺ کا اتباع کرنا بھی شامل ہے۔ اور آیات اگرچہ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئیں لیکن ان کا حکم سب کے لیے عام ہے یعنی علم دین کا چھپانا ہر جاننے والے کے لیے گناہ ہے۔ (روح المعانی بحوالہ تفسیر انوار البیان)

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا: کتمان علم کی وجہ سے انسان لعنت کا مستحق ٹھہرتا ہے، مگر جو لوگ اس جرم سے باز رہے، انہوں نے کتمان علم کا ارتکاب نہیں کیا ان پر لعنت نہیں کی جائے گی، یا پھر وہ لوگ جنہوں نے یہ فعل شنیع کر لیا مگر اس کے بعد صدق دل سے اپنے کیے پر شرمندگی اور ندامت کے ساتھ ساتھ توبہ کر لی، اور توبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اصلاح بھی کر لی، جو خرابی مچائی تھی اس کو دور کر دیا، حق بات کو چھپانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے جو حقوق ضائع کیے تھے ان کا ازالہ بھی کیا، جنہیں سیدھے راستے سے بھٹکایا تھا انہیں راہ راست پر لانے کی کاوش کی، جنہیں اندھیروں میں رکھا تھا ان پر یہ بات عیاں کر دی کہ ہم نے تمہیں غلط سلط باتیں کہہ کر گمراہ کیا تھا، ہماری باتیں بالکل غلط تھیں، ہم نے اللہ کی کتاب میں تحریف و تبدیلی کی تھی ہم اس جرم سے باز آئے اور توبہ کرتے ہیں، یہ اصلاح کرنے والے لوگ اس قہر و غضب سے بچ جائیں گے، یہاں بَيَّنُوا اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ صاف صاف اور واشگاف انداز میں اپنے جرائم کو واضح کر دیں۔

مفسر قرآن علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے حق کو چھپایا، فساد کیا، لوگوں کو گمراہی پر ڈالا، ان کی توبہ اسی وقت پوری ہو گی جب وہ اصلاح بھی کریں اور بیان بھی کریں، ان کے قول و فعل سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں اور عوام و خواص میں جو گمراہی پھیلی اس کی تلافی کریں جو حقوق تلف ہوئے ہیں ان کا تدارک کریں۔ (روح المعانی، انوار البیان)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ: جن لوگوں نے کفر کیا، کفر پر زندہ رہے، کفر پر عمر ساری لوٹادی اور کفر کی حالت میں ہی اس دنیا سے چلے گئے تو ایسے بدبختوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی، اللہ کے فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، یہ بہت ہی بدنصیب لوگ ہیں، ان کا ٹھکانہ بہت

ہی برا ہے، دنیا بھی تباہ و برباد کر ڈالی اور آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کی سزا ان کا مقدر بن گئی۔

خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ: کفار دنیا میں دین اسلام کی مخالفت و مخاصمت پر کمر بستہ رہے، دین کو نقصان پہنچایا، اہل دین کی دشمنی مول لی، یہ دنیا کی زندگانی جیسی کیسی ہو گی کٹ ہی جائے گی مگر ان بدبخت کافروں کا اخروی انجام بہت ہی برا ہے، یہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں جلتے رہیں گے، ان کو ایسا عذاب دیا جائے گا جو ہلکا نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی۔

اللہ وحدہ لاشریک ہے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے،

وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ {۱۶۳} البقرہ

جواب اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ رحمن ہے، رحیم ہے۔

اللہ تعالیٰ ساری کائنات کے انسانوں کو پیام دے رہے ہیں کہ تمہارا معبود ایک ہے، وہ اکیلا ہے، وہ بے نیاز ہے، وہ ساری کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے، یہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے اس سارے کو پس منظر سے منظر عام پر لانے والا وہی ایک معبود ہے، وہ رحمان ہے اور رحیم ہے، اس کے علاوہ کوئی بندگی کے لائق نہیں، کوئی سجدہ کے لائق نہیں ہے اسی کو اپنا معبود مانو اور تسلیم کرو، اسی کے ساتھ لو لگاؤ اور تعلق جوڑو۔

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و فردیت کے دلائل

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے،

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ

كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ {۱۶۴} البقرۃ

جواب ترجمہ: بیشک آسمان اور زمین کی تخلیق میں رات دن کے لگاتار آنے جانے میں اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لیکر سمندر میں تیرتی ہیں اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا اور اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے، اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع دار بن کر کام میں لگے ہوئے ہیں، ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔

شان نزول: حضرت نبی کریم ﷺ کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد جب یہ آیت وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ نازل ہوئی تو قریش مکہ نے سخت تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی معبود ہو، اس پر کوئی دلیل، برہان اور نشانی؟ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی ہے۔ (تفسیر کبیر امام رازی رحمہ اللہ)

حضرت سعید بن مسروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قریش مکہ نے یہودیوں سے پوچھا کہ تم بتاؤ حضرت موسیٰ علیہ السلام کیا کیا نشانیاں لائے تھے، اس پر یہودیوں نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک عصا ہوتا تھا جو سانپ بن جایا کرتا تھا، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام جب اپنا ہاتھ اپنی بغل میں رکھتے تھے تو وہ چمکنے لگتا تھا، اسی طرح قریش نے نصاریٰ سے پوچھا کہ بتاؤ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیا کیا نشانیاں لے کر آئے تھے؟ اس پر انہوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادرزاد اندھے کو بینا کر دیتے تھے، کوڑھی کو درست کر دیتے تھے، مردوں کو زندہ کر دیتے تھے، یہ سن کر قریش نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ ان کے لیے صفا پہاڑی کو سونا بنا دے تاکہ اس کے ذریعے ہمارے یقین میں اضافہ ہو اور دشمنوں پر ہمیں اس کے ذریعے قوت حاصل ہو، نبی کریم ﷺ نے قریش کی درخواست پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے اللہ! ان کے لیے ایسا کر دیجیے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کے

لیے ایسا کر دوں گا مگر اس کے بعد انہوں نے اگر جھٹلایا تو میں انہیں ایسا عذاب دوں گا جو جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیا، اس پر نبی کریم ﷺ نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ ذَرْنِي وَقَوْمِي أَدْعُوهُمْ يَوْمًا فَيَوْمًا مجھے اور میری قوم کو چھوڑیے میں انہیں روزانہ دعوت دیتا رہوں گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اگر یہ کہتے ہیں کہ صفا پہاڑی کے سونا بن جانے سے ان کے یقین میں پختگی آئے گی، تو زمین و آسمان کے پیدا کرنے میں اس سے بڑھ کر نشانیاں موجود ہیں۔ (مفاتیح الغیب)

اللہ تعالیٰ نے اپنی فردیت و وحدانیت پر یہاں ایسی چیزوں کا ذکر کیا ہے جو صرف اور صرف اسی کے چاہنے اور اسی کی قدرت اور اسی کے تصرف سے عدم سے وجود میں آئی ہیں، ان چیزوں کا باقی رہنا اور مٹ جانا بھی اسی کی چاہت اور اسی کی قدرت سے ہو گا، اللہ تعالیٰ کی یہ مخلوقات اس کی قدرت کاملہ کا عظیم شاہکار ہیں، ان سب کو عدم سے وجود میں لانے والی وہی اکیلی ذات ہے جسے اللہ کہتے ہیں، جو نہ صرف معبود برحق ہے بلکہ اکیلا وہی معبود و مسجود ہے، باقی سارے اس کے محتاج ہیں۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ: قریش مکہ جس چیز کا مطالبہ کرتے تھے وہ ان چیزوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، ان چیزوں میں آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق قدرت کا عظیم شاہکار ہے، جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ اس قدر بلند آسمان کو کس نے پیدا کیا تو وہ بے ساختہ کہتے تھے کہ اسے پیدا کرنے والا اللہ ہے، ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے پوچھا کہ تم ہی بتاؤ کہ جن کو تم لوگ اللہ کی ذات کے سوا پکارتے ہو، جن سے حاجت براری چاہتے ہو بھلا انہوں نے زمین میں موجود کون سی چیز پیدا کی ہے؟ یا ان کے لیے آسمانوں کی پیدائش میں کوئی شریک و سہیم و ساجھی ہے؟

عقل و دانش رکھنے والے لوگ ذرا غور و فکر کریں تو انہیں پتا چلے کہ آسمانوں کو وجود عطا کرنے والے اللہ نے اپنی سب سے عظیم الشان کتاب قرآن کریم میں کس طرح جگہ جگہ ان کا ذکر کیا، تو بار بار آسمانوں کا ذکر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا جانا یہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ آسمانوں کی بڑی شان ہے، ان میں اللہ تعالیٰ نے بہت ہی عظیم اسرار رکھے ہیں، ان میں اس کی حکمت بالغہ پوشیدہ ہے، س

میں کسی مخلوق کی عقل و فہم پہنچ ہی نہیں سکتی۔

آسمان کو اللہ تعالیٰ نے سات اشیاء سے مزین فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے ① آسمان دنیا کو چراغوں سے سجایا ہے۔ ② اس میں چاند رکھا ہے جسے منور کیا ہے۔ ③ اس میں سورج رکھا ہے جسے سراج کہا ہے۔ ④ اس میں عرش رکھا ہے۔ ⑤ اس میں کرسی رکھی ہے جو آسمانوں اور زمینوں سے وسیع ہے۔ ⑥ اس میں لوح محفوظ رکھی ہے اور ⑦ اس میں قلم رکھی ہے۔ ان سات اشیاء میں تین ظاہری ہیں اور چار معنوی ہیں۔

قدرت والے نے آسمان کو سماء قرار دیا ہے، جو اس کی عظمت شان پر دلالت کرتا ہے، اسے محفوظ چھت قرار دیا ہے، اس نے سات طبقات کا ذکر فرمایا ہے، ایک وقت ایسا آئے گا جب اس آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے، جب اس کی کھال کھینچ لی جائے گی، جب اسے قدرت والا لپیٹ لے گا، وہ وقت بھی آئے گا جب یہ پتیوں کی طرح بکھر جائے گا، اللہ تعالیٰ اپنی کاریگری دکھا چکا اور دکھانے والا ہے، آسمان وزمین کی پیدائش میں کوئی عبث کام نہیں کیا گیا، ان کو پیدا کرنے کا بھی کوئی مقصد ہے، آسمان کو بنانے والے نے قبلہ دعا بنایا ہے، انسانی ہاتھ جب اپنی محتاجی، اپنی ضرورت کے لیے اٹھتے ہیں تو آسمان ہی کی طرف ان کا رخ ہوتا ہے، انسانی چہرے اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، آسمان ہی وہ چیز ہے جو انوارات کے اترنے کی جگہ ہے، صفا اور روشنیوں کا محل ہے، پاکیزگی کا مقام ہے، خلل اور فساد سے محفوظ ہے۔

قریش مکہ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس آسمان میں قدرت والے کی کس قدر قدرتیں دکھائی دیتی ہیں، سورج اور چاند اور ستاروں کی طرف نگاہیں دوڑائیں، سورج کے طلوع اور غروب میں غور وفکر کریں، اگر سورج کا طلوع اور غروب نہ ہوتا تو نظام عالم تباہ وبرباد ہو جاتا، اگر سورج نہ ہوتا تو لوگ اپنی گزراوقات کے لیے کیونکر سعی وکوشش کرتے؟

سورج کے طلوع میں جو منافع اور فوائد ہیں وہ تو دیکھتی آنکھوں کو دکھائی دیتے ہیں، ذرا سورج

کے غروب ہونے کی طرف بھی توجہ کرلی جائے، غور وفکر کرلیا جائے کہ اس کے غروب میں کتنا فائدہ ہے، اگر سورج غروب نہ ہوتا تو انسان کو سکون و قرار کیسے آتا؟ باوجودیکہ اسے سکون و قرار کی سخت ضرورت ہے، اسے آرام وراحت کی ضرورت ہے، اس کے غروب کے ساتھ ہی تو اس کی قوت ہاضمہ درست سمت کام کرتی ہے، اس کی غذا اس کے اعضاء تک پہنچتی ہے، اسی جانب تو قدرت والے نے اپنی کتاب میں اشارہ کیا ہے کہ ہم نے تمہارے لیے رات بنائی ہے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو۔

اگر سورج غروب نہ ہوتا تو انسانی حرص وہوس اسے ہمیشہ کام کام اور کام میں باندھے رکھتی، اسی لیے قدرت والے قدیر اللہ نے فرمایا کہ رات تمہارا لباس اور دن تمہارا ذریعہ معاش ہے، اسی طرح اگر سورج غروب نہ ہوتا تو اس کی شعاعوں اور اس کی حرارت سے، اس کی حدت اور تمازت سے وہ سب کچھ جل جاتا، خاکستر ہو جاتا جو اس کی پشت پر موجود ہوتا، اس کی پشت پر رہنے والے حیوانات بھسم ہو جاتے، اس پر اُگنے والی بوٹیاں تک خاکستر ہو جاتیں، یہی تو اس کی کاریگری کا شاہکار ہے کہ وہ اپنی قدرت کاملہ سے وقفے وقفے سے زمین پر سائبان تان دیتا ہے، سائے پھیلا دیتا ہے اگر وہ نہ چاہتا تو اس کو درازی عطا کرتا۔

سورج اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کے تحت بروقت طلوع ہوتا ہے اور بروقت غروب ہوتا ہے، جس طرح کسی گھر میں اس کی ضرورت کے مطابق روشنی کی جاتی ہے اور بروقت اس روشنی کو بجھا دیا جاتا ہے تاکہ اس گھر کے لوگ راحت وآرام کر سکیں، روشنی اور اندھیرا دونوں ہی ایک دوسرے کے متضاد ہیں مگر اصلاح عالم کے لیے دونوں ہی معاون ہیں اور اس سب کی نظارگی سورج کے طلوع اور غروب میں دکھائی دیتی ہے۔

سورج کے طلوع اور غروب کو اللہ تعالیٰ نے چار موسموں کا سبب بنایا ہے، موسم سرما میں درختوں اور نباتات میں گرمی پیدا کرتا ہے، جس کی وجہ سے مادہ ثمرات و پھل بنتا ہے، ہوا کو نرم اور بادل وبارش کو زیادہ کر دیتا ہے جو باطن میں حرارت غریزیہ پیدا کر کے حیوانات کے جسموں کو قوت دیتا

ہے، موسم ربیع و بہار میں طبیعتوں کو متحرک کرتا ہے، سرما میں پیدا شدہ مواد کو ظاہر کرتا ہے، پودے اگتے ہیں تو درخت و نباتات منور و روشن ہو جاتے ہیں اور حیوانات جفتی کے لیے بھڑک اٹھتے ہیں، گرما میں ہوا سخت گرم سے پھل پکتے ہیں، جسموں کے فضلات کھلتے ہیں، روئے زمین خشک اور عمارات اور مکانات کے لیے تیار ہو جاتی ہے، موسم خزاں میں خشکی اور ٹھنڈک جسموں کو آہستہ آہستہ سردی کی طرف لے جاتی ہے، کیونکہ اگر یہ انتقال ایک دم ہوتا تو جسم ہلاک اور خراب ہو جاتے۔

سورج کے طلوع اور غروب میں منافع تو ہیں ہی، سورج کی حرکت میں بھی بہت منفعت ہے، اگر سورج ایک ہی جگہ کھڑا رہے حرکت نہ کرے تو اس مقام پر گرمی بہت سخت ہو جائے گی، جب کہ دوسرے مقامات میں سردی شدید ہو جائے گی، لیکن سورج دن کی ابتدا میں مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب کے محاذات پر اس کا وقوع ہوتا ہے پھر وہ گھومتے گھومتے مرحلہ وار غروب تک جاتا ہے، تو وہ مشرق میں چمکتا ہے، کوئی جگہ ننگی و کھلی نہیں جو سورج کی شعاعوں سے حصہ نہ پائے، اگر سورج مشرق میں کھڑا رہے تو امیر آدمی اپنا مکان فقیر کی چھت سے بلند بنالے گا تو اب فقیر کو روشنی نہیں ملے گی لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر امیر، غریب سے سورج کی روشنی روک لے تو میں فلک کو چکر دوں گا کہ فقیر اس سے روشنی حاصل کرلے۔

چاند کو رات کی نشانی کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کبھی اس کے طلوع اور کبھی اس کے غروب کو مصلحت قرار دیتے ہیں، اس کے غروب میں دشمن سے بھاگنے والے کے لیے نفع ہے، رات اسے پوشیدہ کر دیتی ہے، تاکہ اسے تلاش کرنے والا اسے پا نہ سکے، اس لیے وہ دشمن کے تعاقب سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اگر اندھیرے نہ ہوتے تو اسے دشمن پکڑ لیتا۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں آسمان کی پیدائش کے ساتھ زمین کی پیدائش کا ذکر فرمایا، بعض حضرات نے زمین و آسمان کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ زمین آسمان سے افضل ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے کچھ حصوں میں برکت رکھی ہے، اللہ نے زمین پر اپنا مقدس گھر بیت اللہ رکھوایا

ہے، زمین کا وہ ٹکڑا جس پر بیت اللہ بنایا گیا اسے مبارک فرمایا گیا ہے، پھر زمین کے ایک حصہ پر مسجد اقصیٰ بنائی گئی جس کے ارد گرد اللہ نے برکت رکھی ہے، اللہ نے ارض شام میں برکت رکھی ہے، اللہ نے زمین کے مشارق و مغارب میں برکات رکھی ہیں، اللہ نے زمین کو پہاڑوں کے ساتھ مضبوطی عطا فرمائی ہے، اللہ نے ان میں برکت رکھی ہے۔

زمین میں انسانی اور حیوانی رہائش گاہیں ہوتی ہیں، زمین میں اہل ایقان کے لیے نشانیاں رکھی گئی ہیں، اگرچہ یہ نشانیاں یقین نہ کرنے والوں کے لیے بھی ہیں مگر ان سے کامل نفع اٹھانے والے اہل ایمان وایقان ہیں، پھر زمین کا کس قدر اعزاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو اس پر پیدا فرمایا، اور اس زمین کی مٹی سے پیدا فرمایا، جب کہ آسمان سے کوئی چیز پیدا نہیں کی گئی کیونکہ اسے اللہ نے محفوظ چھت بنایا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو اپنے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرف عطا فرمایا کہ ساری کی ساری زمین ان کے لیے اور ان کی امت کے لیے سجدہ گاہ بنادی گئی ہے، اس زمین کی ساری مٹی ان کے لیے پاکیزہ بنادی گئی ہے۔

وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ: یعنی رات دن کے آگے پیچھے آنے، ایک کے کم ہونے دوسرے کے زیادہ ہونے کا تذکرہ فرمایا۔ سورۃ فرقان میں ارشاد ہے وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا اور وہ وہی ذات پاک ہے جس نے بنادیا رات و دن کو آگے پیچھے آنے والا اس شخص کے لیے جو نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ کرے یا ارادہ کرے شکر گزار ہونے کا۔ سورۃ زمر میں فرمایا خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ، وہ لپیٹتا ہے رات کو دن پر، اور اس نے مسخر فرمایا سورج کو اور چاند کو۔

سورۃ فاطر میں فرمایا يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ

قِطْمِیْرٍ ،وہ داخل فرماتا ہے رات کو دن میں اور داخل فرماتا ہے دن کو رات میں اور اس نے مسخر فرمایا سورج کو اور چاند کو ہر ایک چلتا ہے اپنی مقررہ اجل کے لیے، یہ اللہ ہے تمہارا رب ہے اسی کے لیے ملک ہے اور جن لوگوں کو تم اس کے علاوہ پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں۔

رات اور دن کا وجود میں آنا کم و بیش ہونا کسی علاقہ میں کسی زمانہ میں رات کا زیادہ ہونا اور کسی علاقہ میں کسی زمانہ میں دن کا زیادہ ہونا سب اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظام کے تحت ہے کسی کو اس میں ذرا بھی دخل نہیں سب اہل عقل اس کو جانتے اور مانتے ہیں۔(انوار البیان)

سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رات پر ایک فرشتہ مقرر ہے جس کو شراہیل کہا جاتا ہے جب رات کا وقت قریب آتا ہے تو وہ فرشتہ ایک سیاہ موتی لے کر اس کو مغرب کی جانب لٹکا دیتا ہے جب سورج اس کی طرف دیکھتا ہے تو پلک جھپکنے سے بھی زیادہ جلدی غائب ہو جاتا ہے اور سورج کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ غائب نہ ہو یہاں تک کہ موتی کو نہ دیکھے جب سورج غروب ہو جاتا ہے تو رات آجاتی ہے، وہ موتی برابر لٹکا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ دوسرا فرشتہ سفید موتی لے کر آتا ہے جس کو ھراھیل کہتے ہیں وہ طلوع ہونے کی جانب اس کو لٹکا دیتا ہے جب شراہیل مطلع کو دیکھتا ہے تو اس کی طرف وہ موتی لٹکا دیتا ہے اور سورج جب اس سفید موتی کو دیکھتا ہے تو طلوع ہو جاتا ہے اور اس کو یہ حکم کیا گیا ہے کہ طلوع نہ ہو جب تک کہ اس موتی کو نہ دیکھے جب سورج طلوع ہوتا ہے تو دن ہو جاتا ہے۔

وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ: یعنی جو کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں وہ سامان لے کر جس سے لوگ نفع اٹھاتے ہیں، ان کشتیوں کا چلنا بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے، سمندر خود اللہ تعالیٰ کی بڑی مخلوق ہے اس میں طرح طرح کے جانور بہت سی چیزیں ہیں جو انسانوں کے کام آنے والی ہیں، سمندروں نے ایک براعظم کو دوسرے براعظم میں ملا رکھا ہے، اگر سمندر نہ ہوتے تو خشکی ہی کے ذریعہ دور و نزدیک کے سامان کو منتقل کرنا پڑتا، اللہ تعالیٰ نے سمندر میں کشتیاں جاری فرمادیں اگر اللہ چاہتا تو کوئی کشتی سمندر کی سطح پر نہ چلتی بلکہ ڈوب کر رہ جاتی، یہ سامان یورپ سے ایشیا اور ایشیا سے

یورپ تک جاتا ہے، اگر براعظم کے لوگ دوسرے براعظم کی پیداوار سے منتفع ہوتے ہیں باوجود یکہ ہوائی جہازوں کی سروس بہت زیادہ ہوگئی ہے اور ٹرینیں بھی کثیر تعداد میں چلنے لگی ہیں لیکن سامان کو نقل و حمل کے لیے آج تک بحری جہازوں سے بے نیازی نہیں ہے۔

سورۃ نحل میں فرمایا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ سمندر میں پانی کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور تاکہ شکر کرو۔

سمندر کا سفر ہے، نیچے پانی ہے اوپر آسمان ہے، بھاری بھرکم جہاز، دریا کا تلاطم، ہواؤں کے تھپیڑے اور ڈوبنے کا ڈر، اس حالت میں اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرماتے ہیں، ڈوبنے سے بچاتے ہیں، جو سامان لدا ہوا ہے اور جو لوگ اس میں سوار ہیں، صرف اللہ کی حفاظت سے منزل مقصود تک پہنچتے ہیں جب سمندر میں طغیانی آجائے تو ڈرتے ہیں اور لرزتے ہیں اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر نظر نہیں جاتی اور صرف اسی کو پکارتے ہیں، سارے باطل معبودوں کی یادیوں ہی دھری رہ جاتی ہیں۔

سورۃ عنکبوت میں فرمایا فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ

پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خالص اعتقاد کرکے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں پھر جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں تاکہ وہ ناقدری کریں اس نعمت کی جو ان کو ہم نے دی اور تاکہ وہ نفع حاصل کرلیں، سو عنقریب جان لیں گے یہ۔

مشرک انسان کا عجیب مزاج ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو صرف اللہ کو یاد کرتا ہے اور اسی کو پکارتا ہے اور جب مصیبت سے چھوٹ جاتا ہے تو شرک کرنے لگتا ہے اور غیر اللہ کو پکارتا ہے اور اس کی عبادت میں لگ جاتا ہے۔ (تفسیر انوار البیان للشیخ مفتی عاشق الٰہی)

وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا: اللہ تعالیٰ نے آسمان سے جو پانی

اتارا ہے اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ فرمایا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے خالق مالک اور واحد ہونے کی نشانیوں میں سے ہے، سب کو معلوم ہے کہ پانی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور یہ نعمت بہت زیادہ ہے۔ کروڑوں انسان اور چوپائے اور درخت اس سے سیر اب ہوتے ہیں لیکن ختم ہونے نہیں پاتا، بارشیں ہوتی ہیں میٹھا پانی برستا ہے، خشک زمینیں اس سے سیر اب ہوتی ہیں، کھیتیاں ہری بھری ہوتی ہیں، باغات سرسبز و شاداب ہوتے ہیں، تالابوں میں پانی جمع ہوتا ہے، مہینوں انسان اور جانور اس کو اپنے خرچ میں لاتے ہیں۔

بہت سے علاقوں میں بارش کے سوا پانی کا کوئی انتظام ہی نہیں، کنوئیں ہیں تو وہ بھی بہت گہرے اور کم پانی والے ہیں، پانی پینے کپڑے دھونے اور کھیتوں کو سیر اب کرنے، بارش کے لیے اللہ سے لو لگائے بیٹھے رہتے ہیں، جب بارش ہوتی ہے تو جان میں جان آتی ہے، جن علاقوں میں میٹھے پانی کی نہروں سے سیر ابی ہوتی ہے وہ بھی آسمان ہی کا برسایا ہوا ہے کیونکہ آسمان کی بارشیں پہاڑوں پر برف کی صورت میں منجمد ہو جاتی ہیں، پھر وہ برف پگھل پگھل کر نہروں میں آتی ہے۔

سورۃ شوریٰ میں فرمایا وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْم بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ اور وہی ہے جو بارش نازل فرماتا ہے اس کے بعد کہ وہ ناامید ہو چکے اور وہ پھیلاتا ہے اپنی رحمت کو اور وہی کام بنانے والا، سب تعریفوں کے لائق ہے۔

سورۃ حم سجدہ میں فرمایا وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ اِنَّ الَّذِیْۤ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ دبی ہوئی پڑی ہے پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھولتی ہے بلاشبہ جس نے اس زمین کو زندہ فرمایا وہی مردوں کو زندہ کر دے گا۔ بیشک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

سورۃ روم میں فرمایا، فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ

الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ سور رحمت الٰہی کے آثار دیکھو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد کس طرح زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ زمین کا خشک ہو جانا اور اس کے درختوں کا سوکھ جانا اس کو زمین کی موت سے تعبیر فرمایا اور اس کی سرسبزی و شادابی کو حیات سے تعبیر فرمایا۔ (انوار البیان)

وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ: کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پھیلا دیے ہر قسم کے چلنے پھرنے والے جانور عربی لغت کے اعتبار سے دَآبَّة ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو زمین پر چلے پھرے اگرچہ عرف عام میں بڑے بڑے جانور گائے، بیل، بھینس، اونٹ وغیرہ کیلئے استعمال ہوتا ہے، زمین پر چلنے پھرنے والے طرح طرح کے جانور بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں، کس قدر کثیر تعداد میں مختلف اجناس و اصناف کے جانور پیدا فرمائے ہیں۔ ان کی طبیعتیں الگ الگ ہیں، صورتیں الگ الگ ہیں، منافع مختلف ہیں اور ان سب پر انسان کو مسلط فرما دیا ہے، خوب زیادہ غور کیا جائے اور ایک ایک جانور کے خواص پر نظر ڈالی جائے تو بیشمار قدرت الٰہیہ کے مظاہر سمجھ میں آجاتے ہیں (انوار البیان)

وَتَصْرِيْفِ الرِّيَاحِ: یعنی ہواؤں کو چلانے پھرانے ان کے رخوں کو بدلنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، اللہ تعالیٰ جیسا چاہتے ہیں ہوائیں چلتی ہیں جس رخ پر اللہ چاہتے ہیں، ادھر ہی جاتی ہیں، تیز چلنے کا حکم ہو تو تیز چلتی ہیں اور آہستہ چلنے کا حکم ہو تو آہستہ چلتی ہیں، عذاب کا ذریعہ بھی بنتی ہیں اور رحمت کا سبب بھی، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں ہے کہ ان کا رخ بدل دے یا ان کی تیز رفتاری کو کم کر دے یا سست رفتاری کو تیز کر دے۔

سورۃ روم میں فرمایا وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے جو خوشخبری دیتی ہیں اور تاکہ تم کو اپنی رحمت چکھا دے اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں تاکہ اس کے فضل کو تلاش کرو اور

تاکہ تم شکر کرو۔

قوم عاد پر اللہ تعالیٰ نے عذاب دینے کے لیے ہوا بھیج دی وہ آندھی بن کر سات رات اور آٹھ دن چلتی رہی، پوری نافرمان قوم ہلاک اور برباد ہوگئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اس کو نعمت بنا دیا، صبح کو ایک ماہ کی مسافت تک لے جاتی تھی اور شام کو بھی ایک ماہ کی مسافت پر لے جاتی تھی، غزوہ خندق میں اللہ تعالیٰ شانہ نے آندھی بھیج دی جس نے دشمنان اسلام کو واپس ہونے پر مجبور کر دیا، ان کے خیمے اکھڑ گئے، ہانڈیاں الٹ گئیں ان کے چہرے مٹی سے اٹ گئے، سخت تیز اور سخت ٹھنڈی ہوا تھی جس کی وجہ سے بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

سورۃ احزاب میں ارشاد فرمایا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا

اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کی نعمت کو جبکہ آ گئے تمہارے پاس لشکر، سو ہم نے بھیج دیا ان کے اوپر ہوا کو اور ایسے لشکر کو جسے تم نہیں دیکھ رہے تھے، بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نُصِرتُ بالصَّبَا وَ أُهلِكَت عَادٌ بالدَّبُور یعنی صبا کے ذریعہ میری مدد کی گئی اور قوم عاد دبور کے ذریعہ ہلاک کی گئی۔ (صبا اور دبور ہواؤں کے نام ہیں)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہوا رحمت لے کر آتی ہے اور عذاب لے کر آتی ہے، جب تم اس کو دیکھو تو اسے برا نہ کہو اور اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر کا سوال کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس کے شر سے پناہ مانگو۔ (سنن ابی داؤد)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب ہوا چلتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا فرماتے تھے، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ خَیْرَهَا وَ خَیْرَ مَا فِیْهَا وَ خَیْرَ مَا اُرْسِلَتْ بِهٖ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَ شَرِّ مَا فِیْهَا وَ شَرِّ مَا اُرْسِلَتْ بِهٖ اے اللہ! میں آپ سے اس کی خیر کا اور جو کچھ اس میں ہے اس کی خیر کا اور جو کچھ یہ لے کر بھیجی گئی اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس کے شر سے اور جو

کچھ اس میں ہے اس کے شر سے اور جو کچھ یہ لے کر بھیجی گئی ہے اس کے شر سے۔ (صحیح مسلم بحوالہ تفسیر انوار البیان)

ہوائیں رحمت والی ہوتی ہیں اور عذاب والی بھی، جب ہوائیں چلیں تو اللہ سے ان کے بارے میں عرض کرنا چاہیے کہ اے اللہ! انہیں رحمت کی ہوائیں بنادے، عذاب کی ہوائیں نہ بنایئے۔ (در منثور) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ پانی اور ہوا اللہ تعالیٰ کے دو لشکر ہیں، ان میں ہوا اللہ تعالیٰ کا بڑا لشکر ہے۔ (در منثور) حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہوا کے دو بازو اور ایک دم ہوتی ہے۔ (در منثور)

ابن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہوائیں آٹھ ہیں، چار رحمت والی اور چار عذاب والی، رحمت والی چار ہوائیں یہ ہیں ناشرات، مبشرات، مرسلات اور ذاریات، عذاب والی چار ہوائیں یہ ہیں، عقیم، صرصر، یہ دونوں خشکی میں چلتی ہیں، جب کہ دو عاصف اور قاصف ہیں جو سمندروں میں چلتی ہیں۔ (کتاب المطر لابن ابی الدنیا، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، العظمت لابی الشیخ، تفسیر در منثور)

عیسیٰ بن ابی عیسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ ہوائیں سات ہیں، صَبا، دَبور، جنوب، شمال، خروق، نکباء اور ریح القائم صبا مشرق سے آتی ہے، دبور مغرب سے آتی ہے، جنوب: قبلہ کے بائیں طرف سے آتی ہے، شمال: قبلہ کے دائیں طرف سے آتی ہے، نکباء صبا اور جنوب کے درمیان ہوتی ہے خروق: شمال اور دبور کے درمیان ہوتی ہے اور ریح القائم مخلوق کے سانس ہیں۔

حضرت حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ہواؤں کو کعبہ کے اوپر رکھا گیا، جب تو ان کے جاننے کا ارادہ کرے تو کعبہ کے دروازہ کی طرف اپنی پیٹھ کی ٹیک لگائے تو شمال تیرے شمال سے ہوگی اور یہ اس طرف سے ہے جس میں پتھر لگا ہوا ہے اور جنوب تیری داہنی طرف سے ہوگی اور یہ بھی اس طرف سے ہے جس میں حجر اسود لگا ہوا ہے اور صبا تیرے سامنے ہوگی اور یہ باب کعبہ کے سامنے سے آتی ہے اور دَبور کعبہ شریف کے پیچھے سے آتی ہے۔ (دُر منثور)

حسین بن علی جعفی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ میں نے اسرائیل بن یونس رحمہ اللہ سے پوچھا کہ ریح (یعنی ہوا) کے یہ نام کیوں ہیں؟ انہوں نے فرمایا قبلہ پر رکھے گئے ہیں، جو قبلہ کے شمال ہے اس کا نام شمال ہے، جنوب میں ہے اس کا نام جنوب ہے اور صبا وہ ہے جو کعبہ کے سامنے سے آتی ہے اور دبور وہ ہے جو اس کے پیچھے سے آتی ہے۔ (در منثور)

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوب کو جنتی ہوا قرار دیا ہے۔ (در منثور) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنوب کی ہوا جنت میں سے ہے اور یہ درختوں کو بار دار کرتی ہے۔ اور اس میں لوگوں کے لئے بہت سے منافع ہیں اور شمال (ہوا) آگ میں سے نکلتی ہے پھر جنت سے گزرتی ہے پھر اس کو ایک جھونکا جنت میں سے لگتا ہے تو وہ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ (ابو الشیخ، در منثور)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جنت میں سات سال کے فاصلہ کے ساتھ ہوا کے بعد ہوا کو پیدا فرمایا اس کے آگے ایک بند دروازہ ہے اور تمہارے پاس ہوا اس دروازہ کے شگاف کے درز میں سے آتی ہے اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے تو جو کچھ آسمان اور زمین کے درمیان ہے وہ اڑ جائے اور یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اَزیب ہے اور تمہارے نزدیک جنوب ہے۔ (بخاری فی التاریخ، ابن ابی شیبہ، البزار)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنوب تمام ہواؤں کی سردار ہے اس کا نام اللہ تعالیٰ کے نزدیک اَزیب ہے۔ اور اس کے سات دروازے ہیں اور یہ ہوا ان دروازوں کی دراڑوں میں سے آتی ہے اگر اس میں سے ایک دروازہ کھول دیا جائے تو جو کچھ آسمان و زمین کے درمیان ہے وہ بکھر جائے گا۔ (ابو الشیخ، در منثور) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ شمال (ہوا) زمین کا نمک ہے اگر شمال نہ ہوتی تو زمین بدبودار ہو جاتی۔ (در منثور) حضرت کعب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اگر لوگوں سے تین دن ہوا کو روک دیا جائے تو آسمان و زمین کے درمیان میں جو کچھ ہے بدبودار ہو جائے۔ (العظمت)

عثمان اعرج رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ہواؤں کے ٹھہرنے کی جگہیں کروبیون حاملین عرش

فرشتوں کے پاؤں کے نیچے ہیں، ہوا پھرتی ہے تو وہ سورج کی گاڑی پر پڑتی ہے اور فرشتے اس کے کھینچنے پر مقرر ہیں، پھر وہ سورج کی گاڑی سے سمندر میں واقع ہوتی ہے۔ پھر سمندر میں ہوتی ہے تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر واقع ہوتی ہے۔ پھر پہاڑوں کی چوٹیوں سے ابھر کر خشکی میں واقع ہوتی ہے۔ اور شمال (ہوا) جنت عدن سے گزرتی ہے تو وہاں سے اس کی عمدہ خوشبو کو لے لیتی ہے پھر شمال اکیلی سات ستاروں کی کرسی سے مغرب کی طرف آتی ہے دبور اکیلی سورج کے غروب ہونے کی جگہ سے مطلع شمس تک اور سات ستاروں کی کرسی تک پہنچتی ہے یہ ایک دوسرے کی حد میں داخل نہیں ہوتیں۔ (العظمت)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مکہ کے راستے میں ہم کو ہوا نے آلیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج کی ادائیگی پر تھے ہوا سخت ہوگئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا تم کو ہوا کے بارے میں کیا پہنچا ہے؟ (یعنی ہوا کے بارے میں کوئی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہوا اللہ کی روح ہے یہ رحمت اور عذاب لاتی ہے اس کو برا نہ کہو اور اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر سے پناہ مانگو۔ (ابن ابی شیبہ، احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی، در منثور) صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوا کو برا نہ کہو اور اللہ تعالیٰ سے اس کے شر سے پناہ مانگو۔ (در منثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے ہوا پر لعنت کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا ہوا کو لعنت نہ کرو کیونکہ وہ (اللہ کی طرف سے) حکم دی جاتی ہے۔ اور جو آدمی کسی چیز پر لعنت کرتا ہے جو لعنت کی مستحق نہیں ہوتی تو لعنت اسی پر لوٹ آتی ہے۔ (در منثور) جب بھی ہوا چلتی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتے اور یہ دعا فرماتے: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا رَحْمَۃً وَلَا تَجْعَلْھَا عَذَابًا اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا رِیَاحاً وَلَا تَجْعَلْھَا رِیحًا، اے اللہ! اس کو رحمت بنا دے اس کو عذاب نہ بنا، اے اللہ! اسے رحمت کی ہوا بنا دے عذاب والی ہوا نہ بنا۔ (المعرفۃ للبیہقی، در منثور) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب ہوا چلتی اور گھومنے لگتی تو آپ فرماتے تکبیر کہو یعنی کثرت سے اللہ

اکبر اللہ اکبر کہو، کیونکہ یہ ہوا اڑا کر لے جانے والی ہے۔ (ابن ابی شیبہ، ابو الشیخ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رات کو دن کو سورج کو چاند کو اور ہوا کو برا نہ کہو کیونکہ یہ بھیجی جاتی ہے کسی قوم پر عذاب بنا کر اور کسی قوم پر رحمت بنا کر بھیجی جاتی ہے۔ (ابن ابی شیبہ، ابو یعلیٰ، در منثور)

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ: بادلوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان وزمین کے درمیان مسخر فرمایا کہ یہ پانی بھر بھر کر لاتے ہیں جب بارش ہوتی ہے، تو ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بارش ہونیوالی ہے، ان کو دیکھ کر لوگ اپنا انتظام کر لیتے ہیں اور پانی سے بھرے ہوئے بادل ادھر ہی جاتے ہیں جہاں اللہ کا حکم ہوتا ہے۔

سورۃ اعراف میں فرمایا وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ

اور وہ ایسا ہے کہ اپنی رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے جو خوش کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اس بادل کو کسی خشک سرزمین کی طرف ہانک دیتے ہیں پھر اس کے ذریعہ پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ یوں ہی ہم مردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم سمجھو۔

بادلوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو میدان تیہ میں سایہ عطا فرمایا، بادل ان کے ساتھ چلتے تھے، اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت اور تصرف سے بادلوں کا ہلکا بھاری ہونا بہت زیادہ بادلوں کا آجانا بالکل ختم ہو جانا نظروں کے سامنے ہوتا رہتا ہے، سب اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، قوم عاد پر عذاب آنے کی ابتداء اسی طرح سے ہوئی تھی کہ عرصہ دراز سے بارش نہ ہوئی تھی اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ بادل ظاہر ہو گئے، انہوں نے سمجھا کہ بادل بارش برسائے گا، سخت گرمی کی وجہ سے جب میدان میں نکل کر کھڑے ہو گئے تو بجائے بارش کے سخت آندھی آگئی جس کی وجہ سے وہ بالکل تہس نہس ہو کر رہ

گئے۔(تفسیر انوار البیان)

لَآیَاتٍ لِقَوْمٍ یَعْقِلُونَ: یہ امور جو اس آیت میں بیان فرمائے گئے ہیں یہ سبھی اللہ تعالیٰ کے وجود، اللہ کی توحید اور وحدانیت پر کھلی نشانیاں اور دلائل وبراہین قاطعہ ہیں، انہیں صرف اہل یقین وایمان ہی نہیں مانتے بلکہ منکرین توحید بھی ان کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ ایک اکیلے اللہ ہی کی کاریگری ہے، یہ اسی کی صناعی ہے۔ ان نشانیوں پر اہل عقل ودانش مکمل یقین رکھتے ہیں۔

مشرکین کا معبودان باطلہ سے تعلق اوران کی بداعمالیوں کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ {۱۶۵} إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ {۱۶۶} وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا كَذَلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ {۱۶۷} البقرۃ

جواب ترجمہ: اور بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ کے علاوہ اس کے شریک تجویز کر رکھے ہیں وہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ سے محبت ہونی واجب ہے اور جو لوگ ایمان لائے ان کا اللہ سے محبت کرنا بہت ہی زیادہ قوی ہے، اور اگر جان لیں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا جس وقت دیکھیں عذاب کو کہ بلاشبہ ساری قوت اللہ ہی کے لیے ہے۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔ جب کہ بیزار ہو جائیں گے وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی ان لوگوں سے جنہوں نے پیروی کی تھی۔ اور دیکھ لیں گے عذاب کو اور کٹ جائیں گے ان کے آپس کے تعلقات اور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے پیروی کی کاش ہم کو واپس جانا نصیب ہو جاتا تو ہم ان سے بیزار ہو جاتے۔ جیسا کہ وہ ہم سے بیزار ہو گئے۔ اللہ اسی طرح دکھائے گا ان کو ان کے اعمال حسرتیں بنا کر اور وہ آگ سے نکلنے والے نہ

ہوں گے۔

دنیا بھر کے مشرکین اپنے خود ساختہ معبودوں سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں، انہیں پکارتے ہیں، انہیں نفع اور نقصان کا مالک سمجھتے ہیں، ان سے اپنی حاجتیں پوری ہونے کی امید رکھتے ہیں، انہیں حاجت روا اور مشکل کشا خیال کرتے ہیں، جب قرآن کریم نازل ہو رہا تھا اس وقت بھی مکہ کے مشرکین ایسے ہی خیالات کے حامل تھے، خانہ کعبہ جو صرف اللہ کی بندگی اور عبادت کے لیے بنایا گیا تھا اس میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے جو پوجے جاتے تھے، لوگ ان سے اس طرح محبت رکھتے تھے جس طرح اللہ سے محبت رکھی جائے بلکہ مشرکین اللہ سے بھی بڑھ کر غیر اللہ اور اپنے خود ساختہ معبودوں سے محبت رکھتے تھے۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں محبت سے تعظیم اور فرمانبرداری مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور معبود انِ باطلہ کے درمیان برابری کرتے ہیں اور باطل معبودوں کی تعظیم اور اِطاعت میں اسی طرح لگتے ہیں جیسا کہ معبود حقیقی کی عبادت اور اطاعت کرنا لازم ہے چونکہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر سمجھتے ہیں اس لیے وہ ضمیر جمع لائی گئی جو عقلاء کیلئے استعمال ہوتی ہے۔ یعنی یُحِبُّوْنَهُمْ فرمایا یُحِبُّوْنَهَا نہیں فرمایا۔ بعض مفسرین نے اَنْدَاداً سے قوم و قبیلے اور علاقہ کے بڑے لوگ مراد لیے ہیں یعنی بہت سے لوگ اپنے رؤساء کو ایسا مطاع مانتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور فرمانبرداری کرنا لازم ہے۔ (روح المعانی، انوار البیان)

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں یہاں اَنْدَاداً استعمال ہوا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ

اَلْأَنْدَادُ مِنَ الرِّجَالِ يُطِيْعُوْنَهُمْ كَمَا يُطِيْعُوْنَ اللهَ إِذَا أُمِرَ وَهُمْ أَطَاعُوْهُمْ وَعَصَوُا اللهَ

اَنداد سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی وہ لوگ اطاعت کرتے تھے جیسے اللہ کی اطاعت کرتے ہیں جب (ان کو) حکم کیا جاتا ہے اور وہ لوگوں کی اطاعت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے

ہیں۔(تفسیر در منثور للسیوطی)

يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ: مشرکین اپنے خود ساختہ معبودوں سے یوں محبت رکھتے ہیں جس طرح اللہ سے محبت ہونی چاہیے، جس طرح اہل ایمان وایقان اپنے معبود برحق اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں یہ ہر جائی مشرک اپنے ہاتھوں سے تراشیدہ صنم اور خانہ ساز معبودوں سے یوں محبت رکھتے ہیں۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ: اہل ایمان اپنے اللہ سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں، جس طرح مشرکین اپنے خود ساختہ معبودوں سے محبت رکھتے ہیں بلکہ مسلمان اپنے اللہ سے ان سے کہیں زیادہ محبت رکھتے ہیں۔

وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ: حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا کے بارے میں مروی ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ دیکھیں گے ان لوگوں کو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا انہوں نے میرے علاوہ میرے شریک بنا دیئے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے تم لوگ مجھ سے محبت کرتے ہو جب یہ قیامت کے دن میرے عذاب کو دیکھیں گے جس کو میں نے ان کے لیے تیار کر رکھا ہے تو جان لیں گے کہ ساری قوت میرے پاس ہے۔ ان کے شرکاء کے پاس نہیں ہے اور (جھوٹے) معبود اِن کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے اور نہ ان سے عذاب کو ہٹا سکیں گے جو ان پر نازل ہو گا اور میں ان کو یقین دلاؤں گا کہ میرا عذاب سخت ہے اس شخص کے لئے جو میرا انکار کرتا ہے اور میرے ساتھ کسی اور خدا کا دعوی کرتا ہے۔

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ: قتادہؒ سے مروی ہے کہ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا سے مراد یہ ہے کہ ان کے جابر لوگ ان کی قیادت کرنے والے جو شر اور شرک میں سردار تھے، مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا یعنی ان کے پیچھے چلنے والے اور ضعیف لوگ۔

سدیؒ سے مروی ہے کہ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا سے مراد وہ شیاطین ہیں جو انسانوں سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔(ابن جریر) ابن عباس سے مروی ہے کہ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ میں

الْأَسْبَابُ سے مراد ہے کہ ان کی دوستی اور محبت آپس میں ختم ہو جائے گی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں یہ بھی مروی ہے کہ ان کے اسباب کٹ جائیں گے سے مراد یہ ہے کہ ان کی رشتہ داریاں ختم ہو جائیں گی۔ (ابن جریر، ابن المنذر) حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اسباب کٹ جائیں گے سے مراد یہ ہے کہ ان کا آپس میں میل جول اور دوستانہ جو دنیا میں تعلق تھا ختم ہو جائے گا۔ (الحلیہ لابی نعیم، ابن جریر، امام وکیع)

وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا: یہاں کافروں کی ایک اور حسرت اور ندامت اور شناعت اور فظاعت ذکر فرمائی۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ دنیا میں پیشوا تھے اور قوموں اور قبیلوں کے اور ملک و وطن کے بڑے تھے جن کے پیچھے چل کر ان کی اولاد نے اور قوم و قبیلہ نے اور ملک کے بسنے والوں نے اپنا ناس کھویا اور کفر اور شرک میں مبتلا ہوئے۔ یہ سردارانِ قوم اور زُعماءِ ملک و وطن قیامت کے دن اپنے ماننے والوں اور پیچھے چلنے والوں اور ان کی رضامندی کیلئے قربانیاں دینے والوں سے صاف صاف کہہ دیں گے کہ ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں اور یہ بیزاری ایسے موقع پر ہو گی جب ان کے ماننے والے اس دنیا سے گزر چکے ہوں گے اور کفر و شرک پر مر چکے ہوں گے۔ وہاں نہ ایمان لانا معتبر ہو گا نہ دنیا میں واپس آسکیں گے اور عذاب بھگتنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو گا ان کے آپس کے تعلقات ختم ہو چکے ہوں گے اور کوئی کسی کو کسی طرح بھی مدد نہ دے سکے گا۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (سورۃ مومن) ظالموں کے لیے نہ کوئی دوست ہو گا اور نہ کوئی سفارشی ہو گا جس کی اطاعت کی جائے۔ جب سردارانِ قوم بیزاری ظاہر کر دیں گے تو وہ لوگ جنہوں نے ان کا اِتباع کیا تھا یوں کہیں گے کہ اگر ہمیں دنیا میں واپس جانا نصیب ہو جائے تو ہم ان سے اسی طرح بیزاری ظاہر کریں جیسا کہ آج وہ ہم سے بیزار ہو گئے۔ (تفسیر انوار البیان)

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ: یعنی جس طرح ان کو

آپس کی بیزاری کا منظر دکھایا جائے گا اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کے دوسرے اعمال بھی حسرتیں بنا کر ان کو دکھائے گا اور حسرت سے کوئی فائدہ نہ ہو گا، دوزخ کے عذاب کے ساتھ حسرتوں کا عذاب مستقل عذاب ہو گا، بار بار نادم ہوں گے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا اتباع کر لیتے تو اچھا تھا، کفر و شرک اختیار نہ کیا ہوتا، فلاں فلاں عمل اختیار کرتے تو کیا ہی اچھا ہوتا اور اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتے اس دن کا سوچنا، سمجھنا، نادم ہونا، دوزخ سے نکلنے کا ذریعہ نہ بنے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، کبھی بھی اس سے نکلنا نصیب نہ ہو گا۔ (انوار البیان)

اہل عرب کا خود ساختہ حلال و حرام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ {۱۶۸} إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ {۱۶۹} البقرۃ

جواب ترجمہ: اے لوگو! کھاؤ ان چیزوں میں سے جو زمین میں حلال پاکیزہ ہیں اور مت پیچھے چلو شیطان کے قدموں کے۔ بیشک وہ تمہارے لیے کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ تم کو صرف برائی کا اور بے حیائی کا حکم کرتا ہے اور یہ کہ تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کو تم نہیں جانتے۔

شان نزول: یہ آیت بنی ثقیف اور بنی خزاعہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ (اسباب النزول) ان لوگوں نے کچھ کھیتیاں، کچھ جانور اپنے اوپر حرام کر لیے تھے اور جن جانوروں کو حرام کیا تھا، ان کی حرمت کے لیے کچھ شرطیں اور قیدیں لگا دی تھیں اور ان کے نام بحیرہ سائبہ اور وصیلہ اور حام تجویز کر لیے تھے، یہ باتیں ان کو شیطان نے بتائی تھیں، اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرنے کا یا حرام کو حلال کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، یہ جو تحریم و تحلیل کا سلسلہ مشرکین نے نکالا تھا اس میں شیاطین کو اور بتوں کو راضی رکھنے کے جذبات تھے، اللہ تعالیٰ کی شریعت میں جو چیزیں حلال ہیں ان کو حرام کر لینا جائز نہیں ہے، یہ خدا تعالیٰ کی شریعت کو بدلنا ہے اور تحریف کرنا ہے۔

عرب کے مشرکوں نے اپنی مرضی سے بعض چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام کرلیا تھا، مثلاً: بعض جانوروں کو مخصوص کرتے تھے کہ ان کا دودھ صرف وہ لوگ پئیں گے جو لات کے پجاری ہیں اور کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے تھے، جب مادہ جانور کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوتا تھا تو اگر وہ مردہ پیدا ہوتا تو کہتے کہ اس کو عورتیں بھی کھاسکتی ہیں اور اگر زندہ پیدا ہوتا تو کہتے یہ عورتوں کے لئے حرام ہے اور ہمارے لئے حلال ہے اور کئی چیزیں انہوں نے اپنی مرضی سے حلال اور حرام کی ہوئی تھیں، حالانکہ حلال کرنا اور حرام کرنا صرف رب تعالیٰ کا کام ہے مخلوق میں سے کسی کو کسی چیز کے حلال اور حرام کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر خدا کی مخلوق میں اور کوئی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے بھی جب اپنی گھریلو مصلحت کے واسطے صرف اپنی ذات کے لئے شہد حرام کیا تھا، امت کے واسطے نہیں اور بیویوں کے لئے بھی حرام نہیں کیا تھا بلکہ صرف اپنی ذات کے لیے کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مکمل سورت نازل فرمائی، سورۃ التحریم یَاأَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ اے نبی ﷺ! کیوں آپ نے حرام کی وہ چیز جو رب تعالیٰ نے حلال فرمائی ہے، تو انہوں نے اپنی مرضی سے بعض چیزیں حلال کی تھیں اور بعض چیزیں حرام کی تھیں۔

اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو خطاب کرکے فرماتے ہیں یَاأَیُّهَا النَّاسُ اے انسانو! اور انسانوں کی تخصیص اس واسطے ہے کہ زمین کی خلافت انسانوں کے لیے ہے اور جنات ان کے تابع ہیں۔ اے انسانو! كُلُوا كھاؤ مِمَّا فِي الأَرضِ وہ چیز جو زمین میں ہے، لیکن دو شرطیں ہیں حَلَالًا کہ وہ حلال ہو اور اس سے مراد وہ چیز ہے جس کے کھانے کی رب تعالیٰ نے اجازت دی طَيِّبًا اور طیب ہو، طیب اس کو کہتے ہیں کہ جس کے ساتھ کسی اور کا حق متعلق نہ ہو، مثال کے طور پر گندم حلال ہے اور اگر کسی سے رشوت میں لی ہو یا غصب کی ہو یا چوری کی ہو تو وہ طیب نہیں ہے، کھا نہیں سکتا، بکری حلال ہے مگر کسی کی چوری کی بکری ذبح کرکے کھائے تو وہ طیب نہیں ہے، مرغی حلال ہے مگر کسی سے چھین کر نہ لی ہو۔

کھانے کے لیے دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ رب تعالیٰ نے اس کے کھانے کی اجازت دی ہو اور دوسرا یہ کہ غیر کا حق اس کے ساتھ وابستہ نہ ہو۔ یا یوں کہہ لیں کہ حلال میں حق اللہ کو ملحوظ رکھے اور طیب میں حق العبد کو ملحوظ رکھے، اگر کسی غیر کا حق ہے تو وہ اسی طرح حرام ہے جس طرح خنزیر حرام ہے۔ (ذخیرۃ الجنان)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ آیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تلاوت کی گئی یَاأَیُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے مستجاب الدعا بنادے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یَا سَعْدُ أَطِبْ مَطْعَمَكَ تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَةِ وَالَّذِي نَفْسِ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ أَنَّ الرَّجُلَ لَيَقْذِفُ اللُّقْمَةَ الْحَرَامَ فِي جَوْفِهِ فَمَا يُتَقَبَّلُ مِنْهُ أَرْبَعِينَ يَوْمًا وَأَيُّمَا عَبْدٍ نَبَتَ لَحْمُهُ مِنَ السُّحْتِ وَالرِّبَا فَالنَّارُ أَوْلَى بِهِ اے سعد! اپنے کھانے کو حلال کرلے تو مستجاب الدعا ہو جاؤ گے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے آدمی جب حرام لقمہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے تو اس سے چالیس دن کی عبادت قبول نہیں کی جاتی اور جو گوشت حرام اور سود سے پیدا ہوتا ہے وہ دوزخ کی آگ کا زیادہ مستحق ہے۔ (ابن مردویہ، در منثور)

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ: شیطان کی پیروی نہ کرو، خُطُوَاتِ خُطْوَةٌ کی جمع ہے اتنی مقدار کو خُطْوَةٌ کہتے ہیں جو دونوں قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ سے مراد شیطانی اعمال وافعال ہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس سفید انگور اور نمک لایا گیا انہوں نے کھانا شروع کیا ایک شخص علیحدہ بیٹھا تھا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا اپنے ساتھی کو بھی دے دو اس نے کہا میں نہیں کھاتا فرمایا کیا تم روزے سے ہو؟ کہا نہیں فرمایا پھر کیا بات ہے، کیوں نہیں کھاتے ہو، اس نے کہا میں نے انگور کھانے کو اپنے اوپر ہمیشہ کے لئے حرام کرلیا ہے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا

یہ حرام کرنا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ میں سے ہے اس کو کھالو اور اپنی قسم کا کفارہ دو۔ (حاکم، طبرانی)

عیسیٰ بن عبد الرحمن سلمی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حسن رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے سوال کیا کہ میں بھی ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس نے آپ سے پوچھا میں نے قسم کھائی ہے کہ میں ایسا ایسا نہ کروں تو مجھ پر گھٹنوں کے بل چل کر حج کرنا لازم ہے آپ نے فرمایا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ میں سے ہے تو سواری پر حج کر اور اپنی قسم کا کفارہ دے۔ (عبد بن حمید، ابو الشیخ، در منثور)

إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ: شیطان تمہارا کھلا اور واضح دشمن ہے، وہ تمہیں اپنی پیروی کروانا چاہتا ہے، وہ تمہیں اللہ کی تعلیمات سے ہٹا کر اپنے خود ساختہ خیالات کا پیروکار بنانا چاہتا ہے، وہ تمہارا رزق حلال اور رزق طیب کھانا پسند نہیں کرتا بلکہ وہ تمہیں حرام کھلانا چاہتا ہے، وہ سود کھلانا چاہتا ہے، وہ رشوت کھلانا چاہتا ہے، وہ غصب شدہ مال کھلانا چاہتا ہے، وہ دوسروں کا مال ناحق تمہیں کھلانا چاہتا ہے، وہ تمہیں راہِ راست سے بھٹکانا چاہتا ہے۔

شیطان تمہیں ایسی ایسی باتیں بتانا چاہتا ہے جن پر چل کر تم لوگ جہنم میں جانے والے بن جاؤ، وہ تمہیں نیکی کی راہ سے ہٹا کر بدی کی راہ پر لگانا چاہتا ہے تاکہ تم سے رحمٰن ناراض ہو جائے، وہ تمہارا نقصان چاہتا ہے، وہ کبھی بھی تمہیں نفع والے کام کرنے میں خوش نہیں ہوتا، اس نے تمہارے ابا آدم علیہ السلام کے ساتھ دشمنی کرتے ہوئے انہیں جنت سے نکلوایا۔

شیطان نے دنیا میں بسیرا کرنے کے بعد اولادِ آدم کو بہکانا اور راہِ راست سے بھٹکانے کی ہمیشہ کوشش کی اور تاحال کر رہا ہے اور تا قیامِ قیامت کرتا رہے گا، جگہ جگہ اس کی واضح دشمنی کے تذکرے قرآن کریم میں کیے گئے ہیں کہ اس نے کس کس طرح انسانوں کے ساتھ دشمنی کی، اس نے انسانوں کے خلاف بارگاہ رب العالمین میں جو مکالمہ کیا تھا وہ اس وقت تک اس مکالمہ کے مطابق انسانوں کا تعاقب کر رہا ہے، اس لیے وہ تمہارا واضح اور کھلا ہوا دشمن ہے۔

إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ: سدیؒ سے روایت ہے کہ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ سے

مراد گناہ ہے اور وَالْفَحْشَاءِ سے مراد زنا ہے۔ (در منثور) اور سوء اور فحشاء کی ایک تفسیر یہ کرتے ہیں کہ جو گناہ زبان سے ہوتے ہیں وہ سوء کہلاتے ہیں۔ جیسا کہ جھوٹ، غیبت گالی اور کسی کی دل آزاری کی بات اور فحشاء وہ ہیں جو عمل کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، جیسے زنا کرنا، شراب پینا وغیرہ۔ تو شیطان تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم زبان سے بھی گناہ کرو جھوٹ بولو، غیبت کرو، گالیاں دو اور عمل کے ساتھ بھی کہ زنا اور بدکاری کرو، لواطت کرو، شراب پیو۔

دوسری تفسیر یہ کرتے ہیں کہ سوء ایسے گناہ کو کہتے ہیں جو آدمی چھپ کر کرتا ہے، مثلاً شراب پیتا ہے مگر چھپ کر اور فحشاء اسے کہتے ہیں جو لوگوں کے سامنے کرے تو شیطان دونوں طرح کے گناہوں کا حکم کرتا ہے۔ (ذخیرۃ الجنان)

وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ سے مراد ہے کہ وہ بحائر، سوائب، وصائل اور حوامی کو حرام قرار دیتے تھے اور یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حرام قرار دیا ہے۔ بحائر: بحیرہ کی جمع ہے جو اونٹنی پانچ مرتبہ بیاہ چکی تھی اس کا کان چیر کر آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ سوائب: سائبہ کی جمع ہے منت پر چھوڑتے ہوئے سانڈ اونٹ کو کہا جاتا ہے۔ وصائل: وصیلہ کی جمع ہے وہ اونٹنی ہوتی تھی جس کے پہلے گاب میں نر اور دوسرے گاب میں مادہ پیدا ہوتی تھی اگر تیسرے گاب میں بھی مادہ ہوتی تو بتوں کے نام پر اس کو آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ حوامی: حام کی جمع ہے اس سے مراد وہ نر اونٹ ہے جس کے تخم سے دس بچے پیدا ہو چکتے تھے تو اس کو بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے تھے۔

بعض چیزیں ہماری سوسائٹی کو ورثے میں ملی ہیں مگر یہ خدا کے قانون اور پیغمبر علیہ السلام کے طریقے کے خلاف ہیں، محرم کے مہینے میں بعض لوگ پان نہیں کھاتے، سرخ لباس نہیں پہنتے، کالا لباس پہننا ضروری سمجھتے ہیں، تاکہ اظہارِ غم ہو، یہ سب شیطانی طریقہ اور آباؤ اجداد کے راستے پر چلنے والی بات ہے بعض لوگ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام کی نیاز دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی مرد اس میں سے نہ کھائے۔ اسی طرح ۲۲ رجب المرجب کو حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے نام کی نیاز دیتے ہیں جسے کو

نڈے کا نام دیا گیا ہے، کہتے ہیں کہ اس نیاز کا کھانا گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے اور یہ سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے کھالینا چاہیے اس قسم کے تمام مفروضات پر عملدرآمد آباؤ اجداد کی پیروی کے مترادف ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی طرح شاہ عبدالحق کا توشہ حلوا ہوتا ہے، مگر حقہ پینے والا یہ توشہ نہیں کھا سکتا، اس پر پابندی ہے، بو علی قلندر کی نیاز میں سویاں پکائی جاتی ہیں، عید کے موقع پر لوگ اس کی بھی پابندی کرتے ہیں، اصحاب کہف کی نیاز گوشت روٹی کی صورت میں دی جاتی ہے، اس کے بغیر نیاز ادا ہی نہیں ہوتی۔

اسی طرح پیر پیران شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی نیاز کے لئے گیارہویں تاریخ کی پابندی کی جاتی ہے، یہاں پر غلط عقیدہ راسخ ہو چکا ہے کہ اگر مقررہ تاریخ پر گیارہویں نہ دی تو مال میں نقصان ہو جاتا ہے یا بھینس کا دودھ کم ہو جاتا ہے اس قسم کی تمام چیزیں أَنْ تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ کی زد میں آتی ہیں۔ (معالم العرفان)

تقلید محمود اور تقلید مذموم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ {۱۷۰} البقرۃ

جواب ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کا اتباع کرو، جو اللہ نے نازل فرمایا تو کہتے ہیں کہ بلکہ ہم اس کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا۔ کیا وہ اپنے باپ دادوں کا اتباع کریں گے اگرچہ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور ہدایت پر نہ ہوں۔

مشرکین کا یہ طریقہ تھا اور اب بھی ہے کہ وہ اپنے باپ دادوں کو مقتدیٰ سمجھتے رہے ہیں، ان کو ہزار سمجھایا جائے، حق کی دعوت دی جائے، توحید کی طرف بلایا جائے، اللہ کے دین اور اس کی شریعت قبول کرنے کے لیے کہا جائے اور توحید کی دلیلیں خوب کھول کر بیان کر دی جائیں اور شرک و کفر کی

مذمت خوب واضح کر کے بتادی جائے تو وہ کسی بھی قیمت پر اپنے باپ دادوں کا دین کفر و شرک چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے ان کا یہی ایک جواب ہوتا ہے کہ ہم اس دین اور طور طریق اور رسم و رواج کے پابند ہیں جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا۔

اس آیت شریفہ میں مشرکین کی یہی بات نقل فرمائی ہے اور پھر اس کی تردید کی ہے، تردید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ کیا وہ اپنے باپ دادوں کا اتباع کریں گے اگرچہ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور ہدایت پر نہ ہوں۔ باپ دادوں نے اپنی ناسمجھی سے شرک اختیار کیا غیر اللہ کی پرستش کی، برے رسم و رواج نکالے وہ لوگ کیسے لائق اتباع ہو سکتے ہیں؟ پھر یہ معلوم ہے کہ باپ دادوں کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایت نہیں، نہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ان کے پاس تھی نہ کسی نبی سے انہوں نے ہدایت حاصل کی تھی، سراپا گمراہی میں تھے گمراہوں کا اتباع کرنا کہاں کی سمجھ داری ہے ہاں اگر باپ دادے ہدایت پر ہوں اور انہوں نے حق کی راہ بتائی ہو تو ان کا اتباع کیا جائے۔ (انوار البیان)

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو اسلام کی طرف بلایا اور ان کو رغبت دلائی اور ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اور اس کے انتقام سے ڈرایا تو رافع بن خارجہ اور مالک ابن عوف نے کہا اے محمد! ہم اس چیز کی تابعداری کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا اور وہ لوگ ہم سے زیادہ جاننے والے اور ہم سے بہتر تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ (ابن ابی حاتم، ابن جریر، در منثور)

تقلید: اہل اسلام میں حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی وغیرہ جو اپنے اماموں کی تقلید کرتے ہیں تو ان کی تقلید کا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی مسئلہ قرآن پاک میں نہیں ملتا، حدیث شریف میں بھی نہیں ملتا، خلفائے راشدین سے بھی نہیں ملتا، اور ایسے بے شمار مسائل ہیں، تو ایسے مسئلے میں اماموں میں سے کسی کی بات کو اس انداز سے تسلیم کرو کہ یہ مجتہد کی بات ہے وہ معصوم نہیں، کیونکہ مجتہد معصوم نہیں ہوتا

اس کے اجتہاد میں غلطی بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی ہو سکتا ہے اور معصوم صرف پیغمبر ہے اور ان کی بات قطعی ہوتی ہے غلطی کا احتمال نہیں ہوتا، اہل اسلام جو تقلید کرتے ہیں اس کا یہی مفہوم ہے۔

اور خود رب تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ (لقمان :١٥) جس نے میرے راستے کی پیروی کی اس کے کہنے پر چلو، اس کی تقلید کرو، تو یہ تقلید جائز ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں ہے، جس مقام پر ایمان کا خطرہ ہو کہ میرا ایمان تقلید کے بغیر نہیں بچے گا وہاں پر تقلید واجب ہو گی اور اس سے نکلنے والا گناہ گار ہو گا، یہ جتنے فرقے گمراہ ہوئے ہیں منکر حدیث وغیرہ۔ تو یہ تقلید چھوڑ کر گمراہ ہوئے ہیں۔ (ذخیرۃ الجنان)

مرزا غلام احمد نے کہا کہ میں نے تقلید چھوڑی تو میرے اوپر دروازے کھلے ہیں، تو گمراہی کا پہلا دروازہ ترک تقلید ہے، اہل ایمان کی تقلید تو یہ ہے کہ جس مسئلہ کی قرآن میں صراحت نہیں ہے، حدیث میں صراحت نہیں ہے، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے نہیں ملتی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نہیں ملتی، تو اماموں میں سے کسی کی بات کو مان لو اور وہ بھی اس خیال سے کہ وہ معصوم نہیں ہیں، معصوم صرف پیغمبر ہے اور پیغمبر کی بات قطعی ہوتی ہے اور اس میں غلطی کا احتمال نہیں ہوتا اور مجتہد کی بات غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی ہو سکتی ہے اور مجتہد کو غلطی میں بھی اجر ملتا ہے گناہ کوئی نہیں ہے، تو اہل ایمان جو تقلید کرتے ہیں وہ اور ہے اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ (ذخیرۃ الجنان)

جائز اور ناجائز تقلید: وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اور جس وقت ان کو کہا جاتا ہے اِتَّبِعُوا پیروی کرو مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ اس چیز کی جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے تو قَالُوا کہتے ہیں بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا بلکہ ہم پیروی کریں گے باپ دادا کی، تو ایسی تقلید کے کفر شرک اور مذموم ہونے میں کیا شک ہے؟ دعوت دی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کا حکم مانو تو وہ کہتے ہیں بلکہ ہم باپ دادا کے راستے پر چلیں گے، رب کی نازل کی ہوئی چیز کو ہم نہیں مانتے، آگے آئے گا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے اور اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے اور آؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی طرف، تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کا حکم

بھی نہیں مانتے، ہم نے تو باپ دادا کا حکم ماننا ہے تو دونوں قسم کی تقلیدوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے جس تقلید کی اس مقام پر تردید ہوئی ہے اس کا اہل اسلام میں سے کوئی بھی قائل نہیں ہے کہ رب کے مقابلے میں اور آنحضرت ﷺ کے مقابلے میں کسی کی تقلید ہو، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، حاشا وکلا، بلکہ اس میں سب سے زیادہ محتاط احناف ہیں، حنفیوں کا یہ مسلک ہے کہ ضعیف حدیث جو موضوع اور من گھڑت نہ ہو تو وہ ضعیف حدیث بھی قیاس اور اجتہاد سے زیادہ مقدم ہے۔ (ذخیرۃ الجنان)

کافر سن سکتے ہیں سمجھ نہیں سکتے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ {۱۷۱} البقرہ

جواب ترجمہ: اور مثال ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا اس شخص کی مثال ہے جو آواز دے ایسی چیز کو جو نہ سنے سوائے پکار کے اور بلاوے کے، بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں سو وہ سمجھ نہیں رکھتے۔ (سورۃ البقرہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس آیت کریمہ میں کافروں کی مثال جانوروں کی دی گئی ہے، جیسے گائے، گدھے اور بکری، اگر ان جانوروں کو کوئی بات کہے تو وہ آواز سنتے ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ کوئی کیا کہہ رہا ہے، اسی طرح کافر ہیں کہ اگر آپ ﷺ انہیں خیر کا حکم دیتے ہیں یا انہیں برائی سے روکتے ہیں یا ان کو نصیحت کرتے ہیں تو وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں، سوائے اس کے کہ ان کے کانوں میں آواز پڑتی ہے۔ (ابن ابی حاتم، ابن جریر)

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مشبہ یا مشبہ بہ کی جانب میں مضاف محذوف ہے پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ کافروں کو دعوت دینے والے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ان جانوروں کے پیچھے چیخ رہا ہو جو بس پکار اور آواز سنتے ہیں اور اس سے زیادہ کوئی بات وہ نہیں سمجھتے، وہ یہ

سمجھتے ہیں کہ ہمیں کسی نے آواز دی لیکن کیا کہا اس کو بالکل نہیں سمجھتے اور دوسری صورت میں یہ مطلب ہو گا کہ کافروں کی مثال اس شخص کے جانوروں کی طرح ہے جو اپنے جانوروں کو پکارتا اور چیختا چلاتا ہے اور جانوروں کو پکار کے سوا کچھ خبر نہیں۔ (تفسیر روح المعانی، تفسیر انوار البیان)

مطلب دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ کافر لوگ اپنی جہالت اور حماقت سے باپ دادوں کی تقلید میں لگے ہوئے ہیں حق سمجھنے اور قبول کرنے کو تیار نہیں، اس بارے میں وہ جانوروں کی طرح ہیں۔ حق کی آواز سنتے ہیں لیکن سب سنی ان سنی کر دیتے ہیں، نہ ادھر اپنے ذہنوں کو متوجہ کرتے ہیں اور نہ غور و فکر کے لیے تیار ہوتے ہیں، بالکل جانوروں کی طرح سے ہیں، آواز تو سنی لیکن سمجھتے کچھ نہیں۔ (تفسیر انوار البیان)

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ: کہ یہ لوگ حق سننے کو تیار نہیں بہرے بنے ہوئے ہیں، حق بولنے کو تیار نہیں گونگے بنے ہوئے ہیں، راہ حق پر چلنے کو تیار نہیں، اندھا پن اختیار کیے ہیں، اپنے حواس کھو چکے ہیں، لہٰذا حق کو ذرا بھی نہیں سمجھتے۔ (انوار البیان)

اکل حلال اور ادائے شکر کا حکم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ {۱۷۲} البقرۃ

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ تم پاک صاف اور حلال طیب چیزیں کھایا کرو اور میری شکر گزاری کرو، لقمہ حلال دعا عبادت کی قبولیت کا سبب ہے اور لقمہ حرام عدم قبولیت کا، حضرت نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ پاک چیز کو قبول فرماتا ہے اس نے

رسولوں کو اور ایمان والوں کو حکم دیا کہ وہ پاک چیزیں کھائیں اور نیک اعمال کریں، ارشاد ہے یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (المؤمنون: ۵۱) اس مقام پر ارشاد ہے (یٰٓاَیُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (البقرۃ: ۱۷۲) (مسند احمد) پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے وہ پراگندہ بالوں والا غبار آلود ہوتا ہے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعا کرتا ہے اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے لیکن اس کا کھانا پینا لباس اور غذا سب حرام کے ہیں اس لئے اس کی اس وقت کی ایسی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔

کون کون سی چیزیں کھانا حرام ہیں؟

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلاَ عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ {۱۷۳} البقرۃ

جواب ترجمہ: اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو اور سور کا گوشت اور جس چیز پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام کر دیا ہے، ہاں جو ناچار ہوئے (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد سے باہر نہ نکل جائے اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک خدا بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ کلمہ انما حصر کے لئے آتا ہے اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف وہ چیزیں حرام کی ہیں جن کا آگے ذکر کیا جاتا ہے اس کے سوا کچھ حرام نہیں اس آیت میں تو لفظ اِنَّمَا سے اس کی طرف اشارہ ہوا اور دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بھی آیا ہے، قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ اس میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کرکے یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ میری وحی میں بجز ان چند چیزوں کے جن کا ذکر آگے کیا گیا ہے اور کوئی چیز حرام نہیں۔ (معارف القرآن)

یہاں مطلق حلال و حرام کا بیان نہیں بلکہ ان مخصوص جانوروں کی حلت و حرمت کا بیان ہے جن

کے بارے میں مشرکین مکہ اپنے مشرکانہ عقائد کی غلطیاں کیا کرتے تھے پچھلی آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکین حرام سمجھ لیتے تھے یا اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے اس کی مخالفت کی گئی تھی اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں جن سے تم اجتناب نہیں کرتے اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے پرہیز کرتے ہو اس لئے اس جگہ حصر مطلق نہیں بلکہ اضافی ہے مشرکانہ عقائد کے بالمقابل۔ (معارف القرآن)

آگے اس آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ چار چیزیں یہ ہیں، ① میتہ (مردار) ② خون ③ لحم خنزیر ④ وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پھر چاروں چیزوں کی مزید تشریحات خود قرآن کریم کی دوسری آیات اور احادیث صحیحہ میں آئی ہیں جن کو ملانے کے بعد ان چاروں چیزوں کے احکام حسب ذیل ہیں

میتہ: جس کو اردو میں مردار کہتے ہیں، اس سے مراد وہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کے لئے ازروئے شرع ذبح کرنا ضروری ہے مگر وہ بغیر ذبح کے خود بخود مر جائے یا گلا گھونٹ کر یا کسی دوسری طرح چوٹ مار کر مار دیا جائے تو وہ مردار اور حرام ہے لیکن خود قرآن کریم کی دوسری آیت اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (۵:۹۶) سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور کے لئے ذبح کرنا شرط نہیں وہ بلا ذبح بھی جائز ہے اس بناء پر احادیث صحیحہ میں مچھلی اور ٹڈی کو میتہ سے مستثنیٰ قرار دے کر حلال کیا گیا ہے رسول ﷺ نے فرمایا ہمارے لئے دو مردار حلال کر دیئے گئے ایک مچھلی دوسرے ٹڈی اور دو خون حلال کر دیئے گئے جگر اور طحال (ابن کثیر از احمد، ابن ماجہ، دار قطنی)

معلوم ہوا کہ جانوروں میں سے مچھلی اور ٹڈی بغیر ذبح کے حلال ہیں، خواہ وہ خود مر جائیں یا کسی کے مارنے سے مر جائیں البتہ جو مچھلی سڑ جانے کی وجہ سے خود پانی کے اوپر آجائے وہ حرام ہے (احکام القرآن للجصاص) اسی طرح وہ شکاری جانور جو قابو میں نہیں کہ ذبح کر لیا جائے اور اس کو بھی بسم اللہ پڑھ کر تیر وغیرہ دھاردار چیز سے زخم لگا دیں تو بغیر ذبح کے حلال ہو جاتا ہے مطلقاً زخمی ہو جانا کافی

نہیں کسی آلہ جارحہ تیز دھار سے زخمی ہونا شرط ہے۔ (معارف القرآن)

اس موقع پر حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ مسائل بھی لکھے ہیں

بندوق کی گولی سے شکار: مسئلہ: بندوق کی گولی سے کوئی جانور زخمی ہو کر قبل ذبح مر جائے تو وہ ایسا ہے جیسے پتھر یا لاٹھی مارنے سے مر جائے جس کو قرآن کریم کی دوسری آیت میں موقوذۃ کہا گیا ہے اور حرام قرار دیا ہے ہاں مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر لیا جائے تو حلال ہو جائے گا۔

مسئلہ: آج کل بندوق کی ایک گولی نوکدار بنائی گئی ہے اس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ تیر کے حکم میں ہے مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ بھی تیر کی طرح آلہ جارحہ نہیں بلکہ خارقہ ہے جس سے بارود کی طاقت کے ذریعہ گوشت پھٹ جاتا ہے ورنہ خود اس میں کوئی دھار نہیں جس سے جانور زخمی ہو جائے اس لئے ایسی گولی کا شکار بھی بغیر ذبح کے جائز نہیں۔

مسئلہ: آیت مذکورہ میں مطلقاً میتہ کو حرام قرار دیا ہے اس لئے جس طرح اس کا گوشت کھانا حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے یہی حکم تمام نجاسات کا ہے کہ جیسے ان کا استعمال حرام ہے ان کی خرید و فروخت اور ان سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے یہاں تک کہ مردار جانور یا ناپاک کوئی چیز با اختیار خود جانور کو کھلانا بھی جائز نہیں ہاں ایسی جگہ رکھ دے کہ جہاں سے کوئی کتا بلی خود کھالے یہ جائز ہے مگر خود اٹھا کر ان کو کھلانا جائز نہیں۔ (جصاص، قرطبی وغیرہ)

مسئلہ: اس آیت میں میتہ کے حرام ہونے کا حکم عام معلوم ہوتا ہے جس میں میتہ کے تمام اجزاء شامل ہیں لیکن دوسری آیت میں اس کی تشریح طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ کے الفاظ سے کر دی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ مردار جانور کے وہ اجزاء حرام ہیں جو کھانے کے قابل ہیں، اس لئے مردار جانور کی ہڈی، بال جو کھانے کی چیز نہیں وہ پاک ہیں اور ان کا استعمال جائز ہے آیت قرآن کریم وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ (۱۶:۸۰) میں ان جانوروں کے بالوں کو مطلقاً جائز الانتفاع قرار دیا ہے ذبیحہ کی شرط نہیں (جصاص) کھال پر چونکہ خون وغیرہ کی نجاست لگی ہوتی ہے اس لئے وہ دباغت

سے پہلے حرام ہے مگر دباغت دینے کے بعد حلال اور جائز ہے۔ (جصاص)

مسئلہ: مردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں ان کا استعمال کسی طرح سے جائز نہیں اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔

مسئلہ: یورپ وغیرہ سے آئی ہوئی چیزیں صابوُن وغیرہ جن میں چربی استعمال ہوتی ہے ان سے پرہیز کرنا احتیاط ہے مگر مردار کی چربی ہونے کا علم یقینی نہ ہونے کی وجہ سے گنجائش ہے نیز اس وجہ سے بھی کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ابن عمر رضی اللہ عنہ، ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے مردار کی چربی کا صرف کھانے میں استعمال حرام قرار دیا ہے خارجی استعمال کی اجازت دی ہے اس لئے اس کی خرید و فروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔

مسئلہ: دودھ کا پنیر بنانے میں ایک چیز استعمال کی جاتی ہے جس کو عربی زبان میں اِنفَحہ کہا جاتا ہے یہ جانور کے پیٹ سے نکالی جاتی ہے اس کو دودھ میں شامل کرنے سے دودھ جم جاتا ہے اب اگر یہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا ہو تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں مذبوح جانور کا گوشت چربی وغیرہ سب حلال ہیں لیکن غیر مذبوح جانور کے پیٹ سے لیا جائے تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ اس کو پاک قرار دیتے ہیں لیکن صاحبین امام ابو یوسف رحمہ اللہ و محمد رحمہ اللہ اور ثوری رحمہ اللہ وغیرہ اس کو ناپاک کہتے ہیں۔ (جصاص، قرطبی)

یورپ اور دوسرے غیر اسلامی ملکوں سے جو پنیر بنا ہوا آتا ہے اس میں غیر مذبوح جانوروں کا انفحہ استعمال ہونے کا احتمال غالب ہے اس لئے جمہور فقہاء رحمۃ اللہ علیہم کے قول پر اس سے پرہیز کرنا چاہئے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے قول پر گنجائش ہے ہاں یورپ سے آئے ہوئے بعض پنیر ایسے بھی ہیں جن میں خنزیر کی چربی استعمال ہوتی ہے اور ڈبہ پر لکھا ہوا ہوتا ہے وہ قطعاً حرام اور نجس ہیں۔ (معارف القرآن)

خون کے مسائل: دوسری چیز جو آیت مذکورہ میں حرام قرار دی گئی ہے وہ خون ہے لفظ دم بمعنی خون

اس آیت میں اگرچہ مطلق ہے مگر سورہ انعام کی آیت میں اس کے ساتھ مسفوح یعنی بہنے والا ہونے کی شرط ہے، اَو دَماً مَسْفُوْحاً (۱۵) اس لئے باتفاق فقہاء رحمۃ اللہ علیہم خون منجمد جیسے گردہ تلی وغیرہ وہ حلال اور پاک ہیں۔

مسئلہ: جب کہ حرام صرف بہنے والا خون ہے تو جو خون ذبح کے بعد گوشت میں لگا رہ جاتا ہے وہ پاک ہے فقہاء رحمۃ اللہ علیہم و صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور امت کا اس پر اتفاق ہے اسی طرح مچھر، مکھی، کھٹمل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں لیکن زیادہ ہو جائے تو اس کو بھی دھونا چاہیے۔ (جصاص)

مسئلہ: جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے اسی طرح اس کا خارجی استعمال بھی حرام ہے اور جس طرح تمام نجاسات کی خرید و فروخت بھی اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے اسی طرح خون کی خرید و فروخت بھی حرام ہے اس سے حاصل کی ہوئی آمدنی بھی حرام ہے کیونکہ الفاظ قرآنی میں مطلقاً دم کو حرام فرمایا ہے جس میں اس کے استعمال کی تمام صورتیں شامل ہیں۔ (معارف القرآن)

مریض کو دوسرے کا خون دینے کا مسئلہ: تحقیق اس مسئلہ کی یہ ہے کہ انسانی خون انسان کا جزء ہے اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے اس کا اصل تقاضا تو یہ ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا دو وجہ سے حرام ہو، اول اس لئے کہ اعضاء انسانی کا احترام واجب ہے اور یہ اس احترام کے منافی ہے دوسرے اس لئے کہ خون نجاست غلیظہ ہے اور نجس چیزوں کا استعمال ناجائز ہے۔ لیکن اضطراری حالات اور عام معالجات میں شریعتِ اسلام کی دی ہوئی سہولتوں میں غور کرنے سے امور ذیل ثابت ہوئے، اول یہ کہ خون اگرچہ جزء انسانی ہے مگر اس کو کسی دوسرے انسان کے بدن میں منتقل کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں کانٹ چھانٹ اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آتی، انجکشن کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے کے بدن میں ڈالا جاتا ہے اس لئے اس کی مثال دودھ کی سی ہوگئی جو بدنِ انسانی سے بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے نکلتا اور دوسرے انسان کا جزء بنتا ہے اور شریعتِ اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیش نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے

اور ماں پر اپنے بچوں کو دودھ پلانا واجب کیا، جب تک وہ بچوں کے باپ کے نکاح میں رہے طلاق کے بعد ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا بچوں کا رزق مہیا کرنا باپ کی ذمہ داری ہے وہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائے یا ان کی ماں ہی کو معاوضہ دے کر اس سے دودھ پلوائے قرآن کریم میں اس کی واضح تصریح موجود ہے، فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ اگر تمہاری مطلقہ بیوی تمہارے بچوں کو دودھ پلائے تو اس کو اجرت و معاوضہ دیدو۔

خلاصہ یہ ہے کہ دودھ جزء انسانی ہونے کے باوجود بوجہ ضرورت اس کے استعمال کی اجازت بچوں کے لئے دی گئی ہے اور علاج کے طور پر بڑوں کے لئے بھی۔ (معارف القرآن ج ۱) اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں کیونکہ دودھ بھی خون کی بدلی ہوئی صورت ہے اور جزء انسان ہونے میں مشترک ہے فرق صرف یہ ہے کہ دودھ پاک ہے اور خون ناپاک، تو حرمت کی پہلی وجہ یعنی جزء انسانی ہونا تو یہاں وجہ ممانعت نہ رہی صرف نجاست کا معاملہ رہ گیا علاج و دواء کے معاملہ میں بعض فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے خون کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔

اس لئے انسان کا خون دوسرے کے بدن میں منتقل کرنے کا شرعی حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں تو جائز نہیں مگر علاج و دواء کے طور پر اس کا استعمال اضطراری حالت میں بلاشبہ جائز ہے اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے مؤثر یا موجود نہ ہو اور خون دینے سے اس کی جان بچنے کا ظن غالب ہو، ان شرطوں کے ساتھ خون دینا تو اس نص قرآنی کی رو سے جائز ہے جس میں مضطر کے لئے مردار جانور کھا کر جان بچانے کی اجازت صراحتاً مذکور ہے اور اگر اضطراری حالت نہ ہو یا دوسری دوائیں بھی کام کر سکتی ہوں تو ایسی حالت میں مسئلہ مختلف فیہا ہے بعض فقہا رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک جائز ہے بعض ناجائز کہتے ہیں (معارف القرآن)

تحریم خنزیر: تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی ہے وہ لَحْمِ خِنْزِيْرِ ہے آیت میں حرمتِ خنزیر کے ساتھ لحم کی قید مذکور ہے، امام قرطبی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مقصود لحم یعنی

گوشت کی تخصیص نہیں بلکہ اس کے تمام اجزاء ہڈی، کھال، بال، پٹھے سب ہی باجماع امت حرام ہیں لیکن لفظ لحم بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ خنزیر دوسرے حرام جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ وہ ذبح کرنے سے پاک ہوسکتے ہیں اگرچہ کھانا حرام ہی رہے کیونکہ خنزیر کا گوشت ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا کہ وہ نجس العین بھی ہے حرام بھی صرف چمڑا سینے کے لئے اس کے بال کا استعمال حدیث میں جائز قرار دیا ہے (جصاص قرطبی بحوالہ معارف القرآن ج ۱ ص ۴۲۱)

مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی تین صورتیں: چوتھی چیز جس کو آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ جانور ہے جو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو جس کی تین صورتیں متعارف ہیں اول یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا جائے اور بوقت ذبح اسی غیر اللہ کا نام لیا جائے یہ صورت باتفاق و بااجماعِ امت حرام ہے اور یہ جانور میتہ ہے اس کے کسی جُزء سے انتفاع جائز نہیں کیونکہ یہ صورت آیت مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے یعنی اس کا خون بہانے سے تقرب الیٰ غیر اللہ مقصود ہو لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ ہی کا لیا جائے جیسے بہت سے نا واقف مسلمان بزرگوں پیروں کے نام پر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں لیکن ذبح کے وقت اس پر نام اللہ ہی کا پکارتے ہیں یہ صورت بھی باتفاق فقہا رحمۃ اللہ علیہم حرام اور مذبوحہ مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے بعض حضرات مفسرین رحمۃ اللہ علیہم و فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح قرار دیا ہے جیسا کہ حواشی بیضاوی میں ہے، فَكُلُّ مَا نُوْدِيَ عَلَيْهِ بِغَيْرِ اسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ حَرَامٌ وَاِنْ ذُبِحَ بِاسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى حَيْثُ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ لَوْ اَنَّ مُسْلِماً ذَبَحَ ذَبِيْحَةً وَقَصَدَ بِذَبْحِهِ اَلتَّقَرُّبَ اِلٰى غَيْرِ اللّٰهِ صَارَ مُرْتَدًّا وَذَبِيْحَتُهُ ذَبِيْحَةُ مُرْتَدٍّ ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام کر دیا گیا وہ حرام ہے اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا نام لیا ہو اس لئے کہ علماء فقہاء رحمۃ اللہ علیہم کا اتفاق ہے

کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاوے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ کہلائے گا۔

نیز در مختار کتاب الذبائح میں ہے: ذُبِحَ لِقُدُومِ الْأَمِيرِ وَنَحْوِهِ كَوَاحِدٍ مِنَ الْعُظَمَاءِ يَحْرُمُ لِأَنَّهُ أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَلَوْ ذَكَرَ اسْمَ اللّٰهِ تَعَالَى واقرہ الشامی (ص ۲۱۴ ج ۵) کسی امیر یا بڑے کے آنے پر جانور ذبح کیا تو وہ حرام ہو گا کیونکہ وہ ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل ہے اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا نام لیا ہو اور شامی نے اس کی تائید کی۔ (معارف القرآن ج ۱ ص ۴۲۲)

مفتی محمد تقی عثمانی معارف القرآن میں اسی مقام پر حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر محض ذبح کے عمل سے کسی بڑے کی تعظیم مقصود ہو تو یہ حرام ہے لیکن اگر مقصد مہمانی کرنا ہو اور اس مہمانی کے لیے جانور ذبح کیا جائے یعنی اس کا گوشت مہمان کو کھلانا مقصود ہو، محض ذبح کے عمل سے تعظیم مقصود نہ ہو تو یہ سنت ضیافت ہے اور جائز ہے اور دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں میزبانی کے لیے گوشت کا حصول مقصود ہوتا ہے اور پہلی صورت میں تعظیم کی علامت کے طور پر جانور کو ذبح کرنا مقصود ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا گوشت کھایا جائے گا یا نہیں؟ چنانچہ در مختار میں آگے یہی وضاحت کی گئی ہے

وَلَوْ ذُبِحَ لِلضَّيْفِ لَا يَحْرُمُ لِأَنَّهُ سُنَّةُ الْخَلِيلِ وَإِكْرَامُ الضَّيْفِ إِكْرَامُ اللّٰهِ تَعَالَى وَالْفَارِقُ أَنَّهُ إِنْ قَدَّمَهَا لِيَأْكُلَ مِنْهَا كَانَ الذَّبْحُ لِلّٰهِ وَالْمَنْفَعَةُ لِلضَّيْفِ أَوْ لِلْوَلِيمَةِ أَوْ لِلرِّيحِ وَإِنْ لَّمْ يُقَدِّمْهَا لِيَأْكُلَ مِنْهَا بَلْ يَدْفَعُهَا لِغَيْرِهِ كَانَ لِتَعْظِيمِ غَيْرِ اللّٰهِ فَتَحْرُمُ علامہ شامی نے اس کی شرح میں مزید تشریح فرمادی ہے۔ (رد المختار ص ۳۱۰ ج ۶)

اور بعض حضرات نے اس صورت کو مَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح تو نہیں بنایا کیونکہ وہ بحیثیت عربیت تکلف سے خالی نہیں مگر بوجہ اشتراک علت یعنی تقرب الیٰ غیر اللہ کی نیت کے اس کو بھی مَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے احقر کے نزدیک یہی وجہ احوط اور

اسلم ہے۔(معارف القرآن ج ا ص ۴۲۲)

نیز اس صورت کی حرمت کے لئے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے یعنی وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ، نصب ان تمام چیزوں کو کہا جاتا ہے جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہے معنی یہ ہیں کہ وہ جانور جس کو معبودانِ باطلہ کے لئے ذبح کیا گیا ہے اس سے پہلے وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مَآ اُهِلَّ کا مدلول صریح تو وہی جانور ہے جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا اور ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (۵:۳) اس کے بالمقابل آیا ہے جس میں غیر اللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں صرف بتوں وغیر اللہ کی خوشنودی کی نیت سے ذبح کرنا مراد ہے اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کو ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے تقرب کے لئے مگر بوقت ذبح اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے (افادہ شیخ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ، معارف القرآن)

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے ان کی عبارت یہ ہے، وَجَرَتْ عَادَةُ الْعَرَبِ بِالصِّيَاحِ بِاسْمِ الْمَقْصُودِ بِالذَّبِيحَةِ، وَغَلَبَ ذٰلِكَ فِي اسْتِعْمَالِهِمْ حَتّٰى عُبِّرَ بِهٖ عَنِ النِّيَّةِ الَّتِي هِيَ عِلَّةُ التَّحْرِيمِ، (تفسیر قرطبی ص ۲۰۷ ج ۲) عرب کی عادت تھی کہ جس کے لئے ذبح کرنا مقصود ہوتا ذبح کرنے کے وقت اس کا نام بلند آواز سے پکارتے اور یہ رواج ان میں عام تھا یہاں تک کہ اس آیت میں تقرب الیٰ غیر اللہ کو جو کہ اصل علت تحریم ہی اہلال کے لفظ سے تعبیر کر دیا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو حضرات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فرزدق شاعر کے باپ غالب نے ایک اونٹ ذبح کیا تھا جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذکر نہیں مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا اور سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو قبول کیا اسی طرح امام مسلم رحمہ اللہ کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ رحمہ اللہ کی سند سے حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث نقل کی جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت

صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ ام المؤمنین ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار عجمی لوگوں میں سے ہیں اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا رہتا ہے یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں ہم اس کو کھائیں یا نہیں؟ اس پر صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: أَمَّا مَا ذُبِحَ لِذَلِكَ الْيَوْمِ فَلَا تَأْكُلُوا وَلَكِنْ كُلُوا مِنْ أَشْجَارِهِمْ (قرطبی ص ۲۰۷ ج ۲) جو جانور اس عید کے دن کے لئے ذبح کیا گیا ہو وہ نہ کھاؤ لیکن ان کے درختوں کے پھل وغیرہ کھا سکتے ہو۔

الغرض یہ صورت ثانیہ جس میں نیت تو تقرب الیٰ غیر اللہ کی ہو مگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے اول تو اشتراک علت یعنی نیت تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے حکم میں ہے دوسرے آیت وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا بھی مدلول ہے اس لئے یہ بھی حرام ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو کان کاٹ کر یا کوئی دوسری علامت لگا کر تقرب الی غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لئے چھوڑ دیا جائے نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں یہ جانور مَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ دونوں میں داخل نہیں بلکہ اس قسم کے جانور کو بحیرہ یا سائبہ وغیرہ کہا جاتا ہے اور حکم ان کا یہ ہے کہ یہ فعل تو بنص قرآن حرام ہے۔ (معارف القرآن ج ۱ ص ۴۲۳)

مگر ان کے اس حرام عمل سے اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہو جاتے بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے عقیدہ باطلہ کی تائید و تقویت ہوتی ہے اس لئے یہ جانور عام جانوروں کی طرح حلال ہے، مگر شرعی اصول کے مطابق یہ جانور اپنے مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوا اسی کا مملوک ہے اگرچہ وہ اپنے غلط عقیدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میری ملک سے نکل کر غیر اللہ کے لئے وقف ہو گیا مگر شرعاً اس کا یہ عقیدہ باطل ہے وہ جانور بدستور اس کی ملک میں ہے، اب اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا ہبہ کر دے تو اس کے لئے یہ جانور حلال ہے جیسا بکثرت ہندو اپنے دیوتاؤں کے نام بکری یا گائے وغیرہ کو اپنے نزدیک وقف کر کے چھوڑ دیتے ہیں اور

مندروں کے پجاریوں جوگیوں کو اختیار دیتے ہیں وہ جو چاہیں کریں یہ مندروں کے پجاری ان کو مسلمانوں کے ہاتھ بھی فروخت کر دیتے ہیں، یا اسی طرح بعض جاہل مسلمان بھی بعض مزارات پر ایسا ہی عمل کرتے ہیں کہ بکرا یا مرغا چھوڑ دیتے ہیں اور مزارات کے مجاورین کو اختیار دیتے ہیں وہ ان کو فروخت کر دیتے ہیں تو جو لوگ ان جانوروں کو ان لوگوں سے خرید لیں جن کو اصل مالک نے اختیار دیا ہے ان کے لئے خریدنا اور ذبح کر کے کھانا اور فروخت کرنا سب حلال ہے۔ (معارف القرآن)

نذر غیر اللہ کا مسئلہ: یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے ہے مثلاً مٹھائی کھانا وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر (منت) کے طور سے ہندو لوگ بتوں پر اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں حضرات فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے اس کو بھی اشتراک علت یعنی تقرب الیٰ غیر اللہ کی وجہ سے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے حکم میں قرار دے کر حرام کہا ہے اور اس کے کھانے پینے دوسروں کو کھلانے اور بیچنے خریدنے سب کو حرام کہا ہے کتب فقہ بحر الرائق وغیرہ میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں یہ مسئلہ قیاسی ہے جس کو نص قرآنی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم، (معارف القرآن ج ۱ ص ۴۲۴)

اضطرار و مجبوری کے احکام: آیت مذکورہ میں چار چیزیں حرام قرار دینے کے بعد ایک حکم استثنائی مذکور ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ اس حکم میں اتنی آسانی کر دی گئی ہے کہ جو شخص بھوک سے بہت ہی بیتاب ہو جائے بشرطیکہ نہ تو کھانے میں طالب لذت ہو اور نہ قدر ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس حالت میں ان حرام چیزوں کو کھا لینے سے بھی اس شخص کو کوئی گناہ نہیں ہوتا بے شک اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور ورحیم۔ اس میں مضطر کے لئے جان بچانے کے واسطے دو شرطوں کے ساتھ ان حرام چیزوں کے کھا لینے سے بھی گناہ اٹھا دیا گیا ہے،

مضطر: شرعی اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی جان خطرہ میں ہو معمولی تکلیف یا ضرورت سے مضطر نہیں کہا جا سکتا تو جو شخص بھوک سے ایسی حالت پر پہنچ گیا کہ اگر کچھ نہ کھائے تو

جان جاتی رہے گی اس کے لئے دو شرطوں کے ساتھ یہ حرام چیزیں کھا لینے کی گنجائش دی گئی ہے۔ ایک شرط یہ ہے کہ مقصود جان بچانا ہو کھانے کی لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو دوسری شرط یہ ہے کہ صرف اتنی مقدار کھائے جو جان بچانے کے لئے کافی ہو پیٹ بھر کر کھانا یا قدر ضرورت سے زائد کھانا اس وقت بھی حرام ہے۔ (معارف القرآن)

اہم فائدہ: یہاں قرآن عزیز نے اضطرار کی حالت میں بھی حرام چیزوں کے کھانے کو حلال نہیں فرمایا بلکہ لَآ اِثْمَ عَلَيْهِ فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو اب بھی اپنی جگہ حرام ہی ہیں مگر اس کھانے والے سے بوجہ اضطرار کے استعمال حرام کا گناہ معاف کر دیا گیا حلال ہو جانے اور گناہ معاف کر دینے میں بڑا فرق ہے۔ اگر اضطراری حالت میں ان چیزوں کو حلال کر دینا مقصود ہوتا تو حرمت سے صرف استثناء کر دینا کافی ہوتا مگر یہاں صرف استثناء پر اکتفاء کر دینے کے بجائے لَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کا اضافہ فرما کر اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ حرام تو اپنی جگہ حرام ہی ہے اور اس کا استعمال گناہ ہی ہے مگر مضطر سے یہ گناہ معاف کر دیا گیا، (معارف القرآن)

حالت اضطرار میں دواء کے طور پر حرام چیزوں کا استعمال: حضرت مفتی شفیع رحمہ اللہ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ آیت مذکورہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ جس شخص کی جان خطرہ میں ہو وہ جان بچانے کے لئے بطور دواء کے حرام چیز کو استعمال کر سکتا ہے مگر آیت مذکورہ ہی کے اشارہ سے اس میں چند شرطیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ حالت اضطرار کی ہو خطرہ جان جانے کا ہو، معمولی تکلیف و بیماری کا یہ حکم نہیں ہے دوسرے یہ کہ بجز حرام چیز کے اور کوئی چیز علاج و دواء کے لئے مؤثر نہ ہو یا موجود نہ ہو جیسے شدید بھوک کی حالت میں استثناء اسی وقت ہے جب کہ کوئی دوسری حلال غذا موجود و مقدور نہ ہو تیسرے یہ کہ اس حرام کے استعمال کرنے سے جان بچ جانا یقینی ہو جیسے بھوک سے مضطر کے لئے ایک دو لقمہ حرام گوشت کا کھا لینا عادتاً اس کی جان بچانے کا یقینی سامان ہے اگر کوئی دواء ایسی ہے کہ اس کا استعمال مفید تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے شفاء یقینی نہیں تو اس دواء کا استعمال آیت مذکورہ کے

استثنائی حکم میں داخل ہو کر جائز نہیں ہو گا اس کے ساتھ مزید دو شرطیں آیت قرآنی میں منصوص ہیں کہ اس کے استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدرِ ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔

آیت مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ ہر حرام و ناپاک دواء کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باتفاق فقہاء امت رحمۃ اللہ علیہم جائز ہے ان شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔ ① حالت اضطرار کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو۔ ② دوسری کوئی حلال دواء کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔ ③ اس دواء سے مرض کا ازالہ عادتاً یقینی ہو۔ ④ اس کے استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو۔ ⑤ قدر ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔ (معارف القرآن ج ۱ ص ۴۲۶)

غیر اضطراری حالت میں عام علاج و دواء کے لئے حرام چیز کا استعمال: حضرت مفتی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اضطراری حالت کا مسئلہ تو شرائط مذکورہ کے ساتھ نصِ قرآن سے ثابت اور اجماعی حکم ہے لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی ناپاک یا حرام دواء کا استعمال جائز ہے یا نہیں اس مسئلہ میں فقہاء رحمۃ اللہ علیہم کا اختلاف ہے اکثر فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا کہ بغیر اضطرار اور ان تمام شرائط کے جو اوپر مذکور ہوئیں حرام دواء کا استعمال جائز نہیں کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی۔ (بخاری شریف)

بعض دوسرے فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا وہ واقعہ عُرنیین کا ہے جو تمام کتب حدیث میں مذکور ہے کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اونٹ کا دودھ اور پیشاب استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے ان کو شفاء ہو گئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہے اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جب تک شرائط اضطرار مذکورہ موجود نہ ہوں حرام دواء کا

استعمال جائز نہیں۔ لیکن فقہاء متاخرین رحمۃ اللہ علیہم نے موجودہ زمانے میں حرام وناپاک دواؤں کی کثرت اور ابتلاء عام اور عوام کے ضعف پر نظر کرکے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری حلال اور پاک دواء اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

كما فى الدر المختار قبيل فصل البير اُخْتُلِفَ فِي التَّدَاوِي بِالْمُحَرَّمِ وَظَاهِرُ الْمَذْهَبِ الْمَنْعُ كَمَا فِي رَضَاعِ الْبَحْرُ، لَكِنْ نَقَلَ الْمُصَنِّفُ ثَمَّةَ وَهُنَا عَنِ الْحَاوِي: وَقِيلَ يُرَخَّصُ إِذَا عُلِمَ فِيهِ الشِّفَاءُ وَلَمْ يُعْلَمْ دَوَاءٌ آخَرُ كَمَا رُخِّصَ الْخَمْرُ لِلْعَطْشَانِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوَى ومثله فى العالمگيرية (ص۳۵۵ ج۵)

در مختار میں فصل بیر سے پہلے مذکور ہے حرام چیزوں کو بطور دواء استعمال کرنے میں اختلاف ہے اور ظاہر مذہب میں اس کی ممانعت آئی ہے جیسا کہ بحر الرائق کتاب الرضاع میں مذکور ہے لیکن مصنف تنویر نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی حاوی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علماء رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا دواء وعلاج کے لئے حرام چیزوں کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس دواء کے استعمال سے شفاء ہو جانا عادتاً یقینی ہو اور کوئی حلال دواء اس کا بدل نہ ہو سکے جیسا کہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ پینے کی اجازت دی گئی ہے، (معارف القرآن ج ا ص ۵۲۷)

حق پوشی کرنے والوں کا طریقہ واردات اور ان کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ {۱۷۴} أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ {۱۷۵} ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ {۱۷۶}

البقرۃ

جواب ترجمہ: بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو اللہ نے نازل فرمائی یعنی کتاب، اور خریدتے ہیں اس کے بدلہ تھوڑی قیمت تو یہ لوگ ہیں جو نہیں بھرتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ، اور اللہ قیامت کے دن ان سے بات نہ کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لیا گمراہی کو ہدایت کے بدلے، اور عذاب کو مغفرت کے بدلے، سو وہ کس قدر صبر کرنے والے ہیں آگ پر۔ یہ اس وجہ سے کہ بیشک اللہ نے نازل فرمایا کتاب کو حق کے ساتھ، اور بیشک جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا بیشک وہ بڑی دور کی خلاف ورزی میں ہیں۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ آیت کریمہ یہود کے سرداروں اور علماء کے بارے میں نازل ہوئی ہے انہیں نچلے درجے کے لوگوں سے ہدیے ملتے تھے اور یہ امید رکھتے تھے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم انہی میں مبعوث ہوں گے جب نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسماعیل میں مبعوث ہوئے اور انہیں اپنی کمائی اور سرداری ہاتھ سے نکلنے کا خدشہ ہوا تو انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کو تبدیل کر دیا اور لوگوں کے سامنے یوں بیان کیا کہ آخری زمانے میں جو نبی مبعوث ہوں گے ان کی نشانی اور صفت یہ ہے اور مکہ میں جو نبی ہے اس کی صفت اس کے مشابہ نہیں جب نچلوں نے اس بدلی ہوئی صفت کو دیکھا اور اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کے مخالف پایا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار نہ کی۔ (تفسیر القرطبی، اسباب النزول نیشاپوری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے یہود کے سرداروں سے پوچھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تم تورات میں کیا پڑھتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم تورات میں پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسیح علیہ السلام کے بعد ایک نبی کو مبعوث فرمائیں گے جن کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہو گا وہ زنا، شراب، کھیل کود کے آلات اور ناحق خون بہانے کو حرام کرے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما دیا اور وہ مدینہ تشریف لے آئے تو سرداروں نے یہود سے پوچھا کیا یہ وہ نبی ہے جس کو تم اپنی کتابوں میں پڑھتے ہو تو

سرداروں کے مالوں میں لالچ کرتے ہوئے یہودیوں نے کہا یہ وہ نبی نہیں ہے تو سرداروں نے ان کو اموال دیئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو جھٹلانے کے لئے اس آیات کو نازل فرمایا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہودی سرداروں کعب بن اشرف، کعب بن اسد، مالک بن صیف، حیی بن اخطب اور ابویاسر بن اخطب کے بارے میں نازل ہوئی، یہ لوگ اپنے پیروکاروں سے ہدیے لیا کرتے تھے جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کیے گئے تو انہیں ڈر لگا کہ اب ان کے یہ ہدیے اور منافع جاتے رہیں گے تو انہوں نے اس خدشہ کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ کو چھپایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے متعلق معاملے کو پوشیدہ رکھا، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (تفسیر کبیر للرازی)

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ: حضرات مفسرین کرام کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ لوگ کیا چیز چھپاتے اور پوشیدہ رکھتے تھے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت قتادہ رحمہ اللہ، حضرت سدی رحمہ اللہ اور حضرت اصم رحمہ اللہ و حضرت ابو مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وستائش اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دی گئی بشارت کو چھپاتے اور پوشیدہ رکھتے تھے، جب کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ احکامات کو پوشیدہ رکھتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ میں فرمایا کہ بہت سے احبار ورھبان لوگوں کے اموال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں۔

معانی اور مفاہیم کا کتمان: وہ کیسے کتمان کرتے تھے؟ اس پوشیدگی کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟ اس بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان یہ ہے کہ وہ تورات اور انجیل میں تحریف کرتے تھے، جب کہ حضرات متکلمین کہتے ہیں کہ ایسا کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ دونوں کتابیں شہرت اور تواتر کی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھیں، اس لیے ان دونوں کتابوں میں ایسا کرنا مشکل کام تھا، بلکہ وہ ان فرمودات وارشادات کی تاویل و تعبیر کو چھپاتے اور پوشیدہ رکھتے تھے کیونکہ ان لوگوں میں ایسے لوگ موجود

تھے جو نبی کریم ﷺ کی نبوت ورسالت پر دلالت کرنے والی نشانیوں سے آگاہ تھے، اس لیے وہ باطل تاویلات کا تذکرہ کرتے تھے اوران صفات کے درست محامل سے انہیں پھیر پھرا کر بیان کرتے تھے، تاکہ نبی کریم ﷺ میں پائی جانے والی صفات سے ان کی بیان کردہ تاویلات برعکس نظر آئیں، یہی یہاں کتمان کا مفہوم ہے تو معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں نازل کی گئی چیزوں کے معانی ومفاہیم کو چھپاتے ہیں۔(تفسیر الکبیر للامام الرازی)

وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا: بِهِ میں ضمیر کا مرجع چھپائی گئی بات ہے۔ ثَمَنًا قَلِيلًا یعنی رشوت لیتے ہیں۔اس کو قلیل فرمایا کیونکہ اس کی مدت ختم ہونے والی ہے اور اس کا انجام برا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو وہ رشوت لیتے تھے وہ تھوڑی ہوتی تھی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اگرچہ علماء یہود کے متعلق ہے مگر یہ مسلمانوں کو بھی شامل ہے جو دنیا کے حصول کی خاطر حق کو چھپاتے ہیں۔(قرطبی)

أُولَئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ: وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں، یہاں بطون (پیٹ) کا ذکر کھانے کی حقیقت پر تاکید اور دلالت کے لیے ہے، کبھی یہ مجازاً استعمال ہوتا ہے مثلاً اَكَلَ فُلَانٌ اَرضِي وَنَحوَهُ (فلاں نے میری زمین کو کھایا) اور بطون کے ذکر میں ان کی نادانی پر تنبیہ ہے۔ انہوں نے اپنی آخرت کو اپنے اس کھانے کے بدلے فروخت کیا جس کا کوئی مقام نہیں۔ إِلَّا النَّارَ کا معنی یہ ہے کہ وہ حرام ہے اللہ تعالیٰ اس پر انہیں آگ کا عذاب دے گا۔ جو انہوں نے رشوت کھائی اسے آگ فرمایا، کیونکہ وہ انہیں آگ تک پہنچانے والی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ انہیں حق کو چھپانے کی وجہ سے جہنم میں حقیقۃً آگ کھانے کے ساتھ عذاب دے گا۔ اس نے مآل کے مطابق حال کے ساتھ خبر دی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا [النساء: ۱۰] یعنی ان کا انجام اسی کی طرف پھیرا جائے گا، اسی سے عربوں کا قول ہے: لِدُوا لِلْمَوْتِ وَابْنُوا لِلْخَرَابِ موت

کے لیے پیدا کرو اور ویرانی کے لیے تعمیر کرو۔ ایک اور نے کہا: فَلِلْمَوْتِ مَا تَلِدُ الْوَالِدَةُ: ماں جنم دیتی ہے موت کے لئے۔ ایک اور نے کہا: وَدُوْرُنَا لِخَرَابِ الدَّهْرِ نَبْنِيهَا ہم اپنے گھر زمانے کی ویرانی کی خاطر تعمیر کرتے ہیں۔ (قرطبی)

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ: کتاب اللہ کے احکامات، نبی کریم ﷺ کی صفات، آپ ﷺ کی نعت و مدح کو پوشیدہ رکھنے والے، رشوت خور، لوگوں کا مال ناجائز ہڑپ کرنے والے لوگ کس قدر بدنصیب و بدبخت ہیں کہ بروز محشر اللہ ان سے بات نہیں کریں گے، ان کا تزکیہ نہیں کریں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے ایسی بات نہیں کرے گا جو انہیں پسند ہو، دوسرے مقام پر قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جہنم میں دھتکارے اور پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اور میرے ساتھ بات نہ کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف فرشتوں کو سلام کرنے کے لیے نہیں بھیجے گا، وَلَا يُزَكِّيهِمْ ان کے اعمال کی اصلاح نہیں کرے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا، زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ ان کی خیر کی تعریف نہیں کرے گا اور نہ ہی انہیں پاکیزہ لوگ قرار دے گا۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: ان کے لیے عذاب الیم (دردناک) ہے، فعیل کبھی فاعل کے معنیٰ میں ہوتا ہے جیسے سمیع سامع کے معنیٰ میں، علیم عالم کے معنیٰ میں اور کبھی فعیل مفعول کے معنیٰ میں ہوتا ہے جیسے جریح مجروح کے معنیٰ میں، قتیل مقتول کے معنیٰ میں اور کبھی فعیل مفعل کے معنیٰ میں ہوتا ہے جیسے بصیر مبصر کے معنیٰ میں، اسی طرح الیم مؤلم کے معنیٰ میں ہے یعنی درد دینے والا عذاب۔

عذاب و عقاب: ایک عذاب ہوتا ہے اور ایک عقاب، عقاب اس سزا کو کہا جاتا ہے جس میں اہانت بھی کی جائے، یہاں اللہ نے اہانت کا ذکر اس طرح فرمایا کہ اللہ ان سے بات نہیں کرے گا، ان کا تزکیہ نہیں کرے گا، یہ ان کی حقارت اور استخفاف کی طرف اشارہ ہے، جب کہ عذاب الیم میں مضرت کی

طرف اشارہ ہے، یہاں اہانت کو مضرت سے پہلے ذکر فرما کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اہانت بہت گراں اور بہت ہی مشکل عذاب ہے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ: وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب مول لیا، گویا یہ ایک خرید وفروخت ہے، جس میں یہ لوگ ہدایت سے روگردانی کرتے ہیں اور ضلالت خریدتے ہیں، مغفرت سے محروم ہوتے ہیں اور عذاب دائمی خریدتے ہیں، کس قدر ناسمجھ ہیں یہ لوگ جو اس قدر بڑے خسارے کا سودا کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایک بڑی برائی خریدلی ہے، ہدایت ان کے لئے عام تھی مگر انہوں نے اسے چھوڑ کر ضلالت کو اختیار کرلیا، مغفرت کے مواقع ان کے لیے موجود تھے، مگر انہوں نے انہیں گنوادیا اور عذاب کو اپنالیا۔

فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ: جمہور مفسرین کرام اس کو تعجب کے معنیٰ میں لیتے ہیں، یہ مخلوق کی طرف راجع ہے۔ گویا فرمایا: انہوں نے ان کے آگ پر صبر کرنے پر اور آگ پر ٹھہرے رہنے پر تعجب کیا۔ قرآن حکیم میں ہے: قُتِلَ الْإِنْسانُ ما أَكْفَرَهُ (عبس) غارت ہو منکر انسان! وہ کتنا احسان فراموش ہے۔ أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ (مریم) (اس دن) یہ خوب سننے لگیں گے اور خوب دیکھنے لگیں گے۔ اس معنی کی بنا پر ابو علی نے لکھا ہے کہ حسن، قتادہ، ابن جبیر اور ربیع نے کہا: اللہ کی قسم! آگ پر انہیں صبر نہیں ہے لیکن وہ کتنے آگ پر جرأت کرنے والے ہیں۔ یہ یمنی لغت ہے۔

فراء نے کہا: مجھے کسائی نے بتایا، فرمایا: مجھے یمن کے قاضی نے بتایا کہ دو جھگڑے والے ان کے پاس جھگڑا لے کر آئے تو ان میں سے ایک پر قسم واجب ہوئی تو اس نے قسم اٹھادی۔ دوسرے مخالف نے اسے کہا: مَا أَصْبَرَكَ عَلَى اللَّهِ؟ أَيْ مَا أَجْرَأَكَ عَلَيْهِ تو اللہ تعالیٰ پر کتنا جرأت کرنے والا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ آگ پر کتنے بہادر ہیں کیونکہ وہ ایسے اعمال کرتے ہیں جو انہیں آگ تک پہنچاتے ہیں۔

زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے مَا أَبْقَاهُمْ عَلَى النَّارِ وہ آگ پر کتنے باقی رہنے والے ہیں۔ یہ

عربوں کے اس قول سے مشتق ہے: مَا أَصْبَرَ فُلَانًا عَلَى الْحَبْسِ! أَيْ مَا أَبْقَاهُ فِيهِ، یعنی وہ کتنا حبس (قید) میں باقی رہنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فَمَا أَقَلَّ جَزَعِهِمْ مِنَ النَّارِ ان کا آگ سے جزع فزع کتنا کم ہے۔ جزع کی قلت کو صبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کسائی اور قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے مَا أَدْوَمَهُمْ عَلَى عَمَلِ أَهْلِ النَّارِ وہ دوزخیوں کے عمل پر کتنا دوام اختیار کرنے والے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: مَا اسْتِفْهَامٌ مَعْنَاهُ التَّوْبِيخُ ما استفہام ہے اس کا معنی توبیخ ہے۔ اس کا معنی ہے: کس چیز نے انہیں دوزخیوں کے عمل پر صبر دیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان کی استہانت اور ان کے امر کے استخفاف (ہلکا سمجھنا) کی بناء پر ہے۔ (قرطبی)

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ: یہ اس ناراضگی اور غضب کا سبب بیان ہو رہا ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس عتاب کے مستحق اس وجہ سے ٹھہریں گے کہ خدا نے ان کو راہ رست پر لانے کے لیے ایک ایسی کتاب اتاری جو تمام جھگڑوں اور سارے اختلافات کو چکا دینے والی ہے لیکن انہوں نے اس کے بعد بھی ہدایت کی جگہ ضلالت ہی کو اختیار کیا تو یہ اسی بات کے مستحق ہیں کہ یہ ہمیشہ کے لیے خدا کی نظر التفات سے محروم ہو کر اس عذاب میں پڑیں جس سے ان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہو۔

اس میں بِالْحَقِّ کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ خدا نے یہ کتاب قول فیصل کے ساتھ اتاری ہے یعنی اہل کتاب نے حق پوشی اور تحریف کر کے اللہ کے دین میں جو طرح طرح کے اختلافات پیدا کر دیئے تھے اور جس کے سبب سے یہ معلوم کرنا سخت مشکل ہو گیا تھا کہ کیا حرام ہے، کیا حلال، کیا حق ہے اور کیا باطل، اللہ نے قرآن کے ذریعہ سے اس اختلاف و نزاع کو بالکل رفع کر دیا، اب حق کی راہ ہر طالب حق کے لیے پھر کھل گئی ہے اور خدا کی شریعت اپنی صحیح اور مکمل شکل میں لوگوں کے سامنے آگئی ہے، اس کے بعد بھی جو لوگ انہی جھگڑوں میں پڑے رہیں تو ان کی شامت اور بد بختی ہی ہے، شِقَاقٍ کے معنی مخالفت اور عناد کے ہیں۔ (تدبر قرآن)

اعمال صالحہ اور اخلاق عالیہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ {۱۷۷} البقرۃ

جواب ترجمہ: نیکی بس یہی تو نہیں ہے کہ اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں اور اس کے نبیوں پر ایمان لائیں، اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیں، اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اور جب کوئی عہد کرلیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی ہوں، اور تنگی اور تکلیف میں نیز جنگ کے وقت صبر و استقلال کے خوگر ہوں۔ ایسے لوگ ہیں جو سچے (کہلانے کے مستحق) ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

شان نزول: حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے سامنے ذکر کیا گیا کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی کے متعلق سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی، آپ فرماتے ہیں کہ فرائض سے پہلے جب کوئی آدمی یہ گواہی دے دیتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں پھر اسی پر مر جاتا تو اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (اسباب النزول، زاد المسیر)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ یہودی مغرب کی جانب نماز پڑھتے تھے اور نصاریٰ مشرق کی طرف اور اپنے اپنے قبلہ پر جمنے ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے اور ایمان قبول نہ کرتے تھے لہٰذا آیت

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ نازل ہوئی۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے یہ بھی منقول ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی کی تفصیلات کے بارے میں سوال کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی آپ نے اس شخص کو بلایا اور آیت کریمہ پڑھ کر اسے سنادی۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم ہوا پھر خانہ کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا گیا تو اہل کتاب اور کچھ مسلمانوں کو شاق گزرا تو اللہ نے تحویل قبلہ کی حکمت نازل فرمائی کہ کوئی جہت مقصود بالذات نہیں ہے، بندوں کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کریں، اس کے حکموں کو مانیں جدھر رخ کرنے کا حکم ہوادھر رخ کرلیں۔ بس یہ نیکی اور تقویٰ ہے اور ایمان کامل کا تقاضا ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق عمل ہوجائے، مشرق یا مغرب کو رخ ہو عند اللہ یہ کوئی چیز نہیں۔ (ابن کثیر، انوار البیان)

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ: اس آیت میں بہت سے نیک کام مذکور ہیں۔ سب سے پہلے تو ایمان کا ذکر فرمایا اور اصول وعقائد بتادیئے، ایمان وہ چیز ہے جس کے بغیر کوئی نیکی قبول نہیں ہے، یہود و نصاریٰ ایمان تو لاتے نہیں تھے اور اپنے اپنے قبلہ کی طرف رخ کرنے ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اصلی نیکی اس شخص کی ہے جو اللہ پر ایمان لائے اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور اللہ تعالیٰ کی سب کتابوں پر اور اس کے سب نبیوں پر، جو شخص ان چیزوں پر ایمان لائے گا اللہ کی کسی کتاب یا اس کے کسی رسول کی تکذیب نہ کرے گا اور رسولوں کے درمیان تفریق نہ کرے گا وہ مومن ہوگا پھر ایمان کے تقاضوں کے مطابق جو اعمال کرے گا اور جو اموال خرچ کرے گا اور جو اقوال اس سے صادر ہوں گے وہ سب نیکی اور تقویٰ میں شمار ہوں گے۔ (تفسیر انوار البیان)

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ:: عَلٰى حُبِّهٖ میں جو ضمیر مجرور مضاف الیہ ہے اس کا مرجع مفسرین نے مال کو قرار دیا ہے اور بعض حضرات نے یہ بھی احتمال نکالا ہے کہ یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے جس کا

مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے اپنے مال کو وجوہ خیر میں خرچ کرتے ہیں، لیکن پہلا معنی دوسرے معنی کو شامل ہو جاتا ہے، کیونکہ جو شخص مال کی محبت ہوتے ہوئے مذکورہ وجوہ میں خرچ کرے گا وہ اللہ تعالیٰ ہی کی محبت میں خرچ کرے گا۔

ذَوِی الْقُرْبٰی: عربی زبان میں ذوی القربیٰ رشتہ داروں کو کہا جاتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسکین کو صدقہ دینے میں صرف صدقہ کا ثواب ہے اور جس سے رحم کا رشتہ ہو اس کو صدقہ دینے میں (دوہرا) ثواب ہے۔ (کیونکہ وہ) صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے، رشتہ داروں میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا رشتہ ماں باپ کا اور اپنی اولاد کا ہے، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا جگہ جگہ حکم دیا گیا ہے اور بیوی پر اور اولاد پر خرچ کرنے کی فضیلت بھی وارد ہوئی ہے، ان رشتوں کے تعلق سے طبعی تقاضے کے باعث سب ہی خرچ کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے نہ صرف والدین اور اولاد بلکہ دور اور نزدیک کے دوسرے رشتہ داروں پر خرچ کرنے میں بھی ثواب رکھا ہے، اللہ کی رضا مقصود ہو، ریاکاری نہ ہو، جن پر خرچ کرے ان پر احسان نہ جتائے، طعن و تشنیع نہ کرے، حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل خرچ کرنا اس دینار کا ہے جو تو اپنے گھر والوں پر خرچ کرے اور وہ دینار جسے تو اپنے ساتھیوں پر جہاد میں خرچ کرے (یعنی سب سے زیادہ افضل صدقہ ہے)۔ (صحیح مسلم، انوار البیان)

ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان آدمی کا اپنے گھر والوں پر ثواب سمجھتے ہوئے خرچ کرنا صدقہ ہے۔ (یعنی اس میں بھی ثواب ہے) (صحیح بخاری) بلکہ خرچ کرنے میں ان لوگوں کا سب سے پہلے دھیان رکھنے کا حکم فرمایا جو اپنے عیال میں ہوں۔ (مشکوٰۃ، انوار البیان)

وَالْیَتَامٰی: یہ یتیم کی جمع ہے، یتیم ان نابالغ بچوں کو کہا جاتا ہے جن کا باپ زندہ نہ ہو، عموماً ایسے بچے حاجت مند ہوتے ہیں، ان پر خرچ کرنے کا خصوصی خیال رکھا جائے، اخراجات کے علاوہ دوسرے

طریقوں سے بھی ان کی دلداری کی جائے۔

سنن ترمذی میں ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور صرف اللہ کی رضا کے لیے ایسا کیا تو ہر بال جس پر اس کا ہاتھ گزرے گا اس کے عوض نیکیاں ملیں گی اور صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنیوالا جنت میں اس طرح ساتھ ہوں گے، اس موقع پر آپ نے اپنی انگلیاں (انگوٹھے کے پاس والی اور بیچ والی) ساتھ ملا کر دکھائیں، آج کل لوگوں میں یہ رواج ہو گیا ہے کہ وہ یتیموں پر اپنا مال تو کیا خرچ کرتے انہیں کا مال کھا جاتے ہیں، باپ کی میراث میں سے جو حصہ ان کو ملتا ہے اس کو دبا لیتے ہیں، اپنے نام یا اپنی اولاد کے نام کروا لیتے ہیں، یتیم کے مال پر قبضہ کرنے سے ذرا نہیں جھجکتے۔ (انوار البیان)

وَالْمَسَاكِيْنَ: جن لوگوں کے پاس کچھ بھی نہ ہو ان کو مسکین کہا جاتا ہے، ان میں بہت سے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی حاجت کو کسی پر ظاہر نہیں کرتے، دکھ، تکلیف میں بھوکے پیاسے وقت گزار لیتے ہیں، ایسے لوگوں پر خرچ کرنے کا بہت زیادہ ثواب ہے، جن کو سوال کرنے کی عادت ہوتی ہے وہ تو سوال کر کے اپنی حاجت پوری کر لیتے ہیں، لیکن آبرومند آدمی سوال نہیں کرتا، ایسے لوگوں کی تلاش رکھنی چاہیے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسکین وہ نہیں ہے جو (سوال کرنے کے لیے) لوگوں کے پاس چکر لگاتا ہے، جسے ایک لقمہ اور دو لقمہ یا ایک کھجور اور دو کھجوریں واپس کر دیتی ہیں، یعنی کوئی دیتا ہے کوئی نہیں دیتا، (لیکن واقعی مسکین وہ ہے، جو ایسی چیزیں نہیں پاتا جو اسے بے نیاز کرے اور اس کا پتہ بھی نہیں چلتا تا کہ اس پر صدقہ کیا جائے اور وہ سوال کرنے کے لیے بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ (تفسیر انوار البیان)

وَابْنَ السَّبِيْلِ: عربی زبان میں ابن سبیل مسافر کو کہا جاتا ہے، بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مسافر کے پاس سفر میں خرچہ ختم ہو جاتا ہے یا مال چوری ہو جاتا ہے، یا جیب تراش کر رقم نکال لی جاتی ہے، ایسے

لوگوں کا حال معلوم ہو جائے تو ان پر خرچ کرنے کا اہتمام کیا جائے، ضروری نہیں کہ یہ لوگ حاجت کا اظہار کریں تب ہی دیا جائے، کسی طرح بھی ان کی حاجت معلوم ہو جائے تو ان کی مدد کر دی جائے، مسافر کے گھر پر جس قدر بھی مال ہو اور اپنے اموال و املاک و جائیداد کی وجہ سے غنی ہو لیکن سفر میں حاجت مند ہو گیا تو اس پر خرچ کر کے ثواب لیا جائے۔ (انوار البیان)

وَالسَّآئِلِیْنَ: یہاں سوال کرنے والوں کو دینے کا ذکر فرمایا، ان لوگوں میں کئی قسم کے لوگ ہوتے ہیں ان میں واقعی ضرورت مند بھی ہوتے ہیں، ان کو تو دینا ہی چاہیے اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے بارے میں یقین تو نہیں کہ وہ حاجت مند ہو گا لیکن اس کے ظاہر حال اور غالب گمان سے ضرورت مند ہونا معلوم ہوتا ہے، ان کو بھی دینا درست ہے۔ (انوار البیان)

حضرت مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بھیک مانگنے کا پیشہ اختیار کرنے کی ممانعت ہے، مجبوری میں بھوک دفع کرنے یا اور کسی حاجت کے پورا کرنے کے لیے کوئی مانگ لے تو گنجائش ہے، لیکن اس کو پیشہ بنالینا کسی طرح بھی درست نہیں، جن کو سوال کی عادت ہوتی ہے وہ مانگتے رہتے ہیں، مال جمع کرتے رہتے ہیں، ایسے لوگوں کو نہ دیا جائے، دنیا میں تو سوال کرنے والے بن کر بے آبرو ہوتے ہی ہیں، قیامت کے دن بھی بے آبرو ہوں گے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے لوگوں سے ان کے مالوں کا سوال اس لیے کیا کہ مال زیادہ جمع ہو جائے تو وہ آگ کے انگاروں کا سوال کرتا ہے (جو دوزخ میں اسے ملیں گے) اب چاہے کم کرے یا زیادہ کرے۔ (مسلم)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ انسان دنیا میں برابر سوال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ قیامت میں اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہو گی۔ (بخاری) اس کا چہرہ دیکھ کر لوگ سمجھ لیں گے کہ یہ دنیا میں سائل تھا وہاں اپنے چہرے کی آبرو کھوئی تو یہاں بھی اسی کا ظہور ہوا، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ غنی کو اور ٹھیک ٹھاک بدن والے قوی آدمی کو سوال کرنا حلال نہیں ہے، الّا یہ کہ ایسا مجبور ہو کہ تنگدستی نے اسے مٹی میں ملا

رکھا ہو (یعنی زمین کی مٹی کے سوا اس کے پاس کچھ نہ ہو) یا قرضے میں مبتلا ہو گیا ہو جو ذلیل کرنے والا ہو اور جس شخص نے مال زیادہ کرنے کے لیے لوگوں سے سوال کیا تو قیامت کے دن اس کا چہرہ چھلا ہوا ہو گا اور یہ مال گرم پتھر بنا ہو گا، جس کو جہنم سے لیکر کھاتا ہو گا، اب جی چاہے تو کمی کرے اور چاہے تو زیادتی کرلے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

ہر شخص کو اپنی اپنی ذمہ داری بتادی گئی، مانگنے والا مانگنے سے پرہیز کرے اور جس سے مانگا جائے وہ موقع دیکھ کر خرچ کرے، سائل کو جھڑکے بھی نہیں، کیا معلوم مستحق ہی ہو اور غور و فکر بھی کرے حاجت مندوں کو تلاش بھی کرے۔ (انوار البیان)

وَفِي الرِّقَابِ: رقاب، رقبۃ کی جمع ہے۔ رقبہ گردن کو کہتے ہیں، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فِي الرِّقَابِ سے مکاتبوں کے آزاد کرانے میں مدد دینا مراد ہے، جو غلام کسی کی ملکیت میں ہو اور اس کا آقا کہہ دے کہ اتنا مال دے دو تو تم آزاد ہو، اس کو مکاتب کہا جاتا ہے، ان کو مال دے کر آزاد کرا دینا بھی وجوہ خیر میں سے ہے اور ثواب کا کام ہے، علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قیدیوں کی جانوں کا فدیہ دے کر ان کا چھڑا لینا یا غلام خرید کر آزاد کر دینا بھی اس کے عموم میں شامل ہے، (جب کبھی مسلمان اللہ کے لیے جنگ کرتے تھے اور شریعت کے مطابق جہاد اور قتال ہوتا تھا، اس وقت غلام اور باندیوں کے مالک ہوتے تھے، اب نہ اللہ کے لیے جہاد ہے نہ غلام ہیں نہ باندیاں ہیں، کوئی انسان کسی انسان کا مالک نہیں ہے، پھر جب کبھی مسلمان اللہ کے لیے جنگ کریں گے اور اصول شریعت پر لڑیں گے تو پھر غلام باندیاں قبضہ میں آئیں گی، ان شاء اللہ) (تفسیر ابن کثیر، تفسیر بیضاوی، تفسیر انوار البیان)

وَأَقَامَ الصَّلَاةَ: تقویٰ کے کاموں میں یہ بھی ہے کہ فرض نماز قائم کریں، ایک عاقل، بالغ مسلمان پر چوبیس گھنٹے میں پانچ وقت کی نماز فرض ہے، نماز وقت مقررہ پر فرض کی گئی ہے، فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء، تمام نمازوں کو اپنے اپنے وقت پر ادا کرنا ہے، وقت ٹل جانے کے بعد نماز قضا ہو جاتی ہے، نماز اہل ایمان کی معراج ہے، نماز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ہے،

مسلمان اور کافر کے درمیان فرق کرنے والی چیز نماز ہی ہے، نبی کریم ﷺ ان لوگوں پر خوش ہوتے تھے جو نماز باجماعت ادا کرتے تھے اور آپ سخت ناراض ہوتے تھے ان لوگوں پر جو باجماعت نماز سے کنی کتراتے تھے۔

وَآتَى الزَّكَاةَ: نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے اموال کی زکوٰۃ دی جائے، زکوٰۃ ہر مسلمان پر ادا کرنا فرض نہیں ہے بلکہ اس مسلمان پر فرض ہے جو صاحب نصاب ہو، اگر اس کا نصاب پورا ہے تو سالانہ زکوٰۃ ادا کرے، زکوٰۃ روزانہ، ہفتہ وار، ماہوار ادا نہیں کرنا ہوتی بلکہ سالانہ ادا کرنا ہوتی ہے، سونا چاندی اور اموال تجارت پر زکوٰۃ لاگو ہوتی ہے، جو لوگ اپنے اموال میں سے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں ان کے اموال میں برکت آتی ہے اور ان کے اموال بڑھتے بھی ہیں۔

وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا: نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں سے ایک اہم الاہم کام اپنے عہد وپیمان کو پورا کرنا ہے، اپنے عہد وپیمان کو پورا کرنے کی شریعت مطہرہ میں بڑی اہمیت بیان کی گئی ہے، جو لوگ اپنے عہد وپیمان کو پورا کرتے ہیں ان کی مدح کی گئی ہے، جو عہد وپیمان کو پورا نہیں کرتے ان کے ساتھ ناراضی کا اظہار کیا گیا ہے، بلکہ عہد وپیمان کو پورا نہ کرنے والوں کی اس خصلت کو منافقین کی خصلت بتایا گیا ہے، پھر عہد وپیمان کے بارے میں واضح کیا گیا ہے کہ اس بارے میں تم سے بروز محشر سوال کیا جائے گا، جہاں خائن کی خیانت کو ناپسند کیا گیا اور اسے لَا اِیْمَانَ کہا گیا وہیں جو شخص عہد وپیمان کی پاسداری نہیں کرتا اس کے بارے کہا گیا کہ اس کا کوئی دین نہیں ہے۔

حضرت مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ بڑے بڑے وعدے کر کے حکومت حاصل کرتے ہیں یا حکومت کے چھوٹے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں پھر وہ عوام کے ساتھ غدر کرتے ہیں اور سارے عہد وپیمان توڑ دیتے ہیں ان لوگوں کے حق میں یہ کیسی سخت وعیدیں ہیں غور کر لیں۔ (تفسیر انوار البیان)

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ: یہاں صبر کرنے والوں کی تعریف فرمائی، سختی اور

تکلیف کے زمانہ میں صبر کرنے کو نیکی اور تقویٰ والے کام بتایا ہے اور جنگ کے وقت جب کافروں سے مقابلہ ہو اس وقت جم کر ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرنے کو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں شمار فرمایا ہے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ: آیت کے آخری حصہ میں ان صفات کے حاملین کو تمغہ دیا گیا اور ان کی تحسین کی گئی ہے فرمایا کہ یہ حضرات جن کی صفات اوپر مذکور ہوئیں وہ لوگ ہیں جو اپنے ایمان میں سچے ہیں اور ان صفات کے حاملین متقی اور پرہیز گار لوگ ہیں۔

قصاص کے احکامات

سوال اس آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر بیان کیجیے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ {۱۷۸} وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ {۱۷۹} البقرۃ)

جواب ترجمہ: اے ایمان والو مقتولوں میں برابری کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے آزاد بدلے آزاد کے اور غلام بدلے غلام کے اور عورت بدلے عورت کے پس جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کیا جائے تو دستور کے موافق مطالبہ کرنا چاہیے اور اسے نیکی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے پس جو اس کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور اے عقلمندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم (خونریزی سے) بچو۔

شان نزول: اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں بنو قریظہ اور بنو نضیر کی جنگ ہوئی تھی جس میں بنو نضیر غالب آئے تھے اب یہ دستور ہو گیا تھا کہ جب نضری کسی قرظی کو قتل کرے تو اس کے بدلے اسے قتل نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک سو وسق کھجور دیت میں لی جاتی تھی اور جب

کوئی قرظی نضری کو مار ڈالے تو قصاص میں اسے قتل کر دیا جاتا تھا اور اگر دیت لی جائے تو دوگنی دیت یعنی دو سو وسق کھجور لی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کی اس رسم کو مٹایا اور عدل و مساوات کا حکم دیا۔ (ابن کثیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ لوگ مرد کو عورت کے بدلے قتل نہیں کرتے تھے جس پر آیت مبارکہ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (المائدہ:۴۵) نازل ہوئی پس آزاد لوگ سب برابر ہیں، جس کے بدلے جان لی جائے گی خواہ قاتل مرد ہو خواہ عورت ہو اسی طرح مقتول خواہ مرد ہو خواہ عورت ہو جب کہ ایک آزاد انسان نے ایک آزاد انسان کو مار ڈالا ہے تو اسے بھی مار ڈالا جائے گا، اسی طرح یہی حکم غلاموں اور لونڈیوں میں بھی جاری ہو گا اور جو کوئی جان لینے کے ارادے سے دوسرے کو قتل کرے گا وہ قصاص میں قتل کیا جائے گا اور یہی حکم قتل کے علاوہ اور زخمیوں کا اور دوسرے اعضاء کی بربادی کا بھی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ بھی اس آیت کو آیت (النَّفْسَ بِالنَّفْسِ) سے منسوخ بتلاتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام ثوری رحمہ اللہ، امام ابن ابی لیلی رحمہ اللہ اور داؤد کا مذہب ہے کہ آزاد نے اگر غلام کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلے وہ بھی قتل کیا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مَنْ قَتَلَ عَبْدَهُ قَتَلْنَاهُ، وَمَنْ جَدَعَهُ جَدَعْنَاهُ، وَمَنْ خَصَاهُ خَصَيْنَاهُ (ابوداؤد، ترمذی) جو شخص اپنے غلام کو قتل کرے ہم اسے قتل کریں گے اور جو شخص اپنے غلام کی ناک کاٹے ہم بھی اس کی ناک کاٹیں گے اور جو اپنے غلام کو خصی کرے ہم بھی اسے خصی کریں گے۔

لیکن جمہور کا مذہب ان بزرگوں کے خلاف ہے، وہ کہتے ہیں آزاد غلام کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اس لئے کہ غلام مال ہے اگر وہ خطا سے قتل ہو جائے تو دیت یعنی جرمانہ نہیں دینا پڑتا صرف اس کے مالک کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور اسی طرح اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ کے نقصان پر بھی

بدلے کا حکم نہیں۔ (ابن کثیر)

جمہور کے نزدیک اگر کسی مسلمان نے کافر کو قتل کیا تو اس کا مسلمان سے بدلہ نہیں لیا جائے گا، جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کسی کافر کے قتل کا بدلہ مسلمان سے نہیں لیا جائے گا، جب کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی مسلمان نے کافر کو قتل کیا تو مسلمان کو بدلے میں قتل کیا جائے گا، کیونکہ قرآن کریم کی سورۃ المائدہ میں اللہ نے فرمایا وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ (المائدہ ۴۵) اور ہم نے ان پر فرض کیا ہے کہ جان بدلے جان کے، آنکھ بدلے آنکھ کے، ناک بدلے ناک کے، کان بدلے کان کے، دانت بدلے دانت کے اور زخموں کا بدلہ ہے۔

چاروں اماموں رحمہم اللہ اور جمہور امت کا مذہب ہے کہ کئی ایک نے مل کر ایک مسلمان کو قتل کیا ہے تو وہ سارے اس ایک کے بدلے میں قتل کر دیے جائیں گے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص کو سات شخص مل کر مار ڈالتے ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ ان ساتوں کو قتل کراتے ہیں اور فرماتے ہیں اگر صنعاء کے تمام لوگ بھی اس قتل میں شریک ہوتے تو میں قصاص میں سب کو قتل کرا دیتا۔

آپ رضی اللہ عنہ کے اس فرمان کے خلاف آپ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے اعتراض نہیں کیا پس اس بات پر گویا اجماع ہو گیا۔ لیکن امام احمد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں ایک کے بدلے ایک ہی قتل کیا جائے زیادہ قتل نہ کیے جائیں۔ (تفسیر ابن کثیر) قرآن کریم، احادیث اور اجماع امت میں مکمل تصریحات موجود ہیں، جو ایک مسلمان کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

وصیت کی اہمیت، وصیت کے اقسام اور احکام

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ {۱۸۰} فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ إِنَّ

اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ {۱۸۱} فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ {۱۸۲} البقرۃ

جواب ترجمہ: تم پر فرض کیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی، اپنے پیچھے مال چھوڑ کر جانے والا ہو تو جب اس کی موت کا وقت قریب آجائے وہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں دستور کے مطابق وصیت کرے یہ متقی لوگوں کے ذمے ایک لازمی حق ہے۔ پھر جو شخص اس وصیت کو سننے کے بعد اس میں کوئی تبدیلی کرے گا، تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہو گا جو اس میں تبدیلی کریں گے یقین رکھو کہ اللہ (سب کچھ) سنتا جانتا ہے۔ ہاں اگر کسی شخص کو یہ اندیشہ ہو کہ کوئی وصیت کرنے والا بے جا طرف داری یا گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، اور وہ متعلقہ آدمیوں کے درمیان صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔

یہاں وصیت کے احکامات بیان کیے جا رہے ہیں، وصیت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جائے خواہ زندگی میں یا بعد الموت لیکن عرف میں اس کام کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم بعد الموت ہو۔ خیر۔ لفظ خیر کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی مال کے بھی آتے ہیں جیسے قرآن میں ہے وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ (۸: ۱۰۰) اس جگہ باتفاق مفسرین خیر سے مراد مال ہے، شرع اسلام میں جب تک میراث کے حصے شرع سے مقرر نہ ہوئے تھے یہ حکم تھا کہ ترکہ کے ایک ثلث میں مرنے والا اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے جتنا جتنا مناسب سمجھے وصیت کر دے اتنا تو ان لوگوں کو حق تھا باقی جو کچھ رہتا وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا اس آیت میں یہ حکم مذکور ہے یعنی، تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو (اپنے) والدین اور (دیگر) اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو) کچھ کچھ بتلا جاوے (اس کا نام وصیت ہے جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ یہ ضروری (کیا جاتا) ہے۔ (بیان القرآن للشیخ تھانویؒ)

وصیت: کا اصل معنی عہد لینا یا تاکیدی حکم کرنا ہے، البتہ شرعی اصطلاح میں وصیت وہ خاص قسم کا عہد یا تاکیدی حکم ہے جو کوئی شخص اپنے پس ماندگان کو کرتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس پر عمل کیا جائے، خواہ وہ کسی مال کی بابت ہو یا قول و قرار سے متعلق۔

حضرت نبی کریم ﷺ کے اس فرمان گرامی سے وصیت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَا حَقُّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ لَهُ شَيْءٌ يُوصِي فِيهِ يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إِلَّا وَوَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ، کسی مسلمان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کے پاس کوئی چیز ہو جس کے متعلق وہ وصیت کرنا چاہتا ہے تو وہ دو راتیں بھی ایسی گزارے کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

وصیت ایک ایسا عمل ہے جو انبیاء اور اللہ کے نیک بندوں کی سنت رہی ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پوتے یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا یوں ذکر فرمایا وَوَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (۱۳۲) البقرہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اور نبی ﷺ نے اپنے فرمودات میں وصیت کی اہمیت کو واضح کیا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والی مذکورہ روایت اس کا بین ثبوت ہے، چونکہ کسی بھی فرد بشر کو اپنی موت کا وقت معلوم نہیں ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ اس کے دروازے پر موت کا فرشتہ کب دستک دینے والا ہے اور یہ بھی یقینی طور پر معلوم ہے کہ جب موت کا فرشتہ دستک دے دے گا تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مہلت دینے والا نہیں ہے اس لیے ہر مسلمان کو چاہئے کہ اگر اس کے پاس کوئی چیز قابل وصیت ہے تو اسے لکھ کر رکھ لے اور اس معاملے میں سستی اور تاخیر سے کام نہ لے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے یہ حدیث نبی ﷺ سے سنی ہے میرے اوپر ایک رات بھی ایسی نہیں گزری الا یہ کہ میری وصیت میرے سرھانے موجود رہتی ہے۔ (مسلم)

شرعی وصیت: شرعی وصیت کو اسلام نے قانونی حیثیت دی ہے اور اس کے کچھ شرائط آداب ہیں جس کا لحاظ رکھنا ہر شخص پر ضروری ہے اولاً وصیت کے اقسام: علماء کہتے ہیں کہ وصیت کی تین قسمیں ہیں، واجب، حرام اور جائز۔

① واجب: اگر انسان کے اوپر قرض یا کسی اور شکل میں لوگوں کے حقوق ہیں تو اس کی ادائیگی کی وصیت کرنا واجب ہے۔ (ب) اگر اس کے اوپر کچھ شرعی واجبات و فرائض رہ گئے ہیں جیسے قسم کا کفارہ، حج یا اسی قسم کے دیگر فرائض جنہیں ورثاء ادا کرسکتے ہیں تو ان کی وصیت بھی ضروری ہے۔ (ج) بعض علماء کا خیال ہے کہ اگر کسی کے پاس وافر مقدار میں مال موجود ہے تو بعض ان رشتہ داروں کے لئے بھی کچھ مال کی وصیت کرکے جائے جن کا حق میراث میں نہیں ہے، ارشاد باری تعالی ہے، كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (۱۸۰)البقرہ) تم پر فرض کردیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی مرنے لگے اور مال چھوڑ جاتا ہو تو اپنے ماں باپ اور قرابت داروں کے لئے اچھائی کے ساتھ وصیت کرجائے، پرہیز گاروں پر یہ حق اور ثابت ہے۔

اس آیت میں خَيْرًا سے مراد وافر مقدار میں مال ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسر قرآن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آیت میراث سے والدین اور ہر وہ قرابت دار نکل گئے جن کا حق متعین ہے البتہ جن کا حق میراث متعین نہیں ہے ان کے بارے میں اس آیت کا حکم باقی ہے۔

(د) اسی طرح اگر ورثاء کی بے دینی کا خطرہ ہو اور قوی امید ہو کہ میرے بعد یہ لوگ غیر شرعی رسومات کا ارتکاب کریں گے اور دین کی پرواہ نہ کریں گے تو ایسی صورت میں بھی وصیت کردینی واجب ہے۔

② حرام: شریعت کے خلاف کی گئی وصیت حرام ہے اور اس کی تنفیذ بھی جائز نہیں ہے، مثلا کسی حرام کام کی وصیت یا ظلم و ناانصافی کی وصیت، یا اپنے مال میں سے ایک تہائی مال سے زیادہ کی

وصیت یہ سب وصیتیں حرام ہیں، چنانچہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بیوی یا ایک بیٹا باپ کی زیادہ خدمت کرتے ہیں اور دوسرا بیٹا نافرمان ہے تو فرمانبردار بیٹے اور اطاعت شعار بیوی کے لئے ان کے شرعاً مقرر حصے سے زیادہ کی وصیت کرنا حرام وصیت میں داخل ہے۔

اسی طرح نرینہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں اپنی بیٹی یا لے پالک بچے کو اپنے سارے مال کی وصیت کرنا بھی حرام وصیت میں داخل ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک مرد یا عورت ساٹھ سال تک اللہ کی اطاعت کرتے رہتے ہیں پھر جب موت کا وقت آتا ہے تو وصیت میں ظلم سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر آگ واجب ہو جاتی ہے۔ (ابو دواد: ۲۸۶۷، ترمذی: ۲۱۱۷)

③ جائز وصیت: اپنے مال میں سے کسی شخص کو کچھ دینے کی وصیت کر دے، یا کسی دینی ادارے کے لئے اپنی وفات کے بعد کوئی چیز وقف کر دے، یہ بھی ایک نیک کام اور وصیت کرنے والے کے لئے موت کے بعد بھی اجر و ثواب کا ذریعہ ہے، البتہ اس کے جواز کے لئے تین شرطیں ہیں ① ایک تہائی مال یا اس سے کم کی وصیت ہو۔ ② جس کے لئے وصیت کر رہا ہے اس کا وراثت میں کوئی حصہ نہ ہو۔ ③ اس وصیت سے ورثا کو ضرر پہنچانا مقصود نہ ہو۔

ثانیاً: صحابہ کرام وصیت لکھتے تو ابتداً اس طرح کرتے: بِسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم، یہ فلاں بن فلاں کی وصیت ہے جو "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحدَهٗ لَا شَرِیكَ لَهٗ: کی گواہی دے رہا ہے اور یہ بھی گواہی دے رہا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ کہ قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو قبروں سے اٹھائے گا، میں اپنے اہل و عیال کو اس بات کی وصیت کرتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیں آپس میں ایک ہو کر رہیں، اگر مومن ہیں تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہیں، اور میں انہیں ان باتوں کی وصیت کرتا ہوں جن کی وصیت حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام نے اپنے بیٹوں کو کی تھی، (مصنف عبد الرزاق، دارمی، دار قطنی وغیرہ) اس کے بعد جو وصیت کرنا چاہتا ہے لکھے۔

ثالثا: بہتر یہ ہے کہ وصیت لکھ کر رکھ دی جائے، اور اس پر گواہ بنالیا جائے، تاکہ کسی کو شبہ یا انکار کی گنجائش نہ رہے، جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی روایت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

رابعا: اگر غریب اور قلیل الایمان انسان ہے یا بچے زیادہ ہیں اور محتاج ہیں تو ایسے شخص کے لئے یہی بہتر ہے کہ اپنے مال کی وصیت نہ کرے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تیرا اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑنا انہیں مفلس چھوڑ جانے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ: مطلب یہ کہ اگر کوئی شخصیت وصیت کر کے فوت ہو جائے اور اس وصیت کو سننے والے یا جاننے والے اس پر عمل درآمد کرنے کی بجائے اسے تبدیل کرنے کی کوشش کریں، تو اس کا وبال وصیت میں تحریف کرنے والوں پر ہو گا، کیونکہ وصیت کرنے والا تو اپنا فرض ادا کر گیا، اب اس پر عملدرآمد کے وقت کمی بیشی کرنے والے گناہ گار ہوں گے۔ وصیت میں تبدیلی کی کئی ایک صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً مرنے والا کسی ایسے شخص کو کوئی حصہ دے گیا، جسے وارث پسند نہیں کرتے یا کسی کے کم حصے کو زیادہ یا زیادہ کو کم کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح اپنی طرف سے ردوبدل کرتے ہیں۔ تو وہ لوگ گناہ گار ہوں گے، کیونکہ جائز وصیت پر عمل نہیں کیا، وارثان کے حصص کی تقسیم وصیت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک نے بار بار تصریح کی ہے۔ (معالم العرفان)

إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ: بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے، وہ خوب خوب سنتا ہے کہ وصیت کرنے والے نے کیا وصیت کی، کس کے حق میں کتنی وصیت کی، سننے والوں نے اس وصیت کو کس قدر اہمیت دی اور انہوں نے اس وصیت کے مطابق کس قدر عمل کیا اور اس کے بعد ان لوگوں نے کس قدر اپنی طرف سے گڑبڑ کی۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ: اسی

طرح اگر کوئی وصیت کرنے والا وصیت صحیح طریقے سے نہیں کرتا، کسی کو حق سے زیادہ دے دیتا ہے اور کسی کو پورا حق بھی نہیں دیتا اور اس طرح پسماندگان میں تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے، تو اس نازک صورت حال کو دیکھتے ہوئے۔ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا جو شخص ڈر گیا۔ وصیت کرنے والے کے ایک طرف جھک جانے سے یا کسی گناہ کے ارتکاب سے فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ پس اس شخص نے فریقین میں صلح کرا دی فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ تو ایسے شخص پر کوئی گناہ نہیں۔ بعض اوقات کوئی بیٹا نافرمان ہوتا ہے اور وصیت کرنے والا اسے جائیداد سے محروم کرتا ہے، تو یہ بات غلط ہے اور کبیرہ گناہ ہے۔

وارث بننا ایک غیر اختیاری چیز ہے اور جو حصہ اللہ نے ورثاء کو دیا ہے، وہ نیکی بدی یا فرمانبرداری اور نافرمانی پر موقوف نہیں ہے، اس کا اچھا یا برا صلہ کسی اور طریقے سے دیا جا سکتا ہے، مگر وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ حق اسے اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے، ایسی ہی صورت میں فرمایا کہ اگر کوئی شخص درمیان میں آکر صلح کرا دے، تو یہ اچھی بات ہے اس سے دونوں کو فائدہ ہو گا، وارثان کو ان کا جائز حصہ مل جائے گا اور وصیت کرنے والا بھی سرخرو ہو گا، ایسی صورت میں اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو گئی ہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا، کیونکہ ان اللہ غفور رحیم بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (تفسیر معالم العرفان)

روزہ کی اہمیت اور تاریخی حیثیت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ {۱۸۳} البقرۃ)

جواب ترجمہ: مومنو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم پرہیز گار بنو۔

معاذ رضی اللہ عنہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ لَمْ يَزَلْ هَذَا مَشْرُوعًا

مِنْ زَمَانِ نُوحٍ إِلَى أَنْ نَسَخ اللّٰهُ ذٰلِكَ بِصِيَامِ شَهْرِ رَمَضَانَ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے ہر مہینہ میں تین روزوں کا حکم تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لئے بدلا اور ان پر اس مبارک مہینہ کے روزے فرض ہوئے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وَاللّٰهِ لَقَدْ كُتب الصِّيَامُ عَلَى كُلِّ أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ كَمَا كُتِبَ عَلَيْنَا شَهْرًا كَامِلًا، جس طرح ہم پر پورے ایک مہینے کے روزے فرض کیے گئے ہیں ،قسم بخدا! ہم سے پہلی امتوں پر بھی فرض کیے گئے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا صِيَامُ رَمَضَانَ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَى الْأُمَمِ قَبْلَكُمْ، رمضان کے روزے تم سے پہلے کی امتوں پر بھی فرض تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ كُتِبَ عَلَيْهِمْ إِذَا صَلَّى أَحَدُهُمُ الْعَتَمَةَ وَنَامَ حَرَّمَ [اللّٰهُ عَلَيْهِ الطَّعَامَ وَالشَّرَابَ وَالنِّسَاءَ إِلَى مِثْلِهَا (تفسیر ابن کثیر ج۱ ص ۴۹۷) پہلی امتوں کو یہ حکم تھا کہ جب وہ عشاء کی نماز ادا کرلیں اور سو جائیں تو ان پر کھانا پینا عورتوں سے مباشرت کرنا حرام ہو جاتا ہے۔

ہندو مت میں روزہ: مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ارکان اربعہ میں لکھتے ہیں کہ دنیا کے جن قدیم مذاہب وادیان اور تاریخ کے جن مذہبی قوانین ورسوم میں ہم کو روزہ ملتا ہے، ان قدیم ترین مذاہب میں ہندوستان کا ہندو مذہب بھی ہے، جس سے اس ملک کی بہت بڑی تعداد وابستہ ہے۔

اس مذہب کے ایک نمائندہ ٹی ایم پی جو مدراس یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے صدر بھی ہیں، ہندو مذہب اور ہندو سماج میں روزہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں، ان تہواروں میں جن کو سالانہ منایا جاتا ہے، بعض تہواروں روزہ (برت) کے لیے مخصوص ہیں، جو تزکیۂ نفس کے لیے رکھا جاتا ہے، ہر ہندو فرقہ نے دعاوعبادت کے لیے کچھ دن مقرر کر لیے ہیں، جن میں اکثر افراد روزہ رکھتے ہیں، کھانے پینے سے باز رہتے ہیں، رات رات بھر جاگ کر اپنی مذہبی کتابوں کی تلاوت کرتے

اور مراقبہ کرتے ہیں، ان میں سب سے اہم اور مشہور تہوار جو مختلف فرقوں میں رائج ہے ویکنتا ایکاوشی کا تہوار ہے، جو وشنو کی طرف منسوب ہے، لیکن اس میں صرف وشنو ہی کے ماننے والے نہیں بلکہ دوسرے بہت سے لوگ بھی روزہ رکھتے ہیں، اس تہوار میں وہ دن میں روزہ رکھتے ہیں اور رات کو پوجا کرتے ہیں۔ (آؤٹ لائن آف ہندوازم)

بعض دن ایسے ہیں جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں، وہ ان دیبیوں سے دعائیں کرتی ہیں، جو ایشور کی ان نسوانی صفات کا مظہر ہیں، جو مختلف اشکال میں ظاہر ہوئی ہیں، ان دونوں کو ان کی مخصوص اہمیت کے پیش نظر "برت" یا عہد و معاہدہ کہا جاتا ہے اور یہ روح کے تزکیہ کے لیے مخصوص ہیں اور ان کا مقصد روح کو معنوی غذا پہنچانا ہے۔ (آؤٹ لائن آف ہندوازم بحوالہ ارکان اربعہ ۲۵۱)

یہودی مذہب میں روزہ: مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے، عہدِ بابل میں روزہ ان کے نزدیک ماتم اور سوگ کا رمز بن گیا تھا، اگر کوئی خطرہ درپیش ہوتا یا کوئی کاہن کسی الہام اور نبوت کے لیے تیاری شروع کرتا تو اس وقت روزہ ضرور رکھا جاتا، یہودی اس وقت بھی عارضی طور پر روزہ رکھتے جب وہ سمجھتے کہ خدا ان سے ناراض یا بادشاہ کسی بڑی مہم پر روانہ ہوتے تب بھی روزہ رکھا جاتا۔

یہودی تقویم میں روزہ کے دن محدود اور قدیم ہیں، یہ اس کفارہ کے علاوہ ہیں جو موسوی مذہب میں واحد روزہ ہے، اس کے علاوہ ان کے ہاں "مسلسل روزہ" کے بھی موسم ہیں، جن کا تعلق قدیم حوادث اور واقعات سے ہے، مثلاً بابل کے عہد میں زمانۂ اسیری یہ چوتھے مہینہ (مئی) اور پانچویں مہینہ (جون) اور چھٹے مہینے تشری (جولائی) اور دسویں مہینہ تبت میں پڑتے ہیں، "تلمود" کے بعض عالموں کا خیال ہے کہ ان دنوں کے روزے عہدِ غلامی میں لازمی اور آزادی و خوشحالی کے زمانہ میں اختیاری ہیں۔ (ارکان اربعہ ص ۲۵۲)

ان روزوں کے علاوہ کچھ روزے اور بھی ہیں جو ان مختلف المناک حوادث کی یاد میں رکھے جاتے

ہیں جو یہودیوں کے ساتھ پیش آئے، یہ روزے بھی دوسرے روزوں کے ساتھ شامل کر لیے گئے ہیں، یہ لازمی اور جبری نہیں ہیں اور ان کو عوام میں زیادہ مقبولیت بھی حاصل نہیں ہو سکی، تھوڑے اختلاف کے ساتھ ان کی تعداد ۲۵ ہے۔ (ارکان اربعہ ص ۲۵۲)

ان کے علاوہ کچھ روزے اور ہیں جو مقامی اور علاقائی کہے جاسکتے ہیں، ان کا تعلق بھی یہودیوں کے تاریخی مصائب سے ہے، بہت سے روزے مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں، ہر طبقہ ایک مخصوص اور المناک تاریخی واقعہ کی یاد میں یہ روزہ رکھتا ہے، یا غمی خوشی کی تقریبات کی یادگار کے طور پر اس کو مناتا ہے، سال کے پہلے دن کا روزہ یہودیوں کے بہت سے طبقوں میں رائج ہے، بہت سے روزے یہودی عالموں کے اختیار میں ہیں، جو قحط سالی، کسی خطرہ اور مصیبت یا حکومت وقت کے ظالمانہ قوانین، نیز مختلف اور بلاؤں سے حفاظت کے لیے اپنی صوابدید پر وقتاً فوقتاً یہ روزے عوام پر فرض کرتے رہتے ہیں۔

کچھ انفرادی روزے بھی ہیں جن کو ہر شخص اپنے حالات اور ضروریات کے پیش نظر رکھ سکتا ہے، یہ روزے بھی شخصی واقعات کی یاد میں گناہوں کے کفارہ کے لیے یا کسی مصیبت اور افتاد کے وقت رحمتِ خداوندی کے حصول کے لیے رکھے جاتے ہیں، لیکن یہود کے علماء وفقہاء کے نزدیک یہ روزے اس شخص کے لیے ہیں جو خود عالم یا معلم نہ ہو، تاکہ اس کی جمعیت خاطر میں کوئی فرق نہ آنے پائے اور اس کی صحبت پر برا اثر نہ پڑے، نیز ڈراؤنا خواب بھی دیکھ کر روزہ رکھا جاتا ہے، عید کے مواقع پر یہودی شریعت میں روزہ رکھنا ممنوع ہے، لیکن "تلمود" نے ان دنوں میں روزہ رکھنے کی اجازت اس شرط پر دی ہے کہ عام دنوں میں اس کا کفارہ روزہ ہی کے ذریعہ ادا کیا جائے۔

روزہ یہودیوں میں اشراق کے وقت شروع ہوتا ہے اور رات کے پہلے تارہ کے طلوع تک جاری رہتا ہے، سوائے اس روزہ کے جو کفارہ کے لیے ہے (الیہودیہ والاسلام) اور مئی کے نویں روز رکھا جاتا ہے (یہ روزہ ہیکل کے پہلی یا دوسری بار جلانے کی یادگار میں رکھا جاتا ہے) یہ روزہ شام سے شام تک چلتا ہے، عام روزوں کے لیے کوئی خاص احکام و قوانین نہیں ہیں، روزہ میں صدقہ دینے

اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی بھی ترغیب دی گئی ہے، خصوصاًرات کے اس کھانے کی غرباء میں تقسیم پر جو معمولاً تیار کیا جاتا ہے زیادہ زور دیا گیا ہے۔(ارکان اربعہ)ماہ آب کے پہلے نو دن اور تموز کی ستر ہویں اور آب کی دسویں تاریخ کے درمیانی دن جزئی روزہ کے لیے مخصوص ہیں یعنی ان میں صرف گوشت کھانا اور شراب پینا منع ہے۔(جیوش انسائیکلوپیڈیا)

عیسائیوں میں روزہ: سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عیسائیوں میں روزہ کی حقیقت کیا ہے، اس کی تفصیل اور تشریح کچھ دشوار طلب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیحی شریعت فقہ اور احکام کے لحاظ سے دوسرے مذاہب سے پیچھے ہے، اس کے احکام و قوانین زمانہ کے ساتھ اور سیاسی واجتماعی عوامل کے اثر سے اکثر بدلتے رہے ہیں، اس لیے اس پر شریعت الٰہیہ کے لفظ کا اطلاق بہت مشکل ہے، تاہم اس کا مختصر خاکہ یہاں پیش کیا جارہا ہے، اس سے ان تغیرات کا بھی اندازہ ہوگا جو مختلف اوقات میں اس میں برابر ہوتے رہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی نبوت کے آغاز سے قبل ۴۰ دن روزہ رکھا تھا، وہ کفارہ کا روزہ تھا، جو موسوی شریعت میں فرض کے درجہ میں ہے، وہ اس کو اسی طرح پابندی کے ساتھ رکھتے تھے، جو کوئی مخلص یہودی رکھ سکتا ہے، انہوں نے روزہ کے کچھ احکام اپنے پیچھے نہیں چھوڑے، انہوں نے صرف اس کے اصول وکلیات بیان کیے اور اس کی تشریح و تطبیق کلیسا پر چھوڑ دی، چنانچہ عیسائیت میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ روزہ کے احکام و قوانین خود اس کے نکالے ہوئے ہیں، مسیحی مصادر میں "پولس" کے روزہ کا ذکر ملتا ہے، اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ پہلے زمانہ کے وہ عیسائی جو یہودی النسل تھے کفارہ کا روزہ برابر رکھتے تھے، راہب لیوک نے اس کا خاص اہمیت سے ذکر کیا ہے، لیکن وہ عیسائی جو دوسرے اصولوں کی طرف اپنا انتساب کرتے ہیں، اس پر زور نہیں دیتے۔

پولس کے انتقال کے ڈیڑھ سو سال بعد لوگوں میں روزہ کے قوانین کو ضبط میں لانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی، بہت سے راہب اور کلیسا کے ذمہ دار جنسی ترغیبات کے مقابلہ کے لیے بھی روزہ کی

تلقین کرتے تھے، اس زمانہ میں اس کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ روزہ کوئی ایسی خارجی چیز بن کر نہ رہ جائے، جو روزہ دار پر کوئی اثر نہ ڈال سکے، "ایرنیس" کا روزہ کے اقسام کے متعلق بیان ہے کہ روزہ ایک دن کا بھی ہوتا تھا اور دو دن کا بھی اور مسلسل ۴۰ گھنٹے کا بھی، یہ صورت حال مدتوں برقرار رہی، "دکھوں اور صلیب کے جمعہ" کا روزہ ایک عوامی اور مقبول روزہ تھا، جو دوسری صدی مسیحی میں بعض ممالک میں رائج تھا، اسی طرح جو لوگ بپتسمہ کے خواہش مند ہوتے تھے وہ بھی ایک دن یا دو دن کا روزہ رکھتے تھے اور اس میں بپتسمہ کرنے اور کرانے والے دونوں شریک ہوتے تھے۔

عیسائیوں کے مختلف فرقوں میں روزہ کے طریقہ اور احکام کے معاملہ میں جزئی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں (انسائیکلوپیڈیا مذاہب واخلاق) روزہ کی تنظیم اور قانون سازی کا سب سے زیادہ کام دوسری اور پانچویں صدی مسیحی کے درمیانی وقفہ میں انجام پایا، اس وقت کلیسا نے بعض احکام اور ہدایات پر مشتمل ایک بیان شائع کیا، چوتھی صدی مسیحی میں روزہ میں تشدد اور سختی کا عنصر بہت بڑھ گیا اور اس سے توسع، نرمی اور لچک کی خاصیت جاتی رہی، ایسٹر (عید الفصح) سے قبل دو دن روزے کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے، ان دنوں کا روزہ نصف شب کو ختم ہوتا تھا، بیماروں کو جوان دنوں میں روزہ رکھنے سے معذور تھے، سنیچر کو روزہ رکھنے کی اجازت تھی، تیسری صدی مسیحی میں روزہ کے دن مقرر کیے گئے، روزہ کے اختتام پر بھی بہت اختلاف تھا، بعض لوگ مرغ کی بانگ پر افطار کرتے تھے اور بعض لوگ تاریکی اچھی طرح پھیل جانے پر۔

چالیس دن کے روزہ کا کوئی سراغ چوتھی صدی مسیحی تک ہم کو نہیں ملتا، مختلف ممالک کی آب وہوا، ماحول اور طرزِ زندگی بھی روزہ پر اثر انداز تھا، چنانچہ رومیوں کا روزہ "اسکندریہ" اور "لامان" کے روزہ سے مختلف ہوتا تھا، بعض لوگ جانوروں کے گوشت سے پرہیز کرتے تھے، بعض اس کو جائز سمجھتے تھے، کچھ لوگ صرف مچھلی اور پرندوں کے گوشت پر اکتفا کرتے تھے، بعض لوگ انڈے اور پھلوں سے پرہیز کرتے تھے، کچھ صرف روکھی روٹی کھاتے تھے اور بعض لوگ ان سب چیزوں

کو ناجائز سمجھتے تھے، بعد میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے اہم واقعات اور مسیحی تاریخ کی روشنی میں مختلف روزے تجویز ہوئے جو مرورِ زمانہ کے ساتھ اپنی شکل بدلتے رہے، اس کے علاوہ ملکوں کے اختلاف کے لحاظ سے روزے بھی زیادہ تر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے۔

عہدِ اصلاح کے بعد انگلستان کے کلیسا نے روزے کے دن تو مقرر کیے، لیکن روزہ کے آداب واحکام اور حدود و قوانین روزہ دار کے ضمیر اور احساس ذمہ داری پر چھوڑ دیے گئے، البتہ ایڈورڈ ششم جیمس اول اور الزبتھ کے عہد میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے روزہ کے دنوں میں گوشت خوری ممنوع قرار دے دی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ مچھلیوں کے شکار اور بحری تجارت کی ہمت افزائی اور اس سے نفع اندوزی ضروری ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجیس، بحوالہ ارکان اربعہ)

مصریوں اور یونانیوں کا روزہ: قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے، یونان میں صرف عورتیں "تھسموفیریا" کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی تھیں۔ (انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا بحوالہ سیرت النبی ﷺ)

پارسیوں کا روزہ: پارسی مذہب میں گو عام پیروؤں پر روزہ فرض نہیں، لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے یہاں موجود تھا، خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لیے تو پنجسالہ روزہ ضروری تھا۔ (سیرت النبی ﷺ ج ۵) ان نگارشات سے اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ ہر مذہب میں کسی نہ کسی شکل میں روزہ جیسی عبادت موجود ہے، ان مذاہب کے پیروکار اپنے اپنے طریقے پر انجام دیتے ہیں۔

اسلام میں روزہ: اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا اور اس میں جو سہولتیں پیدا کیں وہ حسب ذیل ہیں ① سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے ان میں اکثر روزہ صرف پیروؤں کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا، مثلاً ہندوؤں میں غیر برہمن کے لیے کوئی روزہ ضروری نہیں، پارسیوں کے یہاں صرف دستور اور پیشوا کے لیے روزہ ہے، یونانیوں میں صرف

عورتوں کے لیے روزہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروانِ مذاہب کے لیے برابر طور سے ضروری ہے۔ اسلام میں پیشوا اور غیر پیشوا، عورت، مرد، کی کوئی تخصیص نہیں، اس نے تمام پیروؤں کو عام حکم دیا اور اس میں کسی چیز کی کوئی تخصیص نہیں کی، اس مہینے میں جو موجود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔ (سیرت النبی ﷺ علامہ سلیمان ندوی)

② اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شمسی سال معتبر ہے، شمسی سال میں روزہ کی جو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی، ان میں تغیر و تبدل ناممکن ہے، اس بناپر اگر گرمی یا سردی کے موسم میں چھوٹے یا بڑے دنوں میں واقع ہوتے ہیں تو یا تو وہ مختلف ملکوں میں ہمیشہ کے لیے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لیے آرام دہ ہیں، اسلام کے روزوں کی تاریخیں قمری مہینوں سے ہیں جو موسم اور چھوٹے بڑے دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، اس سے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک میں ہر موسم میں آتا ہے اور اس بناء پر اس کی سختی نرمی بدلتی رہتی ہے۔

③ جہاں تک دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا ہے روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالت انسانی کی تخصیص واستثناء نظر سے نہیں گزری، تورات میں تو یقیناً مذکور نہیں، بلکہ یہاں تک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو وہ کٹ جائے گا یا قتل ہو جائے گا، بلکہ یہ ہے کہ اس پردیسی پر بھی روزہ فرض ہو گا جو گو یہودی نہیں مگر یہودیوں کے پاس آکر رہا ہو۔ (احبار)

لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور و مجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا، بچے مستثنیٰ ہیں، عورتیں ایام حمل ورضاعت میں اور دیگر مخصوص ایام میں روزہ سے مستثنیٰ ہیں، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرتاً قادر نہیں مستثنیٰ ہیں، بیمار و مسافر اور عارضی معذور، بیماری، حالت سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنوں کی قضا بعد کو رکھیں اور جو دائمی طور سے معذور ہیں وہ روزہ کی بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ (سیرت النبی ۵)

④ اور مذہبوں میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے، یا تو چالیس چالیس روز کا فاقہ تھا، یا روزہ کے

دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام میں اس میں بھی توسط اختیار کیا، یعنی روزہ کے اوقات میں گوہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا، مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی۔

⑤ جنیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے، یہودیوں کے ہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا، اسلام نے صبح سے شام تک کا روزہ قرار دیا۔ (سیرت النبی ﷺ)

⑥ یہودیوں کے ہاں یہ روزہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھالیتے، پھر نہیں کھاسکتے تھے یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہوجاتا، عرب میں رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھالیتے سو کھالیتے، سوجانے کے بعد کھانا، پھر ناجائز تھا، ابتداً اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا، ایک دفعہ رمضان کا مہینہ تھا ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا تیار نہیں ہوا تھا، ان کی بیوی کھانا پکارہی تھی، وہ انتظار کرتے کرتے سوگئے، کھانا پک چکا تو ان کی بیوی کھانا لے کر آئیں وہ سوچکے تھے، اس لیے کھانا نہیں کھاسکتے تھے، دوسرے دن پھر روزے کا دن تھا، ان کو غش آگیا، اس پر یہ آیت اتری وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہوجائے۔ (سورۃ البقرہ ۱۸۷)

⑦ جاہلیت میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی علیحدہ رہتے تھے، لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہوکر نفسانی خیانت کے مرتکب ہوجاتے تھے، اس لیے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لیے یہ ممانعت محدود کردی اور رات کو اجازت دے دی أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ (سورۃ البقرہ ۱۸۷) روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت تمہارے لیے حلال کی

گئی، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی، خدا جانتا ہے کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے، تو اس نے معاف کیا، اب بیویوں سے جاملو، اور خدا نے تمہارے مقدر میں جو کچھ رکھا ہے (یعنی اولاد) اس کی تلاش کرو۔

⑧ بھول چوک اور خطاء ونسیان اسلام میں معاف ہے، اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو بھول کر کھائے یا پیے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کہ یہ تو خدا کی روزی ہی تھی (ترمذی)

⑨ اسی طرح ان افعال سے جو گو روزہ کے منافی ہیں، لیکن قصداً سرزد نہیں ہوئے، بلاارادہ از خود سرزد ہوئے ہیں، روزہ نہیں ٹوٹتا، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو قے ہو گئی یا سوتے میں غسل کی ضرورت پیش آگئی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (ابوداؤد)

⑩ یہودیوں میں اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار اور غم کی علامت تھے، اس لیے روزہ کی حالت میں وہ زیب وزینت نہیں کرتے تھے اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں، کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنا لگا، اور منہ دھو، تاکہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکارہ تجھے بدلہ دے۔ (متی)

اسلام میں روزہ کی اصل خوبی یہی ہے، اس لیے روزہ کی حالت میں سر میں تیل لگانا، سرمہ ڈالنا، خوشبو ملنا اسلام میں روزہ کے منافی نہیں، منہ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے، اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار، ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نمائش کر کے ریا میں گرفتار نہ ہو اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں اور خدا کے اس حکم کے بجالانے میں نہایت تکلیف، مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے، بلکہ ہنسی، خوشی رضامندی اور

مسرّت ظاہر ہو۔

⑪ روزہ دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ عام افراد امت کو اس میں غلو اور تعمق سے بازر کھا جائے، خود آنحضرت ﷺ اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے، مہینوں میں کچھ دن مقرر تھے، ہفتوں میں بھی کچھ دن مقرر تھے، ان کے علاوہ کبھی کبھی رات کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے، لیکن دوسرے روزوں کو صرف استحباب تک رکھا اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی، بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا: تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے (یعنی روحانی غذا) لوگوں نے اصرار کیا، تو آپ ﷺ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کیے، جب مہینہ گزر گیا تو بطور سرزنش کے فرمایا کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا تو میں اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا۔ (سیرت النبی ﷺ)

روزے میں تبدیلیاں: پہلی تبدیلی: جب نبی ﷺ مدینہ میں آئے تو ہر مہینہ میں تین روزے رکھتے تھے اور عاشورہ کا روزہ رکھا کرتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ، نازل فرما کر رمضان کے روزے فرض کئے۔ (البقرہ)

دوسری تبدیلی: دوسرا ابتدائی حکم یہ تھا کہ جو چاہے روزہ رکھے جو چاہے نہ رکھے اور فدیہ دے دے پھر یہ آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (البقرہ ۱۸۵) تم میں سے جو شخص رمضان کے مہینے میں اقامت کی حالت میں ہو وہ روزہ رکھا کرے پس جو شخص مقیم ہو مسافر نہ ہو تندرست ہو بیمار نہ ہو اس پر روزہ رکھنا ضروری ہو گیا ہاں بیمار اور مسافر کے لئے رخصت ملی اور ایسا بوڑھا جو روزے کی طاقت ہی نہ رکھتا ہو اسے بھی رخصت دی گئی۔

تیسری تبدیلی: تیسری حالت یہ ہے کہ ابتداء میں کھانا پینا عورتوں کے پاس آنا سونے سے پہلے پہلے جائز تھا سو گیا تو پھر گو رات کو ہی جاگے لیکن کھانا پینا اور جماع اس کے لئے منع تھا پھر قیس بن صرمہ رضی اللہ عنہ نامی ایک انصاری صحابی دن بھر کام کاج کر کے رات کو تھکے ہارے گھر آئے عشاء کی نماز ادا کی اور

نیند آگئی دوسرے دن کچھ کھائے پیئے بغیر روزہ رکھا لیکن حالت بہت نازک ہوگئی حضور ﷺ نے پوچھا کہ مَالِی أَرَاكَ قَدْ جَهِدْتَ جَهْدًا شَدِيدًا؟ یہ کیا بات؟ میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ تو نے بہت زیادہ مشقت اٹھائی ہے۔

تو انہوں نے سارا واقعہ کہہ دیا، ادھر یہ واقعہ تو ان کے ساتھ ہوا ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سو جانے کے بعد اپنی بیوی صاحبہ سے مجامعت کر لی اور حضور ﷺ کے پاس آکر حسرت و افسوس کے ساتھ اپنے اس قصور کا اقرار کیا جس پر آیت أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ (البقرہ ۱۸۷) یہاں سے لے کر ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ تک نازل ہوئی اور مغرب کے بعد سے لے کر صبح صادق کے طلوع ہونے تک رمضان کی راتوں میں کھانے پینے اور مجامعت کرنے کی رخصت دے دی گئی۔

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ كَانَ عَاشُورَاءُ يُصَامُ، فَلَمَّا نَزَلَ فَرْضُ رَمَضَانَ كَانَ مَنْ شَاءَ صَامَ وَمَنْ شَاءَ أَفْطَرَ، پہلے عاشورہ کا روزہ رکھا جاتا تھا، جب رمضان کی فرضیت نازل ہوئی تو اب ضروری نہ رہا جو چاہتا رکھ لیتا جو نہ چاہتا نہ رکھتا۔ (تفسیر ابن کثیر ۱)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی یہ مروی ہے۔ آیت وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (البقرہ ۱۸۴) کا مطلب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں جو چاہتا روزہ رکھتا جو چاہتا نہ رکھتا اور ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا۔ (ابن کثیر ج ۱ ص ۴۹۹)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے بھی صحیح بخاری میں ایک روایت آئی ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت جو شخص چاہتا افطار کرتا اور فدیہ دے دیتا یہاں تک کہ اس کے بعد کی آیت اتری اور یہ منسوخ ہوئی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی اسے منسوخ کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ منسوخ نہیں مراد اس سے بوڑھا مرد اور بڑھیا عورت ہے جسے روزے کی طاقت نہ ہو۔ بہر حال ان ارشادات اور فرمودات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رب العالمین نے اس امت مرحومہ پر مہربانی

کرتے ہوئے تدریجاً روزے میں تبدیلیاں کی ہیں، تاکہ ان کے لیے سہولت رہے اور یہ کسی قسم کی مشقت اور تکلیف میں نہ پڑیں۔

مسافر اور مریض کے لیے روزہ نہ رکھنے کی اجازت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

أَيَّاماً مَّعْدُودَاتٍ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضاً أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْراً فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُواْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ {۱۸۴} البقرہ

جواب ترجمہ: گنتی کے چند روز پھر جو کوئی تم میں سے بیمار یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرلے اور ان پر جو اس کی طاقت رکھتے ہیں فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا پھر جو کوئی خوشی سے نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

مریض کا روزہ: اللہ تعالیٰ نے مریض کو بیماری کی حالت میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی ہے، یہ بات یاد رہے کہ مریض سے مراد معمولی سے مرض والا مریض نہیں ہے بلکہ مریض سے مراد وہ مریض ہے جس کو روزہ رکھنے سے ناقابل برداشت تکلیف پہنچے یا مرض بڑھ جانے کا قوی اندیشہ ہو، اس لیے کہ اللہ مہربان ذات ہے وہ اپنے ایمان دار بندوں کے ساتھ آسانی کرتا ہے، مشکل کا ارادہ نہیں کرتا، جیسا کہ اس کے بعد اللہ نے واضح بھی فرمادیا ہے، جمہور فقہاء کرام کا یہی مسلک ہے۔

مسافر کا روزہ: حضرت مفتی شفیعؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں اَوْ عَلٰی سَفَرٍ یہاں لفظ مسافر کے بجائے علیٰ سفر کا لفظ اختیار فرما کر کئی مسائل کی طرف اشارہ فرمادیا۔ اول یہ کہ مطلقاً لغوی سفر یعنی اپنے گھر اور وطن سے باہر نکل جانا روزہ میں رخصت سفر کے لئے کافی نہیں بلکہ سفر کچھ طویل ہونا چاہئے کیونکہ لفظ عَلٰی سَفَرٍ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ سفر پر سوار ہو جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر سے دس پانچ میل چلے جانا مراد نہیں مگر یہ تحدید کہ سفر کتنا طویل ہو قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں رسول اللہ

ﷺ کے بیان اور صحابہ کے تعامل سے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور بہت سے فقہاء نے اس کی مقدار تین منزل یعنی وہ مسافت جس کو پیادہ سفر کرنے والا بآسانی تین روز میں طے کر سکے قرار دی ہے اور بعد کے فقہاء نے میلوں کے حساب سے اڑتالیس میل لکھے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اسی لفظ عَلٰی سَفَرٍ سے یہ نکلا کہ وطن سے نکل جانے والا مسافر اسی وقت تک رخصت سفر کا مستحق ہے جب تک اس کے سفر کا سلسلہ جاری رہے اور یہ ظاہر ہے کہ آرام کرنے یا کچھ کام کرنے کے لئے کسی جگہ ٹھہر جانا مطلقاً اس کے سلسلہ سفر کو ختم نہیں کر دیتا جب تک کوئی معتدبہ مقدار قیام نہ ہو اور اسی معتدبہ قیام کی مدت نبی کریم ﷺ کے بیان سے ثابت ہوئی کہ پندرہ دن ہیں جو شخص کسی ایک مقام پر پندرہ دن ٹھرنے کی نیت کرے تو وہ عَلٰی سَفَرٍ نہیں کہلاتا اس لئے وہ رخصت سفر کا بھی مستحق نہیں۔

مسئلہ: اسی سے یہ بھی نکل آیا کہ کوئی شخص پندرہ دن کے قیام کی نیت ایک جگہ نہیں بلکہ متفرق مقامات شہروں اور بستیوں میں کرے تو وہ بدستور مسافر کے حکم میں رہ کر رخصت سفر کا مستحق رہے گا، کیونکہ وہ عَلٰی سَفَرٍ کی حالت میں ہے۔ (معارف القرآن ج ۱)

روزہ کی قضا: حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ یعنی مریض و مسافر کو اپنے فوت شدہ روزوں کی گنتی کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھنا واجب ہے اس میں بتلانا تو یہ منظور تھا کہ مرض یا سفر کی مجبوری سے جو روزے چھوڑے گئے ہیں ان کی قضاء ان لوگوں پر واجب ہے جس کے لئے فعلیه القَضَاءُ کا مختصر جملہ بھی کافی تھا مگر اس کے بجائے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ مریض و مسافر پر فوت شدہ روزوں کی قضاء صرف اس صورت میں واجب ہو گی جب کہ مریض صحت کے بعد اور مسافر مقیم ہونے کے بعد اتنے دنوں کی مہلت پائے جنہیں قضاء کر سکے تو اگر کوئی شخص اتنے دن سے پہلے ہی مر گیا تو اس پر قضاء یا وصیتِ فدیہ لازم نہیں ہو گی۔ (معارف)

مسئلہ: عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ میں چونکہ اس کی کوئی قید نہیں کہ ترتیب وار رکھے یا غیر مسلسل رکھے بلکہ

عام اختیار ہے اس لئے اگر کوئی شخص جس کے رمضان کے ابتدائی دس روزے قضا ہو گئے ہوں وہ دسویں یا نویں روزے کی قضا پہلے کرے اور ابتدائی روزوں کی قضا بعد میں تو اس میں بھی مضائقہ نہیں اسی طرح متفرق کر کے قضا روزے رکھے تو یہ بھی جائز ہے کیوں کہ عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ میں اس کی گنجائش ہے۔ (معارف القرآن ج ۱)

روزہ کا فدیہ: حضرت مفتی شفیعؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ اس آیت کے بے تکلف معنی ہیں کہ جو لوگ مریض یا مسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں بلکہ روزے کی طاقت تو رکھتے ہیں مگر کسی وجہ سے دل نہیں چاہتا تو ان کے لئے بھی یہ گنجائش ہے کہ وہ روزے کے بجائے روزے کا فدیہ بصورت صدقہ ادا کر دیں اس کے ساتھ اتنا فرما دیا وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ ہی رکھو۔

یہ حکم شروع اسلام میں تھا جب لوگوں کو روزے کا خوگر کرنا مقصود تھا اس کے بعد جو آیت آنے والی ہے یعنی مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ اس سے یہ حکم عام لوگوں کے حق میں منسوخ کر دیا گیا صرف ایسے لوگوں کے حق میں اب بھی باجماع امت باقی رہ گیا جو بہت بوڑھے ہوں (جصاص) یا ایسے بیمار ہوں کہ اب صحت کی امید ہی نہیں رہی جمہور صحابہ و تابعین کا یہی قول ہے (جصاص، مظہری

صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد، نسائی، ترمذی، طبرانی وغیرہ تمام ائمہ حدیث نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ نازل ہوئی تو ہمیں اختیار دے دیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزے رکھے جس کا جی چاہے ہر روزے کا فدیہ دیدے پھر جب دوسری آیت مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نازل ہوئی تو یہ اختیار ختم ہو کر طاقت والوں پر صرف روزہ ہی رکھنا لازم ہو گیا۔ (معارف القرآن ۱)

فدیہ کی مقدار: ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گندم یا اس کی قیمت ہے، نصف صاع ہمارے مروّجہ اسی (۸۰) تولہ کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر ہوتے ہیں اس کی بازاری قیمت معلوم کر کے کسی

غریب مسکین کو مالکانہ طور پر دیدینا ایک روزہ کا فدیہ ہے بشرطیکہ کسی مسجد مدرسہ کی خدمت کے معاوضہ میں نہ ہو۔

مسئلہ: ایک روزہ کے فدیہ کو دو آدمیوں میں تقسیم کرنا یا چند روزوں کے فدیہ کو ایک ہی شخص کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں جیسا کہ شامی نے بحوالہ بحر از قنیہ نقل کیا ہے۔ اور بیان القرآن میں اسی کو نقل کیا گیا ہے مگر حضرت (تھانویؒ) نے امداد الفتاوٰی میں فتویٰ اس پر نقل کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ شامی نے بھی فتویٰ اس پر نقل کیا ہے البتہ امداد الفتاوٰی میں ہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ کئی روزوں کا فدیہ ایک تاریخ میں ایک کو نہ دے لیکن دے دینے میں گنجائش بھی ہے۔

مسئلہ: اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو وہ فقط استغفار کرے اور دل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کروں گا۔ (بیان القرآن، بحوالہ معارف القرآن مفتی شفیعؒ ج ۱)

مسئلہ: مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ رمضان سے قبل ادا کرنے سے فدیہ ادا نہ ہو گا، البتہ رمضان شروع ہونے کے بعد آئندہ ایام کا فدیہ ایک ساتھ دے سکتے ہیں۔ (احسن الفتاویٰ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان والے بندوں کے لیے آسانی کی ہے، وہ اگر صحت مند ہیں تو روزے رکھیں، ہلکی پھلکی بیماری روزے کے لیے اور روزہ اس کے لیے نقصان دہ نہیں ہے، لیکن جب بیماری شدید ہو جائے تو اس میں انہیں اجازت دی گئی ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں بعد میں جب صحت یاب ہو جائیں تو رکھ لیں، اگر عمر کے اس حصے میں جا پہنچے کہ اب منزل ہی پر جا کر دم لیں گے تو ایسی صورت میں فدیہ دے دیا جائے، جس کے مسائل علماء امت نے بیان فرمائے ہیں۔

روزے کا مقصد

سوال روزہ رکھنے کا اہم ترین مقصد کیا ہے؟

جواب روزہ رکھنے کا یک اہم ترین مقصد اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمادیا ہے کہ تمہیں متقی اور

پرہیز گار بنانا مقصود ہے، اس کی تفصیل میں علماء امت نے اپنے اپنے انداز میں تفصیل سے بات کی ہے، امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں، اما ابن قیم جوزی رحمہ اللہ نے اپنی مختلف تحریروں میں اور دیگر مفسرین کرام نے اپنی اپنی تفاسیر میں اس پر خوب احسن انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ اپنی کتاب احیاء علوم الدین میں روزے کے اسرار ورموز پر تحریر فرماتے ہیں کہ

أَنَّ المَقصُودَ مِنَ الصَّومِ اَلتَّخَلُّقُ بِخُلُقٍ مِّن أَخلَاقِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَهوَ الصَّمَدِيَّةُ و الإِقتِدَاءُ بِالمَلَائِكَةِ فِی الكَفِّ عَنِ الشَّهوَاتِ بِحَسبِ الإِمكَانِ فَإِنَّهم مُنَزَّهُونَ عَنِ الشَّهَوَاتِ وَالإِنسَانُ رُتبَتُهُ فَوقَ رُتبَةِ البَهَائِمِ لِقُدرَتِهِ بِنُورِ العَقلِ عَلَى كَسرِ شَهوَتِه وَدُونَ رُتبَةِ المَلَائِكَةِ لِاستِيلَاءِ الشَّهوَاتِ عَلَيهِ وَ كَونُهُ مُبتَلى بِمُجَاهِدَتِهَا فَكُلَّمَا اِنهَمَكَ فِی الشَّهوَاتِ اِنحَطَّ إِلى أَسفَلِ السَّافِلِينَ وَالتَحَقَ بِغِمَارِ البَهَائِمِ وَكلَّمَا قَمَعَ الشَّهواتِ ارتَفَعَ إِلى أَعلىٰ عِلِّيِينَ وَالتَحَقَ بِأُفُقِ المَلَائِكَةِ (احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۲۳۶)

روزے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے اخلاق میں سے ایک اخلاق کا عکس اپنے اندر پیدا کرے، جسے صمدیت کہتے ہیں، امکانی حد تک فرشتوں کی پیروی کرتے ہوئے شہوات سے بچے، اس لیے کہ فرشتے شہوات سے پاک ہیں اور انسان کا مرتبہ اور مقام جانوروں کے مرتبہ اور مقام سے بلند ہے، اس لیے کہ اسے عقلی نور پر قدرت دی گئی ہے، اسے خواہشات کو توڑنے کی قدرت سے نوازا گیا ہے، البتہ وہ فرشتوں سے اس لحاظ سے کم رتبے والا ہے کہ خواہشات اس پر اکثر غلبہ پالیتی ہیں، اسے ان خواہشات سے بڑے مجاہدے کے ساتھ آزادی ملتی ہے، چنانچہ جب وہ اپنی خواہشات کی رو میں بہنے لگتا ہے تو اسفل السافلین میں جا پہنچتا ہے، اور جانوروں کے ریوڑ سے جاملتا ہے اور جب اپنی خواہشات کا قلع قمع کرتا ہے، انہیں توڑتا ہے تو پھر اعلیٰ علیین تک پہنچ جاتا ہے اور فرشتوں کے آفاق تک پہنچ جاتا ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چونکہ فرشتے اللہ کے مقرب ہوتے ہیں اور جو بھی ان کی پیروی کرے گا وہ اللہ کا مقرب ہو جائے گا۔

علامہ ابن القیم جوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں لَمَّا كَانَ الْمَقْصُودُ مِنَ الصِّيَامِ حَبْسَ النَّفْسِ عَنِ الشَّهَوَاتِ، وَفِطَامَهَا عَنِ الْمَأْلُوفَاتِ، وَتَعْدِيلَ قُوَّتِهَا الشَّهْوَانِيَّةِ، لِتَسْتَعِدَّ لِطَلَبِ مَا فِيهِ غَايَةُ سَعَادَتِهَا وَنَعِيمِهَا، وَقَبُولِ مَا تَزْكُو بِهِ مِمَّا فِيهِ حَيَاتُهَا الْأَبَدِيَّةُ، وَيَكْسِرُ الْجُوعُ وَالظَّمَأُ مِنْ حِدَّتِهَا وَسَوْرَتِهَا، وَيُذَكِّرُهَا بِحَالِ الْأَكْبَادِ الْجَائِعَةِ مِنَ الْمَسَاكِينِ وَتُضَيِّقُ مَجَارِيَ الشَّيْطَانِ مِنَ الْعَبْدِ بِتَضْيِيقِ مَجَارِي الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ، وَتُحْبَسُ قُوَى الْأَعْضَاءِ عَنِ اسْتِرْسَالِهَا لِحُكْمِ الطَّبِيعَةِ فِيمَا يَضُرُّهَا فِي مَعَاشِهَا وَمَعَادِهَا،

وَيُسَكِّنُ كُلَّ عُضْوٍ مِنْهَا وَكُلَّ قُوَّةٍ عَنْ جِمَاحِهِ وَتُلْجِمُ بِلِجَامِهِ، فَهُوَ لِجَامُ الْمُتَّقِينَ، وَجُنَّةُ الْمُحَارِبِينَ، وَرِيَاضَةُ الْأَبْرَارِ وَالْمُقَرَّبِينَ، وَهُوَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ مِنْ بَيْنِ سَائِرِ الْأَعْمَالِ، فَإِنَّ الصَّائِمَ لَا يَفْعَلُ شَيْئًا، وَإِنَّمَا يَتْرُكُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ وَشَرَابَهُ مِنْ أَجْلِ مَعْبُودِهِ، فَهُوَ تَرْكُ مَحْبُوبَاتِ النَّفْسِ وَتَلَذُّذَاتِهَا إِيثَارًا لِمَحَبَّةِ اللَّهِ وَمَرْضَاتِهِ، وَهُوَ سِرٌّ بَيْنَ الْعَبْدِ وَرَبِّهِ لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ سِوَاهُ، وَالْعِبَادُ قَدْ يَطَّلِعُونَ مِنْهُ عَلَى تَرْكِ الْمُفْطِرَاتِ الظَّاهِرَةِ، وَأَمَّا كَوْنُهُ تَرَكَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ وَشَهْوَتَهُ مِنْ أَجْلِ مَعْبُودِهِ، فَهُوَ أَمْرٌ لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ بَشَرٌ، وَذَلِكَ حَقِيقَةُ الصَّوْمِ،

روزوں سے مقصود نفس انسانی کو شہوات سے روکنا ہے، نفس کی محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو چھڑانا ہے، اس کی شہوانی قوتوں میں اعتدال پیدا کرنا ہے، تاکہ وہ اس طرح سے سعادتوں اور نعمتوں کے حصول تک رسائی کر سکے اور دائمی زندگی کو حاصل کرنے کے لیے اپنے نفس کو پاک کر سکے، بھوک اور پیاس سے اس کی ہوس کی تیزی اور شہوت کی گرمی میں کمی واقع ہو سکے، اسے روزہ رکھنے کی وجہ سے یہ بات یاد آئے کہ کتنے ہی مسکین لوگ ایسے ہیں جن کے جگر بھوکے ہیں، وہ شیطانی گزرگاہوں کو کھانے پینے کی گزرگاہوں کے ذریعے سے تنگ کر دے، وہ اعضاء اور جوارح کو ان چیزوں کی طرف مائل ہونے سے روک دے، جن میں کہ اس کی دنیا اور اس کی آخرت دونوں ہی کا نقصان ہے، ہر عضو کو اس سے سکون دیا جائے، ہر قوت کو اس کی سرکشی سے بچائے، اس سرکش کو لگام دی جائے، وہ لگام

اہل تقویٰ کی ہے، مجاہدین کی ڈھال ہے، نیکوکاروں اور اللہ کے مقربین کی ریاضت ہے، روزہ داران تمام اعمال کے درمیان میں صرف رب العالمین کے لیے ہو جائے، روزہ دار کچھ بھی نہیں کر سکتا، وہ اپنی شہوت، اپنے کھانے، اپنے پینے، کو اپنے معبود کے لیے چھوڑ دیتا ہے، وہ نفس کی محبوب اور مرغوب چیزوں کو اللہ کی محبت کو ترجیح دیتے ہوئے، اس کی رضا کی خاطر چھوڑ دیتا ہے، یہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان ایک راز ہوتا ہے، جس پر اس کے سوا کوئی مطلع نہیں ہوتا، اللہ کے بندے تو ظاہری روزہ توڑنے والی چیزوں سے آگاہ ہوتے ہیں، مگر اس کا کھانا چھوڑنا، اس کا پانی کو چھوڑنا، اس کا اپنے معبود کی خاطر شہوت کو چھوڑنا یہ ایسا کام ہے جس پر کوئی انسان مطلع نہیں ہو سکتا اور یہی روزے کی حقیقت ہے۔ (زاد المعاد فی ھدی خیر العباد ۲/ ۲۷)

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ روزہ ظاہری اعضاء اور باطنی قوتوں کی حفاظت میں بڑی تاثیر رکھتا ہے، خراب مادہ کے جمع ہو جانے کی وجہ سے انسان میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان سے وہ اس کی حفاظت کرتا ہے، جو چیزیں صحت کے لیے رکاوٹ ہیں ان کو باہر نکال دیتا ہے، انسانی اعضاء میں جو خرابیاں ہوئی وہوس کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں وہ روزے کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں، روزہ صحت والی زندگی کے لیے فائدہ مند اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے میں بہت ہی مددگار ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں روزے کا مقصد بیان فرمایا کہ اس کی وجہ سے تم متقی بن جاؤ گے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ روزہ ڈھال ہے، چنانچہ ایسا آدمی جسے نکاح کی خواہش ہو اور وہ نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو اسے روزے رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اس کو اس کا تریاق قرار دیا گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ روزہ کی مصلحتیں اور فائدے چونکہ عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کی رو سے تسلیم شدہ تھے اس لیے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی حفاظت کی خاطر محض اپنی رحمت اور احسان سے فرض کیا ہے۔ (زاد المعاد فی ھدی خیر العباد ج ۲ ص ۲۸)

قرآنی تعلیمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں پتا چلتا ہے کہ روزے کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ

① اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان کو رشد وہدایت کی دولت سے مالامال کیا ہے، اس لیے اسے بجا طور پر اللہ کی بڑائی اور عظمت کو ظاہر کرنا چاہیے۔

② اللہ تعالیٰ نے انسان کو بیش بہا نعمتوں سے مالامال اور سرشار کیا ہے، اس لیے اسے چاہیے کہ رب العالمین کی ان عطاء ونوازشات پر اس کا شکر ادا کرے۔

③ رب العالمین روزے کی فرضیت کا فلسفہ جو از خود ذکر فرمایا ہے وہ یہی ہے کہ انسان متقی اور پرہیز گار بن جائے۔ تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی ہے اور نیک باتوں کی طرف اسے بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے، روزے سے مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو۔ (سیرت النبی ﷺ ج ۵ ص ۱۶۶)

روزے کے اسرار ورموز: حضرت امام غزالی رحمہ اللہ نے روزے کے تین درجات قرار دیے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ روزے کے تین مراتب ہیں، عام لوگوں کا روزہ، خاص لوگوں کا روزہ، اخص الخصوص لوگوں کا روزہ۔

① عام لوگوں کا روزہ: عام لوگوں کا روزہ یہ ہے کہ انسان اپنے پیٹ اور شرم گاہ کو شہوت پورا کرنے سے روکے۔

② خاص لوگوں کا روزہ: خاص لوگوں کا روزہ یہ ہے کہ انسان کانوں، آنکھوں، زبان، ہاتھ، پاؤں اور تمام اعضاء کو گناہوں سے بچائے۔

③ خاص الخاص لوگوں کا روزہ: خاص الخاص لوگوں کا روزہ یہ ہے کہ انسانی دل گھٹیا باتوں اور دنیوی افکار سے رک جائے، غیر اللہ سے بالکل ہی رک جائے، غیر اللہ کی طرف دھیان دینے سے یہ روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح دنیا کی فکر میں مست ومگن ہونے سے بھی یہ روزہ ٹوٹ جاتا ہے، ہاں دنیا کی ایسی فکر جس سے دین مقصود ہو وہ اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ یہ تو آخرت کا توشہ ہے، اہل دل کا کہنا ہے کہ جو اپنے دن میں کسی تدبیر کے لیے تصرف کرتا ہے تو اس پر اس کی ایک خطا لکھی جاتی ہے، اس لیے

کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس کا اللہ پر بھروسہ کم ہے، اسے اللہ کی طرف سے وعدہ کیے ہوئے رزق پر یقین کم ہے۔

اللہ کے فضل پر بھروسہ اور اس کے عہد کیے ہوئے رزق پر مضبوط یقین تو انبیاء کرام علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے مقربین کے مراتب اور مقام میں سے ہے، یہ ایسی باتیں ہیں جن کی تفصیل میں زبانی کلامی جانے کی بجائے عملی اعتبار سے ان کی گہرائی میں اترنا چاہیے، اللہ نے اسی طرف تو اشارہ کیا ہے کہ جو اس کی ذات سے غافل ہیں، دنیا کے کاروبار میں مست و مگن ہیں ان کی طرف لپکنے اور گھسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو خاص لوگوں کا روزہ ہے اس سے مراد نیک لوگ ہیں، ان کا روزہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعضاء و جوارح کو گناہوں سے روکے رکھے، یہ تمام چھ کام ہیں،

① اول نگاہ کو نیچا رکھنا، نگاہ کو ایسی جگہوں پر گھمانے اور لے جانے سے گریز کرنا جہاں مذمت کی جاتی ہے یا جہاں ناپسند سمجھا جاتا ہے، اور نگاہ کو ہر ایسی جگہ پر لے جانے سے پرہیز کرنا چاہیے جو دل کو مشغول کر دے اور اللہ کی یاد سے غافل کر دے، جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلنَّظْرَةُ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ إِبْلِيسَ مَسْمُومَةٌ فَمَنْ تَرَكَهَا مِنْ خَوْفِ اللّٰهِ أَثَابَهُ جَلَّ وَعَزَّ إِيمَانًا يَجِدُ حَلَاوَتَهُ فِي قَلْبِهِ (مستدرک حاکم) نگاہ شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر ہے، اللہ اس پر لعنت کرے، جس شخص نے نگاہ بازی کو اللہ کے خوف کی وجہ سے چھوڑ دیا اللہ اسے ایسا ایمان عطا فرمائیں گے جس کی مٹھاس وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خَمْسٌ يُفَطِّرْنَ الصَّائِمَ اَلْكِذْبُ وَالْغِيْبَةُ وَالنَّمِيْمَةُ وَالْيَمِيْنُ الْكَاذِبَةُ وَالنَّظْرُ بِشَهْوَةٍ پانچ چیزیں روزے کو توڑ دیتی ہیں جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، چغلی کرنا، جھوٹی قسم کھانا، شہوت کی کسی پر نگاہ ڈالنا۔

احیاء العلوم کے حاشیے میں اس روایت کو ضعیف قرار دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان چیزوں سے اگر روزہ نہ بھی ٹوٹتا ہو پھر بھی یہ چیزیں بہت زیادہ خطرناک ضرور ہیں، یہ دواعی ہیں روزہ

توڑنے کی، ان سے جس قدر احتیاط ہو گی اسی قدر روزے میں حسن و جمال پیدا ہو گا، ورنہ ان چیزوں کی موجودگی میں وہ روایت سامنے آئے گی جس میں فرمایا گیا کہ ایسے روزے دار کو بھوک پیاس کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہے۔

② دوسری بات یہ ہے کہ بکواسات سے زبان کی حفاظت کرے، جھوٹ سے زبان کی حفاظت کرے غیبت اور چغلی سے بچے، بے ہودہ گوئی سے پرہیز کرے، ظلم و زیادتی سے احتراز کرے، لڑائی جھگڑے سے گریزاں ہو، دکھلاوے سے بچے، خاموشی اختیار کرے اور اپنی زبان کو اللہ کے کلام کی تلاوت میں مشغول رکھے یہ زبان کا روزہ ہے۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غیبت روزے کو برباد کر دیتی ہے۔ حضرت لیث رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انسان کی دو عادات روزے کو برباد کر دیتی ہیں، ایک غیبت اور دوسرا جھوٹ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الصَّوْمُ جُنَّةٌ، فَإِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ يَوْمًا صَائِمًا، فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَجْهَلْ، فَإِنِ امْرُؤٌ شَاتَمَهُ أَوْ قَاتَلَهُ، فَلْيَقُلْ: إِنِّي صَائِمٌ (مسند احمد) روزہ ڈھال ہے، جب تم میں کوئی شخص روزہ دار ہو تو کوئی گناہ کا کام نہ کرے، کوئی جہالت کا کام نہ کرے، اگر کوئی شخص اس سے لڑائی کرے یا اسے گالی دے تو وہ اسے کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں، میں روزہ دار ہوں۔

حدیث شریف میں آیا ہے، مسند امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ میں موجود ہے کہ أَنَّ امْرَأَتَيْنِ صَامَتَا وَأَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّ هَاهُنَا امْرَأَتَيْنِ قَدْ صَامَتَا، وَإِنَّهُمَا قَدْ كَادَتَا أَنْ تَمُوتَا مِنَ الْعَطَشِ، فَأَعْرَضَ عَنْهُ أَوْ سَكَتَ، ثُمَّ عَادَ، وَأُرَاهُ قَالَ: بِالْهَاجِرَةِ، قَالَ: يَا نَبِيَّ اللهِ، إِنَّهُمَا وَاللهِ قَدْ مَاتَتَا أَوْ كَادَتَا أَنْ تَمُوتَا قَالَ: ادْعُهُمَا قَالَ: فَجَاءَتَا، قَالَ: فَجِيءَ بِقَدَحٍ أَوْ عُسٍّ فَقَالَ لِإِحْدَاهُمَا: قِيئِي فَقَاءَتْ قَيْحًا أَوْ دَمًا وَصَدِيدًا وَلَحْمًا حَتَّى قَاءَتْ نِصْفَ الْقَدَحِ، ثُمَّ قَالَ لِلْأُخْرَى: قِيئِي فَقَاءَتْ مِنْ قَيْحٍ وَدَمٍ وَصَدِيدٍ وَلَحْمٍ عَبِيطٍ وَغَيْرِهِ حَتَّى مَلَأَتِ الْقَدَحَ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّ هَاتَيْنِ صَامَتَا عَمَّا أَحَلَّ اللهُ لَهُمَا، وَأَفْطَرَتَا عَلَى مَا حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِمَا، جَلَسَتْ إِحْدَاهُمَا

إِلَى الْأُخْرَى، فَجَعَلَتَا يَأْكُلَانِ لُحُومَ النَّاسِ (احمد)

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں دو عورتوں نے روزہ رکھا، ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، یارسول اللہ! یہاں دو عورتوں نے روزہ رکھا ہوا ہے، وہ پیاس کی وجہ سے قریب الموت ہو چکی ہیں، آپ ﷺ نے اس کی طرف توجہ نہیں کی یا خاموش رہے، پھر وہ شخص واپس آیا، راوی کا خیال ہے کہ دوپہر کی شدید گرمی میں وہ شخص واپس آیا، اس نے عرض کیا، یا نبی اللہ! وہ دونوں یا تو مر چکی ہیں یا مرنے کے قریب ہو چکی ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان دونوں کو بلالاؤ، راوی کہتے ہیں کہ وہ دونوں عورتیں آئیں، اس کے بعد ایک چھوٹا پیالہ لایا گیا یا بڑا، آپ ﷺ نے ان دونوں میں سے ایک سے فرمایا، تو اس پیالے میں قے کر، اس نے پیپ قے کی، یا خون اور پیپ اور گوشت کی ملی جلی قے کی، یہاں تک کہ اس نے آدھے پیالے میں قے کی، پھر آپ ﷺ نے دوسری سے فرمایا کہ تو اس پیالے میں قے کر، اس نے پیپ اور خون اور کچلہو اور کچے تازہ گوشت کی قے کی، یہاں تک کہ پیالہ بھر گیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان دونوں نے اس چیز سے روزہ رکھا ہوا ہے جو اللہ نے ان کے لیے حلال کی ہے اور ان دونوں نے اس چیز پر روزہ توڑا ہے جو اللہ نے ان کے لیے حرام کی ہوئی ہے، یہ دونوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ جاتی ہیں اور لوگوں کے گوشت کھاتی ہیں۔

جھوٹ سننے اور حرام کھانے والے: حضرت امام غزالی رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں ③ تیسری بات یہ ہے کہ کانوں کو ہر ناپسندیدہ بات کے سننے کی طرف مائل کرنا، اس لیے کہ ہر وہ چیز جس کے بارے میں گفتگو کرنا حرام ہے اس کی طرف کان لگانا بھی حرام ہے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے حرام کھانے والے اور جھوٹ سننے والے دونوں کو برابر قرار دیا ہے جیسے ارشاد فرمایا کہ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (المائدہ ۴۲) یہ لوگ جھوٹ کو خوب سنتے ہیں اور حرام خوب کھاتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ

وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ (المائدہ ۶۳) ان لوگوں کو رب والوں نے اور علماء نے گناہ کی بات سے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکا؟

غیبت پر خاموشی اختیار کرنا حرام ہے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس طرح تم لوگ اس گناہ میں برابر کے شریک ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ غیبت کرنے والا اور غیبت سننے والا دونوں گناہ میں شریک ہیں۔ (احیاء العلوم لامام غزالی)

④ چوتھی بات یہ ہے کہ باقی اعضاء وجوارح جیسے ہاتھ، پاؤں ہیں کو ناپسندیدہ چیزوں سے بچانا، اسی طرح پیٹ کو افطار کے وقت شبہات والی چیزوں سے بچانا۔ شبہات والی چیزوں سے افطار کیا تو پھر روزے کا تو کوئی مقصد ہی نہیں ہوا، کیونکہ روزے سے مقصود تو یہ ہے کہ حلال چیزوں کے کھانے سے رکنا، پھر حرام چیزوں کے ساتھ افطار کرنے کا کیا مقصد؟ اس روزے دار کی مثال یوں ہے جیسے ایک شخص محل تعمیر کر رہا ہے اور شہر کو گرا رہا ہے۔

حلال کھانا ہو مگر کثرت سے ہو تو وہ نقصان دہ ہے، ایک شخص بہت زیادہ کھانے سے بچتا ہے، مگر اس نے زہر تھوڑا سا بھی تناول کر لیا تو یہی کہا جائے گا کہ یہ شخص بے وقوف ہے اور حرام ایسا زہر ہے جو دین کے لیے مہلک ہے اور حلال ایسی دوا ہے جو تھوڑی سی بھی ہو تو بھی فائدہ مند ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صَوْمِهِ إِلَّا الْجُوعُ وَالْعَطَشُ (نسائی، ابن ماجہ) کتنے ہی روزہ دار ہیں کہ ان کا روزہ بھوک اور پیاس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو حرام چیزوں پر افطار کرتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو حلال کھانوں سے بچتا ہے اور غیبت کر کے لوگوں کے گوشت کھاتا ہے، جو کہ حرام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے اعضاء وجوارح کو گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

⑤ پانچویں بات یہ ہے کہ حلال کھانا بھی افطار کے وقت بہت زیادہ نہ کرے، اس طرح کہ اس کا پیٹ بھر جائے، کیونکہ اللہ کے ہاں حلال چیزوں کے ساتھ بھرے ہوئے پیٹ سے زیادہ کوئی برتن

زیادہ مبغوض نہیں ہے۔(احیاء علوم الدین)

جب اللہ کا دشمن غالب ہو گا تو روزے سے فائدہ کیسے اٹھایا جاسکتا ہے؟ دن بھر جس شہوت کو توڑا تھا وہ کثرت افطار کی وجہ سے اس کو پھر سے بحال کرلیتا ہے، بسا اوقات رنگ برنگے کھانوں کا اضافہ ہو جاتا ہے، جیسے لوگوں کی عادات جاریہ ہیں کہ وہ رمضان المبارک کے لیے انواع واقسام کے کھانوں کو جمع کرتے ہیں، پھر وہ رمضان میں ان کھانوں کو اس طرح استعمال کرتے ہیں جو کئی ماہ میں استعمال نہیں کر سکتے۔

یہ بات تو طے ہے کہ روزے کا مقصد پیٹ کو خالی رکھنا اور شہوت کو توڑنا ہے، تاکہ تقویٰ کے لیے نفس مضبوط ہو جائے اور جب روشن دن سے لے کر عشاء تک سب کچھ معدے کے سپرد کیا جائے، یہاں تک کہ اس کی شہوت گھس جائے اور اس کا شوق مضبوط ہو جائے پھر اس کو لذتیں کھلائی جائیں، شکم سیر کیا جائے تو لذتوں میں اضافہ ہو گا، قوت دگنی ہو جائے گی، پھر اس سے شہوات اٹھیں گی جو کبھی ٹھہری ہوئی تھیں، اگر اسے یونہی اپنی عادت پر چھوڑ دیا گیا۔

پس روزے کی روح اور اسرار ان اعضاء کو کمزور کرنا ہے جو شرارتوں کی طرف شیطان کے لوٹنے کے وسائل اور ذرائع ہیں، اور یہ بات ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ انسان اپنے کھانے میں کمی نہ کرے جو وہ بے روزے کے زمانے میں کھایا کرتا تھا، جب تک یہ شخص دن چڑھنے سے لے کر رات تک کے اپنے کھانے کو کم نہیں کرے گا تب تک وہ اپنے روزے سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ آداب میں سے یہ ہے کہ یہ شخص دن کو اس وقت تک نیند نہ کرے جب تک کہ اسے بھوک اور پیاس محسوس نہ ہو، اسے اعضاء کی کمزوری محسوس نہ ہو، اس وقت وہ اپنے دل کی صفائی کرے، وہ ہر شب میں اس کمزوری پر ہمیشگی اختیار کرے، یہاں تک کہ اسے تہجد کا اٹھنا اور اوراد وظائف کا پڑھنا ہلکا محسوس ہو، تو پھر شیطان اس کے دل کے اوپر غالب نہیں ہو گا۔

⑥ چھٹی بات یہ ہے کہ اس شخص کا دل افطار کے بعد ایسا معلق ہو، خوف اور امید کے درمیان ایسا بے

چین ہو کہ پتا نہیں اس کا روزہ قبول ہوا ہے کہ نہیں ؟ آیا وہ مقربین میں سے ہے یا متر ددین میں سے ہے ؟ اسی طرح اس کو چاہیے کہ ہر عبادت سے فارغ ہونے کے بعد فکر کرے۔ (احیاء)

انسانی اعضاء کا روزہ: زبان کا روزہ: صرف کھانے پینے سے رکنے کا نام ہی روزہ نہیں ہے بلکہ انسانی اعضاء کے مختلف اعمال ایسے ہیں جن میں سے بعض کے کرنے پر اللہ راضی ہوتا ہے اور بعض کے کرنے پر اللہ ناراض ہوتا ہے، انسانی جسم میں زبان ہے، یہ اہم کردار ادا کرتی ہے، یہ تحت پر بھی جلوہ افروز کراتی ہے اور پریشان کن حالات سے بھی دوچار کرتی ہے، اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ باقی اعضا کی طرح زبان کا بھی روزہ رکھے، اسے اللہ کے ذکر میں مشغول اور مصروف رکھے۔

کان کا روزہ: کان کا روزہ یہ ہے کہ انہیں باطل کی طرف نہ جھکائے، ایسی باتوں کی طرف متوجہ نہ کرے جن کا سننا حلال نہیں ہے۔

آنکھوں کا روزہ: آنکھوں کا روزہ یہ ہے کہ انسان ان چیزوں کی طرف نہ دیکھے جن کو اللہ نے حرام کیا ہوا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَن نَظَرَ إِلَى امْرَأَةٍ نَظرَةً حَرَامًا حَشا اللهُ عَيْنَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِمَسَامِيرٍ مِّن نَارٍ حَتَّى يقْضِيَ اللهُ بَينَ الْخَلقِ ثُمَّ يُؤمَرُ بِهِ إِلَى النَّارِ إِلَّا أَن يَتُوبَ،

جو شخص کسی عورت پر حرام کی نظر ڈالے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی دونوں آنکھوں میں آگ کے کیل گاڑ دیں گے، یہاں تک کہ اللہ مخلوق کے درمیان فیصلہ کر دیں گے، پھر اس کے لیے دوزخ کی طرف لے جانے کا حکم دیا جائے گا، ہاں اگر وہ توبہ کر لے گا تو اس کے ساتھ ایسا نہیں ہو گا۔ (بستان الواعظین علامہ ابن جوزی ج ا ص ۲۱۸)

ہاتھوں کا روزہ: ہاتھوں کا روزہ یہ ہے کہ ان کو ان چیزوں سے روکے رکھے جن پر اس کا کوئی حق نہیں ہے، ہاتھوں کو صرف اسی صورت میں کھولے جس میں اللہ راضی ہو۔

پیٹ کا روزہ: پیٹ کا روزہ یہ ہے کہ اسے سود کھانے سے بچائے، حرام کھانے سے بچائے، یتیموں کا مال ظلماً کھانے سے بچائے۔

پاؤں کا روزہ: پاؤں کا روزہ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کے بغیر انہیں کسی طرف نہ اٹھائے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَن مَشی فِي إفشَاءِ عَيبٍ أَو كَشفِ عَورَةٍ لِّمُسلِمٍ كَانَ أَوَّلُ خُطوَةٍ يخطُوهَا يَضَعهَا اللهُ فِي النَّارِ وَ كَشَفَ اللهُ عَوْرَته يَوْمَ الْقِيَامَة عَلى رُؤُوسِ الْاَشْهَادِ ثُمَّ يُؤمَرُ بِهِ إِلَى النَّارِ، جو شخص کسی راز کو فاش کرنے کے لیے چلا، یا کسی مسلمان کی پردہ دری کرنے کے لیے چلا، تو پہلا قدم رکھتے ہی اس کے لیے اللہ تعالیٰ جہنم کا فیصلہ کر دیں گے، قیامت کے دن اس کی پردہ دری ہو گی، تمام لوگوں کے سامنے، پھر اسے دوزخ میں ڈالنے کا حکم دیا جائے گا۔

شرم گاہ کا روزہ: شرم گاہ کا روزہ یہ ہے کہ انسان کوئی بے حیائی اور بدکاری کا کام نہ کرے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مَن زَنَى بِأمرأةٍ يَهُودِيَّةٍ أَو نَصرَانِيَّةٍ أَو مَجُوسِيَّةٍ أَو مُسلِمَةٍ أَو كَائنةٍ من كَانَت من النِّسَاءِ فَتَحَ اللهُ فِي قَبرِه ثَلَاثمِائَة بَاب من جَهَنَّمَ يَخرُجُ عَلَيهِ مِنهَا حَيَاتٌ وَعَقَارِبُ من نَار جَهَنَّم وَشُهُب مِن نَار فَهِيَ تَحرقُهُ وَهُوَ مُعَذَّبٌ مِّمَّا يُلقَى مِن حَيَاتِ جَهَنَّم و عقاربها وَيبعَث يَوم الْقِيَامَة وَهُوَ يتَأَذَّى بِهِ النَّاس من ريح فرجه ثمَّ يُؤمر بِهِ إِلَى النَّار وَهُوَ يُؤذِي أهل النَّار مَعَ مَا هم فِيهِ من شدَّة الْعَذَاب (بستان الواعظین ص ۲۱۸)

جس شخص نے کسی یہودی، کسی عیسائی، کسی مجوسی یا کسی مسلمان عورت کے ساتھ یا جو بھی کوئی ہو کے ساتھ زنا کیا تو اللہ اس کی قبر میں دوزخ کے تین سو دروازے کھول دیں گے، ان دروازوں سے اس کی طرف دوزخ کی آگ کے سانپ اور بچھو نکلیں گے، جہنم کے انگارے نکلیں گے، جو اسے جلائیں گے، اسے دوزخ کے سانپوں اور بچھوؤں کے ذریعے عذاب دیا جائے گا، قیامت میں اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کی شرم گاہ سے نکلنے والی بدبو سے لوگوں کو تکلیف ہو رہی ہو گی، پھر اس کو دوزخ میں ڈالنے کا حکم دیا جائے گا، وہ شدت عذاب کی وجہ سے اہل دوزخ کی تکلیف میں اضافہ کر رہا ہو گا۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَن زَنَى بِحلِيلَةِ جَارِهِ الْمُسلِم لَم يَرِح رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَإِنَّ رِيحَهَا يُوجَدُ مِن مَسِيرَةِ خَمسمِائَة عَام جس نے اپنے مسلمان پڑوسی کی بیوی سے زنا کیا وہ جنت کی

خوشبو تک نہیں سونگھے گا، جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت اس سے دور ہو گی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: تم پاک دامنی اختیار کرو، تمہاری عورتوں کی حفاظت کی جائے گی، آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی عورت سے زنا کیا اسے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اسی کوڑے مارے جائیں گے۔ (بستان الواعظین)

نزول قرآن کریم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ {۱۸۶} البقرہ

جواب ترجمہ: رمضان کا وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کے واسطے ہدایت ہے اور ہدایت کی روشن دلیلیں اور حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے کو پالے تو اس کے روزے رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرے اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر تنگی نہیں چاہتا اور تاکہ تم گنتی پوری کر لو اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو۔

اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کی قدر و منزلت بیان کر رہے ہیں، اس مہینے کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قرآن کریم کے نزول کے لیے خاص فرمایا ہے، یہ ایسا مہینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام پر کتابیں نازل فرمائیں۔ حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا أُنْزِلَتْ صُحُفُ إِبْرَاهِيمَ فِي أَوَّلِ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ. وَأُنْزِلَتِ

التَّوْرَاةُ لِسِتٍّ مَضَيْنَ مِنْ رَمَضَانَ، وَالْإِنْجِيلُ لِثَلَاثَ عَشْرَةَ خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ وَأَنْزَلَ اللّٰهُ الْقُرْآنَ لِأَرْبَعٍ وَعِشْرِينَ خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ (مسند احمد بن حنبل) ابراہیم کے صحیفے رمضان المبارک کی پہلی رات میں نازل ہوئے، تورات چھ رمضان المبارک کو نازل ہوئی، انجیل تیرہ رمضان المبارک کو نازل ہوئی، قرآن کریم چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں یوں ہے أَنَّ الزَّبُورَ أُنْزِلَ لِثِنْتَيْ عَشْرَةَ [لَيْلَةً] خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ، وَالْإِنْجِيلُ لِثَمَانِي عَشْرَةَ، بے شک زبور بارہویں رات کو نازل کی گئی، انجیل رمضان کی اٹھارہویں رات کو نازل کی گئی۔ (ابن مردویہ بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ أُنْزِلَتِ الصُّحُفُ الْأُولٰى فِي أَوَّلِ يَوْمٍ مِنْ رَمَضَانَ وَأُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ فِي سِتٍّ مِّنْ رَمَضَانَ وَأُنْزِلَ الْإِنْجِيلُ فِي اثْنَتَيْ عَشْرَةَ مِنْ رَمَضَانَ وَأُنْزِلَ الزَّبُورُ فِي ثَمَانِي عَشْرَةَ مِنْ رَمَضَانَ وَأُنْزِلَ الْقُرْآنُ فِي أَرْبَعٍ وَعِشْرِينَ مِنْ رَمَضَانَ (تفسیر درمنثور ج۱ ص ۴۵۶) پہلے صحیفے یکم رمضان المبارک کو نازل کیے گئے، تورات چھ رمضان المبارک کو نازل کی گئی، انجیل بارہ رمضان المبارک کو نازل کی گئی، زبور اٹھارہ رمضان المبارک کو نازل کی گئی، قرآن کریم رمضان المبارک کی چوبیس تاریخ کو نازل کیا گیا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صحیفے، تورات، اور انجیل جس جس نبی پر نازل ہوئے وہ یکبارگی ہی نازل ہوئیں، لیکن قرآن کریم یکبارگی آسمان دنیا کے بیت العزت کی طرف اتارا گیا، یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا، لیلۃ القدر تھی، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ القدر میں ارشاد فرمایا کہ ہم نے قرآن کریم کو لیلۃ القدر میں اتارا ہے (سورۃ القدر) ہم نے اس قرآن کریم کو برکت والی رات میں اتارا ہے (سورۃ الدخان) اس کے بعد حسب ضرورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر نازل ہوتا رہا۔

اس بات پر اجماع ہے کہ قرآن کریم لوح محفوظ سے ایک ہی بار آسمان دنیا کے بیت العزت پر اتارا گیا ہے، آسمان دنیا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر تیئس سال تک موقع بہ موقع اتارا جاتا رہا،

جبریل موقع اور محل کی مناسبت سے آیات لاتے اور نبی کریم ﷺ کو پڑھ کر سناتے رہے، ترتیل کے ساتھ تلاوت کرتے تھے، نبی کریم ﷺ سنتے تھے، جبریل اپنی طرف سے کبھی بھی کوئی آیت، کوئی جملہ، کوئی سورت لے کر نہیں آئے، آپ کو قرآن کریم نے امین فرشتہ قرار دیا، اس لقب کی جبریل نے ہمیشہ لاج رکھی، کبھی مخالفین تک کو موقع نہیں دیا کہ جبریل کہیں اور آرہے تھے، کہیں اور بھیجے گئے تھے اور کہیں اور چلے گئے۔

سال بھر نبی کریم ﷺ کے قلب اطہر پر جو قرآن کریم نازل ہوتا تھا، رمضان میں جبریل آپ ﷺ کے ساتھ اس کو دہراتے تھے، اس دوران اللہ تعالیٰ جس حکم کو چاہتے باقی رکھتے، جس کو چاہتے ثابت رکھتے، جس کو چاہتے بھلا دیتے اور جسے چاہتے منسوخ کر دیتے تھے۔ (تفسیر در منثور)

دعا کی اہمیت و فضیلت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ {۱۸۶} البقرہ

جواب ترجمہ: اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں سو بلاشبہ میں قریب ہوں، دعا کرنیوالے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرے۔ سو وہ میرے احکام کو قبول کریں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ وہ نیک راہ پر رہیں۔

شان نزول: ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا کہ یارسول اللہ! کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس کو چپکے سے پکاریں یا دُور ہے کہ ہم اس کو زور سے پکاریں۔ نبی کریم ﷺ خاموش ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (ابن جریر، بغوی، در منثور)

کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب! کیا آپ قریب ہیں تو میں آپ کو چپکے سے پکاروں یا آپ دور ہیں کہ میں آپ کو زور سے پکاروں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

اے موسیٰ! میں اس کے پاس ہوتا ہوں جو مجھے یاد کرتا ہے پھر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب! میں کبھی ایسی حالت میں بھی ہوتا ہوں کہ میں اس حالت میں تیرا ذکر کرنے سے تیری ذات کو بلند سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا! وہ کون سی حالت ہوئی؟ عرض کیا جنابت اور غائط (پیشاب پاخانہ) کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! ہر حال میں میرا ذکر کرتے رہو۔ (مصنف ابن ابی شیبہ)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنگ میں تھے، تو ہم نے اونچی جگہ پر چڑھنے اور نیچے وادی میں اترنے کے وقت بلند آواز سے تکبیر کہنی شروع کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے قریب ہوئے اور فرمایا اے لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو کیونکہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو تم ایک ایسی ذات کو پکار رہے ہو جو ہر بات کو دور قریب سے سننے والی ہے اور ہر ایک کو دیکھنے والی ہے بلاشبہ وہ ذات جس کو تم پکارتے ہو وہ تم سے اس کی سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔ (ابن ابی شیبہ، احمد، بخاری، ابو داؤد، نسائی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھ کو پکارتا ہے۔ (احمد، در منثور)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا رب حیا والا اور کرم والا ہے جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ اپنے بندہ سے شرم فرماتا ہے کہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم، الاسماء والصفات، در منثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب کوئی تم میں سے اپنے ہاتھوں کو اٹھائے تو تین مرتبہ یوں کہے۔ یَاحَیُّ یَا قَیُّوْمُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ پھر جب اپنے ہاتھوں کو واپس کرنا چاہے کہ خیر کو اپنے چہرے پر ڈال دے (یعنی دعا کے بعد دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر دے)۔ (معجم کبیر للطبرانی، در منثور)

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی قوم اللہ عزوجل کی

بارگاہ میں (اپنے ہاتھوں کو) اٹھائے ہوئے اس سے کسی چیز کا سوال کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ ان کے ہاتھوں میں وہ چیز ڈال دے جس چیز کا وہ سوال کر رہے ہیں۔ (طبرانی)

ولید بن ابی مغیث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی دعا کرے تو اپنے ہاتھوں کو اٹھائے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں میں برکت اور رحمت ڈال دیتے ہیں وہ ان کو خالی نہیں لوٹاتا یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھوں کو چہرہ پر مل لے۔ (معجم الاوسط للطبرانی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے ابن آدم! ایک چیز میرے لئے ہے ایک چیز تیرے لئے ہے اور ایک چیز میرے اور تیرے درمیان ہے اور ایک چیز تیرے اور میرے بندوں کے درمیان ہے جو چیز میرے لئے ہے وہ یہ ہے کہ تو میری عبادت کر اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کر اور جو چیز تیرے لئے ہے وہ یہ ہے کہ جو تو عمل کرے گا میں اس کا پورا پورا بدلہ دوں گا اور وہ چیز جو میرے اور تیرے درمیان ہے وہ یہ ہے کہ تیری طرف سے دعا کرنا ہے اور مجھ پر قبول کرنا ہے اور وہ چیز جو تیرے اور میرے بندوں کے درمیان ہے وہ یہ ہے کہ تو ان کے لیے وہی پسند کرے جو تو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ (البزار، بیہقی)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مسلمان اللہ تعالیٰ سے ایسی دعا کرتا ہے جس میں گناہ کی بات نہ ہو اور قطع رحمی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو تین چیزوں میں سے ایک چیز (ضرور) عطا فرما دیتے ہیں یا تو یہ کہ اس کی دعا جلدی قبول فرما لیتے ہیں یا اس کے لئے آخرت میں ذخیرہ بنا دیتے ہیں یا اسی طرح کی کوئی تکلیف اس سے دور کر دیتے ہیں تو صحابہ نے عرض کیا پھر تو ہم کثرت سے دعا کریں گے فرمایا اللہ تعالیٰ زیادہ عطا فرمانے والا ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول ہوتی ہے، جب تک جلدی نہ کرے، پھر فرمایا جیسے وہ کہتا ہے میں نے دعا کی مگر میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ (بخاری، مسلم، در منثور) مطلب یہ ہے کہ لگاتار دعا مانگتا رہے، اپنے ذہن کے مطابق دعا

کی قبولیت کا دورانیہ طے کر کے اس کے بعد دعا مانگنے کا سلسلہ موقوف نہ کر دے، تسلسل سے دعا مانگتا رہے تو ایک دن فرشتے بھی پکار اٹھتے ہیں کہ اے پروردگار! اس بندے کی دعا قبول فرمالیجیے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا نہیں کافی ہوتا تقدیر سے بچنا یعنی قضا و قدر سے کوئی آدمی نہیں بچ سکتا اور دعا نفع دیتی ہے اس مصیبت سے جو نازل ہو چکی اور جو ابھی نازل نہیں ہوئی اور مصیبت البتہ نازل ہوتی ہے تو دعا اس کا استقبال کرتی ہے، پھر وہ دونوں آپس میں جھگڑتی رہیں گی قیامت کے دن تک۔ (مستدرک حاکم، در منثور)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا نہیں ٹالتی تقدیر کو مگر دعا اور نہیں زیادتی کرتی عمر میں مگر نیکی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، نسائی، ابن ماجہ، مستدرک حاکم، در منثور)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، قبولیت کا یقین کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور تم جان لو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے دل کی دعا قبول نہیں فرماتے جو غافل ہو (ترمذی، ابن ابی حاتم، مستدرک حاکم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ مؤمن کو قیامت کے دن بلایا جائے گا یہاں تک کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے اے میرے بندے! میں نے تجھ کو حکم کیا تھا کہ تو مجھ سے دعا کر اور میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تیری دعا کو قبول کروں گا تو کیا تو نے مجھ سے دعا کی تھی؟ تو وہ مؤمن کہے گا۔ ہاں میرے رب میں نے دعا کی تھی۔ (پھر) فرمایا اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو نے مجھ سے جو دعا کی تھی میں نے تیری دعا کو قبول کیا تھا کیا تو نے مجھ سے فلاں فلاں دن دعا نہیں کی تھی؟ پھر میں نے وہ تیری پریشانی دور کی تھی، مؤمن بندہ کہے گا کیوں نہیں اے میرے رب (پھر) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میں نے تجھ کو دنیا میں ہی جلدی دے دیا تھا اور تو نے فلاں فلاں دن غم و پریشانی کے لئے دعا مانگی تھی جو تجھے لاحق تھی کہ اس کو دور کروں اور تجھے اس سے نکلنے کا راستہ نظر نہیں آرہا تھا، مؤمن بندہ عرض کرے گا ہاں، اے میرے رب! (اس طرح ہوا تھا) پھر اللہ

تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کے بدلہ میں، میں نے تیرے لئے جنت میں اس کو ذخیرہ بنالیا ہے اور تو نے مجھ سے اس حاجت کے بارے میں دعا کی تھی کہ میں نے اس کو تیرے لئے پورا کر دیا تھا، (تو) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا مؤمن بندہ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے تو اس کے لئے یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ یا تو دنیا میں جلدی اس کام کو پورا کر دیا جاتا ہے یا اس کے لئے آخرت میں ذخیرہ بنا لیا جاتا ہے تو مؤمن اس مقام پر کہے گا کاش! میری دعا میں سے کوئی چیز بھی مجھے دنیا میں نہ دی جاتی۔ (حاکم)

مالک بن دینار رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک نبی کو حکم فرمایا کہ نبی اسرائیل سے کہہ دو تم اپنی زبانوں سے مجھ سے دعا مانگتے ہو جبکہ تمہارے دل مجھ سے دور ہوتے ہیں جو تم دعا مانگتے ہو وہ رائیگاں جاتی ہے اور فرمایا تم مجھ سے دعا مانگتے ہو جبکہ تمہارے ہاتھوں پر خون ہوتا ہے اپنے ہاتھوں کو خون سے دھو ڈالو یعنی خطاؤں سے پاک کرو پھر میرے پاس آؤ (اور) مجھ کو پکارو۔ (کتاب الزہد لاحمد) مطلب یہ کہ غافل اور ظالم نہ بنو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی تم سے یوں نہ کہے (اے اللہ) مجھ کو بخش دیجئے اگر آپ چاہیں پورے یقین کے ساتھ سوال کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں۔ (ابن ابی شیبہ، مسند احمد، بخاری، مسلم، نسائی، در منثور) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جس کے لئے دعا کے دروازے کھولے گئے گویا اس کے لئے قبولیت کے دروازے کھولے گئے۔ (ابن ابی شیبہ، در منثور)

ترمذی شریف کے الفاظ یوں ہیں، تم میں سے جس کے لئے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا گویا اس کے لئے رحمت کا دروازہ کھولا گیا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ سوال غائب کا سوال ہے۔

حضرت ابراہیم تیمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب انسان دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرتا ہے تو اس کی قبولیت واجب ہو جاتی ہے اور جو ثناء سے پہلے دعا کرتا ہے تو اس کی قبولیت امید پر ہے۔ (ابن ابی شیبہ)

سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو (ان سے) فرمایا ایک چیز

میرے لئے ہے اور ایک چیز تیرے لئے ہے اور ایک میرے اور تیرے درمیان ہے، تیری طرف سے سوال کرنا اور دعا کرنا ہے اور مجھ پر (دعا کو) قبول کرنا ہے۔ (ابن ابی شیبہ)

حضرت نافع بن معدیکرب رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں اور حضرت عائشہؓ موجود تھے حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اپنے رب سے درخواست کی کہ اے میرے رب عائشہ کا مسئلہ (حل فرما دیجئے) تو جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور فرمایا اللہ آپ کو سلام فرماتے ہیں کہ میرا نیک بندہ سچی نیت اور پاک دل کے ساتھ کہتا ہے اے میرے رب! تو میں (اس کی آواز پر) لبیک کہتا ہوں اور اس کی حاجت کو پورا کر دیتا ہوں۔ (ابن مردویہ، در منثور)

روزہ کے کچھ مزید احکامات

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ {۱۸۷} البقرہ

جواب ترجمہ: حلال کیا گیا تمہارے لیے روزوں کی راتوں میں بیویوں میں مشغول ہونا، وہ لباس ہیں تمہارے لیے اور تم ان کا لباس ہو۔ اللہ نے جان لیا کہ بلاشبہ تم اپنے نفسوں کی خیانت کرتے ہو سو تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تم کو معاف فرما دیا۔ سو اب ان سے میل ملاپ کرو، اور تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، اور کھاؤ اور پیئو یہاں تک کہ تمہارے لیے سفید دھاگہ سیاہ دھاگہ سے ممتاز ہو کر ظاہر ہو جائے۔ یعنی فجر کا دھاگہ پھر تم روزے پورے کرو رات تک۔ بیویوں میں میل ملاپ نہ کرو

اس حال میں کہ تم اعتکاف کئے ہوئے ہو مسجدوں میں۔ یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں لہٰذا ان کے پاس نہ پھٹکو اسی طرح اللہ بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے اپنی آیات تاکہ لوگ پرہیز گار بنیں۔

فرضیت رمضان سے پہلے یہود و نصاریٰ چوبیس گھنٹے کا روزہ رکھتے تھے اور سحری نہیں کرتے تھے، جب مسلمانوں پر رمضان کے روزے فرض ہوئے تو حضور ﷺ نے فرمایا فَرْقٌ مَّا بَيْنَنَا وَ بَيْنَ اَهلِ الكِتٰبِ اَكلَةُ السَّحَر یعنی ہمارے رمضان اور اہل کتاب کے روزے میں سحری کھانے کا فرق ہے فرضیت رمضان کے ابتدائی عرصہ میں ہماری شریعت میں بھی یہ قانون تھا کہ رات کو نماز عشاء کے بعد یا ایک دفعہ سو جانے کے بعد کھانا پینا اور مباشرت منع تھی، عشاء کی نماز یا سونے سے پہلے کھانا پینا اور مباشرت جائز تھی۔ (معالم العرفان)

شان نزول: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب میں سے جب کوئی آدمی روزہ رکھتا پھر وہ افطاری کے وقت افطار کرنے سے پہلے سو جاتا تو پھر وہ نہ کھا سکتا تھا رات کو اور نہ دن کو یہاں تک کہ (دوسرے دن کی) شام ہو جاتی۔ قیس بن صرمہ انصاری رضی اللہ عنہ روزہ سے تھے، دن بھر اپنی زمین میں کام کرتے رہے، جب افطار کا وقت ہوا تو وہ اپنی بیوی کے پاس آئے اور کہا کیا تیرے پاس کھانا ہے؟ اس نے کہا نہیں ہے لیکن میں تیرے لئے کھانا ابھی تلاش کرتی ہوں (اتنے میں) ان پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سو گئے ان کی بیوی آئی اور جب ان کو نیند کرتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگی میرے لئے خسارہ ہو گیا تم سو گئے دوسرے دن جب آدھا دن گزرا تو (بھوک کی وجہ سے) ان پر غشی طاری ہو گئی یہ بات نبی اکرم ﷺ کو ذکر کی گئی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ اس سے بہت خوش ہوئے۔ (عبد بن حمید، بخاری، ابو داؤد، ترمذی، ابن جریر)

رات کا روزہ بعد میں منسوخ ہو گیا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے مسلمان جب عشاء کی نماز پڑھ لیتے تھے تو ان پر کھانا پینا اور عورتیں حرام ہو جاتی تھیں، یہاں تک کہ دوسرے دن شام کو افطار کر لیتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ عشاء کے بعد اپنی بیوی کو پہنچ

گئے (یعنی اس سے جماع کرلیا) اور صرمہ بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کو مغرب کے بعد نیند غالب ہو گئی اور وہ سو گئے کھانا نہ کھا سکے اور نہ جاگے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز پڑھ چکے تھے آپ اس وقت اٹھے کھانا کھایا اور پانی پیا، جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بتایا (اس پر) اللہ تعالیٰ نے (یہ آیت) نازل فرمائی أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ اور رفث سے مراد ہے عورتوں سے جماع کرنا۔ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ یعنی تمہارا عورتوں سے جماع کرنا، کھانا اور پینا عشاء کے بعد (حلال کر دیا گیا فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ یعنی ان سے اب جماع کرو۔ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ یعنی بچے طلب کرو وَكُلُوا وَاشْرَبُوا (یعنی کھاؤ اور پیو) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے درگزر ہے اور رحمت ہے۔ (در منثور)

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ: جب روزے کے احکامات سخت تھے تو ایسے میں اپنی عورتوں سے جماع نہیں کیا جاسکتا تھا، اس پر جب کچھ صحابہ کرام سے صبر نہ ہو سکا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر کمال مہربانی فرماتے ہوئے رمضان المبارک کی راتوں میں اپنی عورتوں سے جماع کی اجازت عطا فرمادی، اس مقام پر یہی بات ارشاد فرمائی گئی ہے، اس حکم پر صحابہ کرام میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ: رمضان المبارک کی راتوں میں بیویوں سے مباشرت کی اجازت دیتے ہوئے میاں بیوی کے تعلق کو ایک لطیف انداز میں بیان فرمایا اور وہ یہ کہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں یعنی وہ تمہارے لیے سکون اور دل جمعی کا باعث ہیں اور تم ان کے لیے سکون اور دل جمعی کا باعث ہو۔ کما فی سورۃ الاعراف (لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا و فی سورۃ الروم لِتَسْكُنُوٓا إِلَيْهَا) عورت اور مرد چونکہ معانقہ کرتے ہیں اور ہر ایک دوسرے سے لپٹ جاتا ہے، اس لیے ہر ایک کو ایک دوسرے کے لیے لباس سے تعبیر فرمایا اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے پردہ بن جاتے ہیں اور فسق و فجور سے روکتے ہیں، اس لیے بھی ہر ایک کو

دوسرے کا لباس بتایا، حدیث شریف میں ہے کہ جب کسی بندہ نے نکاح کر لیا تو اس نے آدھا دین کامل کر لیا، لہٰذا وہ باقی آدھے دین کے بارے میں اللہ سے ڈرے۔ (مشکوٰۃ، شعب الایمان، انوار البیان)

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں پہلے جملہ یعنی هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ تم عورتوں سے صبر نہیں کر سکتے اور دوسرا جملہ (وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ) یہ بتا رہا ہے کہ تمہارے لیے ان سے پرہیز کرنا مشکل ہے اور چونکہ مرد کا احتیاج خوب واضح ہے اس لیے پہلے جملے کو مقدم کیا گیا۔ (من روح المعانی، انوار البیان)

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ: نفس کے اُبھار کی وجہ سے جو نفسوں کا تقاضا پورا کر لیا اس میں بظاہر نفس کی موافقت ہے لیکن قانون شرعی کی خلاف ورزی کی وجہ سے یہ نفسوں کی خیانت ہے کیونکہ احکام کی خلاف ورزی مواخذہ کی چیز ہے، اور تَخْتَانُوْنَ کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ غلبہ شہوت کی وجہ سے تمہارے نفسوں کا تقاضا بیویوں کے پاس جانے کا ہوتا تھا لیکن تم اجازت شرعی نہ ہونے کی وجہ سے تقاضے کو پورا نہ کرتے تھے اس میں نفسوں کی خواہش کی خیانت اگرچہ ایمانی تقاضوں کی موافقت تھی، اب مباشرت کی اجازت دے گئی تو نفسوں کی خیانت بھی ختم ہوئی۔ (انوار البیان) اللہ تعالیٰ کتنی مہربان ذات ہے کہ صحابہ کرام کے اس عمل پر ان کی توبہ قبول فرمائی اور ان سے اس غلطی کو معاف کر دیا اور ان کی بدولت باقی امت کے لیے آسانی پیدا کر دی گئی۔

فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ: پس اب تم ان سے ہم بستر ہو یعنی اب حلال طور سے مجامعت کرو مباشرت بول کر صحبت مراد لی ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ: اور چاہو جو اللہ نے لکھ دیا تمہارے لیے یعنی جو تمہاری قسمت میں اولاد اللہ تعالیٰ نے لکھ دی ہے وہ بذریعہ صحبت کے طلب کرو۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ جب کوئی شخص اپنی عورت سے مجامعت کرے تو مناسب یہ ہے کہ مجامعت سے اولاد کی نیت کرے صرف اپنی خواہش ہی پوری کرنے کا ارادہ نہ کرے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایسی عورت سے نکاح

کرو جو خاوند کو دوست رکھنے والی ہو اور خوب جننے والی ہو کیونکہ میں تمہاری کثرت پر اور امتوں کے سامنے فخر کروں گا۔ (ابوداؤد، نسائی، مظہری)

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ: حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اسلام کی تعلیم دی اور ہر نماز کے وقت میں نماز پڑھنا سکھایا، پھر فرمایا: جب رمضان آئے تو کھاتے پیتے رہنا حتی کہ فجر کا سفید دھاگہ رات کے سیاہ دھاگے سے ممتاز ہو جائے، پھر رات تک روزہ پورا کرنا، حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نہیں سمجھ سکا کہ کالے اور سفید دھاگے سے کیا مراد ہے؟ میں فجر تک ان دونوں دھاگوں کو دیکھتا رہا اور وہ مجھے ایک جیسے دکھائی دیئے پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، پھر میں نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وہ چیز جس کی آپ نے مجھے وصیت کی تھی مجھے یاد ہے، البتہ سفید دھاگے اور کالے دھاگے کا مطلب مجھے یاد نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے گویا کہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ میں نے کیا کہا تھا، میں نے کہا: میں نے ان دونوں دھاگوں کو بٹ لیا اور رات بھر انہیں دیکھتا رہا، مجھے یہ ایک جیسے دکھائی دیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے حتی کہ آپ کی ڈاڑھیں دکھائی دیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں نے تم سے فجر کا لفظ نہیں کہا تھا، اس سے مراد رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی ہے۔ (جامع البیان)

بعض حضرات کو بڑی غلط فہمی کا سامنا ہوا کہ عین طلوع فجر کے وقت آنکھ کھلے تو وہ جلدی جلدی اٹھ کر کچھ کھا پی لے، ان کو کہیں سے اطلاع مل گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور اذان کی آواز آجائے تو فوراً چھوڑ نہ دے بلکہ اپنی حاجت بھر کھا پی لے، یہ بات اردو کی ایک تفسیر میں لکھی ہوئی ہے، اس روایت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ فجر طلوع ہونے کے بعد بھی کچھ دیر کھانے کی گنجائش موجود ہے۔

حالانکہ یہ بات جن صاحب نے اپنی تفسیر میں لکھی بالکل درست نہیں لکھی، کیونکہ طلوع فجر کے بعد سحری کھانا جائز نہیں ہے، جس حدیث شریف میں انہیں کچھ کھانے کی گنجائش دکھائی ہے اس

میں طلوع فجر کے بعد کھانے پینے کی اجازت کا ذکر تک نہیں ہے، اصل حدیث شریف بخاری میں ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلال رات کو اذان دیتے ہیں تو تم کھاتے پیتے رہو حتی کہ ابن ام مکتوم اذان دیں۔ (بخاری) رمضان میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ رات کے وقت اذان دیتے تھے تاکہ سحری کرنے والے جاگ اٹھیں اور جس نے تہجد پڑھنی ہو وہ اٹھ کر تہجد پڑھ لے اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ طلوع فجر کے وقت صبح کی اذان دیتے تھے رسول اللہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی اذان کو سحر کی انتہاء قرار دیا ہے، اس سے طلوع فجر کے بعد کھانے پینے کی اجازت کہاں نکلتی ہے۔ (تبیان القرآن)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ نازل ہوئی اور ابھی لفظ من الفجر نازل نہ ہوا تھا تو بعض لوگوں نے اپنے پاؤں میں سفید اور کالا تاگہ باندھ لیا اور برابر کھاتے رہے یہاں تک کہ ان دونوں میں فرق ظاہر ہو جائے (وہ زمانہ بتی اور بجلی کا تو تھا نہیں چھوٹے چھوٹے گھروں میں اندر بیٹھ کر کھاتے رہے صبح صادق ہو جانے اور باہر روشنی پھیل جانے پر بھی دونوں تاگوں میں امتیاز نہ ہوا۔ (ان حضرات نے خَيْطِ اَبْيَضْ اور خَيْطِ اَسْوَدْ کا معروف معنی سمجھا) پھر اللہ تعالیٰ نے لفظ مِنَ الْفَجْرِ نازل فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ خَيْطِ اَبْيَضْ اور خَيْطِ اَسْوَدْ سے دن اور رات مراد ہے۔ (صحیح بخاری) معلوم ہوا کہ سحری کھانے کا آخری وقت صبح صادق تک ہے۔ (انوار البیان)

مسئلہ: یہ سب کلام ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ایسے مقام پر ہیں جہاں سے صبح صادق کو چشم خود دیکھ کر یقین حاصل کر سکتے ہیں اور مطلع بھی صاف ہے اور وہ صبح صادق کی ابتدائی روشنی کی پہچان بھی رکھتے ہیں تو ان پر لازم ہے کہ براہ راست افق کو دیکھ کر عمل کریں اور جہاں یہ صورت نہ ہو مثلاً کھلا ہوا افق سامنے نہیں یا مطلع صاف نہیں یا اس کو صبح صادق کی پہچان نہیں اس لئے وہ دوسرے آثار و علامات یا ریاضی حسابات کے ذریعہ وقت کا تعین کرتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کے لئے کچھ وقت ایسا آئے

گا کہ صبح صادق کا ہو جانا مشکوک ہو یقینی نہ ہو، ایسے لوگوں کو مشکوک حالت میں کیا کرنا چاہیے، اس کے متعلق امام جصاص رحمہ اللہ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس حالت میں اصل تو یہی ہے کہ کھانے پینے پر اقدام نہ کرے، لیکن مشکوک حالت میں تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس وقت صبح ہو چکی تھی تو قضاء اس کے ذمہ لازم ہے جیسے شروع رمضان میں چاند نظر نہ آیا اور لوگوں نے روزہ نہیں رکھا مگر بعد میں شہادت سے ۲۹ کا چاند ثابت ہو گیا تو جن لوگوں نے اس دن کو شعبان کی تیسویں تاریخ سمجھ کر روزہ نہیں رکھا تھا وہ گنہگار تو نہیں ہوئے مگر اس روزے کی قضاء ان پر باتفاق لازم ہے اسی طرح بادل کے دن میں غروب کے گمان پر روزہ افطار کر لیا بعد میں آفتاب نکل آیا تو یہ شخص گناہگار تو نہیں مگر قضاء اس پر واجب ہے۔ (معارف القرآن)

امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھائے گا تو وہ گناہگار بھی ہو گا اور قضاء بھی اس پر لازم ہو گی اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا مگر قضاء ساقط نہ ہو گی اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہو گی۔ (احکام القرآن، معارف)

ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ: پھر رات تک روزے کو پورا کرو یعنی طلوع فجر سے لے کر رات کی آمد تک روزہ رکھو، رات سے مراد مطلق غروب آفتاب ہے نہ کہ سرخی یا سفیدی کا زائل ہونا جونہی سورج ڈوب گیا، رات ہو گئی، روزہ افطار کر لینا چاہیے، مزید کسی چیز کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ (معالم العرفان)

وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ: اور بیویوں سے میل ملاپ نہ کرو اس حال میں کہ تم اعتکاف کیے ہوئے ہو مسجدوں میں، اعتکاف مسنون ہے جو صرف مسجدوں ہی میں ہوتا ہے اور اس کے لیے نیت کرنا بھی ضروری ہے، اعتکاف کی نیت کے بغیر مسجد میں جتنا بھی وقت گزارے اعتکاف میں شمار نہ ہو گا، اعتکاف کے دنوں میں ایک تو شب قدر میں بیدار رہنے اور نمازوں میں قیام کرنے کی آسانی ہو جاتی ہے، دوسرے مخلوق سے تعلق کم سے کم ہو جاتا ہے اور خالق تعالیٰ شانہ ہی کی طرف

پوری توجہ رہتی ہے، دل و جان سے جسم اور زبان سے عبادت اور تلاوت میں مشغولیت رہتی ہے، یہ در پر جا پڑنے والی بات ہے۔ (انوار البیان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں دس دن کا اعتکاف فرماتے تھے اور جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال بیس دن کا اعتکاف کیا۔ (صحیح بخاری) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے، پھر ایک سال کا اعتکاف نہیں کیا تو آئندہ سال بیس دن کا اعتکاف کیا۔ (سنن ابی داؤد) اور ایک سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ شوال میں بھی بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ (سنن ابی داؤد، انوار البیان)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہ گناہوں سے روکتا ہے اور اس کے لیے اس شخص کا ثواب لکھا جاتا ہے جو تمام نیکیاں کرنے والا ہو۔ (ابن ماجہ)

رات ہو یا دن اعتکاف میں جماع کرنا یا شہوت کے ساتھ بیوی کو چھونا جائز نہیں ہے، اگر جماع کر لیا تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا اگر شہوت کے بغیر ہاتھ لگایا تو اس کی گنجائش ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حالت اعتکاف میں مسجد میں بیٹھے ہوئے اپنا سر مبارک میری طرف نکال دیتے تھے اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر دھو دیتی تھی، اور ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر میں کنگھی کر دیتی تھی۔ (بخاری) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کی حالت میں صرف انسانی حاجت کے لیے گھر میں داخل ہوتے تھے۔ (بخاری)

حاجت انسانی سے پیشاب پاخانہ مراد ہے، کھانا پینا چونکہ مسجد ہی میں ہوتا ہے اس لیے معتکف کو اس کے لیے مسجد سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے، جب کوئی شخص اعتکاف کرے گا اور راتوں میں بیدار رہے گا تو جس رات میں بھی شب قدر ہو گی وہ اسے پالے گا اور اس کی خیر و برکت سے محرومی نہ ہو گی۔ (انوار البیان)

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ: یعنی یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں لہٰذا ان کے پاس نہ پھٹکو۔ گزشتہ آیات میں جو روزہ کی فرضیت اور مریض و مسافر کے لیے رخصت اور روزہ کی ابتداء اور انتہاء کے اوقات بیان ہوئے اور اعتکاف والوں کے لیے ارشاد ہوا کہ اعتکاف میں مباشرت نہ کریں ان سب کے بیان کرنے کے بعد ارشاد ہے کہ یہ احکام اللہ کی حد بندیاں ہیں، حدود سے آگے مت بڑھو جو حکم جس طرح ہوا ہے اس کو اسی طرح پورا کرو اور ایسی صورت کے قریب جانے کی ممانعت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے روزہ ضائع ہو جائے، نہ سحری میں اتنی دیر کریں کہ صبح صادق ہو جائے، نہ افطار میں اتنی جلدی کریں کہ سورج چھپنے سے پہلے ہی کھا کے فارغ ہو جائیں حالت روزہ میں منہ میں ایسی کوئی چیز نہ لیں جس کے اندر جانے کا اندیشہ ہو اور وضو کرتے وقت ناک میں پانی دینے میں مبالغہ نہ کریں۔ (انوار البیان)

باطل طریقوں سے اموال کھانے کی ممانعت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ {۱۸۸} البقرۃ

جواب ترجمہ: اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقوں سے نہ کھاؤ، اور نہ ان کا مقدمہ حاکموں کے پاس اس غرض سے لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا کوئی حصہ جانتے بوجھتے ہڑپ کرنے کا گناہ کرو۔

ماہ رمضان میں روزہ کی حالت میں حلال مال کھانے کی ممانعت ہوتی ہے، جب کہ حرام مال تو رمضان اور غیر رمضان دونوں میں کھانے، استعمال کرنے اور ہڑپ کرنے کی شدت سے شریعت میں ممنوع قرار دیا گیا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے باطل طریقہ سے مال کھانے کو ممنوع قرار دیا ہے، اللہ نے حلال اور طیب مال کھانے کا حکم اور ترغیب دی ہے، نبی کریم ﷺ کی تعلیمات میں بھی مال حرام

کھانے کی ممانعت کی گئی ہے۔

شانِ نزول : یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے واقعہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے دو صاحبوں کا آپس میں ایک زمین پر جھگڑا ہوا مقدمہ رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں پیش ہوا مدعی کے پاس گواہ نہ تھے آنحضرت ﷺ نے شرعی ضابطہ کے مطابق مدعاعلیہ کو حلف کرنے کا حکم دیا وہ حلف پر آمادہ ہو گیا اس وقت آنحضرت ﷺ نے بطور نصیحت ان کو یہ آیت سنائی، اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا جس میں قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرنے پر وعید مذکور ہے، صحابی نے جب یہ آیت سنی تو قسم کھانے کو ترک کر دیا اور زمین مدعی کے حوالہ کر دی۔ (روح المعانی، معارف القرآن)

حضرت مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں قرآن کریم نے ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے جس کے ذریعے لوگوں کے مالوں پر باطل طریقہ سے قبضہ کر لیا جاتا ہے، حکام وقت کو ذریعہ بنا کر لوگوں کے مالوں کو اپنا مال بنا لیتے ہیں، اس کی کئی صورتیں ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ کسی کے مال پر دعویٰ کیا کہ یہ میرا ہے اور حاکم کو رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرا لیا اور ایک طریقہ یہ ہے کہ جھوٹی تحریر لکھ کر یا جھوٹے گواہ بنا کر حاکم کے ہاں پیش کر کے کسی غیر کے مال اور جائیداد کے بارے میں اپنے حق میں فیصلہ کرا لیا۔

اور ایک طریقہ یہ ہے کہ شرعی قانون کے خلاف حکومت وقت کے رائج قوانین کے مطابق کسی کا مال دبا لیا، مثلاً کسی حکومت نے یہ قانون بنا دیا کہ مرنے والے کے مال میں صرف لڑکوں کا حصہ ہو گا اور اس قانون کے پیشِ نظر لوگوں نے حاکم سے اپنے حق میں میراث تقسیم کرانے کا فیصلہ کرا لیا اور بہنوں کو محروم کر دیا یا جیسے کسی حکومت نے قانون بنا دیا کہ فلاں فلاں اشخاص کا مال زبردستی لے کر فلاں فلاں قسم کے آدمیوں پر تقسیم کر دیا جائے، تو ان میں سے کسی بھی صورت میں کسی شخص کا مال ہرگز حلال نہیں ہو گا اور بھی اس کی بہت سی صورتیں ہیں جنہیں مقدمہ باز جانتے ہیں اور مکر و فریب کے

ذریعہ حکام کو استعمال کر کے دوسروں کے مالوں پر قبضہ کرتے رہتے ہیں، حاکم سے فیصلہ کرا کر جو شخص کسی کا مال لے لے گا وہ اس کے لیے حلال نہ ہو گا، دنیا و آخرت میں اس کا بہت بڑا وبال ہے اور سخت عذاب ہے۔

دنیاوی حکام کے فیصلوں کے ذریعے کسی کا مال اپنا بنا کر مطمئن نہ ہو جائیں، یہ یاد رکھیں کہ مالک یوم الدین قاضی روز جزاء جل مجدہٗ کے حضور میں بھی پیش ہونا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں انسان ہی ہوں اور تم میرے پاس جھگڑے لے کر آتے ہو اور ممکن ہے کہ تم میں سے ایک آدمی دوسرے کے مقابلہ میں اپنی حجت کو بڑھ چڑھ کر بیان کر دے اور میں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں جو کچھ میں نے اس سے سنا (اور یہ فیصلہ حقیقت میں غلط ہو) سو جس کے لیے میں اس کے بھائی کے مال میں سے کسی چیز کا کوئی فیصلہ کر دوں تو اسے ہر گز نہ لے کیونکہ میں اس کے لیے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔ (صحیح بخاری)

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی پر جھوٹا مقدمہ دائر کیا اور جس کا حق نہیں ہے اس کے زورِ بیان پر میں نے اس کو دوسرے کا حق دلا دیا تو میرے دلانے سے وہ اس کے لیے حلال نہ ہو جائے گا، وہ یہ نہ سمجھے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا، لہٰذا میرے لیے دوسرے کا مال حلال ہو گیا، باوجود فیصلہ کر دینے کے دوسرے کا مال مدعی کے لیے حلال نہ ہو جائے گا۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی ایسی چیز کا دعویٰ کرے جو اس کی نہیں ہے تو وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے اور وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لے۔ (مسلم) اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے جھوٹی قسم کھائی جس کے ذریعہ کسی مسلمان کا مال اپنے حق میں کر لینا چاہتا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غصہ ہو گا۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، تفسیر انوار البیان)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس آدمی کے بارے میں ہے کہ اس پر کسی کا مال

(قرض) ہو اور اس بارے میں اس پر کوئی گناہ بھی نہ ہو اس لئے وہ دوسرے کے مال کا انکار کرتا ہے اور حکام کی طرف جھگڑا لے جاتا ہے، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ دوسرے کا حق اس پر ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ گناہ ہے، کھانا حرام ہے۔ (در منثور)

وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ: حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اپنے بھائی کے مال کا جھگڑا حکام کے پاس نہ لے جا اور تو جانتا ہے کہ بلاشبہ تو ہی ظالم ہے اور حاکم کا فیصلہ تیرے لئے کسی چیز کو حلال نہیں کرے گا بلکہ وہ تجھ پر حرام ہو گا۔ (دُر منثور)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں نہ پہنچاؤ حاکموں تک یعنی کسی کے مال کی خبر نہ دو ظالم حاکموں کو یا اپنا مال بطریق رشوت حاکم تک نہ پہنچاؤ کہ حاکم کو موافق بنا کر کسی کا مال کھالو یا جھوٹی گواہی دیکر یا جھوٹی قسم کھا کر یا جھوٹا دعویٰ کر کے کسی کا مال نہ کھاؤ اور تم کو اپنے ناحق پر ہونے کا علم بھی ہو۔ (تفسیر عثمانی)

فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ: اس میں یہ بتادیا کہ صرف آپس میں مسلمانوں ہی کا مال ناحق لے لینا حرام نہیں ہے بلکہ غیروں کا مال ناحق لے لینا بھی حرام ہے، جو کافر مسلمانوں کی عملداری میں رہتے ہیں شریعت کی اصطلاح میں ان کو ذمی کہا جاتا ہے، تمام مسلمانوں پر ان کی جان و مال کی حفاظت لازم ہے اور خیانت کر کے یا کسی بھی طرح ان کا مال ناحق رکھ لینا جائز نہیں ہے۔ (انوار البیان)

مال حلال کی برکات اور حرام کی نحوست: حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حرام سے بچنے اور حلال کے حاصل کرنے کے لئے قرآن کریم نے مختلف مقامات میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں فرمائی ہیں ایک آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق میں بہت بڑا دخل حلال کھانے کو ہے اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اخلاق حمیدہ اور اعمال صالحہ کا صدور مشکل ہے ارشاد ہے، **يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ** (۵۱: ۲۳) یعنی اے گروہ انبیاء! حلال اور پاک چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو میں تمہارے اعمال کی حقیقت

سے واقف ہوں۔ (معارف القرآن)

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ عمل صالح کا حکم فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ اعمال صالحہ کا صدور جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ انسان کا کھانا پینا حلال ہو اور آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب انبیاء علیہم السلام کو ہے مگر یہ حکم کچھ انہیں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ سب مسلمان اس کے مامور ہیں اس حدیث کے آخر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی دعاء قبول نہیں ہوتی بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اٹھاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دعاء کے لئے پھیلاتے ہیں اور یارب یارب پکارتے ہیں مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام ہے تو ان کی یہ دعاء کہاں قبول ہو سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا حصہ اسی کام کے لئے وقف رہا ہے کہ امت کو حرام سے بچانے اور حلال کے استعمال کرنے کی ہدایتیں دیں، ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کی ایذاؤں سے محفوظ رہے وہ جنت میں جائے گا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ آج کل تو یہ حالات آپ کی امت میں عام ہیں بیشتر مسلمان ان کے پابند ہیں آپ نے فرمایا ہاں! آئندہ بھی ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہیں گے جو ان احکام کے پابند ہوں گے۔ (ترمذی)

محشر میں ہر انسان سے پانچ اہم سوالات: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مَا تَزَالُ قَدَمَا عَبْدٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ اَرْبَعٍ عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيْمَا اَنْفَقَهُ وَعَنْ عِلْمِهٖ مَاذَا عَمِلَ فِيْهِ (بیہقی)

قیامت کے روز محشر میں کوئی بندہ اپنی جگہ سے سرک نہ سکے گا جب تک اس سے چار سوالوں کا جواب نہ لیا جائے ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں فنا کی دوسرے یہ کہ اپنی جوانی کس شغل میں برباد کی تیسرے یہ کہ اپنا مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا اور چوتھی یہ کہ اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ اے جماعت مہاجرین! پانچ خصلتیں ہیں جن کے متعلق میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں ایک یہ ہے کہ جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلتی ہے تو ان پر طاعون اور وبائیں اور ایسے نئے نئے امراض مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو ان کے آباء واجداد نے سنے بھی نہ تھے اور دوسرے یہ کہ جب کسی قوم میں ناپ تول کے اندر کمی کرنے کا مرض پیدا ہو جائے تو ان پر قحط اور گرانی اور مشقت و محنت اور حکام کے مظالم مسلط کر دیئے جاتے ہیں اور تیسرے یہ کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہ کرے تو بارش بند کر دی جاتی ہے اور چوتھے یہ کہ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے عہد کو توڑ ڈالے تو اللہ تعالیٰ ان پر اجنبی دشمن مسلط فرما دیتے ہیں جو ان کے مال بغیر کسی حق کے چھین لیتا ہے اور پانچویں یہ کہ جب کسی قوم کے اَرباب اِقتدار کتاب اللہ کے قانون پر فیصلہ نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام ان کے دل کو نہ لگیں تو اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں منافرت اور لڑائی جھگڑے ڈال دیتے ہیں۔ (ابن ماجہ، بیہقی، حاکم علی شرط مسلم، معارف القرآن)

اسلامی تقویم اور رویت ہلال

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَى وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ {۱۸۹} البقرہ

جواب ترجمہ: لوگ آپ سے نئے مہینوں کے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ انہیں بتا دیجیے کہ یہ لوگوں (کے مختلف معاملات کے) اور حج کے اوقات متعین کرنے کے لیے ہیں اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہو بلکہ نیکی یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار

کرے اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔

اس آیت مبارکہ کی روشنی میں قمری تقویم کی اہمیت وافادیت کا پتا چلتا ہے، یہاں قرآن نے چاند کے لیے لفظ اَھِلَّه استعمال فرمایا ہے، جب کہ دوسرے مقامات پر قمر کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، اسی طرح چاند کو بدر بھی کہا جاتا ہے، پہلی رات اور اس کے قریب کی راتوں کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے، ہلال کہنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کچھ عرصے تک مخفی رہنے کے بعد اس وقت اس کا ظہور ہوتا ہے، اسی سے اَلْإِهْلَالُ بِالْحَجِّ کا محاورہ ہے جس کے معنی اظہار تلبیہ کے ہیں اسی طرح اِسْتِهْلَالُ الصَّبِيِّ ہے جس کا مطلب آواز یا حرکت کے ذریعے بچے کی زندگی کے آثار کا ظہور ہے۔

بعض لوگوں کا یہ قول ہے کہ اہلال کا مطلب هُوَ رَفْعُ الصَّوْتِ آواز بلند کرنا ہے اور إِهْلَالَ الْهِلَالِ اسی سے بنا ہے کیونکہ جب چاند نظر آجاتا ہے تو دیکھنے والوں کی آواز بلند ہوتی ہے لیکن پہلی بات زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔

اھل عرب کہتے ہیں تَهَلَّلَ وَجْهُهُ اس کا چہرہ دمک اٹھا، یہ فقرہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ اس شخص کے چہرے پر خوشی اور مسرت کے آثار ہویدا ہوتے ہیں، حالانکہ اس محاورے میں بلند آواز کا کوئی مفہوم موجود نہیں ہے، تابط شرا کا ایک شعر ہے،

وَإِذَا نَظَرْتَ إِلَى أَسِرَّةِ وَجْهِهِ بَرَقَتْ كَبَرْقِ الْعَارِضِ الْمُتَهَلِّلِ

جب تم اس کے چہرے کی لکیروں پر نظر ڈالو گے تو تمہیں وہ اس طرح چمکتی ہوئی نظر آئیں گی جس طرح پر مسرت رخسار یا بجلیوں والے بادل کی چمک ہوتی ہے۔ یہاں الْمُتَهَلِّلِ کے معنی کھلے ہوئے اور روشن کے ہیں۔

اہل لغت کا اس وقت کے بارے میں اختلاف ہے جو ہلال کہلاتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ مہینے کی پہلی اور دوسری رات کا چاند ہلال ہوتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ پہلی تین راتوں کا چاند ہلال کہلاتا ہے

اس کے بعد قمر کہلاتا ہے، اصمعی کا کہنا ہے کہ چاند جب تک ایک باریک لکیر کے ذریعے گول نظر نہ آئے اس وقت تک ہلال ہوتا ہے، بعض کا قول ہے کہ چاند کی روشنی جب تک رات کی تاریکی پر غالب نہ آجائے اس وقت تک ہلال ہوتا ہے، اس کے بعد قمر کہلاتا ہے، چاند کی یہ صورت ساتویں رات میں ہوتی ہے، زجاج کا قول ہے کہ اکثر لوگ پہلی دوراتوں کے چاند کو ہلال کہتے ہیں۔

شانِ نزول : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے چاند کے بارے میں سوال کیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کہ اس سے قرض وغیرہ کے وعدوں کی میعاد معلوم ہوجاتی ہے، عورتوں کی عدت کا وقت معلوم ہوتا ہے، حج کا وقت معلوم ہوتا ہے، مسلمانوں کے روزے کے افطار کا تعلق بھی اسی سے ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جَعَلَ اللّٰهُ الْأَهِلَّةَ مَوَاقِيتَ لِلنَّاسِ فَصُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَعُدُّوا ثَلَاثِينَ يَوْمًا اللہ تعالیٰ نے چاند کو لوگوں کے وقت معلوم کرنے کے لئے بنایا ہے اسے دیکھ کر روزے رکھو اسے دیکھ کر عید مناؤ اگر ابر و باراں کی وجہ سے چاند نہ دیکھ سکو تو تیس دن پورے گن لیا کرو۔ (مسند عبدالرزاق)

امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک شان ہے کہ انہوں نے بوجہ عظمت وہیبت کے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات بہت کم کئے ہیں بخلاف پچھلی امتوں کے کہ جنہوں نے بکثرت سوالات کئے اور اس ادب کو ملحوظ نہیں رکھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سوالات جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے کل چودہ ہیں جن میں سے ایک سوال ابھی اوپر گذرا ہے، وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي دوسرا سوال یہ ہے اور ان کے بعد سورۃ بقرہ ہی میں چھ سوال اور مذکور ہیں اور باقی چھ سوالات مختلف سورتوں میں آئے ہیں۔ (معارف القرآن)

آیت مذکورہ میں ذکر یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اَهِلَّة یعنی شروع مہینے

کے چاند کے متعلق سوال کیا کہ اس کی صورت آفتاب سے مختلف ہے کہ وہ کبھی باریک ہلالی شکل میں ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے پھر پورا دائرہ ہو جاتا ہے پھر اس میں تدریجی کمی اسی طرح آتی ہے اس کی حقیقت دریافت کی یا حکمت و مصلحت کا سوال کیا دونوں احتمال ہیں مگر جو جواب دیا گیا اس میں حکمت و مصلحت کا بیان ہے اگر سوال ہی یہ تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت و مصلحت کیا ہے تب تو جواب اس کے مطابق ہو ہی گیا اور اگر سوال سے اس گھٹنے بڑھنے کی حقیقت دریافت کرنا مقصود تھا جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان سے بعید ہے تو پھر جواب بجائے حقیقت کے حکمت و مصلحت بیان کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اجرام سماویہ کے حقائق دریافت کرنا انسان کے بس میں بھی نہیں اور ان کا کوئی دینی یا دنیوی کام اس حقیقت کے علم پر موقوف بھی نہیں اس لئے حقیقت کا سوال فضول ہے پوچھنے اور بتلانے کی بات یہ ہے کہ چاند کے اس طرح گھٹنے بڑھنے چھپنے اور طلوع ہونے سے ہمارے کون سے مصالح وابستہ ہیں اس لئے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ تمہارے مصالح جو چاند سے وابستہ ہیں یہ ہیں کہ اس کے ذریعہ تمہیں اپنے معاملات اور معاہدوں کی میعاد مقرر کرنا اور حج کے ایام معلوم کرنا آسان ہو جائے گا۔

الشیخ احمد بن علی ابو بکر رازی جصاص حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ لفظ اَھِلَّه، لوگوں کے لئے تاریخوں کی تعیین کا مفہوم ادا کر رہا ہے اور یہ مفہوم تمام اَھِلَّه، کے لئے عام ہے اس بنا پر حج کے سلسلے میں بھی اس کا یہی حکم ہونا چاہیے، اس لئے کہ لوگوں کے لئے تاریخوں کی تعیین یعنی مواقیت کے لئے جن اَھِلَّه کا ذکر ہوا ہے بعینہ حج کے لئے بھی ان ہی اَھِلَّه کا ذکر ہوا ہے کیونکہ ارشاد باری ہے قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ اس بنا پر اگر ہم آیت کو افعال حج پر محمول کریں گے اور قول باری اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ میں مذکور معنیٰ پر اس کے مفہوم کو محدود کر دیں گے تو اس سے یہ نتیجہ بر آمد ہو گا کہ آیت قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ کا فائدہ ساقط ہو جائے گا، اس کے حکم کا انعدام ہو گا اور بغیر کسی دلیل کے اس کے لفظ کی تخصیص ہو جائے گی اور اس کا مفہوم قول باری اَلْحَجُّ

أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ کے مفہوم میں محدود ہو جائے گا۔

لیکن قاعدے کی رو سے جب ہر لفظ کو حکم اور فائدے کے لحاظ سے اس کا پورا پورا حق دینا واجب ہے تو یہ ضروری ہو گیا کہ آیت میں مذکور اَھِلَّه کو سال کے تمام ہلالوں پر محمول کیا جائے اور انہیں حج کے احرام کے لئے مواقیت شمار کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ سے اس فقہی مسئلے پر روشنی پڑتی ہے کہ اگر کسی عورت پر ایک مرد کی طرف سے دو عدتیں واجب ہو جائیں تو اس کے لئے ایک عدت گزار دینا دونوں کی طرف سے کافی ہو جائے گا اور وہ حیض اور مہینوں کے حساب سے نئے سرے سے دوسری عدت شروع نہیں کرے گی، پہلی مدت کی عدت ہی کافی ہو گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب تمام اَھِلَّه کو سب لوگوں کے لئے وقت کی تعیین کا ذریعہ قرار دیا تو اس نے ان میں کسی عدت کو وقت کے کسی ایک حصے کے ساتھ مخصوص نہیں کیا اور عدت کی مدت کا گزر جانا ان دونوں میں سے ہر عدت کے لئے وقت ہے کیونکہ ارشاد باری ہے فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا، تمہارے لئے ان عورتوں پر کوئی عدت نہیں جسے تم شمار کرنے لگو۔

آیت میں عدت کو شوہر کا حق قرار دیا، پھر جب عدت مرور اوقات کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ نے اَھِلَّه کو تمام لوگوں کے لئے وقت قرار دیا ہے تو یہ ضروری ہو گیا کہ دونوں عدتوں کے لئے ایک ہی مدت کے گزرنے کو کافی سمجھا جائے۔

ذرا اللہ تعالیٰ کے ارشاد هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ پر غور کیجیے اس کے خطاب کے مفہوم سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے، اَھِلَّه تمام لوگوں کے اجارہ (مکان یا دکان وغیرہ کرایہ پر دینا) کی مدتوں اور ان کے تمام قرضوں وغیرہ کی ادائیگی کے اوقات کی علامتیں ہیں اور ان میں سے کسی شخص کو بھی اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات کے لئے بعض اَھِلَّه کو خاص کرے اور دوسرے اَھِلَّه کو نظر انداز کر دے، ٹھیک اسی طرح عدت کے متعلق آیت کا مفہوم دو مردوں کے لئے ایک مدت کے گزر

جانے کا تقاضا کرتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمانا هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اگر عدت کی ابتدا چاند کے حساب سے ہو اور مدت کا حساب مہینوں کے لحاظ سے ہو تو اس مدت کی تکمیل بھی چاند کے تین مہینوں کے حساب سے واجب ہو گی اگر عدت کی مدت تین ماہ ہو یا عدت وفات کی صورت میں چاند کے حساب سے چار مہینے پورے کرنے ہوں گے، دنوں کی تعداد کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا۔

آیت کی اس پر بھی دلالت ہوتی ہے روزے کے مہینے کی ابتدا اور انتہا دونوں کا اعتبار چاند کے ذریعے ہو گا اور تعداد کی ضرورت رویت ہلال نہ ہونے کی صورت میں پیش آئے گی۔ آیت کی دلالت اس فقہی مسئلہ پر بھی ہو رہی ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی سے مہینے کی ابتدا میں ایلاء کیا تو طلاق واقع ہونے کے لئے چار ماہ کی مدت کا حساب چاند کے ذریعے ہو گا، تیس دنوں کا اعتبار نہیں ہو گا۔

یہ مسئلہ اجارے کی تمام صورتوں، قسموں اور قرضوں کی مدت کی تحدید وغیرہ کے لئے ہے کہ جب ان کی ابتداء ہلال یعنی چاند کی پہلی تاریخ سے ہو گی تو پھر ان کا حساب چاند کے مہینوں کے لحاظ سے ہو گا اور تیس دنوں کی گنتی کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، اس چیز کا حضور ﷺ نے اپنے فرمان صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَعُدُّوا ثَلَاثِينَ میں حکم دیا ہے کہ رویت ہلال نہ ہونے کی صورت میں تیس کی گنتی پوری کرنے کی طرف رجوع کیا جائے۔ (احکام القرآن)

قمری اور شمسی حساب کی شرعی حیثیت: حضرت مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت سے تو اتنا معلوم ہوا کہ چاند کے ذریعہ تمہیں تاریخوں اور مہینوں کا حساب معلوم ہو جائے گا جس پر تمہارے معاملات اور عبادات حج وغیرہ کی بنیاد ہے اسی مضمون کو سورۃ یونس کی آیت نمبر ۵ میں اس عنوان سے بیان فرمایا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ (یونس) جس سے معلوم ہوا کہ چاند کو مختلف منزلوں اور مختلف حالات سے گزارنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سال اور مہینوں اور تاریخوں کا حساب معلوم ہو سکے مگر سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۱۲ میں اس حساب کا

تعلق آفتاب سے بھی بتلایا گیا ہے وہ یہ ہے فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (۱۲: ۱۷) پھر مٹایارات کا نمونہ اور بنادیا دن کا نمونہ دیکھنے کو تاکہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا اور تاکہ معلوم کرو گنتی برسوں کی اور حساب۔ اس تیسری آیت سے اگرچہ یہ ثابت ہوا کہ سال اور مہینوں وغیرہ کا حساب آفتاب سے بھی لگایا جاسکتا ہے (کماذکرہ فی روح المعانی)

لیکن چاند کے معاملہ میں جو الفاظ قرآن کریم نے استعمال کئے ان سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعت اسلام میں حساب چاند ہی کا متعین ہے خصوصاً ان عبادات میں جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہے جیسے روزہ رمضان، حج کے مہینے، حج کے ایام، محرم، شب برأت وغیرہ سے جو احکام متعلق ہیں وہ سب رویت ہلال سے متعلق کئے گئے ہیں کیونکہ اس آیت میں هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ فرما کر بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حساب چاند ہی کا معتبر ہے اگرچہ یہ حساب آفتاب سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

شریعت اسلام نے چاند کے حساب کو اس لئے اختیار فرمایا کہ اس کو ہر آنکھوں والا اُفق پر دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے عالم، جاہل، دیہاتی، جزیروں، پہاڑوں کے رہنے والے جنگلی سب کو اس کا علم آسان ہے بخلاف شمسی حساب کے کہ وہ آلات رصدیہ اور قواعد ریاضیہ پر موقوف ہے جس کو ہر شخص آسانی سے معلوم نہیں کر سکتا پھر عبادات کے معاملہ میں تو قمری حساب کو بطور فرض متعین کر دیا اور عام معاملات تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا جو عبادت اسلامی کا ذریعہ ہے اور ایک طرح کا اسلامی شعار ہے اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا شرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہو جائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلا دیں کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات روزہ وحج وغیرہ میں خلل لازم آتا ہے جیسا اس زمانے میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی اور شخصی مکاتبات میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے بھی پورے یاد نہیں رہے

یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرت قومی وملی کا بھی دیوالیہ پن ہے اگر دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے ان میں صرف شمسی حساب رکھیں باقی نجی خط و کتابت اور روز مرہ کی ضروریات میں قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرض کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہو گا اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔ (معارف القرآن)

قرآن وسنت کی تعلیمات سے جو لوگ ناواقف ہیں وہ قمری کیلنڈر کی بجائے شمسی کیلنڈر کو ترجیح دیتے ہیں، چند سال پہلے تو ہمارے ہاں حکومتی سطح پر یہ نعرہ لگتے لگتے رہ گیا کہ پاکستان میں رویت ہلال کمیٹی کی ضرورت نہیں ہے وزارت سائنس اینڈ ٹیکنالوجی پورے سال کا کیلنڈر بنادے گی، جس کو دیکھ کر روزے رکھے جائیں گے اور اسے دیکھ کر عید کی جائے گی۔

رویت ہلال کے بکھیڑوں اور الجھیڑوں میں الجھنے اور کھپنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ دنیادار مغرب پرست حکمران اور ان کے آلہ کار اس طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں، مگر اللہ جزائے خیر دے علماء کرام کو وہ کبھی بھی ان حکمرانوں کے کروفر، جاہ وجلال، رعب ودبدبہ سے متأثر نہیں ہوتے، ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے احکامات اور نبی کریم ﷺ کے فرمودات وارشادات اولین حیثیت رکھتے ہیں، علماء کرام قرآن وسنت کی تعلیمات اور تعبیرات کے مطابق امت مسلمہ کی راہنمائی کرتے ہیں، قرآنی ونبوی تعلیمات سے ہمیشہ علماء کرام نے سمجھایا کہ شرعی اور دینی معاملات کا تعلق شمسی تقویم کی بجائے قمری تقویم سے ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اور نبی کریم ﷺ نے اپنے فرمودات میں وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔

حضرت مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چاند کے مہینوں سے دینی امور کو متعلق کرنے میں عوام اور خواص کے لیے اور پورے عالم کے انسانوں کے لیے آسانی بھی ہے، چاند شروع میں مغرب کی طرف چھوٹا سا نظر آتا ہے، اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب مہینہ شروع ہے پھر چند دن کے بعد پوری رات روشن رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ایام بیض کا زمانہ ہے پھر اخیر میں مشرق کی

طرف چھوٹا ہو کر نظر آنے لگتا ہے اور ایک دو دن بالکل ہی نظر نہیں آتا، اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب مہینہ کا آخر ہو رہا ہے۔ اگر شمسی مہینوں سے عبادات کا تعلق ہوتا تو اسے صرف حساب دان ہی سمجھ سکتے تھے اور ہر شخص کے پاس کیلنڈر اور جنتری ہونا ضروری تھا اور یہ یاد رکھنا ضروری تھا کہ کونسا مہینہ کتنے دن کا ہوتا ہے یہ سب باتیں عوام کے لیے سمجھنا اور یاد رکھنا مشکل تھا پھر کیلنڈر وغیرہ اب ترقی یافتہ دنیا میں چھپنے لگے وہ بھی ہر بستی اور ہر گھر میں نہیں ہوتے اور احکام اسلام چودہ سو سال سے نافذ ہیں پھر کیلنڈر اور جنتریوں پر عبادات کیسے موقوف رکھی جاسکتی ہیں، عوام اور خواص کے لیے یہ آسانی ہے کہ چاند دیکھا اور مہینے کی ابتداء اور انتہا سمجھ لی، سورج روزانہ ایک ہی طرح نکلتا اور چھپتا ہے، سردی گرمی میں اس کا طلوع غروب ایک ہی طرح ہے، اسے دیکھ کر مہینوں کی ابتداء اور انتہا سمجھنے کا کوئی راستہ نہیں۔ (انوار البیان)

راقم الحروف کے استاذ، محدث عظیم، ترمذی وقت شیخ موسیٰ روحانی بازی رحمہ اللہ اپنے دور میں فلکیات کے امام سمجھے جاتے تھے، علم ہئیت اور علم فلکیات پر انہیں دسترس حاصل تھی، انہوں نے فلکیات جدیدہ پر سورج، چاند اور ستاروں کے احوال پر سیر حاصل بحث کی ہے، انہوں نے قدیم وجدید ماہرین فلکیات کے خیالات و نظریات بھی پیش کیے ہیں، سیر القمر کے عنوان پر ایک چھوٹا سا رسالہ بھی تحریر فرمایا جو فلکیات جدیدہ کے ساتھ موجود ہے۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا: یہ نیکی نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پچھواڑے سے آؤ، امام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انصار میں سے کچھ لوگ ایسے تھے کہ جب عمرے کا تلبیہ کہتے تو اپنے اور آسمان کے درمیان حائل نہ ہونے دیتے اور اسے گناہ کی بات سمجھتے پھر کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی شخص عمرے کا تلبیہ کہتے ہوئے اپنے گھر سے نکلتا، اسے کوئی ضرورت پیش آجاتی تو واپس ہو کر دروازے سے گھر میں داخل نہ ہوتا تاکہ کمرے کی چھت اس کے اور آسمان کے درمیان حائل نہ ہو جائے، اس لئے وہ گھر کے پچھواڑے سے دیوار پھاڑ کر اندر داخل ہوتا اور کمرے کے دروازے پر

کھڑا ہو کر اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے اہل خانہ کو ہدایات دیتا اور واپس ہو جاتا۔

حضور ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر عمرے کا احرام باندھ کر تلبیہ کہا پھر اپنے حجرے میں داخل ہو گئے اور آپ کے پیچھے پیچھے انصار قبیلہ بنی سلمہ کا ایک شخص بھی کمرے میں داخل ہو گیا، حضور ﷺ نے اس سے فرمایا کہ میں احمس ہوں یعنی دین کے معاملے میں بڑا دلیر اور جوشیلا ہوں۔

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے آپ کو پر جوش دیندار کہلاتے تھے وہ تلبیہ کے بعد چھت کے نیچے جانے کی پروا نہیں کرتے تھے، یہ سن کر اس انصاری نے بھی کہا کہ میں بھی احمس ہوں یعنی میں بھی آپ کے دین پر ہوں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک گروہ ایسا تھا جو احرام باندھ کر گھر کی پچھلی دیوار میں بڑا سا سوراخ کر کے اس کے ذریعے آنا جانا کرتا، ان لوگوں کو اس قسم کی دینداری سے منع کر دیا گیا۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ نے بیان کی ہے کہ نیکی کو اس کے درست طریقے سے سر انجام دو، درست طریقہ یہی ہے جس کا حکم اللہ نے دیا ہے، تاہم اس میں کوئی امتناع نہیں کہ آیت میں یہ تمام باتیں اللہ کی مراد ہوں، اس طرح اس میں یہ بیان بھی ہے کہ گھر کے پچھواڑے سے گھر میں آنا تقرب الٰہی کا ذریعہ نہیں، نہ ہی یہ اللہ کی شریعت کا جز ہے اور نہ ہی اس کی ترغیب دی گئی ہے۔

ساتھ ہی یہ مثال بھی بن سکتی ہے جو اللہ نے لوگوں کے سامنے بیان کی ہے کہ تمام امور اسی ڈھنگ سے سر انجام دینے چاہئیں جس کا اللہ نے حکم دیا اور جس کی ترغیب دی ہے، اس میں یہ بھی بیان ہے کہ جو بات اللہ کی شریعت کا جز نہیں اور نہ ہی اللہ نے اس کی ترغیب دی ہے وہ نہ تو تقرب الٰہی کا ذریعہ بن سکتی ہے اور نہ ہی دینداری میں شمار ہو سکتی ہے کہ کوئی تقرب حاصل کرنے والا اسے قربت

یعنی عبادت سمجھ بیٹھے یا اس کے متعلق اس کا عقیدہ یہ ہو جائے کہ یہ دین ہے۔

سنت میں اس کی نظیر وہ حدیث ہے جو حضور ﷺ سے مروی ہے جس میں آپ نے دن بھر کی صمت یعنی چپ کے روزے سے منع فرمایا ہے جو رات تک ہو، اسی طرح آپ نے ایک شخص کو دھوپ میں کھڑا دیکھا، استفسار کرنے پر پتہ چلا کہ اس نے دھوپ میں کھڑے ہونے کی نذر مانی ہے، آپ نے اسے سائے میں چلے جانے کا حکم دیا۔

اسی طرح آپ نے صوم وصال سے منع فرمایا، اس لئے کہ رات کو تو روزہ نہیں ہوتا، اس لئے آپ نے یہ عقیدہ رکھنے سے روک دیا کہ رات کے وقت کا روزہ اور کھانے پینے سے پرہیز بھی کوئی قربت یعنی عبادت ہے، یہ تمام صورتیں اس اصول کی بنیاد ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز کی نذر مان لے جو قربت نہ ہو تو نذر کی بنا پر وہ چیز اس پر لازم نہیں آئے گی اور اسے اپنے اوپر واجب کر لینے سے یہ قربت نہیں بنے گی۔

اسی طرح اس پر بھی دلالت ہو رہی ہے کہ جس چیز کی اصلیت کی بنا وجوب پر نہ ہو تو وہ چیز نذر کی وجہ سے واجب نہیں ہوتی خواہ وہ قربت ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً مریض کی عیادت، کھانے کی دعوت میں شرکت، مسجد کی طرف پیدل جانا اور مسجد میں دیر تک بیٹھے رہنا وغیرہ۔

وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ: اللہ تعالیٰ یہاں واضح فرما رہے ہیں کہ خود ساختہ اور خانہ ساز طریقوں پر عمل کرنے سے نیکی کا تصور اجاگر نہیں ہوتا، اصل نیکی وہی ہے جو اللہ کے احکامات کی پیروی میں ہو، اللہ کی طرف سے منع کی گئی چیزوں سے رک جانے میں ہے، اس لیے فرمایا کہ اصل نیکی تقویٰ ہے اور تقویٰ نام ہے اللہ کے حکموں کے مطابق زندگی کے شب و روز گزارنے کا، ایک مفہوم اس کا یہ ہے کہ اصل نیکی اس شخص کی نیکی ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا۔

وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا: گھروں میں پچھواڑے کی طرف سے آنے کی بجائے سامنے کی طرف سے آنے کا حکم اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر کام درست طریقہ سے سرانجام دیا جائے، صراط

مستقیم کو اختیار کیا جائے، سیدھے راستے پر چلا جائے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرو تا کہ تم لوگ کامیاب ہو جاؤ، اللہ سے ڈرنے کا مفہوم یہ ہے کہ شریعت کے احکامات کی پیروی کرو اور جن چیزوں سے شریعت نے منع کیا ہے ان سے رک جاؤ، اس کا فائدہ فوز و فلاح کی شکل میں ملے گا، فلاح مقصود و مطلوب کے حصول کا نام ہے، انسان کی کس قدر خوش نصیبی ہے کہ اسے اس کا مقصود مل جائے، جب اللہ کی بارگاہ میں حاضری ہو گی تو اس شخص کو اس کے تقویٰ کا صلہ ملے گا اس کی کامیابی کی صورت میں۔

مسلمانوں کو جہاد کا حکم اور جہاد کی چند شرائط

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ {۱۹۰} وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ {۱۹۱} فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ {۱۹۲} وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ {۱۹۳} البقرہ

جواب ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو ان لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں، اور زیادتی مت کرو، بیشک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ اور تم ان کو قتل کرو جہاں بھی پالو، اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا، اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اور ان سے جنگ مت کرو مسجد حرام کے پاس جب تک کہ وہ تم سے اس میں خود نہ لڑیں۔ سو اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم ان کو قتل کر دو۔ ایسی ہی جزا ہے کافروں کی۔ سو اگر وہ باز آجائیں تو اللہ غفور رحیم ہے۔ اور ان سے یہاں تک جنگ کرو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور ہو جائے دین اللہ ہی کے لیے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو زیادتی نہیں ہے مگر ظالموں پر۔

شانِ نزول: حضرت ربیع رحمہ اللہ اور حضرت ابن زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ پہلی آیت ہے جس میں قتال و جہاد کا حکم دیا گیا، جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں سے جہاد کرتے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں سے ہاتھ روک لیتے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیتے تھے، یہ سلسلہ یونہی اس وقت تک چلتا رہا جب تک سورۃ التوبہ کی یہ آیت نازل نہیں ہوئی جس میں مشرکین کے خلاف قتال کا حکم نہیں آیا تھا، ارشاد ہوا فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ [التَّوْبَةِ: ۵] (تفسیر کبیر) یہ پہلی آیت ہے جو قتال کے بارے میں مدینہ شریف میں نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن کثیر)

اس آیت کے نزول سے متعلق ایک قول یہ ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام کے ہمراہ حج کے ارادہ سے نکلے اور حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ کیا، حدیبیہ ایسی جگہ ہے جہاں بہت زیادہ درخت اور وافر مقدار میں پانی دستیاب تھا، مگر مشرکین مکہ نے ان لوگوں کو بیت اللہ شریف میں حاضری دینے سے روک دیا، چنانچہ یہ لوگ ایک مہینہ تک اس طرح انتظار کرتے رہے کہ انہیں بیت اللہ شریف میں حاضری کی قدرت نہ ہوئی، پھر اہل مکہ نے اس شرط پر ان لوگوں سے مصالحت کی کہ وہ اب واپس چلے جائیں اور اگلے سال بیت اللہ شریف آئیں، ان کے لیے تین دن تک مکہ مکرمہ کھلا رہے گا، وہ بیت اللہ کا طواف، قربانیاں یہاں تک کہ جو چاہیں کر سکیں گے، اس شرط پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو گئے اور ان کے ساتھ مصالحت کر لی۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ شریف چلے گئے اور اگلے سال بیت اللہ شریف آنے کی تیاری شروع کر دی، مگر حضرات صحابہ کرام کو یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں قریش مکہ ان کے ساتھ وعدہ خلافی نہ کر دیں اور انہیں پھر مسجد الحرام میں داخلے سے روک نہ دیں اور ان سے کہیں لڑائی شروع نہ کر دیں، جب کہ خود صحابہ کرام حرمت والے مہینے میں اور حرم شریف میں ان کے ساتھ لڑائی اور قتال کو پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی یہ آیت مبارکہ نازل کرتے ہوئے ان کے ساتھ لڑائی کرنے کا طریقہ کار بیان فرمایا کہ اگر انہیں مکہ والوں کے ساتھ لڑائی کی ضرورت پیش

آجائے تو وہ کیسے لڑائی کریں، اس پر ارشاد فرمایا کہ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اللہ کی راہ میں لڑائی کرو۔ (مفاتیح الغیب)

اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑائی سے مقصود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور اللہ کی رضا طلب کرنا ہے، حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب پوچھا گیا کہ کون اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کرتا ہے، فرمایا وہ شخص جہاد کرتا ہے جس کا مقصد و مطلوب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو جائے، ریا، دکھلاوے اور شہرت کی طلب میں قتال نہ کرے۔ (مفاتیح الغیب)

عبد الرحمن بن زید بن سلام رحمہ اللہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے اور ناسخ آیت فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ (التوبہ: ۵) ہے یعنی جہاں کہیں مشرکین کو پاؤ انہیں قتل کرو، لیکن اس بارے میں اختلاف ہے اس لئے کہ اس سے تو مسلمانوں کو رغبت دلانا اور انہیں آمادہ کرنا ہے کہ اپنے ایسے دشمنوں سے کیوں جہاد نہ کرو جو تمہارے اور تمہارے دین کے کھلے دشمن ہیں، جیسے وہ تم سے لڑتے ہیں تم بھی ان سے لڑو جیسے اور جگہ فرمایا وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (التوبہ: ۳۶) یعنی مل جل کر مشرکوں سے جہاد کرو جس طرح وہ تم سے سب کے سب مل کر لڑائی کرتے ہیں، چنانچہ اس آیت میں بھی فرمایا انہیں قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں وہاں سے نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح ان کا قصد تمہارے قتل کا اور تمہیں جلا وطن کرنے کا ہے تمہارا بھی اس کے بدلے میں یہی قصد رہنا چاہیے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ: پھر فرمایا کہ حد سے تجاوز نہ کرو کیوں کہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والے کو پسند نہیں کرتے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرو ناک کان وغیرہ نہ کاٹو، خیانت اور چوری نہ کرو، عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرو، ان بوڑھے بڑے لوگوں کو بھی نہ مارو جو نہ لڑنے کے لائق ہیں نہ لڑائی میں دخل دیتے ہیں، درویشوں اور تارک دنیا لوگوں کو بھی قتل نہ کرو بلکہ بلا مصلحت

جنگی نہ درخت کاٹو نہ حیوانوں کو ضائع کرو۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت نبی کریم ﷺ مجاہدین اسلام کو باقاعدہ ہدایات دیتے تھے جن میں آپ ﷺ فرماتے کہ اغْزُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، قَاتِلُوا مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ، اغْزُوا وَلَا تَغُلُّوا، وَلَا تَغْدِرُوا، وَلَا تُمَثِّلُوا، وَلَا تَقْتُلُوا وَلِيدًا، وَلَا أَصْحَابَ الصَّوَامِعِ (مسلم) اللہ کی راہ میں جہاد کرو، خیانت نہ کرو، بدعہدی سے بچو، ناک کان وغیرہ اعضاء نہ کاٹو، بچوں کو اور زاہد لوگوں کو جو عبادت خانوں میں پڑے رہتے ہیں قتل نہ کرو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وُجِدَتِ امْرَأَةٌ فِي بَعْضِ مَغَازِي النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقْتُولَةً، فَأَنْكَرَ رسولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قتلَ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ (بخاری، مسلم) ایک غزوے میں ایک عورت قتل کی ہوئی پائی گئی حضور ﷺ نے اسے بہت برا مانا اور عورتوں اور بچوں کے قتل کو منع فرمادیا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک، تین، پانچ، سات، نو، گیارہ (طاق عدد) مثالیں ہمارے سامنے بیان کیں، ایک تو ظاہر کردی باقی چھوڑ دیں فرمایا کہ إِنَّ قَوْمًا كَانُوا أَهْلَ ضُعْفٍ وَمَسْكَنَةٍ، قَاتَلَهُمْ أهلُ تَجَبُّرٍ وَعَدَاءٍ، فَأَظْهَرَ اللّٰهُ أَهْلَ الضُّعْفِ عَلَيْهِمْ، فَعَمَدُوا إِلَى عَدُوِّهِم فَاسْتَعْمَلُوهُمْ وَسَلَّطُوهُمْ فَأَسْخَطُوا اللّٰهَ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ کچھ لوگ کمزور اور مسکین تھے کہ ان پر زور آور مالدار دشمن چڑھ آیا اللہ تعالیٰ نے ضعیفوں کی مدد کی اور ان طاقتوروں پر انہیں غالب کردیا اب ان لوگوں نے ان پر ظلم وزیادتی شروع کردی جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے ان ضعیفوں کی مدد کی اور ان طاقتوروں پر انہیں غالب کردیا اب ان لوگوں نے ان پر ظلم وزیادتی شروع کردی جس کے باعث اللہ تعالیٰ ان پر قیامت تک کے لئے ناراض ہوگیا۔ (مسند احمد)

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ: یہ آیت واقعہ حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی ہے جب صلح حدیبیہ کی شرط کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

کے ساتھ اس عمرہ کی قضاء کے لئے سفر کا ارادہ کیا جس سے اس سے پہلے سال میں کفار مکہ نے روک دیا تھا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس سفر کے وقت یہ خیال ہو رہا تھا کہ کفار کی صلح اور معاہدہ کا کچھ بھروسہ نہیں اگر وہ لوگ اس سال بھی آمادہ پیکار ہو گئے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے اس پر آیت مذکورہ کے الفاظ نے ان کو اجازت دے دی کہ اگر وہ قتال کرنے لگیں تو تمہیں بھی اجازت ہے کہ جہاں پاؤ ان کو قتل کرو اور اگر قدرت میں ہو تو جس طرح انہوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا تم بھی ان کو مکہ سے نکال دو۔

مسلمان حرم وحدود حرم میں بامر مجبوری قتال کی اجازت ملنے کے باوجود کئی باتیں سوچتے تھے کہ کہیں کوئی نافرمانی نہ ہو جائے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے تلقین فرمائی کہ بیت اللہ کا حج تم پر فرض ہے اور ملت ابراہیم کے اصلی وارث ہونے کی حیثیت سے یہ تمہارا حق بھی ہے بلکہ اس کے اصلی حق دار تم ہی ہو اس وجہ سے اگر تمہارے اس حق و فرض کی راہ میں قریش رکاوٹ ڈالتے ہیں تو تم لوگ ان کا مقابلہ کرو اور جہاں کہیں ان سے جھگڑا ہو وہیں ان کو مار ڈالو، اگرچہ اس قتال کی نوبت حرم اور حدود حرم ہی میں پیش آجائے اور جس مکہ سے انہوں نے تم کو نکالا تھا تم بھی ان کو وہاں سے نکالو، اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی وراثت صرف نسل و نسب کی بنا پر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق اس کے اصلی حق دار وہ ہیں جو ان کے دین اور ان کی ملت پر قائم ہیں، یہ مقام تمہیں حاصل ہے نہ کہ مشرکین مکہ کو۔

اس لیے مشرکین مکہ بیت اللہ سے نکالے جانے کے لائق ہیں تم لوگ مکہ مکرمہ سے نکالے جانے کے لائق نہیں ہو۔ اسی آیت کی روشنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مشرک کو مکہ مکرمہ سے نکال باہر کیا تھا اور اسی آیت کی روشنی میں ہر مشرک کو مدینہ منورہ سے نکال باہر کیا تھا۔ (مفاتیح الغیب)

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فتنہ سے مراد کفر کرنا ہے، کفر کا نام فتنہ اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ کفر زمین میں وہ فساد ہے جو ظلم و قتل کی طرف انسان کو لے

جاتا ہے، تو پھر یہی قتل و ظلم ہی فتنہ قرار پاتا ہے، اس لیے کفر کو قتل سے بڑا قرار دیا گیا، اس لیے کہ کفر وہ گناہ ہے جو کافر کو ہمیشہ کے عذاب کا مستحق بنا دیتا ہے، جب کہ قتل ہونے والے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب میں رہے گا، کفر ایسی چیز ہے جو کافر کو دین و ملت سے باہر نکال دیتا ہے جب کہ قتل کی وجہ سے بندہ دین و ملت سے باہر نہیں نکلتا، اس لیے کفر قتل سے بھی بڑا جرم ہے۔

شان نزول: اس آیت کے سبب نزول میں یہ بات مروی ہے کہ بعض صحابہ نے ایک کافر کو حرمت والے مہینے میں قتل کر دیا تو اہل ایمان نے ایسا کرنے کو معیوب سمجھا، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ کافروں کا کفر حرمت والے مہینے اور احرام سے کہیں بڑھا ہوا ہے، یعنی اسے حرمت والے مہینے میں جنہوں نے مار ڈالا درست کیا۔ (اللباب فی علوم الکتاب، تفسیر رازی، تفسیر نیشاپوری) امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم حرمت والے مہینے میں قتل کرنے کو بڑا گناہ نہ خیال کرو کیونکہ کافروں کا کفر حرمت والے مہینے میں قتل سے بڑھ کر ہے۔

فتنہ کا اصل معنیٰ عربی زبان میں زر گر اور سنار کا بھٹی پر سونے کو رکھ کر اس کے اندر سے کھوٹ کو نکالنا ہے، پھر یہ ہر اس چیز کا نام پڑ گیا جو کسی امتحان و آزمائش کا سبب ہو، مطلب یہ ہے کہ کافروں کا کفر کرنا، مسلمانوں کو ڈرانا دھمکانا، ان کے لیے مسائل کھڑے کرنا کہ وہ اپنے وطن، اپنے گھر بار کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے، وہ ان کے خوف و ڈر سے اپنی جانیں بچانے کی فکر میں لگ گئے یہ سب کچھ بہت بڑا فتنہ ہے، یہ ایسا فتنہ ہے جو قتل سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے، یہ ایسا فتنہ ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دنیا کو اس فتنہ سے پاک صاف کیا جائے، اس کی قہرمانیوں سے دنیا کو نجات دلائی جائے، اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے یہی طریقہ بہترین ہے کہ ان کی گردنیں ناپی جائیں اور انہیں قتل کر دیا جائے۔

فتنہ کا ایک مفہوم دائمی عذاب ہے جو انہیں پکڑے گا اور اپنی گرفت میں لے گا ان کے کفر کی وجہ سے، اس لیے فرمایا گیا کہ انہیں جہاں پاؤ قتل کر ڈالو، ان کے ناپاک وجود سے دھرتی کو پاک کر دو،

یہاں ان کی گردن مار دینا ہی بہتر ہے کیونکہ ان شریروں کے لیے اللہ کا عذاب اس قتل وخون ریزی سے کہیں زیادہ سخت ہو گا، اس لیے عذاب پر فتنہ کا لفظ استعمال کرنا بھی جائز ہوا، اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ آگ پر پیش کیے جائیں گے، سورۃ الذاریات میں اللہ نے فتنہ استعمال فرمایا، ایک مقام پر مجہول کا صیغہ استعمال فرمایا اور ایک مقام پر مصدر استعمال فرمایا، دونوں مقام پر عذاب ہی مراد ہے۔

مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو مسجد الحرام میں آنے سے روکا، انہیں اللہ کی بندگی سے روکا، حالانکہ جنوں اور انسانوں کی پیدائش کا مقصد اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا کہ یہ میری بندگی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے ان کے اس جرم کو انہیں حرم شریف میں قتل کرنے سے بڑا جرم قرار دیا گیا۔

وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ: یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسجد الحرام میں ان سے اس وقت تک لڑائی نہ کرو جب تک وہ تمہارے ساتھ مسجد الحرام میں لڑائی نہ کریں، جیسے بخاری و مسلم میں ہے کہ إِنَّ هَذَا الْبَلَدَ حَرَّمَهُ اللَّهُ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ، فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَلَمْ يَحِلَّ لِي إِلَّا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ، وَإِنَّهَا سَاعَتِي هَذِهِ، حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، لَا يُعْضَدُ شَجَرُهُ، وَلَا يُخْتَلَى خَلَاهُ. فَإِنْ أَحَدٌ تَرَخَّصَ بِقِتَالِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُولُوا: إِنَّ اللَّهَ أَذِنَ لِرَسُولِهِ وَلَمْ يَأْذَنْ لَكُمْ

یہ شہر حرمت والا ہے آسمان و زمین کی پیدائش کے زمانے سے لے کر قیامت تک باحرمت ہی ہے صرف تھوڑے سے وقت کے لئے اللہ تعالیٰ نے میرے لئے اسے حلال کر دیا تھا لیکن وہ آج اس وقت بھی حرمت والا ہے اور قیامت تک اس کا یہ احترام اور بزرگی باقی رہے گی اس کے درخت نہ کاٹے جائیں اور اس کے کانٹے نہ اکھیڑے جائیں اگر کوئی شخص اس میں لڑائی کو جائز کہے اور میری جنگ کو دلیل میں لائے تو تم کہہ دینا اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے رسول ﷺ کو تھوڑے سے وقت کے لیے اجازت دی تھی لیکن تمہیں کوئی اجازت نہیں، آپ ﷺ کے اس فرمان سے مراد فتح مکہ کا دن ہے جس دن آپ ﷺ نے مکہ والوں سے جہاد کیا تھا اور مکہ کو فتح کیا تھا چند مشرکین بھی مارے گئے تھے۔

گو بعض علماء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ مکہ صلح سے فتح ہوا حضور ﷺ نے صاف ارشاد فرمادیا تھا کہ مَنْ أَغْلَقَ بَابَهُ فَهُوَ آمِنٌ، وَمَنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَهُوَ آمِنٌ، وَمَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِي سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ جو شخص اپنا دروازہ بند کرلے وہ امن میں ہے جو مسجد میں چلا جائے امن میں ہے جو ابو سفیان کے گھر میں چلا جائے وہ بھی امن میں ہے۔ یہی وہ تاریخی موقع تھا جب نبی کریم ﷺ نے اپنے دشمنوں کے لیے عام معافی کا اعلان کردیا تھا، جنہوں نے مکہ مکرمہ سے آپ ﷺ کو ہجرت پر مجبور کیا تھا۔

فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ: ہاں اگر وہ تم سے یہاں لڑائی شروع کردیں تو تمہیں اجازت ہے کہ تم بھی یہیں ان سے لڑو تاکہ یہ ظلم دفع ہو سکے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حدیبیہ والے دن اپنے اصحاب سے لڑائی کی بیعت لی جب قریشیوں نے اپنے ساتھیوں سے مل کر یورش کی تھی تب آپ ﷺ نے درخت تلے اپنے اصحاب سے بیعت لی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس لڑائی کو دفع کردیا چنانچہ اس نعمت کا بیان اس آیت میں ہے کہ وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ الفتح: ۲۴) پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ کفار حرم میں لڑائی بند کردیں اور اس سے باز آجائیں اور اسلام قبول کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف فرمادے گا گو انہوں نے مسلمانوں کو حرم میں قتل کیا ہو باری تعالیٰ ایسے بڑے گناہ کو بھی معاف فرمادے گا۔

كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ: جو اللہ کا انکار کرے اس کا بدلہ اور سزا یہی ہے کہ وہ صفحہ ہستی پر باقی نہ رہے، اس کے لیے زمین کا پیٹ زمین کی پشت سے بہتر ہے، عجیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کافروں کے ساتھ بھی ایسا کیا جائے جو وہ اوروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ (البحر المدید) مطلب یہ ہے کہ مشرکوں کی سزا قتل سے کم نہیں ہے اور نہ ہی انہیں باقی رکھنے میں کوئی مصلحت ہے۔ (التحریر والتنویر) مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کا مقابلہ میدان قتال وجہاد میں کافروں سے ہو تو مسلمان ان کے قتل میں کوئی حرج نہ سمجھیں، ان پر کوئی مہربانی، کوئی نرمی، کوئی رشتہ داری ونسب کے ترحمانہ جذبات ان میں نہ آئیں، اگرچہ مقابلے میں جو کفار ہیں وہ مسلمانوں کے والد اور ان کے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں، ان

کے بھائی ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ ان لوگوں نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے، مسلمانوں پر سرکشی کی ہے، ان لوگوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے باہر نکالا ہے، ان لوگوں نے مسلمانوں کو ان کے دین سے متعلق آزمائش میں ڈالا ہے، یہ ان کافروں کا وطیرہ رہا ہے کہ وہ جس مسلمان پر غلبہ پاتے ہیں اسے اپنی شر انگیزیوں اور زیادتیوں کا نشانہ بناتے ہیں، کیا کچھ مکی زندگی میں کافروں نے مسلمانوں کے ساتھ نہیں کیا، ان کے مظالم کی داستانیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں، ان کے مظالم مسفلہ کی گلیاں جانتی ہیں، ان کے مظالم جبل ابو قبیس کے دامن سے لے کر شاہراہ ہجرت تک پھیلے ہوئے ہیں، اس لیے یہ قابل معافی نہیں ہیں۔

لفظ جزا (بدلہ) احسان یا برائی کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، جزا کا لفظ محسن (نیکوکار) کے اس ثواب پر بولا جاتا ہے جو نیکوکار کی نیکی پر اسے دیا جاتا ہے، جزا کا لفظ گناہ گار، خطاکار کی سزا پر بولا جاتا ہے جب اسے اس کے کیے کی سزا دی جائے، گویا کہ جزا کا لفظ دونوں مقامات پر بولا جاتا ہے (الوسیط)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں ان کافروں کو پکڑ لو، جس حال میں ہوں انہیں قتل کرو، انہیں مکہ مکرمہ سے نکالو جس طرح انہوں نے تمہیں یہاں سے نکالا تھا، حرم مکہ میں انہوں نے مسلمانوں کو ان کے دین بارے آزمائش میں ڈالا تھا، مسلمانوں کو طرح طرح کی سزائیں دے کر انہیں تکالیف سے دوچار کیا تھا، مسلمانوں کے مالوں پر انہوں نے ہاتھ صاف کیے تھے، انہیں ان کے وطن مالوف سے زبردستی باہر نکلنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ (تفسیر الوسیط للزحیلی)

اللہ تعالیٰ کافروں کے ظلم وطغیان سے مسلمانوں کو بچانا چاہتے ہیں، مسلمان حرمت والے مہینوں میں اللہ کے حکم کے مطابق لڑائی نہیں کرتے، لیکن یہ اس وقت تک ہے جب تک دوسرا فریق بھی ان سے لڑائی نہ کرے، جب کافر اس بات کی پابندی نہیں کرتے تو اللہ اپنے ماننے والوں کو شکست کا لقمہ کیسے بننے دے، جب دونوں فریق اس بات کا خیال رکھیں تو فبہا، اگر کافر حرمت والے مہینوں کی مخالفت کریں تو پھر مسلمانوں کو بھی لڑائی کی اجازت ہے۔ (تفسیر الشعراوی)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے کہ وہ کافروں کو اسی طرح کی سزا دیتا ہے، اسی طرح کا انہیں عذاب دیتا ہے کیونکہ ان کافروں نے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو پھلانگا ہے، حدود الٰہی کو پھلانگنے کی وجہ سے انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اس لیے بھی کہ انہوں نے عدوان اور سرکشی میں پہل کی ہے، اس لیے انہیں اپنے کیے کی سزا ملے گی۔ (تفسیر مراغی)

فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ: پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے، صرف باز آنا ہی کافی نہیں، مسلمانوں پر تشدد سے باز آجائیں، جنگ سے باز آجائیں، کفر سے بھی باز آجائیں تب وہ معافی اور مہربانی کے مستحق ہوں گے، صرف جنگ سے باز آنے کے لئے تو یہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان حالت امن کا اعلان کردیں، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کفار اللہ کی مغفرت اور رحمت کے بھی مستحق ہو جائیں، ہاں یہاں مغفرت اور رحمت کی طرف اشارے سے مراد یہ ہے کہ کفار کو ایمان کی ترغیب دی جائے تاکہ کفر اور تشدد کے چھوڑ دینے کے بعد وہ اللہ کی مغفرت اور اس کی رحمت کے مستحق بھی ہو جائیں۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر مشرکین حرم میں لڑائی سے رک جائیں اور اسلام کی طرف رجوع کرلیں اور اپنے جرائم سے توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ بہت ہی بخشنے والا، بہت مہربان ہے، اللہ ان کے گناہوں کو معاف کردے گا، اگرچہ ان مشرکوں نے مسلمانوں کو اللہ کے حرم میں ہی کیوں نہ قتل کیا ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی بڑا گناہ اس طرح کا نہیں ہے جسے وہ معاف نہ کرے جب کوئی معافی کا طلب گار، توبہ کا خواست گار اس کی طرف رجوع کرے۔ (ابن کثیر)

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ: ان مشرکین سے جہاد جاری رکھو تاکہ یہ شرک کا فتنہ مٹ جائے اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب اور بلند ہو جائے اور تمام ادیان پر ظاہر ہو جائے، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایک شخص اپنی بہادری جتانے کے لئے لڑتا ہے ایک شخص حمیت و غیرت قومی کی خاطر لڑتا ہے، ایک شخص ریاکاری اور دکھاوے

کے طور پر لڑتا ہے تو فرمایئے کہ ان میں سے کون شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا وہی ہے جو صرف اس لئے لڑے کہ اللہ تعالیٰ کی بات بلند ہو اس کے دین کا بول بالا ہو۔ (بخاری و مسلم)

حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، فَإِذَا قَالُوهَا عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ (بخاری و مسلم) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں ان کی جان و مال کا تحفظ میرے ذمہ ہو گا مگر اسلامی احکام اور ان کا باطنی حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔

فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ: اگر یہ کفار شرک و کفر سے اور تمہیں قتل کرنے سے باز آجائیں تو تم بھی ان سے رک جاؤ اس کے بعد جو قتال کرے گا وہ ظالم ہو گا اور ظالموں کو ظلم کا بدلہ دینا ضروری ہے، حضرت مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لڑیں ان سے ہی لڑا جائے، یا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ان حرکات سے رک جائیں تو وہ ظلم یعنی شرک سے ہٹ گئے پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان سے جنگ و جدال ہو، یہاں لفظ عدوان جو کہ زیاتی کے معنی میں ہے وہ زیادتی کے مقابلہ میں زیادتی کے بدلے کے لئے ہے حقیقتاً وہ زیادتی نہیں۔ (ابن کثیر)

حرمت والے مہینوں میں زیادتی کا جواب

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ {۱۹۴} البقرۃ

جواب ترجمہ: حرمت والے مہینے کا بدلہ حرمت والا مہینہ ہے اور سب قابل تعظیم باتوں کا بدلہ ہے پھر جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی کہ اس نے تم پر زیادتی کی اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

شان نزول: ذوالقعدہ سن ۶ ہجری میں نبی کریم ﷺ عمرے کے لئے صحابہ کرام سمیت مکہ کو تشریف لے چلے لیکن مشرکین نے آپ کو حدیبیہ والے میدان میں روک لیا بالآخر اس بات پر صلح ہوئی کہ آئندہ سال آپ عمرہ کریں اور اس سال واپس تشریف لے جائیں چونکہ ذی القعدہ کا مہینہ بھی حرمت والا مہینہ ہے اس لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

نبی کریم ﷺ حرمت والے مہینوں میں جنگ نہیں کرتے تھے ہاں اگر کوئی آپ پر چڑھائی کرے تو اور بات ہے بلکہ جنگ کرتے ہوئے اگر حرمت والے مہینے آجاتے تو آپ لڑائی موقوف کر دیتے (مسند احمد)

حدیبیہ کے میدان میں بھی جب نبی کریم ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مشرکین نے قتل کر دیا جو کہ نبی کریم ﷺ کا پیغام لے کر مکہ کی طرف گئے تھے تو آپ ﷺ نے اپنے چودہ سو صحابہ سے ایک درخت تلے مشرکوں سے جہاد کرنے کی بیعت لی پھر جب معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے تو آپ ﷺ نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور صلح کی طرف مائل ہو گئے۔

انفاق فی سبیل اللہ، ہلاکت سے بچاؤ اور احسان کا حکم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۹۵)البقرہ

جواب ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور نہ ڈالو اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں، اور خوبی کے ساتھ کام کیا کرو، بیشک اللہ تعالیٰ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

شان نزول: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے (بخاری) حضرت ابو عمران رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مہاجرین میں سے ایک نے قسطنطنیہ کی جنگ میں کفار کے لشکر پر دلیرانہ حملہ کیا اور ان کی صفوں کو چیرتا ہوا ان میں گھس گیا تو بعض لوگ

کہنے لگے کہ یہ دیکھو یہ اپنے ہاتھوں اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے، حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا اس آیت کا صحیح مطلب ہم جانتے ہیں سنو! یہ آیت ہمارے ہی بارے میں نازل ہوئی ہے ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی آپ کے ساتھ جنگ وجہاد میں شریک رہے آپ کی مدد پر تلے رہے، یہاں تک کہ اسلام غالب ہوا اور مسلمان غالب آگئے تو ہم انصاریوں نے ایک مرتبہ جمع ہو کر آپس میں مشورہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے ساتھ ہمیں مشرف فرمایا، ہم آپ کی خدمت میں لگے رہے، آپ کی ہمرکابی میں جہاد کرتے رہے، اب بحمد اللہ اسلام پھیل گیا مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا، لڑائی ختم ہو گئی، ان دنوں میں نہ ہم نے اپنی اولاد کی خبر گیری کی، نہ مال کی دیکھ بھال کی نہ کھیتیوں اور باغوں کا کچھ خیال کیا، اب ہمیں چاہیے کہ اپنے خانگی معاملات کی طرف توجہ کریں اس پر یہ آیت نازل ہوئی، پس جہاد کو چھوڑ کر بال بچوں اور بیوپار تجارت میں مشغول ہو جانا یہ اپنے ہاتھوں اپنے تئیں ہلاک کرنا ہے (ابو داود، ترمذی، نسائی وغیرہ)

ایک اور روایت میں ہے کہ قسطنطنیہ کی لڑائی کے وقت مصریوں کے سردار حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ تھے اور شامیوں کے سردار یزید بن فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ تھے، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ اگر میں اکیلا تنہا دشمن کی صف میں گھس جاؤں اور وہاں گھر جاؤں اور قتل کر دیا جاؤں تو کیا اس آیت کے مطابق میں اپنی جان کو آپ ہی ہلاک کرنے والا بنوں گا؟ آپ نے جواب دیا نہیں نہیں اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ (النسآء: ۸۴) اے نبی اللہ کی راہ میں لڑتا رہ تو اپنی جان کا ہی مالک ہے اسی کو تکلیف دے، یہ آیت تو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے رک جانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے (ابن مردویہ وغیرہ)

ترمذی کی ایک اور روایت میں اتنی زیادتی ہے کہ آدمی کا گناہوں پر گناہ کئے چلے جانا اور توبہ نہ کرنا یہ اپنے ہاتھوں اپنے تئیں ہلاک کرنا ہے۔ (ترمذی)

حضرت ضحاک بن ابو جبیرہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انصار اپنے مال اللہ کی راہ میں کھلے دل سے خرچ کرتے رہتے تھے لیکن ایک سال قحط سالی کے موقع پر انہوں نے وہ خرچ روک لیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی، حضرت امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس سے مراد بخل کرنا ہے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ گنہگار کا رحمت باری سے ناامید ہو جانا یہ ہلاک ہونا ہے اور حضرات مفسرین بھی فرماتے ہیں کہ گناہ ہو جائیں پھر بخشش سے ناامید ہو کر گناہوں میں مشغول ہو جانا اپنے ہاتھوں پر آپ ہلاک ہونا ہے۔ التَّهْلُكَة سے مراد اللہ کا عذاب بھی بیان کیا گیا ہے۔

وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ: لفظ أَحْسِنُوا باب افعال امر کا صیغہ ہے اور احسان حسن سے ماخوذ ہے، حسن خوبی اور اچھائی کو کہتے ہیں اور احسان کسی کام کو عمدہ طریقے پر انجام دینے کو کہا جاتا ہے جو کام کیے جائیں ان کی شرائط اور آداب کا خیال رکھا جائے، تاکہ ان میں صفت احسان پیدا ہو جائے اور خوبی کے ساتھ انجام دینا صادق آجائے۔

حج اور عمرہ کے احکامات

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذَلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ {۱۹۶} البقرۃ

جواب ترجمہ: اور پورا کرو حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے۔ پس اگر تم کو روک دیا جائے تو قربانی کا جانور جو میسر ہو ذبح کر دو، اور اپنے سروں کو اس وقت تک نہ مونڈو جب تک کہ قربانی کا جانور اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے۔ سو جو شخص تم میں سے مریض ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو فدیہ دے دے روزوں سے

یا صدقے سے یا قربانی کے جانور سے پھر جب تم امن کی حالت میں ہو سو جو شخص عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر منتفع ہو تو قربانی کا جانور جو میسر ہو ذبح کر دے، سو جو شخص نہ پائے تو تین دن کے روزے ہیں حج میں اور سات دن کے روزے ہیں جب کہ تم لوٹ آؤ۔ یہ پورے دس ہوئے۔ یہ اس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام میں حاضر نہ ہوں۔ اور اللہ سے ڈرو، اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ سخت عذاب والا ہے۔

حج کی فرضیت: جو شخص مکہ معظمہ تک سواری پر آ جا سکتا ہو اور سفر کے اخراجات اس کے پاس ہوں اور بال بچوں کے لیے ضروری اخراجات بھی موجود ہوں اس پر حج کرنا فرض ہے اور حج زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے اس سے زیادہ جو کوئی شخص حج کرے گا تو وہ نفل ہو گا۔ حج کے کام آٹھ ذوالحجہ سے شروع ہوتے ہیں اور بارہ تیرہ ذوالحجہ تک ختم ہو جاتے ہیں، البتہ طواف وداع اس وقت ہو گا جب مکہ معظمہ سے واپس آنے لگیں گے اگرچہ اس سے پہلے بھی جائز ہے (بشرطیکہ اس سے پہلے طواف زیارت کر چکا ہو) چونکہ افعال حج کے لیے ایام مقرر ہیں اس لیے حج میں یہ بات نہیں ہے کہ جب چاہے کر لیں۔ اور عمرہ پورے سال میں جس وقت چاہے کر سکتا ہے اس کی کوئی تاریخ مقرر نہیں البتہ ایام حج میں یعنی ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳ ذوالحجہ کو عمرہ کرنا فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔ (کیونکہ یہ ایام حج کی مشغولیت کے ہیں) عمرہ زندگی میں ایک مرتبہ کر لینا سنت ہے، اگر کسی کو مقدور ہو تو عمرہ کی فضیلت سے محروم نہ ہو۔ (انوار)

عمرہ میں احرام اور طواف دو چیزیں فرض ہیں اور صفا مروہ کی سعی اور حلق یا قصر (سر منڈانا یا کاٹنا) جس سے احرام سے نکل جائے یہ دونوں چیزیں واجب ہیں، حج اور عمرہ دونوں کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک درمیانی گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور (جس میں گناہ نہ کیے ہوں) اس کی جزا جنت ہی ہے (صحیح بخاری) اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے اللہ کے لیے حج کیا اور ایسی باتیں نہ کیں جو مرد و عورت کے درمیان ہوتی ہیں اور گناہ نہ کیے وہ (حج کر کے) ایسا واپس ہو گا جیسا کہ اس دن

(بے گناہ) تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔ (صحیح بخاری) اور رمضان المبارک میں عمرہ (ثواب میں) حج کے برابر ہے۔ (بخاری) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حج و عمرہ کے درمیان متابعت کرو (کہ ایک کے بعد دوسرے کو ادا کرو) کیونکہ وہ دونوں تنگ دستی اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جیسے بھٹی سونے چاندی اور لوہے کے میل کچیل کو دور کر دیتی ہے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ انوار البیان)

حج نہ کرنے پر وعید: جو لوگ حج کے لیے جاتے ہیں وہ حج سے پہلے یا حج کے بعد عمرہ کر ہی لیتے ہیں لیکن جو لوگ غیر ایام حج میں مکہ مکرمہ جا کر عمرہ کر کے چلے آتے ہیں اور پھر زندگی بھر حج فرض کے لیے نہیں جاتے وہ لوگ ترک حج کر کے گنہگار ہوتے ہیں جس کی وعید بہت شدید ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جسے مجبوری نے، ظالم بادشاہ نے، یا روکنے والے مرض نے حج سے نہ روکا اور مر گیا اور حج نہ کیا تو چاہے یہودی ہونے کی حالت میں مر جائے یا نصرانی ہونے کی حالت میں مر جائے۔

احرام: حج اور عمرہ احرام کے بغیر نہیں ہو سکتا، حج یا عمرہ کی نیت کر کے تلبیہ (یعنی لبیک اللھم لبیک اخیر تک) پڑھنے سے احرام میں داخل ہو جاتا ہے، ممنوعات اور محظورات دونوں احراموں کے ایک ہی ہیں، ان کی خلاف ورزی پر بعض صورتوں میں دم (یعنی حرم مکہ میں ایک سال کی بکری یا بکرا ذبح کرنا) اور بعض صورتوں میں صدقہ بقدر صدقہ فطر واجب ہوتا ہے۔ (تفسیر انوار البیان)

احرام کے ممنوعات: احرام کے ممنوعات یہ ہیں ① خوشبو استعمال کرنا۔ ② جسم سے بال دور کرنا۔ ③ ناخن کاٹنا۔ ④ خشکی کا شکار کرنا۔ ⑤ میاں بیوی والے خاص تعلق کو کام میں لانا اور شہوت کے کام کرنا۔ ⑥ مرد کو ایسا کپڑا پہننا جو پورے بدن یا کسی ایک عضو کی ہیئت اور ساخت پر سی کریا بن کریا چپکا کر تیا کیا گیا ہو۔ ⑦ مرد کو سر یا چہرہ کو کپڑا لگانا اور عورت کو چہرہ پر کپڑا لگانا (اجنبی مردوں سے پردہ کرنے کے لیے چہرہ سے ہٹا کر چادر وغیرہ لٹکا لے، پردہ احرام میں بھی لازم ہے)۔

مرض کی مجبوری سے اگر بال دور کرے یا ناخن کاٹے یا مرد سلا ہوا کپڑا پہنے یا سر ڈھانکے یا چہرہ

ڈھانکے یا عورت چہرہ ڈھانکے تو اس کے لیے رعایت ہے، جب حج یا عمرہ کے احرام سے نکلنے کا شرعاً موقع آجائے اس وقت بال مونڈ کر یا بال کاٹ کر احرام سے نکل جائے، اس وقت سے پہلے بالوں کے مونڈنے یا تراشنے سے جزا لازم ہوگی، عورتوں کو احرام سے نکلنے کے لیے سر مونڈھنا حرام ہے، وہ پورے سر کے بال بقدر ایک پَورے کے کاٹ کر احرام سے نکل جائے، اگر کسی مرد نے بقدر ایک پَورے کے چوتھائی سر کے بال کاٹ دیئے یا عورت نے چوتھائی سر کے بال اپنی چوٹی سے بقدر ایک پورے کے کاٹ دیئے تو احرام سے نکل جائیں گے بشرطیکہ احرام سے نکلنے کا وقت ہو چکا ہو۔ (انوار)

اِحصار کے احکام: اگر کسی مرد یا عورت نے حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیا اور کسی مرض یا دشمن یا درندہ کی وجہ سے آگے بڑھنے سے روک دیا گیا کہ حج کے احرام والا نہ عرفات جاسکتا ہے نہ طواف کر سکتا ہے اور عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد طواف سے روک دیا گیا تو اس کو احصار کہتے ہیں اور جس محرم کو روک دیا گیا ہو اسے محصر کہتے ہیں، محصر اگر انتظار نہیں کر سکتا اور احرام سے نکلنا چاہتا ہے تو وہ حدود حرم میں ایک سال کی بکری ذبح کر دے ایسا کرنے سے احرام سے نکل جائے گا اور اس کے بعد احرام کی پابندیاں ختم ہو جائیں گی اگر حدود حرم میں خود موجود نہیں ہے تو جس جگہ بھی ہے وہاں سے کم از کم ایک سال کی بکری یا بکرا یا اس کی قیمت بھیج دے اور جس کے ذریعے بھیجے اس سے وقت مقرر کر لے کہ فلاں دن فلاں وقت ذبح کر دے، جب وہ وقت آجائے اور غالب گمان ہو جائے کہ اب جانور ذبح ہو چکا ہو گا تو احرام سے نکل جائے۔

اب اگر ان کاموں میں سے کوئی کام کرے گا جو احرام کی وجہ سے ممنوع تھے تو جزا لازم نہ ہو گی اور صرف جانور ذبح ہو جانے سے احرام سے نکل جائے گا مگر بہتر یہ ہے کہ مرد محصر ہو تو سر بھی منڈا دے، اگر کوئی شخص قارن تھا یعنی اس نے حج اور عمرہ کا ایک ساتھ احرام باندھا تھا تو وہ حدود حرم میں دو جانور ذبح کرائے جب یہ دونوں جانور ذبح ہو جائیں گے تو وہ دونوں احراموں سے نکل جائے گا۔ (انوار البیان)

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ: حج زندگی میں صاحب حیثیت آدمی پر ایک بار فرض ہے، یہاں فرمایا گیا کہ حج اور عمرہ کو مکمل کرو، اس بارے میں امام ابو بکر رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں آیت میں وجوب عمرہ پر کوئی دلالت موجود نہیں ہے۔ وہ اس طرح کہ آیت میں زیادہ سے زیادہ جو بات ہے وہ حج اور عمرے کے اتمام کا حکم ہے اور یہ حکم صرف اس بات کا متقاضی ہے کہ ان کی ادائیگی میں کوئی کمی نہ رہے بلکہ ان کے ارکان و افعال پورے پورے ادا کئے جائیں، اس لئے کہ لغت کے لحاظ سے نقصان یعنی کمی رہ جانا تمام یعنی پورا ہونے کے مفہوم کی ضد ہے، بطلان اس کی ضد نہیں ہے، آپ ناقص کو غیر تام کہتے ہیں لیکن کسی ایسی چیز کو غیر تام نہیں کہتے جس کے کسی حصے کا وجود ہی نہ ہو، اس سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ اتمام کا حکم نقصان کی نفی کا متقاضی ہے، اسی بنا پر حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ان دونوں کے اتمام کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے گھر سے ہی ان دونوں کے لئے احرام باندھ لو۔ (احکام القرآن للجصاص)

حضرت مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ جو بھی کوئی مرد یا عورت حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے تو اب احرام کے کپڑے اتار دینے سے یا نیت بدل دینے سے احرام سے نہ نکلے گا اور حج یا عمرہ پورا کرنا ہی ہو گا، حج فرض ہو یا نفل، عمرہ سنت ہو یا نفل، اپنا حج ہو یا حج بدل، بہر حال پورا کرنا ہی لازم ہے۔ (انوار البیان)

فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ: اگر تم روک دیئے گئے یعنی تم نے احرام باندھ کر حج یا عمرہ کا سفر شروع کر دیا اور راستے میں رکاوٹ پیدا ہو گئی تو اسے احصار کہتے ہیں، احصار کی تعریف کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک شرعی اِحصار صرف ایسی صورت میں شمار ہوتا ہے، جب حج و عمرہ کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جائے۔ اس کی مثال ۶ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا واقعہ ہے، جب ان کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر عمرہ کیے مدینہ طیبہ کو لوٹ گئے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کے مطابق دشمن کی رکاوٹ کے علاوہ بیماری یا حادثہ بھی

احصار کا سبب بن سکتا ہے۔ کوئی ایسی بیماری لاحق ہو گئی ہے جس کی وجہ سے عازم حج سفر نہیں کر سکتا یا کوئی ایسا حادثہ پیش آ گیا ہے، سخت زخمی ہو گیا ہے، ٹانگ زخمی ہو گئی ہے کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہے، کسی درندے نے راستہ روک رکھا ہے، سیلاب آ گیا ہے یا کسی اور وجہ سے راستہ رک گیا ہے، یہ بھی شرعی اِحصار کی تعریف میں آئے گا۔ اس قسم کی صورت حال کے متعلق ارشاد فرمایا فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ جو میسر ہو قربانی کر دو۔

احرام باندھ کر حج و عمرہ سے محروم رہنے کی صورت میں قربانی واجب ہو جاتی ہے، ایک بکری یا گائے یا اونٹ جو بھی میسر ہو، قربانی کر دے اور احرام کھول دے، یہ قربانی کس مقام پر کرے، اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس مقام پر کوئی رک جائے، وہیں قربانی کر کے احرام سے باہر آ جائے۔ البتہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قربانی حرم کی حدود میں ہونی چاہیے اور اس کا طریق کار یہ ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے شخص کے ہاتھ قربانی بھیج دی جائے اور اس سے طے کر لیا جائے کہ فلاں دن فلاں وقت پر قربانی حدود حرم میں کر دینا پھر جب ظن غالب ہو جائے کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق قربانی ہو چکی ہے تو احرام کھول دے۔ (معالم العرفان)

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ: اور نہ منڈاؤ اپنے سر یہاں تک کہ پہنچ جائے قربانی اپنے ٹھکانے۔ مَحِلَّهُ کی تفسیر میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تو یہ فرماتے ہیں کہ محل ہدی سے مراد حرم ہے کیونکہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ، پھر ہدی کے اترنے کی جگہ بیت اللہ ہے اور اس لیے کہ خون بہانا فی نفسہٖ تو عبادت نہیں ہے کسی زمانہ خاص یا مکان خاص میں ہو تو اس وقت یہ عبادت ٹھہرایا جائے گا اس لیے اگر حرم میں ذبح نہ ہو تو عبادت نہ ہو گا اور جب ذبح عبادت نہ ہوا تو محصر حلال نہ ہو گا اس لیے واجب یہ ہے کہ محصر ہدی کو حرم میں بھیجے اور ذبح کے لیے کوئی دن مقرر کر دے کہ فلاں دن ذبح کر دینا جب وہ دن آئے محصر حلال ہو جائے گا ابو حنیفہ رحمہ

کے نزدیک ذبح کے لیے دسویں تاریخ کا ہونا ضروری نہیں اور امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر حج سے روکا گیا ہے تو دسویں ہی تاریخ جو یوم نحر کہلاتا ہے ذبح کرے اس بنا پر ان کے نزدیک دن معین کرنے کی ضرورت نہیں اور امام مالکؒ اور شافعیؒ اور احمدؒ نے فرمایا ہے مَحِلَّهُ سے وہ موضع مراد ہے جہاں وہ روکا گیا ہے خواہ وہ جگہ حرم ہو یا حرم سے باہر۔ (مظہری)

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ: اگر کسی بیماری کے سبب سر یا بدن کے کسی دوسرے حصہ کے بال منڈانے کی مجبوری ہو یا سر میں جوئیں پیدا ہو کر تکلیف دے رہی ہوں تو ایسی صورت میں بال منڈانا بقدر ضرورت جائز ہے مگر اس کا فدیہ اور بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے، قربانی کے لئے تو حدود حرم کی جگہ متعین ہے روزے اور صدقہ کے لئے کوئی جگہ متعین نہیں ہر جگہ ادا کر سکتا ہے قرآن کے الفاظ میں صیام کا کوئی عدد اور صدقہ کی کوئی مقدار مذکور نہیں ہے مگر حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ صحابی کو ایسی ہی حالت میں یہ فرمایا کہ تین روزے رکھیں یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع گندم کا بطور صدقہ دیدیں (صحیح بخاری) آدھا صاع ہمارے اسی تولہ کے سیر کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر گندم ہوتے ہیں ان کی قیمت صدقہ کر دینا بھی کافی ہے۔ (معارف القرآن)

فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ: پس جب تم امن کی حالت میں ہو یعنی حج و عمرہ کی ادائیگی میں کوئی چیز رکاوٹ نہ ہو اور ایک ہی سفر میں حج کے ساتھ عمرے کا نفع اٹھایا یعنی حج اور عمرہ دونوں ایک ساتھ کیے تو ایسے شخص کو چاہیے کہ جو آسانی کے ساتھ میسر ہو قربانی دے۔

یہ قربانی دراصل دم ہے اس نقصان کا جو اسے حج و عمرہ ایک سفر میں پورا کرنے کی وجہ سے اٹھانا پڑا، اگر حج اور عمرہ کے لئے علیحدہ علیحدہ سفر اختیار کرتا، تو وقت بھی زیادہ دینا پڑتا، خرچ بھی دوگنا ہوتا اور محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی اور ظاہر ہے کہ ان کا ثواب بھی زیادہ ہوتا، اب ان چیزوں کی بچت کرنے

سے اس کے ثواب میں جو کمی واقع ہوئی یہ قربانی اس کا نعم البدل ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ دم شکر کا دم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سفر میں دو نعمتیں عطا کی ہیں یعنی عمرہ اور حج دونوں ادا کئے ہیں لہٰذا اس کا حکم عام قربانی کا ہے اور اس میں خود بھی کھا سکتا ہے اور دوسروں کو بھی دے سکتا ہے، البتہ ایسی قربانی کو حدود حرم کے اندر ذبح کرنا ضروری ہے۔ (معالم العرفان للسواتیؒ)

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ: جو شخص حج قرآن یا حج تمتع ادا کرے اور قربانی کرنے کے لئے اس کے پاس مال نہ ہو یا جانور نہ مل سکے، تو اس قربانی کا نعم البدل دس روزے ہیں۔ تین روزے تو واضح ہیں کہ ایام حج میں رکھے جائیں گے یعنی ذی الحج کی سات، آٹھ اور نو کو رکھے جائیں کیونکہ دس تاریخ کو روزہ رکھنا منع ہے۔ البتہ سات روزوں کے متعلق اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ واپس لوٹنے سے مراد حاجی کا اپنے وطن پہنچنا ہے اور یہ روزے اگر قیام ہو تو حرم میں رکھے جاسکتے ہیں، یا راستے میں یا گھر واپس آکر ہر طرح درست ہے، دس روزے پورے کرنے سے قربانی کی تلافی ہو جائے گی اور حاجی کا قران یا تمتع درست ہو جائے گا، فقہائے کرام فرماتے ہیں ایام حج میں تین روزے لازمی ہیں، اگر یہ چھوٹ گئے تو پھر باقی سات رکھنے کی ضرورت نہیں، اسے بہر حال دم دینا پڑے گا۔ (معالم العرفان)

ذَٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: فرمایا حج تمتع اور قربانی کے مسائل کے متعلق شرط یہ ہے کہ تمتع کرنے والے کا گھر بار مسجد حرام کے پاس نہ ہو، یعنی حج تمتع اس شخص کے لئے روا ہے جو حدود حرم کا رہنے والا نہ ہو بلکہ آفاقی ہو، حدود حرم کے رہنے والے اور محلی تو جب چاہیں عمرہ کر سکتے ہیں، حدود حرم سے باہر جا کر احرام باندھیں اور مکہ مکرمہ آکر عمرہ کے ارکان پورے کر لیں، حج کے لئے بھی یہ لوگ آٹھ ذی الحج کو احرام باندھ کر با آسانی حج کر سکتے ہیں، مگر دقّت طلب مسئلہ تو بیرونی لوگوں کے لئے ہے، ان کے لئے عمرہ اور حج کے لئے علیحدہ علیحدہ سفر اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے، لہٰذا حج قران اور تمتع کی اجازت صرف ایسے ہی آفاقی لوگوں کو حاصل ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ: قرآن کریم میں بہت ہی احسن انداز سے حج کے احکامات بتائے اور سمجھائے گئے ہیں کہ معمولی سوجھ بوجھ والا شخص بھی انہیں سمجھ سکتا ہے، مگر چونکہ حج روزروز نہیں ہوتا کہ ہر شخص کو اس کے احکامات ازبر ہو جائیں، بڑے بڑے حضرات جب دوردراز کا سفر کرکے وہاں پہنچتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتے ہیں، بعض اوقات حج کے مسائل لکھنے اور بتانے والے بھی بھول جاتے ہیں، اس لیے قرآن کریم نے باریکیاں سمجھانے کے بعد فرمایا کہ جو حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق عمل کرنا ہے، اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی سے ڈریے اور بچیے، اس لیے کہ دلیری کرنے والے اور جسارت کرنے والوں کو اللہ سزا دے گا، اس لیے کہ وہ سخت عذاب دینے والا ہے، جان بوجھ کر اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔

حج کی اقسام: حج کی تین قسمیں ہیں یعنی اِفراد، قران اور تمتع، اِفراد حج یہ ہے کہ میقات سے صرف حج کا احرام باندھے اور حج کرکے احرام کھول دے، اس میں عمرہ شامل نہیں ہوتا۔ دوسری صورت قران ہے کہ کوئی شخص میقات سے عمرہ اور حج کا مشترکہ احرام باندھے، عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام نہ کھولے بلکہ اسی احرام سے ایام حج میں حج کرنے کے بعد یعنی دس تاریخ کو احرام کھول دے، حضور نبی کریم علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔

امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قران کیا تھا کیونکہ احادیث میں واضح طور پر آتا ہے کہ آپ تلبیہ میں کہتے تھے لَبَّيْكَ بِحَجَّةٍ وَّ عُمْرَةٍ اسی لئے امام ابوحنیفہؒ قران کو افضل قرار دیتے ہیں۔ حج کی تیسری قسم تمتع ہے اور عام طور پر یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی حج کے مہینوں میں ایک ہی سفر میں عمرہ اور حج کا علیحدہ علیحدہ احرام باندھا جاتا ہے۔ میقات سے عمرہ کا احرام باندھا، مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کیا اور احرام کھول دیا پھر آٹھ ذی الحج کو حج کا احرام باندھا اور دس تاریخ کو قربانی کرنے اور حجامت بنوانے کے بعد کھول دیا اور حج کے باقی ارکان پورے کرلئے۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن)

حج کے مہینے اور حج کے چند احکام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى وَاتَّقُونِ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ {۱۹۷} البقرہ

جواب ترجمہ: حج کے چند متعین مہینے ہیں۔ چنانچہ جو شخص ان مہینوں میں (احرام باندھ کر) اپنے اوپر حج لازم کرلے تو حج کے دوران نہ وہ کوئی فحش بات کرے نہ کوئی گناہ نہ کوئی جھگڑا۔ اور تم جو کوئی نیک کام کروگے اللہ اسے جان لے گا، اور (حج کے سفر میں) زادِ راہ ساتھ لے جایا کرو، کیونکہ بہترین زادِ راہ تقوی ہے اور اے عقل والو! میری نافرمانی سے ڈرتے رہو۔

الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ: أَشْهُرٌ شَهْرٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں مہینہ۔ پچھلی آیت میں یہ بتلایا گیا تھا کہ جو کوئی حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے تو اس پر لازم آتا ہے کہ اس کے احکام پورے ادا کرے ان دونوں میں عمرہ کے لئے تو کوئی تاریخ اور مہینہ مقرر نہیں سال بھر میں جب چاہیں کرسکتے ہیں لیکن حج کے لئے مہینے اور اس کے افعال واعمال کے لئے خاص تاریخیں اور اوقات مقرر ہیں اس لئے اس آیت کے شروع میں یہ بتلا دیا کہ حج کا معاملہ عمرہ کی طرح نہیں ہے اس کے لئے کچھ مہینے مقرر ہیں جو معروف ومشہور ہیں جاہلیت عرب سے لے کر زمانہ اسلام تک یہی مہینے حج کے مقرر رہے ہیں وہ مہینے شوال ذی قعدہ اور دس روز ذی الحجہ کے ہیں جیسا کہ حدیث میں بروایت ابوامامہ وابن عمر منقول ہے (مظہری)

شوال سے حج کے مہینے شروع ہونے کا حاصل یہ ہے کہ اس سے پہلے حج کا احرام باندھنا جائز نہیں بعض ائمہ کے نزدیک تو قبل شوال کے احرام سے حج کی ادائیگی ہی نہیں ہوسکتی۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس احرام سے حج تو ادا ہوجائے گا مگر مکروہ ہوگا۔ (مظہری)

افعال حج تو ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ سے شروع ہوتے ہیں لیکن شوال اور ذیقعدہ کو حج کے مہینوں میں اس لیے شمار کیا گیا کہ ان میں اگر کوئی شخص عمرہ کرے اور اس کے بعد اسی سال حج بھی کرے تو وہ عمرہ مل کر حج تمتع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے قربانی واجب ہوتی ہے، اگر کوئی شخص شوال سے پہلے عمرہ کرے تو وہ عمرہ مفردہ ہو گا اور اس کی وجہ سے حج تمتع نہ بنے گا، اسی طرح اگر کسی کو تمتع یا قران کی قربانی کے عوض روزے رکھنے ہیں تو وہ حج کے کسی بھی مہینہ میں عمرہ کے احرام کے بعد تین روزے رکھ سکتا ہے جو ھدی کے عوض حج سے پہلے رکھے جاتے ہیں اگر کوئی شخص حج کے مہینوں سے پہلے حج کا احرام باندھ لے تو احرام تو منعقد ہو جائے گا لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے، یہ سب احکام اس پر متفرع ہیں کہ حج کے مہینے شوال کا چاند دیکھنے سے شروع ہو جاتے ہیں، حج ان لوگوں پر فرض ہے جو حج کی استطاعت رکھتے ہوں اور جب حج کی استطاعت ہو جائے تو حج کرنے میں جلدی کرنی چاہیے، اگر کسی نے دیر لگائی اور زندگی بھر میں کبھی بھی حج کر لیا تو وہ حج ادا ہی ہو گا، فرض ہوتے ہی پہلے سال نہ کرنے سے یہ نہ کہا جائے گا کہ حج قضا ہو گیا، جب کسی سال حج کا احرام باندھ لیا تو احرام باندھنے والے نے اپنے ذمہ حج کرنا فرض کر لیا اب حج کرنا ہی ہو گا اور بغیر حج کیے احرام سے نہیں نکل سکتا۔ (انوار البیان)

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ: جس آدمی نے حج کے لیے احرام باندھ لیا اس کے لیے احرام کی پابندیاں ضروری ہیں، احرام کی حالت میں محرم کے لیے بہت سی پابندیاں ہیں جو بغیر احرام کے نہیں ہوتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ فلا رفث یعنی حالت احرام میں بیوی میاں والے معاملات نہ کیے جائیں، اسی طرح حالت احرام میں اللہ کی نافرمانی نہ کی جائے، اللہ کی نافرمانی تو کسی حال میں نہیں ہونی چاہیے مگر حالت احرام میں اس پر تاکید کی گئی ہے اور نہ ہی لڑائی جھگڑا کرے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ان باتوں سے بچ گیا وہ حج سے ایسے واپس آئے گا کہ آج ہی اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہے، وقوف عرفات سے پہلے اگر کسی شخص نے جماع کر لیا تو اس کا حج فاسد ہو جائے گا اور اگر کسی نے صرف بوس و کنار کر لیا تو اس پر دم واجب ہو گا۔

وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ: ایام حج کو غنیمت جان کر خیر اور بھلائی کے کام کرنے چاہییں، انسان اچھائی یا برائی کچھ بھی کہیں بھی کرے تو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے، تو کیا ہی خوش بختی کی بات ہے کہ انسان اپنے رب کے سامنے پیش کرنے کے لیے خیر اور نیکی کا کام کرے۔

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى: کچھ لوگ سفر حج میں کھانے پینے کی اشیاء ساتھ نہیں رکھتے تھے، وہ اسے توکل کے خلاف خیال کرتے تھے، مگر جونہی انہیں دوران سفر کھانے پینے کی طلب ہوتی تو وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اور سوال کرتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زادراہ ساتھ لے لیا کرو، بہترین زادراہ سوال سے بچنا ہے۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ كَانَ أَهْلُ الْيَمَنِ يَحُجُّونَ وَلَا يَتَزَوَّدُونَ يَقُولُونَ: نَحْنُ مُتَوَكِّلُونَ ثُمَّ يَقْدَمُونَ فَيَسْأَلُونَ النَّاسَ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ یمن کے لوگ حج کو آتے تھے لیکن سفر کے لیے انتظام کر کے نہیں چلتے تھے (زادراہ پاس نہ ہوتا تھا) اور کہتے تھے کہ ہم توکل والے ہیں جب مکہ معظمہ پہنچ جاتے تھے تو لوگوں سے سوال کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ توشہ ساتھ لیا کرو، کیونکہ بہتر توشہ یہ ہے کہ لوگوں سے سوال نہ کیا جائے۔ (صحیح بخاری)

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ كَانَ نَاسٌ يَخْرُجُونَ مِنْ أَهْلِهِمْ لَيْسَتْ مَعَهُمْ أَزْوِدَةٌ يَقُولُونَ: نَحُجُّ بَيْتَ اللّٰهِ وَلَا يُطْعِمُنَا (ابن ابی حاتم، ابن جریر، در منثور) کچھ لوگ اپنے گھروں سے اس طرح نکلتے تھے کہ ان کے ساتھ توشے نہیں ہوتے تھے اور وہ یوں کہتے تھے کہ ہم بیت اللہ کا حج کرتے ہیں اور ہمیں کھانا نہیں کھلایا جاتا۔ حضرت زبیر سے روایت ہے کہ کچھ لوگ سفر حج کے موقع پر ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہوئے زاد سفر ساتھ نہیں رکھتے تھے، جس پر انہیں منع کرتے ہوئے زادراہ ہمراہ رکھنے کا حکم دیا گیا۔ (طبرانی)

چونکہ ایام حج میں عموماً مال والے ہی ہوتے ہیں، اس لیے ان دنوں میں سوال کرنے والوں کو خوب مواقع ملتے ہیں اور بہت سے لوگ حج اور عمرہ کا سفر ہی حجاج سے مانگنے کے لیے کرتے ہیں بہت

سے مردوں اور عورتوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وقوف عرفات میں سارا وقت خیمہ خیمہ گھومنے اور لوگوں سے سوال کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا جو عرفات میں لوگوں سے مانگ رہا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو ایک درہ مارا اور فرمایا کہ تو آج کے دن میں اور اس جگہ میں غیر اللہ سے سوال کرتا ہے۔ مشکوٰۃ، انوار البیان)

وَاتَّقُونِ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ: الباب، لب کی جمع ہے، لب عقل کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اہل عقل و دانش سے مخاطب ہو کر فرمارہے ہیں کہ اے ارباب دانش! مجھ ہی سے ڈرو، تقویٰ اختیار کرو، میرے احکامات کی پیروی کرو اور میں نے جن جن چیزوں سے روکا ہے ان سے رک جاؤ، میری فرمانبرداری ہی تقویٰ ہے، اس لیے عقل و خرد والوں کو یہ چیز نہیں بھولنا چاہیے کیونکہ عقل و دانش اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اکثر لوگ تقویٰ کی وجہ سے جنت میں جائیں گے جب کہ بہت سے لوگ شرم گاہ اور منہ کی وجہ سے دوزخ میں جائیں گے۔

وہب ابن منبہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اَلْإِيمَانُ عُرْيَانٌ وَلِبَاسُهُ التَّقْوَى وَزِينَتُهُ الْحَيَاءُ وَمَالُهُ الْعِفَّةُ ایمان عریاں ہے، اس کا لباس تقویٰ ہے، اس کا حسن و جمال حیاء ہے، اور اس کا مال پاک دامنی ہے۔ (ابن ابی الدنیا) ابو حازم رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ میری تاک میں چودہ دشمن بیٹھے ہوئے ہیں أَمَّا أَرْبَعَةٌ مِنْهَا فَشَيْطَانٌ يُضِلُّنِي وَمُؤْمِنٌ يَحْسِدُنِي وَكَافِرٌ يَقْتُلُنِي وَمُنَافِقٌ يُبْغِضُنِي ان میں سے چار یہ ہیں، شیطان مجھے گمراہ کرتا ہے، مؤمن مجھ سے حسد کرتا ہے، کافر مجھ کو قتل کرتا ہے اور منافق مجھ سے بغض رکھتا ہے اور ان میں سے دس یہ ہیں۔ بھوک، پیاس، گرمی، سردی، ننگے بدن ہونا، بڑھاپا مرض فقر، موت اور ان سے مقابلہ کی میں طاقت نہیں رکھتا مگر پورے ہتھیار کے ساتھ اور تقویٰ سے افضل کوئی ہتھیار نہیں۔ (ابن ابی الدنیا)

تجارت اور حج

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ {۱۹۸} البقرۃ

جواب ترجمہ: تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم (حج کے دوران تجارت یا مزدوری کے ذریعے) اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو پھر جب تم عرفات سے روانہ ہو تو مشعر حرام کے پاس (جو مزدلفہ میں واقع ہے) اللہ کا ذکر کرو اور اس کا ذکر اسی طرح کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت کی ہے جب کہ اس سے پہلے تم بالکل ناواقف تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز نامی بازار تھے اسلام کے بعد صحابہ کرام ؓ ایام حج میں تجارت کو گناہ سمجھ کر ڈرے تو انہیں اجازت دی گئی کہ ایام حج میں تجارت کرنا گناہ نہیں۔ (بخاری، ابن کثیر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ حج کے دنوں میں احرام سے پہلے یا احرام کے بعد حاجی کے لئے خرید و فروخت حلال ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قرأت میں آیت (من ربکم) کے بعد فی مواسم الحج کا لفظ بھی ہے۔ (ابن کثیر)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص حج کو نکلتا ہے اور ساتھ ہی خوش الحانی کے ساتھ پڑھتا جاتا ہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ نے یہی آیت پڑھ کر سنائی (ابن جریر) مسند احمد کی روایت میں ہے کہ ابو امامہ تیمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ہم حج میں جانور کرایہ پر دیتے ہیں کیا ہمارا حج ہو جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم بیت اللہ شریف کا طواف نہیں کرتے؟ کیا تم عرفات میں نہیں ٹھہرتے؟ کیا تم شیطانوں کو کنکریاں نہیں مارتے؟ کیا تم سر نہیں منڈواتے؟ اس نے کہا یہ سب کام تو ہم کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا سنو ایک شخص نے یہی سوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا اور اس کے جواب میں حضرت جبریل علیہ السلام آیت لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ (البقرۃ: ۱۹۸) لے کر اترے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلا کر فرمایا کہ تم حاجی ہو تمہارا حج ہو گیا۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ: یعنی تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم سفر حج میں تجارت یا مزدوری کے ذریعے کچھ روزی کمالو اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق حاصل کرو۔

فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ: پھر جب تم عرفات سے واپس ہو تو اللہ کو یاد کرو مشعر الحرام کے نزدیک، اس میں عرفات سے واپس ہو کر مزدلفہ میں اللہ کا ذکر کرنے کا حکم فرمایا، عرفات مزدلفہ سے تین میل مشرق کی طرف ہے یہ ایک بہت بڑا میدان ہے، یہاں پر ٹھہرنا حج کا سب سے بڑا رکن ہے حج کے احرام کے ساتھ کوئی شخص ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو زوال کے بعد سے لے کر آنے والی رات کو صبح صادق تک عرفات میں پہنچ جائے تو اس کا حج ہو جاتا ہے، اس کے بعد فرائض حج میں سے صرف طواف زیارت باقی رہ جاتا ہے، عرفات میں ذکر اور دعا میں مشغول رہتے ہیں، ظہر و عصر کی نماز بھی اسی وقفہ میں پڑھتے ہیں، سورج چھپ جانے کے بعد مزدلفہ کے لیے واپس ہوتے ہیں (جب عرفات گئے تھے تو مزدلفہ ہوتے ہوئے گئے تھے، کیونکہ منیٰ سے عرفات کو جاتے ہوئے درمیان میں مزدلفہ آتا ہے) مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز اکٹھی پڑھی جاتی ہے، عرفات میں یا راستہ میں نماز مغرب پڑھنا جائز نہیں، سورج چھپ جانے کے باوجود قصداً نماز مغرب کو مؤخر کرنا واجب ہے۔

مزدلفہ میں پہنچ کر عشاء دونوں نمازیں اکٹھی پڑھ کر رات کو مزدلفہ میں رہنا سنت ہے اور صبح صادق کے بعد تھوڑی دیر مزدلفہ میں وقوف کرنا واجب ہے اور سنت یہ ہے کہ دیر تک وقوف کرے یہاں تک کہ سورج نکلنے میں تھوڑی دیر رہ جائے تو منیٰ کے لیے روانہ ہو جائے۔

المشعر الحرام مزدلفہ میں ایک پہاڑ ہے جس کا نام جبل قزح ہے رسول اللہ ﷺ نے عرفات سے واپس ہو کر مزدلفہ میں مغرب و عشاء کی نماز اکٹھی پڑھی, پھر آرام فرمایا، اس کے بعد صبح صادق ہوتے ہی نماز فجر اندھیرے میں پڑھ کر المشعر الحرام کے پاس تشریف لے گئے اور قبلہ رخ ہو کر خوب زیادہ روشنی پھیل جانے تک دعا اور تکبیر و تہلیل میں اور توحید باری تعالیٰ اور ذکر کرنے میں

مشغول رہے، پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے منیٰ کے لیے روانہ ہوگئے۔ (مسلم۔ انوار البیان)

وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ: ایک اور بھی اصولی مسئلہ نکل آیا کہ ذکر اللہ اور عبادات میں آدمی خود مختار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح چاہے یاد کرے اور جس طرح چاہے اس کی عبادت کرے بلکہ ذکر اللہ اور ہر عبادت کے خاص آداب ہیں ان کے موافق ادا کرنا ہی عبادت ہے، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں اور اس میں کمی بیشی یا مقدم مؤخر کرنا خواہ اس میں ذکر اللہ کی کچھ زیادتی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

نفلی عبادات اور صدقہ وخیرات وغیرہا میں جو لوگ بلا دلیل شرعی اپنی طرف سے کچھ خصوصیات اور اضافے کر لیتے ہیں اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھ لیتے ہیں حالانکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کو ضروری قرار نہیں دیا اور ان افعال کے نہ کرنے والوں کو خطاوار سمجھتے ہیں اس آیت نے ان کی غلطی کو واضح کر دیا کہ وہ اہل جاہلیت کی سی عبادت ہے کہ اپنی رائے و قیاس سے عبادت کی صورتیں گھڑ رکھی تھیں اور چند رسموں کا نام عبادت رکھ لیا تھا۔ (معارف القرآن)

وقوفِ عرفات

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ {۱۹۹} البقرۃ

جواب ترجمہ: پھر تم لوٹ کر آؤ جہاں سے لوگ لوٹ کر آتے ہیں اور اللہ سے بخشش مانگو بیشک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ طریقہ چلا آرہا تھا کہ لوگ حج کے لیے عرفات میں جا کر ٹھہرتے تھے، عرفات میں ٹھہرنا وقوف عرفات کہلاتا ہے، یہ حج کا رکن اعظم ہے، اس کے بغیر حج نہیں ہوتا، قریش اپنے کو بیت اللہ کا مجاور اور خدمت گار سمجھتے تھے، اپنے کو باقی لوگوں سے برتر اور اعلیٰ سمجھتے تھے، اپنی امتیازی حیثیت قائم کرنے کے لیے وہ باقی لوگوں کی طرح عرفات میں نہیں جاتے تھے، وہ کہتے تھے کہ

ہم حدود حرم سے باہر نہیں جائیں گے، مزدلفہ میں ہی نو ذی الحج کو ٹھہر جاتے تھے، حالانکہ ۹ ذی الحج کو منیٰ سے عرفات میں جانا لازمی ہے، مزدلفہ حدودِ حرم میں ہے، جب کہ عرفات حدود حرم سے باہر ہے، تو اللہ نے اس آیت میں واضح حکم دیا کہ اپنی من مانی نہیں چلے گی بلکہ جہاں سے باقی لوگ، باقی حجاج واپس آتے ہیں وہیں سے تم لوگ بھی واپس آؤ، باقی لوگوں کے ساتھ تم بھی عرفات سے واپس پلٹو، مزدلفہ سے نہ پلٹو۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ قریش اور ان کے طریقہ پر چلنے والے لوگ عرفات کی بجائے مزدلفہ میں وقوف کیا کرتے تھے، ان لوگوں کو حمس کہتے تھے، جب کہ باقی عرب عرفات کا وقوف کیا کرتے تھے، جب اسلام کا زمانہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ عرفات میں جائیں، وہاں ٹھہریں اور وہیں سے واپس آئیں، اس آیت میں یہی فرمان جاری کیا گیا ہے۔ (بخاری، کتاب التفسیر باب ثم افیضوا)

ایام منیٰ میں ذکر اللہ۔ بندگان خدا کی طلب دنیا اور طلب آخرت

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ {۲۰۰} وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ {۲۰۱} أُولَئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ {۲۰۲} البقرہ

جواب ترجمہ: پھر جب تم اپنے حج کے کام پورے کر چکو تو اللہ کا اس طرح ذکر کرو جیسے تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر کرو اب بعض لوگ تو وہ ہیں جو (دعا میں بس) یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرمایئے اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اور انہی میں سے وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں

بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے اعمال کی کمائی کا حصہ (ثواب کی صورت میں) ملے گا، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ: قَضَيْتُمْ کا معنیٰ أَدَّيْتُمْ جب تم ادا کر چکو، مَنَاسِك، مَنسَك کی جمع ہے جس سے مراد حج کی عبادات ہیں، جمرہ عقبہ کی رمی ہے، بیت اللہ کا طواف ہے، منیٰ کا قیام ہے، جب ان تمام اعمال سے فارغ ہو جاؤ تو فضولیات میں مشغول نہیں ہونا بلکہ اپنے پروردگار کو یاد کرنا ہے۔

عرب زمانہ جاہلیت میں عرفات و مزدلفہ اور طواف و قربانی سے فارغ ہو کر جب منیٰ میں قیام کرتے تھے تو ان کی مجلسیں صرف اس کام کے لئے ہوتی تھیں کہ مشاعرے منعقد کریں اور ان میں اپنے مفاخر اور اپنے آباء و اجداد کے مفاخر اور کارناموں کا بیان کریں ان کی مجلسیں ذکر اللہ سے یکسر خالی ہوتی تھیں ان مبارک ایام کو ایسی لغو اور فضول چیزوں میں ضائع کرتے تھے۔ اس لئے ارشاد ہوا فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا: جب تم اپنے افعال احرام کو پورا کر چکو اور منیٰ میں قیام کرو تو وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اپنے آباء و اجداد کو یاد کرنا اور خصوصاً ان کے جھوٹے سچے مفاخر اور کارناموں کو بیان کرنا چھوڑو جتنا تم ان کو یاد کرتے ہو اس کی جگہ بلکہ اس سے زیادہ خدا تعالیٰ کو یاد کرو اور ذکر اللہ میں مشغول رہو قرآن کی اس آیت نے عرب کی ایک جاہلانہ رسم کو مٹا کر مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ یہ ایام اور یہ مقام عبادت اور ذکر اللہ کے لئے مخصوص ہیں ان میں ذکر اللہ و عبادت کے جو فضائل و برکات ہیں وہ پھر ہاتھ نہ آئیں گے ان کو غنیمت جاننا چاہیے۔ (معارف)

علاوہ ازیں حج ایک ایسی عبادت ہے جو عموماً سفر طویل کی مشقت، اہل و عیال کی مفارقت، کاروبار کو ترک کرنے اور ہزاروں روپے اور بہت سا وقت خرچ کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے، اس میں حوادث کا پیش آجانا کچھ بعید نہیں کہ آدمی باوجود کوشش کے اپنے مقصد حج میں کامیاب نہ ہو سکے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام موانع ہٹا کر آپ کو مقصد میں کامیاب فرمایا اور فرائض حج پورے ہو گئے تو یہ مقام شکر ہے جس کا اقتضاء یہ ہے کہ اور زیادہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہو ان

اوقات کو فضول اجتماعات اور فضول کام یا کلام میں ضائع نہ کرو اہل جاہلیت ان اوقات میں اپنے آباء و اجداد کے تذکرے کرتے تھے جن کا کوئی نفع دین و دنیا میں نہ تھا، تم اس کی جگہ اللہ کا ذکر کرو جو نور ہی نور اور نفع ہی نفع ہے، دنیا کے لئے بھی آخرت کے لئے بھی، آجکل اگرچہ مسلمانوں میں وہ رسم جاہلیت تو نہیں رہی کہ مشاعرے قائم کریں اور آباء واجداد کے تذکرے کریں لیکن آج بھی ہزاروں مسلمان ہیں جو ان ایام کو فضول اجتماعات میں فضول دعوتوں اور تفریحات میں صرف کرتے ہیں یہ آیت ان کی تنبیہ کے لئے کافی ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو جیسے بچپن میں اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں کہ ان کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کلام یَا اَب یَا اَب ہوتا ہے تم اب بالغ ہو جوان ہو عاقل ہو یَا اَب یَا اَب کی جگہ یَا رَب یَا رَب کو اختیار کرو اور اس پر نظر ڈالو کہ بچہ اپنے باپ کو اس لئے پکارتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں اپنے آپ کو باپ کا محتاج سمجھتا ہے انسان اگر ذرا غور کرے تو وہ ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج اس سے زیادہ ہے جیسا بچہ اپنے باپ کا محتاج ہے نیز بعض اوقات کچھ لوگ اپنے باپ کا ذکر فخراً بھی کیا کرتے ہیں جیسے اہل جاہلیت کرتے تھے تو اس آیت نے یہ بھی ہدایت کردی کہ فخر و عزت کے لئے بھی ذکر اللہ سے زیادہ کوئی چیز مؤثر نہیں (تفسیر روح البیان)

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ: حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدوؤں کا ایک گروہ ایسا تھا جو موقف (وقوف کی جگہ) پر آتا اور یہاں کھڑے ہو کر وہ یوں دعائیں کرتا کہ اے اللہ! اس سال کو بارشوں کا سال بنادے، خوب غلے پیدا ہوں، اچھی اولادیں ہوں، یہ سب کچھ وہ مانگتے تھے مگر آخرت کی فوز و فلاح و کامیابی کے لیے کچھ نہیں مانگتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔ (روح البیان)

ان کی دعائیں صرف دنیا طلبی کے لیے ہوتی تھیں، مال و دولت جاہ و عزت کے سوال کرتے تھے،

دشمنوں پر غلبے کی دعائیں مانگتے تھے، مشرکین دنیا کی لذتوں کا سوال کرتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ انہوں نے دنیا طلب کرلی ہے، آخرت میں ان کا کوئی حصہ اور نصیب نہیں ہے، اس لیے کہ ان کا ہم و غم صرف دنیا طلبی پر تھا، کہ یہ لوگ سب سے عزت والے مؤقف پر کھڑے ہو کر حقیر ترین چیزیں طلب کرتے تھے اور ہمیشہ کی نعمتوں سے روگردانی اور منہ موڑتے تھے، یہ دنیوی نعمتوں کے طلب گار ہوتے تھے اور نعمت والے منعم کو فراموش کیے ہوئے تھے۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ: مومنوں کی دعائیں دونوں جہان کی بھلائیوں کی ہوتی تھیں اس لئے ان کی تعریفیں کی گئیں، اس دعا میں تمام بھلائیاں دین و دنیا کی جمع کر دی ہیں اور تمام برائیوں سے بچاؤ ہے، اس لئے کہ دنیا کی بھلائی میں تشملُ كُلَّ مَطْلُوبٍ دُنْيَوِيٍّ، مِنْ عَافِيَةٍ، وَدَارٍ رَحْبَةٍ، وَزَوْجَةٍ حَسَنَةٍ، وَرِزْقٍ وَاسِعٍ، وَعِلْمٍ نَافِعٍ، وَعَمَلٍ صَالِحٍ، وَمَرْكَبٍ هَنِيءٍ، وَثَنَاءٍ جَمِيلٍ، عافیت، راحت، آسانی، تندرستی، گھر بار، بیوی بچے، روزی، علم، عمل، اچھی سواریاں، نوکر چاکر، لونڈی، غلام، عزت و آبرو وغیرہ تمام چیزیں آگئیں اور آخرت کی بھلائی میں حساب کا آسان ہونا، گھبراہٹ سے نجات پانا، نامہ اعمال کا دائیں ہاتھ میں ملنا، سرخ رو ہونا بالآخر عزت کے ساتھ جنت میں داخل ہونا سب آگیا، پھر اس کے بعد عذاب جہنم سے نجات چاہنا اس سے یہ مطلب ہے کہ ایسے اسباب اللہ تعالیٰ مہیا کر دے مثلاً حرام کاریوں سے اجتناب گناہ اور بدیوں کا ترک وغیرہ۔ (ابن کثیر)

قاسم بن عبدالرحمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں مَنْ أُعْطِيَ قَلْبًا شَاكِرًا، وَلِسَانًا ذَاكِرًا، وَجَسَدًا صَابِرًا، فَقَدْ أُوتِيَ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً، وَوُقِيَ عَذَابَ النَّارِ جسے شکر کرنے والا دل اور ذکر کرنے والی زبان اور صبر کرنے والا جسم مل گیا اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی مل گئی اور عذاب سے نجات پا گیا۔

بخاری میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللَّهُمَّ رَبَّنَا، آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا

عَذَابَ النَّارِ بکثرت پڑھا کرتے تھے اس حدیث میں ہے ربنا سے پہلے اللھم بھی ہے، حضرت قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ تر کس دعا کو پڑھتے تھے تو آپ نے جواب میں یہی دعا بتائی (مسند احمد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ جب خود بھی کبھی دعا مانگتے اس دعا کو نہ چھوڑتے، چنانچہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ کہا کہ حضرت آپ کے یہ بھائی چاہتے ہیں کہ آپ ان کے لئے دعا کریں آپ نے یہی دعا اللّٰھم ربّنا، آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً الخ پڑھی پھر کچھ دیر بیٹھے اور بات چیت کرنے کے بعد جب وہ جانے لگے تو پھر دعا کی درخواست کی آپ نے فرمایا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے کاموں کو مشکل بنادوں، إِذَا آتَاكُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً، وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً، وَوَقَاكُمْ عَذَابَ النَّارِ فَقَدْ آتَاكُمُ الْخَيْرَ كُلَّهُ (ابن ابی حاتم) جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا اچھی دے دی اور آخرت اچھی کر دے، تمہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے تو گویا اس نے تمہیں ساری کی ساری خیریں عطا فرمادی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مسلمان بیمار کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے دیکھا کہ وہ بالکل دبلا پتلا ہو رہا ہے وہ مثل چوزے کے رہ گیا ہے آپ نے پوچھا کیا هَلْ تَدْعُو اللّٰهَ بِشَيْءٍ أَوْ تَسْأَلُهُ إِيَّاهُ؟ تم کوئی دعا بھی اللہ تعالیٰ سے مانگا کرتے تھے؟ اس نے کہا ہاں میری یہ دعا تھی کہ اللّٰهُمَّ مَا كُنْتَ مُعَاقِبِي بِهِ فِي الْآخِرَةِ فَعَجِّلْهُ لِي فِي الدُّنْيَا اے اللہ! جو عذاب تو مجھے آخرت میں کرنا چاہتا ہے وہ دنیا میں ہی کر ڈال آپ نے فرمایا سُبْحَانَ اللّٰهِ! لَا تُطِيقُهُ أَوْ لَا تَسْتَطِيعُهُ فَهَلَّا قُلْتَ: رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ پاک ہے وہ ذات، تو اس کی طاقت نہیں رکھتا یا تو اس کی استطاعت نہیں رکھتا، تو نے یوں کیوں نہ دعا کی کہ اے میرے پروردگار! مجھے دنیا بھی اچھی دے دے اور مجھے آخرت بھی اچھی دے دے اور مجھے آخرت کے عذاب سے بچالے، چنانچہ بیمار نے اب سے اسی دعا کو پڑھنا شروع کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس شفا دے دی۔ (مسند احمد)

حضرت نبی کریم ﷺ حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان یہی دعا مانگا کرتے تھے۔(ابن ماجہ، ابن کثیر) بیت اللہ شریف کے طواف کے دوران نبی کریم ﷺ اس رکن کے قریب سے گزرتے تھے تو آپ ﷺ کی دعا پر فرشتہ آمین کہتا تھا، جس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَا مَرَرْتُ عَلَى الرُّكْنِ إِلَّا رَأَيْتُ عَلَيْهِ مَلَكًا يَقُولُ: آمِينَ میں جب کبھی رکن کے پاس سے گزرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہاں فرشتہ ہے اور وہ آمین کہہ رہا ہے تم جب کبھی یہاں سے گزرو تو دعا رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً الخ پڑھا کرو(ابن مردویہ، ابن کثیر)

شیخ ابو القاسم حکیم رحمہ اللہ نے دنیا کی بھلائی کا مفہوم یہ بیان کیا کہ سعادت والی زندگی مل جائے تو یہ دنیا کی حسنہ ہے، شہادت کی موت مل جائے تو یہ حسنہ دنیویہ ہے، آخرت کی بھلائی یہ ہے کہ جب قبر سے اٹھایا جائے تو خوش وخرم ہو، پل صراط سے سلامتی کے ساتھ گزر جائے، وَقِنَا کا معنٰی ہے کہ ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے، معافی عطا فرمادے، بخشش فرمادے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حسنہ فی الدنیا کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں نیک عورت مل جائے اور آخرت میں حوریں مل جائیں اور عذاب النار سے مراد بری عورت ہے، شیخ سعدیؒ نے فرمایا

چو مستُور باشَد زَن خُوب رُوی ..... بدِیدَار اُو دَر بہشتست شَوِی

اگر حسینہ عورت پردے میں رہے تو اس کے دیدار سے تو دنیا میں ہی بہشت میں ہے

انسانوں کی تین اقسام: انسانوں کی تین قسمیں ہیں ایک قسم کم ہمت لوگوں کی ہے، دوسری قسم درمیانی ہمت والوں کی ہے، تیسری قسم بلند ہمت لوگوں کی ہے، جو لوگ کم ہمت ہیں وہ اس کم قیمت دنیا پر اپنی ہمت کو نچھاور کرتے ہیں، وہ اس کی فانی چیزوں پر مر مٹتے ہیں، ان کا دل ودماغ محبوب کی محبت سے خالی ہوتا ہے، محبوب کی محبت سے خالی انسان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ ونصیب نہیں ہے، درمیانی ہمت والے وہ لوگ ہیں جو دارین کی سلامتی کے طلب گار ہیں، دونوں جہانوں کی درستگی چاہتے ہیں، وہ اس دار فانی میں ان چیزوں میں مشغول ہوتے ہیں جو انہیں دار القرار یعنی آخرت میں نفع

دیں، وہ دنیا میں جس قدر حاجت وضرورت ہے اسی کے طلب گار ہوتے ہیں، یہ طلب گار ہیں دنیا میں اچھائی اور حسنہ کے اور طلب گار ہیں آخرت کی بھلائی اور حسنہ کے، آخرت کی حسنہ خوشی وسرور ہے۔

جو لوگ بلند ہمت ہیں، عالی ہمت ہیں وہ وہ لوگ ہیں جو دونوں جہانوں میں اپنی ہمتوں کو بلند رکھتے ہیں، وہ دونوں جہانوں کی طرف متوجہ ہونے سے چشم پوشی کرتے ہیں، وہ ان دونوں جہانوں کی بجائے اپنی ہمت کو اپنے مولا اور رب کے ساتھ جوڑے رکھتے ہیں، وہ اللہ کی ذات کے سوا کسی چیز پر سیر نہیں ہوتے، وہ اس دنیا سے جب منہ پھیرتے ہیں تو اس سے چشم پوشی کرتے ہوئے، اعراض کرتے ہوئے، منہ موڑتے ہوئے چل پڑتے ہیں، انہیں دنیا کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی ذات عالی سے غافل نہیں کرتی، وہ زبان قال وزبان حال دونوں سے کبیر المتعال، رب ذوالجلال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، وہ ملک الودود کی رضا اور خوشنودی کے طلب گار ہوتے ہیں، وہ اگر دنیا کی حسنہ اور بھلائی کے طلب گار ہوتے ہیں تو صرف اس میں موجودگی کی وجہ سے اور اگر وہ آخرت کی حسنہ اور بھلائی کے طلب گار ہوتے ہیں تو رفیق الاعلیٰ کا قرب چاہنے کے لیے، مقربین بارگاہ رب العالمین کا قرب چاہنے کے لیے، انبیاء کرام علیہم السلام کی معیت چاہنے کے لیے، وہ ملیک مقتدر کا قرب چاہنے کی وجہ سے حسنہ اخروی کے طالب ہوتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا: جو دنیا اور آخرت دونوں جہان کی حسنہ اور بھلائی کی دعائیں مانگتے ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں ہمہ وقت عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کر، یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو اپنی کمائی کا حصہ پائیں گے اور یہ حصہ اس اصول کے مطابق ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے صالح اور نیک بندوں کی حسنات اور نیکیوں کے بدلہ کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔

وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ: اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے، سریع اسم فاعل ہے سرع یسرع سے، روایت ہے کہ جتنی دیر میں بکری کا دودھ دوہا جاتا ہے اتنی دیر میں اللہ تعالیٰ مخلوق کا حساب لے گا، دوسری

روایت یہ ہے کہ ایک لمحہ بھر میں ساری مخلوق کا حساب لے لے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو حساب لینے کے لیے غور و فکر کی حاجت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حساب ایک پلک جھپکنے میں لے لے گا۔(اوضح التفسیر)اللہ جلد حساب لینے والا ہے کا مطلب یہ ہے کہ اسے کوئی چیز دوسری چیز سے مشغول کرنے والی نہیں ہے اور نہ ہی گنتی اور عدد میں اس سے غلطی ہو سکتی ہے۔وہ ایسا معبود ہے کہ ساری مخلوق کا حساب دنیا کے ایک دن کے نصف میں مکمل کر سکتا ہے، ایک مطلب یہ ہے کہ وہ جلد حساب کرنے والا ہے، کام کرنے والے کو اس کے کیے کی جزا جلد دے گا، تاخیر نہیں ہو گی، وہ اس قدر جلد حساب لے گا کہ محاسبہ کے بعد آدھا دن بھی نہیں گزرے گا کہ جنتی جنت میں ہوں گے۔(ایسر التفاسیر الجزائری)

حضرات صحابہ کرام نے اللہ تعالیٰ کے جلد حساب لینے پر نبی کریم ﷺ کے سامنے اشکال پیش کیا کہ اللہ کیسے اتنا جلدی حساب لے گا جب کہ ہم بہت لوگ ہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک چیز کی خبر نہ دوں؟ اللہ کی نعمتوں میں سے ایک چاند ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے، سارے لوگ اسے ایک ہی گھڑی میں بلا مزاحمت و بلا مشقت دیکھتے ہیں، جب اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق کا نور اس قدر ہے کہ سارے انسان اسے بیک وقت دیکھتے ہیں، سارا عالم اس میں شریک ہے، جسے اللہ کے سوا کوئی گن نہیں سکتا تو خالق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟۔ الکفایہ فی التفسیر بالماثور والدرایہ)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا ایک ہی دن میں حساب کیسے لے گا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ انہیں روزانہ رزق دیتا ہے اسی طرح ایک ہی دن میں ان سے حساب بھی لے لے گا(الکفایہ فی التفسیر بالماثور والدرایہ)

سریع الحساب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دسیوں، سینکڑوں اور لاکھوں مخلوقات کا حساب اس طرح لے گا جس طرح کہ ایک شخص کا حساب لے، جیسے سورۃ لقمان میں فرمایا کہ تمہارا پیدا کرنا اور

تمہیں قبروں سے دوبارہ اٹھانا ایسا ہے جیسا کہ ایک جان کا اٹھانا، ہماری اس قدر تعداد کو اس نے پیدا کیا، اس قدر تعداد کو اس نے موت دی، یہ یوں ہی ہے جیسے ایک جان کا پیدا کرنا یا ایک جان کو قبر سے اٹھانا، اس سب کچھ میں اسے کوئی اکتاہٹ اور تھکاوٹ نہیں ہوتی، جیسے نصاریٰ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر ساتویں دن آرام کیا۔ (تفسیر المنتصر)

اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کا حساب اس طرح لے گا جس طرح ایک شخص کا حساب لے۔ وہ حساب لینے میں نہ دیر کرے گا اور نہ ہی خطا کرے گا۔ (ایسر التفاسیر) اللہ سریع الحساب ہے اسے گننے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی گنتی کے لیے مٹھی بند کرنے کی حاجت ہے، نہ اسے کوئی چیز یاد کرنے کی ضرورت ہے، نہ اسے دیکھنے اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔ (تفسیر الثعلبی)

مخلوقات کی کثرت، ان کے اعمال کی کثرت کے باوجود اللہ نے اپنے کو سریع الحساب فرما کر اپنی قدرت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ (حاشیہ علی تفسیر ابی سعود) سریع الحساب کا مطلب یہ ہے کہ جس اجر کا ان لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا وہ انہیں جلد پہنچائے گا، اس میں اسے کسی فکر و تامل کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، کیونکہ وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے، وہ ہر ایک کو ملنے والے ثواب اور عذاب کے بارے میں جانتا ہے وہ سب لوگوں کا حساب بہت تھوڑے سے وقت میں لے لے گا۔ (حدائق روح وریحان)

سریع الحساب کا مطلب یہ ہے کہ اپنے بندوں کی دعا جلد سننے والا اور جلد قبول کرنے والا ہے، وہ تمام سوال کرنے والوں کے سوالوں کو جانتا ہے، ایک معنیٰ اس کا یہ بھی ہے کہ وہ سریع المحاسبہ اور جلد گننے والا ہے، وہ بندوں کی کثرت کے باوجود ان کی عبادت کا حساب کرے گا، وہ ان کے کثرت اعمال کے باوجود ایک لمحہ میں انہیں شمار کرلے گا۔ (حدائق روح وریحان)

سریع الحساب کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک کا حساب اسے دوسرے کے حساب سے غافل نہیں کر سکتا، کسی ایک کا کام دوسرے کے کام سے اسے مشغول نہیں کر سکتا، وہ کسی گنتی کے تکلف کا محتاج

نہیں ہے نہ ہی اسے کسی رجسٹر وکتاب کے دیکھنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی اور چیز کو دیکھنے کی حاجت، اسے زبانی یاد کرنے کی ضرورت نہیں، اسے انگلیوں پر شمار کرنے کی حاجت نہیں، نہ ہی کسی اور چیز پر گننے کی حاجت ہے، وہ بندے کے عمل کرنے سے پہلے اس کے عمل کو جانتا ہے، اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ (نظم الدرر) وہ مخلوق کا حساب جلدی لے لے گا کیونکہ اس کا علم کسی رویت وفکر کا محتاج نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی ایسی چیز کا محتاج ہے جس کی حساب دانوں کو ضرورت پڑتی ہے۔ (بحر المحیط فی التفسیر)

منیٰ میں دو یا تین دن کا قیام اور ذکر اللہ کی تاکید

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقَى وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ {۲۰۳} البقرۃ

جواب ترجمہ: اور اللہ کو گنتی کے (ان چند) دنوں میں (جب تم منیٰ میں مقیم ہو) یاد کرتے رہو۔ پھر جو شخص دو ہی دن میں جلدی چلا جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور جو شخص (ایک دن) بعد میں جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں یہ (تفصیل) اس کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور تم سب تقویٰ اختیار کرو اور یقین رکھو کہ تم سب کو اسی کی طرف لے جا کر جمع کیا جائے گا۔

وَاذْكُرُوا اللَّهَ: اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے، مومن بندوں کو ہر وقت اس میں لگا رہنا چاہیے، بعض خاص ایام اور خاص اوقات میں ذکر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، سب سے بڑی عبادت نماز ہے اس کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ، نماز میرے ذکر کے لیے قائم کرو جیسا کہ سب جانتے ہیں نماز اول سے آخر تک ذکر ہی ہے، نماز سے پہلے اذان واقامت ہے وہ بھی ذکر ہے، نماز کے بعد تسبیحات اور دعائیں ہیں یہ بھی ذکر ہے، حج سراپا ذکر ہے، تلبیہ ذکر ہے، طواف میں ذکر ہے، سعی

میں ذکر ہے، عرفات میں ذکر ہے، مزدلفہ میں ذکر ہے، ایام منیٰ میں ذکر ہے، رمی کرتے وقت ذکر ہے، قربانی کرتے وقت ذکر ہے، سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ نے زندگی کے تمام احوال واشغال میں اذکار وادعیہ کی تعلیم دی، درحقیقت ذکر ہی اس دنیا کی روح ہے، جس دن اللہ کا ذکر نہ ہوگا یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ (انوار البیان)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک ایسا وقت نہ آجائے کہ زمین میں اللہ اللہ نہ کہا جائے، سید المرسلین ﷺ ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے تھے، كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ فِي كُلِّ اَحْيَانِهٖ (صحیح مسلم) منیٰ کے قیام کے دوران خوب اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہیں، تفسیر روح المعانی میں ہے وَاذْكُرُوا اللّٰهَ أَى كَبِّرُوهُ إِدبَارَ الصَّلَوَاتِ وَعِندَ ذَبحِ القَرَابِينَ، وَرَمى الجِمَارِ وَغَيرِهَا ۔ یعنی اللہ کی بڑائی بیان کرو نمازوں کے بعد اور قربانی کرتے وقت رمی جمار وغیرہ کے وقت۔ (انوار البیان)

فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ: ایام معدودات سے ایام تشریق کے تین دن مراد ہیں، ایام تشریق میں ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان میں اللہ کی بڑائی بیان کی جائے، تکبیر کہی جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، نمازوں کے بعد منیٰ میں تکبیر کہتے تھے، مجلس میں بھی تکبیر کہتے تھے، بستر پر بھی تکبیر کہتے تھے، راستہ میں بھی تکبیر کہتے تھے، تکبیر تشریق بھی ان دنوں میں مشروع ہے، تکبیر تشریق ان ایام میں پڑھنا واجب ہے، چاہے آدمی منیٰ میں ہو یا اپنے وطن میں ہو، نمازوں کے بعد تکبیر تشریق مردوں کے لیے باآواز بلند پڑھنا اور عورتوں کے لیے آہستہ آواز سے پڑھنا واجب ہے، تکبیر تشریق نویں ذی الحج کی فجر کو شروع ہو جاتی ہے اور تیرہویں ذی الحج کی عصر کی نماز پر ختم ہو جاتی ہے، سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہی طریقہ منقول ہے، ان دنوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام کرنا چاہیے، ان دنوں میں روزہ نہ رکھا جائے، نبی کریم ﷺ نے ان دنوں میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے، مسلم شریف کی روایت میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان دنوں میں روزہ نہ رکھو کیونکہ یہ دن

کھانے پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔ (مسلم)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فِي أَيَّامٍ مَعْدُودَاتٍ تین دن ہیں، یوم الاضحیٰ اور اس کے بعد دو دن، ذبح کر جس دن میں تو چاہے اور افضل پہلا دن ہے۔ (ابن ابی الدنیا، ابن ابی حاتم،)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أَيَّامٍ مَعْدُودَاتٍ سے مراد ایام تشریق اور أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ سے مراد ذی الحجہ کے دس دن ہیں، ذکر اللہ سے مراد یہ ہے کہ ایام تشریق میں فرض نمازوں کے بعد اللہ اکبر اللہ اکبر کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں عرفے کا دن قربانی کا دن اور ایام تشریق ہمارے یعنی اہل اسلام کی عید کے دن ہیں اور یہ دن کھانے پینے کے ہیں (احمد)

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ: ذکر کا حکم فرمانے کے بعد رمی جمار کے بعض مسائل بیان فرمائے جس کی تشریح یہ ہے کہ دسویں ذی الحجہ کو صرف جمرہ کبریٰ کی رمی کی جاتی ہے، اس کا وقت سورج نکلنے کے بعد سے لے کر آنے والی صبح صادق تک ہے لیکن رات میں کنکریاں مارنا قوت اور صحت والوں کے لیے مکروہ ہے۔ گیارہ اور بارہ تاریخ کی کنکریاں مارنے کا وقت زوال آفتاب کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور وہ بھی آنے والی صبح صادق تک رہتا ہے، قوت و صحت والوں کے لیے رمی کرنا ان دونوں راتوں میں بھی مکروہ ہے، گیارہویں اور بارہویں تاریخ کو تینوں جمرات کی رمی کی جاتی ہے، دس گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کی رمی کرنا واجب ہے۔

منیٰ میں چھوٹے چھوٹے تین منارے سے بنائے ہوئے ہیں ان کو جمرات کہتے ہیں جو جمرۃ کی جمع ہے، پہلا جمرہ مسجد خیف کے قریب ہے اس کو جمرہ اولیٰ اور جمرہ صغریٰ کہتے ہیں، اس کے بعد جو جمرہ ہے اسے جمرہ وسطی کہتے ہیں، پھر اس کے بعد جو جمرہ ہے اس کو جمرہ کبریٰ اور جمرہ اُخریٰ اور جمرۃ العقبۃ کہتے ہیں، اس کے قریب منیٰ کی حد ختم ہو جاتی ہے، ان تینوں جمرات کے نیچے جڑ میں دائرے بنے ہوئے ہیں، ان دائروں میں کنکریاں گرنا ضروری ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان تینوں جگہ شیطان نے وسوسہ ڈال کر ورغلانے کی کوشش کی تھی آپ

نے اس کو کنکریاں ماری تھیں، کنکریاں مارنا اسی کی یادگار ہے ہر کنکری کے ساتھ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ رَغْمًا لِلشَّیْطَانِ وَرِضًی لِلرَّحْمٰنِ، پڑھے (میں اللہ کا نام لے کر رمی کرتا ہوں، اللہ سب سے بڑا ہے، یہ رمی شیطان کو ذلیل کرنے کے لیے ہے اور رحمن کو راضی کرنے کے لیے ہے) (انوار البیان)

۱۳ ذی الحجہ کی رمی چھوڑ دینا جائز ہے: ان دو دنوں (گیارہ بارہ تاریخ) کی رمی کرنے کے بعد اگر کوئی شخص چاہے کہ منیٰ سے چلا جائے اور تیرہویں تاریخ کی رمی نہ کرے تو اس کی اجازت ہے۔ اسی کو فرمایا فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ لیکن افضل یہ ہے کہ منیٰ میں ٹھہرا رہے اور تیرہویں تاریخ کی رمی کر کے منیٰ سے روانہ ہو، رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر تیرھویں تاریخ کی رمی بھی کی تھی جیسا کہ گیارہ بارہ تاریخ کو زوال کے بعد رمی کی، تیرھویں تاریخ کی رمی کا وقت صرف غروب آفتاب تک ہے۔

فقہا نے لکھا ہے کہ بارہویں تاریخ کو اگر منیٰ میں ہوتے ہوئے سورج غروب ہو جائے تو تیرہویں کی رمی چھوڑ کر جانا مکروہ ہے اور اگر منیٰ میں ہوتے ہوئے تیرھویں کی صبح ہو جائے تو تیرھویں کی رمی کرنا بھی واجب ہو جاتا ہے، اگر کوئی شخص گیارہ بارہ کی رمی کر کے چلے جانے کی اجازت ہوتے ہوئے منیٰ میں ٹھہرا رہے اور تیرہویں کی رمی کر کے جائے، اس کے بارے میں فرمایا وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ لِمَنِ اتَّقٰی، اور جو شخص تاخیر کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ (انوار البیان)

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ لفظ فَلَآ اِثْمَ جو دو جگہ وارد ہوا ہے اس سے دونوں باتوں میں اختیار دینا مقصود ہے کہ دسویں تاریخ کے بعد دو دن کی رمی کر کے چلا جائے تو اس کا بھی اختیار ہے اور تیسرے دن کی رمی کے لیے ٹھہر جائے اور منیٰ سے روانگی میں تاخیر کرے تو اس کا بھی اختیار ہے، اس پر یہ جو اشکال ہوتا ہے کہ جب تیرہویں تاریخ کی رمی کر کے جانا افضل ہے تو اس کے بارے میں فَلَا اِثْمَ کے بجائے ایسا لفظ ہونا چاہیے تھا جو افضلیت پر دلالت کرتا، اس کے جواب میں صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اس سے افضلیت کی نفی نہیں ہوتی (کیونکہ جو چیز افضل ہوتی ہے فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ

اس پر بھی صادق آتا ہے) لیکن یہ بات پھر بھی قابل توجہ ہے کہ نفی الاثم کو دونوں جگہ کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کے بارے میں صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اہل جاہلیت کی تردید کرنے کے لیے یہ طرز اختیار فرمایا ہے کیونکہ وہ آپس میں اختلاف رکھتے تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے تعجیل گناہ ہے اور بعض کہتے تھے کہ تاخیر گناہ ہے۔ (روح المعانی، انوار البیان)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ: یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کرو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو وہ تمہارے کھلے ہوئے اور چھپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے اور ان پر جزا وسزا دیں گے احکام حج جو اوپر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ در حقیقت ان سب کی روح ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ خاص ایام حج میں جب کہ اعمال حج میں مشغول ہو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو احکام حج میں کوئی کوتاہی نہ کرو کیونکہ وزن اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھا جائیں گے نیک اعمال کا اثر اور وزن ظاہر نہ ہونے دیں گے ز

عبادت حج کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان حج سے فارغ ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقویٰ کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو آگے احتیاط رکھو تو دنیا وآخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہے ورنہ جو شخص حج کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہو گیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو اس طرح کوئی خاص کام نہ آوے گی بلکہ علماء نے فرمایا ہے کہ حج مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے حج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محبت سے فارغ اور آخرت کی طرف راغب ہو ایسے شخص کا حج مقبول اور گناہ معاف ہیں اور دعاء اس کی مقبول ہے۔

دوران حج میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت و فرمانبرداری کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے اگر حج کرنے والے اس کا دھیان رکھیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آسکتا ہے۔ (معارف القرآن)

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج سے واپس آیا تو میرے دل میں ایک گناہ کا وسوسہ پیدا ہوا مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرمادیا۔ (معارف القرآن)

ایک ترکی بزرگ جو مولانا جامی کے مرید تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر ایک نور کا مشاہدہ کیا کرتے تھے وہ حج کو گئے اور فارغ ہو کر واپس آئے تو یہ کیفیت بجائے بڑھنے کے بالکل سلب ہو گئی اپنے مرشد مولانا جامی سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ حج سے پہلے تمہارے اندر تواضع و انکسار تھا اپنے آپ کو گنہگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاح وزاری کرتے تھے حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے اس لئے یہ حج ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہو گئی۔ (معارف القرآن)

احکام حج کے ختم پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہے اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے اس لئے خاتمہ کلام میں فرمایا کہ جس طرح حج سے پہلے اور حج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح حج کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کری کرائی عبادت ضائع ہو جائے۔ (معارف)

شیریں گفتار منافقین کا عملی کردار

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ {۲۰۴} وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ {۲۰۵} وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ {۲۰۶} البقرہ

جواب ترجمہ: اور لوگوں میں ایک وہ شخص بھی ہے کہ دنیوی زندگی کے بارے میں اس کی باتیں تمہیں بڑی اچھی لگتی ہیں اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ بھی بناتا ہے، حالانکہ وہ (تمہارے) دشمنوں میں سب سے زیادہ کٹر ہے۔ اور جب اٹھ کر جاتا ہے تو زمین میں اس کی دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ وہ اس میں فساد مچائے، اور فصلیں اور نسلیں تباہ کرے، حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا خوف کرو، تو نخوت اس کو گناہ پر اور آمادہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایسے شخص کو تو جہنم ہی راس آئے گی۔

شان نزول: یہ آیت اخنس بن شُریق ثقفی کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ منافق شخص تھا ظاہر میں مسلمان تھا لیکن باطن میں مخالف تھا، ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی برائیاں کی تھیں جو رجیع میں شہید کئے گئے تھے تو ان شہداء کی تعریف میں (من یشری) والی آیت اتری اور ان منافقین کی مذمت کے بارے میں (من یعجبک) الخ والی آیت نازل ہوئی۔

حضرت نوف بکالی جو توراۃ و انجیل کے بھی عالم تھے فرماتے ہیں کہ میں اس امت کے بعض لوگوں کی برائیاں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب میں پاتا ہوں لکھا ہے کہ بعض لوگ دین کے حیلے سے دنیا کماتے ہیں ان کی زبانیں تو شہد سے زیادہ میٹھی ہیں لیکن دل ایلوے سے زیادہ کڑوے ہیں لوگوں کے لئے بکریوں کی کھالیں پہنتے ہیں لیکن ان کے دل بھیڑیوں جیسے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کیا وہ مجھ پر جرأت کرتے ہیں اور میرے ساتھ دھوکے بازیاں کرتے ہیں مجھے اپنی ذات کی قسم کہ میں ان پر وہ فتنہ بھیجوں گا کہ بردبار لوگ بھی حیران رہ جائیں گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا: دنیوی زندگی میں جس شخص کی باتیں آپ کو اچھی لگتی ہیں یہ شخص اخنس بن شریق تھا، اس کا نام ابی تھا اور اخنس اس کا لقب تھا، اس کا یہ لقب اس لئے تھا کیونکہ وہ غزوہ بدر کے دن اپنے حلیفوں میں سے بنی زہرہ کے تین سو افراد کو ساتھ لے کر رسول اللہ

ﷺ کے خلاف جنگ کرنے سے پیچھے ہٹ گیا تھا، وہ انتہائی شیریں بیان اور حسین المنظر آدمی تھا، سو اس کے بعد وہ حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور اپنا اسلام ظاہر کیا اور یہ کہا: اللہ تعالیٰ جانتا ہے میں اپنے قول میں سچا ہوں، پھر اس کے بعد بھاگ گیا۔

وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ: منافقین اپنی چکنی چپڑی باتوں سے نبی کریم ﷺ کے دل میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتے تھے، وہ قسمیں کھا کر آپ ﷺ کے سامنے کہتے تھے کہ ہم آپ ﷺ کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ ان کے دل کے اندر جو کچھ چھپا ہوا ہے اسے بہتر جانتے ہیں، اگرچہ ان کی زبانوں پر کچھ اور ہے، یہ جھگڑالو شخص ہے۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ: یہ شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور پھر نبی اکرم ﷺ کے پاس سے چلا گیا اور مسلمانوں کی کھیتیوں اور گدھوں پر سے گزرا، کھیتیاں جلا ڈالیں اور گدھوں کے پاؤں کاٹ دیئے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ منہ موڑ کر جانا، تاکہ زمین میں فساد مچایا جائے اور کھیتیوں کو برباد اور نسلوں کو تباہ کیا جائے تو یہ ساری شرارتیں اور شر انگیزیاں فسادی لوگوں کی صفات ہیں، ایسے فسادیوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ: اخنس اور اس کے سارے ہم مشربوں کا ایک ہی ڈھنگ ہے، جب انہیں ان کی فتنہ پردازیوں سے روکنے کے لئے اللہ کا خوف دلایا جاتا ہے تو غصہ سے ان کے نتھنے پھول جاتے ہیں اور اسے وہ اپنے ذاتی وقار اور شخصی عزت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں، اس وقت نہ انہیں خدا کا خوف رہتا ہے اور نہ اس کے دردناک عذاب کا، وہ اپنی ساری طاقتیں اپنے جھوٹے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ (ضیاء القرآن)

صہیب بن سنان رومی کی جان فروشی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ {۲۰۷} البقرۃ

جواب ترجمہ: اور بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضاجوئی کے لیے اپنی جان بھی بیچ دیتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے

شان نزول: یہ آیت حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے یہ مکہ میں مسلمان ہوئے تھے جب مدینہ کی طرف ہجرت کرنی چاہی تو کافروں نے ان سے کہا کہ ہم تمہیں مال لے کر نہیں جانے دیں گے اگر تم مال چھوڑ کر جانا چاہتے ہو تو تمہیں اختیار ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے سب مال سے علیحدگی کرلی اور کفار نے اس پر قبضہ کرلیا اور آپ رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی جس پر یہ آیت اتری۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت آپ رضی اللہ عنہ کے استقبال کے لئے حرہ تک آئی اور مبارکباد دی کہ آپ رضی اللہ عنہ نے بڑا اچھا بیوپار کیا، بڑے نفع کی تجارت کی، آپ رضی اللہ عنہ یہ سن کر فرمانے لگے، اللہ تعالیٰ آپ کی تجارتوں کو بھی نقصان والی نہ کرے، آخر بتاؤ تو یہ مبارکبادیں کیا ہیں؟ ان بزرگوں نے فرمایا، آپ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوشخبری سنائی۔ قریش نے ان سے کہا تھا کہ جب آپ مکہ میں آئے آپ کے پاس مال نہ تھا یہ سب مال یہیں کمایا، اب اس مال کو لے کر ہم جانے نہ دیں گے، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے مال کو چھوڑا اور دین لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جب آپ رضی اللہ عنہ ہجرت کے ارادے سے نکلے اور کفار مکہ کو علم ہوا تو سب نے آکر ان کو گھیر لیا، آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے ترکش سے تیر نکال لئے اور فرمایا اے مکہ والو! تم خوب جانتے ہو کہ میں کیسا تیر انداز ہوں؟ میرا ایک نشانہ بھی خطا نہیں جاتا، جب تک یہ تیر ختم نہ

ہوں گے میں تم کو چھید تا رہوں گا، اس کے بعد تلوار سے تم سے لڑوں گا اور اس میں بھی تم میں سے کسی سے کم نہیں ہوں، جب تلوار کے بھی ٹکڑے ہو جائیں گے، پھر تم میرے پاس آسکتے ہو، پھر جو چاہو کر لو، اگر یہ تمہیں منظور ہے تو بسم اللہ، ورنہ سنو میں تمہیں اپنا سارا مال دیئے دیتا ہوں، سب لے لو اور مجھے جانے دو، وہ مال لینے پر رضامند ہو گئے اور اس طرح آپ رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی وہاں بذریعہ وحی یہ آیت نازل ہو چکی تھی، آپ کو دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مبارک باد دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے کہ صہیب تم نے نفع والی تجارت کی ہے، تم نے نفع والی تجارت کی ہے۔

اکثر مفسرین کا یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت عام ہے ہر مجاہد فی سبیل اللہ کی شان ہے جیسے قرآن کریم میں دوسرے مقام پر یوں ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ) التوبہ:۱۱۱) اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں اور ان کے بدلے جنت دے دی ہے۔ یہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں مارتے بھی ہیں اور شہید بھی ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کا یہ سچا عہد تورات، انجیل اور قرآن میں موجود ہے اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچے عہد والا اور کون ہو گا تم اے ایماندارو اس خرید فروخت اور ادلے بدلے سے خوش ہو جاؤ یہی بڑی کامیابی ہے۔

اسلام میں پورے پورے داخل ہونے کا حکم

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ {۲۰۸} فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ {۲۰۹} البقرۃ

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، یقین جانو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ پھر جو روشن دلائل تمہارے پاس آچکے ہیں، اگر تم ان

کے بعد بھی (راہ راست سے) پھسل گئے تو یاد رکھو کہ اللہ اقتدار میں بھی کامل ہے، حکمت میں بھی کامل۔ منافقین کے احوال میں تھا کہ وہ چکنی چپڑی باتوں سے مطلب براری چاہتے ہیں، زمین میں فساد مچانے کی کوشش کرتے ہیں، فصلوں اور نسلوں کو تباہ کرنے کی کاوشیں کرتے ہیں، تو اہل اسلام کو یہاں حکم دیا گیا کہ وہ اس طرح کی کوئی بری حرکت نہ کریں، جو شریعت اسلامیہ کے برخلاف ہو، ان منافقین کے برعکس صاف ستھری اور بہترین زندگی گزاریں، جو مکمل اسلام کی پیروی اور اتباع میں ہے۔

سلم اور اسلام دونوں کا معنیٰ انقیاد اور گردن جھکانا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں ارشاد فرمایا کہ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ [الْبَقَرَةِ: ۱۳۱] جب اسے اس کے پروردگار نے فرمایا کہ تو تابعدار ہو جا تو اس نے کہا کہ میں تابعدار ہو گیا۔ اسلام کو بھی اسلام اسی معنیٰ کے لحاظ سے کہا جاتا ہے، اَلسِّلْمُ کا معنیٰ صلح اور لڑائی کو چھوڑ دینا ہے، جب صلح ہو گئی اور لڑائی چھوڑ دی تو اس میں بھی تابعداری والا معنیٰ پایا گیا، کیونکہ صلح ہر فریق کو دوسرے فریق کا تابعدار بنا دیتی ہے، صاحب لغت ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ السِّلْمِ میں تین لغات ہیں السِّلْمُ، وَالسَّلْمُ، وَالسَّلَمُ۔

بہت سے مفسرین کرام نے السِّلْمُ کو اسلام پر محمول کیا ہے، اس بناء پر اس آیت کی تقدیر عبارت یوں ہو گی کہ اے اہل ایمان! تم اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، حالانکہ ایمان اور اسلام دونوں ایک ہی چیز کا نام ہے، تو یہ جائز نہیں ہے، یہ اشکال ہے اس آیت پر، اس لیے اس سوال پر مفسرین کرام نے اس آیت کریمہ میں بہت سی تاویلات کی ہیں، جنہیں امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل فرمایا ہے۔

پہلی توجیہ: اس آیت سے منافقین مراد ہیں، اس لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے اپنی زبانوں سے ایمان کا دعویٰ کرنے والو! پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، اس کے نشانات حسن و جمال اور دھوکے بازیوں کے باعث نفاق پر قائم نہ رہو، جو لوگ اس سے منافقین مراد لیتے ہیں وہ اس بات سے بھی دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس سے پہلے

منافقین کا ذکر تھا، جس میں کہا گیا کہ لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جن کی باتیں آپ کو خوش کرتی ہیں، جب یہاں منافقین کا ذکر کیا تو اس مقام پر انہیں دلی ایمان لانے کی دعوت دی گئی کہ پورا پورا اسلام لاؤ اور منافقت کو چھوڑ دو۔

دوسری توجیہ: یہ آیت اہل کتاب سے اسلام قبول کرنے والے مسلمان گروہ کے بارے میں نازل ہوئی، جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی، یہ اس لیے کہ جب وہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تو اس کے بعد انہوں نے شریعت موسویہ کی تعظیم بجالانے کی ٹھان لی، ہفتہ کے دن کی تعظیم، اونٹوں کا گوشت اور ان کا دودھ پینے کو ناپسند کیا، یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ ان چیزوں کا چھوڑنا اسلام میں مباح ہے جب کہ تورات میں واجب ہے، اس لیے ہم انہیں احتیاطاً چھوڑتے ہیں، تو یہ باتیں اللہ کو پسند نہیں آئیں اور انہیں حکم دیا کہ وہ پورے پورے اسلام میں داخل ہو جائیں، یعنی شریعت اسلامیہ کی مکمل پیروی کریں، کچھ چیزیں تورات کی اعتقادی اور عملی طور پر قبول نہ کریں کیونکہ وہ منسوخ ہو چکی ہیں، اس لیے تورات کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے شیطان کے نقش قدم پر نہ چلیں، اس علم کے باوجود کہ وہ منسوخ ہو چکے ہیں، جو لوگ اس بات کے قائل ہیں وہ کافہ کو المسلم کی صفت مانتے ہیں، گویا کہ یوں کہا گیا کہ تم تمام شرائع اسلامیہ میں اعتقاداً اور عملاً داخل ہو جاؤ۔

تیسری توجیہ: یہ خطاب درحقیقت ان اہل کتاب کو ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے، جنہیں کہا گیا کہ اے پہلی کتاب پر ایمان لانے والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ یعنی ایمان میں اپنی اطاعت کامل کرو، یہ اس طرح ہو گا کہ تم اللہ کے تمام نبیوں پر ایمان لاؤ، اللہ کی تمام کتابوں پر ایمان لاؤ، پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی کتاب پر کامل طریقے سے ایمان لاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، وہ تمہیں یہ سمجھاتا ہے کہ دینِ تورات پر اکتفا کرو اس وجہ سے کہ وہ ایسا دین ہے جس پر سب کا اتفاق ہے، شیطان تمہیں مزین کر کے بتاتا ہے کہ وہ دین حق ہے جو تورات میں ہے، شیطان تمہیں بتاتا ہے کہ ہفتہ کے دن کی تعظیم کرو جب تک زمین و آسمان قائم ہیں، شیطان کے نقش قدم سے مراد یہی ہے ان شریعتوں کی باقیات پر مضبوطی سے عمل کرنا۔

چوتھی توجیہ: یہ خطاب مسلمان سے ہے، کہ اے زبانی کلامی ایمان لانے والو! پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، اسلام پر دوام اختیار کرو، ہمیشہ ہمیشہ اسی دین پر رہو، اس دین سے کبھی باہر نہ نکلو، اس کے احکامات میں سے کسی حکم سے نہ نکلو، شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو یعنی شکوک وشبہات کی طرف توجہ نہ کرو، جو گمراہوں کی طرف سے تمہارے دلوں میں ڈالے جاتے ہیں، جن لوگوں نے یہ تاویل پیش کی ہے وہ اس توجیہ کو اس سے پہلے اور بعد والی آیت کی بناء پر مضبوط سمجھتے ہیں۔

اس سے پہلے والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس منافق کی صفت بیان کی کہ وہ زمین میں فساد مچانے کی کوشش کرتا ہے، ہم نے وہاں بیان کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے دلوں میں شبہات ڈالتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ یوں فرمارہے ہیں کہ اپنے اسلام پر ڈٹے رہو، شکوک وشبہات کی پیروی نہ کرو جن کا منافقین ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد والی آیت میں فرمایا گیا کہ جو لوگ دلائل واضحہ کی موجودگی میں کج راہی اور گمراہی اختیار کرتے ہیں هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبان میں ان کے پاس سزا دینے کے لیے آئیں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جائے، یعنی کیا یہ لوگ اس وقت امر حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہو گا۔

پانچویں توجیہ: اس آیت میں السِّلْمُ کا معنیٰ ومطلب صلح کرنا، تنازع، محاربہ، لڑائی جھگڑا چھوڑنا ہے، اس لحاظ سے تقدیر عبارت کی یوں ہے کہ اے اہل ایمان! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، یعنی دین کی مدد اور نصرت کے لیے متحد ومنظم ہو جاؤ، شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو کہ وہ کہیں تمہیں دنیا کی طلب اور لوگوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے پر ابھارے، اس کی اللہ نے ممانعت فرمائی ہے، ارشاد ہے وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ [الأنفال: ۴۶] آپس میں نزاع اور جھگڑا نہ کرو ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ارشاد ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا [آلِ عِمْرَانَ: ۲۰۰] اے اہل ایمان! صبر سے کام لو۔ اور ارشاد ہے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعاً وَلَا تَفَرَّقُوا [آلِ عِمْرَانَ: ۱۰۳]

اللہ کی رسی کو سب لوگ مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ بازی نہ کرو، اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اَلْمُؤْمِنُ يَرْضَى لِأَخِيهِ مَا يَرْضَى لِنَفْسِهِ مومن اپنے بھائی کے لیے وہ چیز پسند کرتا ہے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اس آیت پر ہونے والے اشکال کا جواب حضرات مفسرین کی توجیہات کے ساتھ پیش کرنے کے بعد اپنی چند توجیہات بھی پیش فرمائی ہیں، ان کی پیش کردہ توجیہات یہ ہیں

توجیہ اول رازی: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا یہ معرفت اور قلبی تصدیق کی طرف اشارہ ہے، اور ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً یہ گناہوں اور معاصی کو چھوڑنے کی طرف اشارہ ہے اور یہ اس لیے کہ معصیت، گناہ، نافرمانی یہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنا ہے اس لیے یہ بات درست اور صحیح ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور گناہ چھوڑنے کو اَلسِّلْمُ کا نام دیا جائے۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ تم لوگ اطاعت و فرمانبرداری کے ذریعے اللہ کے سامنے جھکنے والے بن جاؤ، اللہ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے رک کر اللہ کے فرمانبردار بن جاؤ۔ اس لیے کہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ گناہوں میں مشغول ہونے کے باوجود ایمان باقی رہتا ہے، اور یہ ظاہری تاویل ہے۔

توجیہ ثانی رازی: اَلسِّلْمُ سے مراد ہے بندے کا یوں راضی رہنا کہ اس کا دل بے چین و مضطرب نہ ہو، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے اَلرِّضَا بِالْقَضَاءِ بَابُ اللّٰهِ الْأَعْظَمُ قضا و تقدیر پر راضی رہنا یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا دروازہ ہے۔

توجیہ ثالث رازی: اس سے مراد انتقام کو چھوڑنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا [الْفُرْقَانِ: ۷۲] جب وہ لوگ فضول باتوں سے گزرتے ہیں تو شرافت سے گزر جاتے ہیں، اسی طرح اللہ کا فرمان ہے خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ [الأعراف:۱۹۹) درگزر کیجیے، نیکی کا حکم کیجیے اور جاہلوں سے منہ موڑ لیجیے۔

كَافَّةً: جن لوگوں کو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جانے کا حکم دیا گیا یہ لفظ ان کی طرف لوٹتا ہے کہ مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ، تفرقہ بازی نہ کرو، اختلاف وانتشار کا شکار نہ ہو جاؤ، اس لفظ کا اسلام کی طرف لوٹنا بھی درست ہے یعنی پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، اس کے سارے شرائع اور احکامات کو مانو، یہی زیادہ درست ہے کیونکہ اہل ایمان حکم دیے گئے ہیں کہ وہ سارے کے سارے احکام اسلام کو مانیں اور ان پر عمل کریں۔

كَافَّه: کا لغوی معنیٰ پردہ اور رکاوٹ ہے، جیسے عربی میں کہا جاتا ہے كَفَفْتُ فُلَانًا عَنِ السُّوءِ میں نے فلاں شخص کو برائی سے روکا، یہاں کففت کا معنیٰ منعت ہے، اسی طرح عربی میں کہا جاتا ہے كَفَّ الْقَمِيصَ کیونکہ وہ کپڑے کو پھیلنے سے روکتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کف ہاتھ کے کنارے کو کہتے ہیں، کیونکہ ہاتھ سارے بدن کے لیے رکاوٹ ہے، اسی طرح جو آدمی آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو اسے عربی میں رجل مکفوف کہا جاتا ہے یعنی وہ شخص جس کی آنکھ دیکھتی نہیں ہے، تو کافہ کا معنیٰ ہے مانعہ روکنے والی۔ پھر یہ ایک ایسے جملے کا نام بن گیا جو جامع ہو، کیونکہ اجتماع تفرق اور شذوذ کو روکتا ہے، تو یہاں جو فرمایا اُدخُلوا فِي السِّلمِ كَافَّه یعنی اسلام کے تمام شرائع اور احکامات میں داخل ہو جاؤ، کسی ایک شرعی حکم کو چھوڑنے سے رک جاؤ، یا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تم سارے کے سارے لوگ اسلام میں داخل ہو جاؤ کوئی ایک بھی اس میں داخل ہونے سے پیچھے نہ رہو۔

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ: اِتِّبَاع باب افتعال ہے، اس کا معنیٰ ہے کسی انسان کے نشان قدم پر چلنا، کسی کے پیچھے پیچھے چلنا، کسی کے قدم بقدم چلنا، اللہ فرماتے ہیں کہ شیطان کے پیچھے پیچھے نہ چلو، اس کی پیروی نہ کرو، اس کی اتباع نہ کرو، وہ تمہیں کبھی تورات کے پیچھے لگاتا ہے، کبھی انجیل کی طرف موڑتا ہے اور کبھی دوسرے ادیان کی کچھ چیزیں دکھا کر تمہیں دین اسلام سے بدظن کرنے کی تگ ودو کرتا ہے، تم دین اسلام، شرائع اسلام سے اگر ذرا سا بھی ہٹ کر کسی دوسری طرف جھانکنے لگو گے تو سمجھ لو تمہیں شیطان نے اپنے پیچھے لگا لیا ہے، اس لیے تم اس کے نشان

قدم پر مت چلو۔

وَخُطُوَاتٌ: خُطْوَۃٌ کی جمع ہے، چلنے کے وقت دو قدموں کے درمیان کے فاصلے کو خطوہ کہا جاتا ہے، لیکن یہاں جو فرمایا گیا کہ شیطان کے قدموں پر نہ چلو سے مراد شیطانی اعمال، افعال اور شیطانی خیالات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان کی راہوں اور طریقوں پر نہ چلو، ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ خطوات الشیطان سے مراد شیطان کے اعمال ہیں، حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خطوات الشیطان سے مراد شیطان کی خطائیں ہیں، ابو مجلز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خطوات الشیطان سے مراد گناہوں کی نذریں ماننا، سنتوں اور شرائع اسلام کے علاوہ جتنی بھی بدعات اور معاصی ہیں وہ سب ہی خطوات الشیطان ہیں۔ (تفسیر الثعالبی)

خطوات الشیطان سے وہ تمام گناہ مراد ہیں جن کا تعلق دل، ہاتھ، زبان کے ساتھ ہے۔ (تفسیر السعدی) خطوات الشیطان سے مراد شیطانی وساوس ہیں۔ (تفسیر مراغی) شیطان حرام کاموں کو مزین کر کے دکھاتا ہے اور شہوات کی پیروی کرواتا ہے۔ (الاساس فی التفسیر) جب انسان خطوات الشیطان پر چلے گا تو شیطان اسے اس راستے پر چلائے گا جس پر چل کر انسان بے حیائی، برائی اور اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب کرے گا، شیطان اسے اللہ کی نافرمانی والے کام خوبصورت بنا کر دکھائے گا، وہ شیطانی چنگل میں پھنس کر اپنی دنیا اور آخرت دونوں ہی برباد کر ڈالے گا، کیونکہ شیطان انسان کو نقصان والے راستے پر ڈالتا ہے، جب کہ رحمان انسان کو درست اور سیدھے راستے پر ڈالتا ہے تاکہ انسان کا نقصان دنیوی اور اخروی دونوں اعتبار سے نہ ہو۔

إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ: شیطان کی پیروی اور اتباع سے منع کیا گیا، کیونکہ وہ نسل انسانی کا دشمن ہے، وہ آدم اور اولاد آدم کا دشمن ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو حکم دیا کہ شیطان کی بندگی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، میری بندگی کرو کیونکہ میرا راستہ سیدھا ہے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے فرمایا تھا کہ شیطان کی پوجا نہ کریں وہ اللہ رحمان کا نافرمان ہے، وہ اپنے دوستوں پر تسلط رکھتا ہے، اس

لیے اس کی دوستی یاری سے بچ کر رہنا ہے، اس نے اولاد آدم کو بہکانے اور راہ راست سے ہٹانے اور گمراہ کرنے کا اعلان عام کر رکھا ہے۔ شیطان بے حیائی اور برائی کے علاوہ تمہیں ایسی ایسی پٹیاں پڑھاتا ہے کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے بارے میں لب کشائی کرو، زبان درازی کرو۔

شیطان کے پاس اسلحہ، مال ومتاع، سازوسامان کچھ نہیں سوائے اس کے کہ اس کے پاس وسوسہ اور اللہ کی نافرمانی والے اعمال کو خوبصورت بنا کر انسانوں کو راہ راست سے ہٹانا ہے، وہ دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، وہ حسین بنا کر چیزیں پیش کرتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حوا پر شیطان نے جنت میں جو پہلا وار کیا تھا وہ انہی دو ہتھیاروں سے کیا تھا، جس درخت سے اللہ نے انہیں روکا تھا اسے اس نے خوبصورت بنا کر ان کے سامنے پیش کیا، بس انہی دو ہتھیاروں کے سامنے انسان زیرو زبر ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے ایسے کارنامے کر ڈالتے ہیں جو شیطان کو خوش اور رحمان کو ناراض کر دیتے ہیں۔

اگرچہ شیطان دکھائی نہیں دیتا، اس کی باتیں سنائی نہیں دیتیں مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے شیطان کو انسان کا کھلا دشمن قرار دیا ہے، جسے عَدُوٌّ مُبِينٌ کہا گیا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی دشمنی اور عداوت آدم علیہ السلام اور اولاد آدم علیہ السلام کے ساتھ کوئی ڈھکی چھپی یا پوشیدہ نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم الشان کتاب میں اسے آدم علیہ السلام اور نسل آدم علیہ السلام کا کھلا دشمن قرار دیا ہے، اگرچہ وہ اور اس کے چیلے چانٹے دکھائی نہ دیں، کوئی شخص کسی آدمی کے لیے کسی بھی شہر سے دشمنی کا اظہار کرے چاہے وہ کتنا ہی دور کیوں نہ ہو تو اس کے لیے یہ کہنا درست ہے کہ وہ فلاں آدمی کا کھلا دشمن ہے اگرچہ وہ فی الحال اسے دیکھ بھی نہ رہا ہو، اللہ نے یہاں شیطان کو مبین کہا ہے کہ وہ کھلا دشمن ہے، مبین ابانۃٌ سے ہے، ابانۃٌ بیان سے ہے، اس کا لغوی معنیٰ کاٹنا ہے، بیان کو عربی میں بیان کہنے کی وجہ یہی ہے وہ بعض لوگوں کے بعض کے بارے احتمالات کو کاٹ دیتا ہے۔ شیطان کو عدو مبین اس لیے کہا گیا کہ وہ انسان کو اپنے وسوسوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری

سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے، وہ انسان کو ثواب اور اللہ کی رضا سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔

شیطان دو اعتبار سے ہمارا دشمن ہے، ایک اس طرح کہ وہ کوشش کرتا ہے ہمیں نقصان پہنچائے، مگر قربان جایئے اللہ تعالیٰ کی مہربان ذات پر وہ ہمیں اس کے ضرر اور نقصان سے بچاتی ہے، دوسرا اس طرح وہ ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ وسوسے ڈالتا ہے، وہ گناہوں کو خوبصورت بنا کر دکھاتا ہے، وہ شکوک وشبہات ڈالتا ہے، یہ ساری چیزیں انسان کو باطل میں ڈالنے کے اسباب ہیں جن کے باعث انسان ثواب سے محروم ہو جاتا ہے، یہی وہ اسباب ہیں جن کے باعث شیطان ہمارا عدو مبین اور کھلا دشمن ہے۔

فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ: پھر جو روشن دلائل تمہارے پاس آچکے ہیں، اگر تم ان کے بعد بھی (راہ راست سے) پھسل گئے تو یاد رکھو کہ اللہ اقتدار میں بھی کامل ہے، حکمت میں بھی کامل۔ اس آیت میں بتایا کہ واضح دلائل آجانے کے بعد پھر بھی اسلام میں داخل نہ ہوئے تو اس کو معمولی بات نہ سمجھنا یہ اللہ تعالیٰ کی بغاوت ہے۔ وہ غالب ہے اس کے عذاب اور انتقام سے بچ نہیں سکتے اور وہ حکیم بھی ہے اپنی حکمت کے موافق وہ سزا دینے میں جلدی نہ کرے تو اس سے دھوکہ نہ کھانا اور یہ نہ سمجھنا کہ گرفت نہ ہوگی اور انتقام سے محفوظ رہیں گے۔ (انوار البیان)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر تم لوگ ہفتہ کی تعظیم اور اونٹوں کے گوشت بارے پھسل گئے بعد اس کے تمہارے پاس واضح دلائل آچکے ہیں، تمہارے پاس محمد صلی اللہ علیہ وسلم آچکے ہیں اور ان کے احکام آچکے ہیں تو پھر جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست انتقام لینے والا ہے وہ حکمت والا ہے، اس پر ان لوگوں نے کہا کہ لَئِنْ شِئْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ لَنَتْرُكَنَّ كُلَّ كِتَابٍ غَيْرَ كتابك، اگر یا رسول اللہ! آپ چاہتے ہیں تو ہم آپ کی کتاب کے علاوہ تمام کتابیں چھوڑ دیتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء کی یہ آیت نازل فرمائی يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ [النِّسَاءِ: ۱۳۶] اے اہل ایمان اللہ

اور اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کسی گناہ پر اس وقت تک مؤاخذہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ پہلے اس کی وضاحت نہ ہو چکی ہو، علت ختم ہو جانے پر گناہ کا مؤاخذہ کیا جائے گا، کیونکہ اللہ نے یہاں وعید کو دلائل کے آنے کی شرط کے ساتھ جوڑا ہے، دلائل آجائیں تو دوسروں کی حجت ختم ہو جاتی ہے، اس لیے جو شخص کسی فعل پر بالکل قدرت نہیں رکھتا اس پر کوئی وعید نہیں ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اعتبار دلائل کے حصول کا ہے، یقین کے حصول کا اعتبار نہیں ہے۔

حق قبول نہ کرنے پر سخت وعید

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ {۲۱۰} البقرۃ

جواب ترجمہ: یہ (کفار ایمان لانے کے لیے) اس کے سوا کس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ خود بادل کے سائبانوں میں ان کے سامنے آموجود ہو، اور فرشتے بھی (اس کے ساتھ ہوں) اور سارا معاملہ ابھی چکا دیا جائے؟ حالانکہ آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف تولٹ کر رہیں گے۔

جس انداز میں قرآن کریم مخالفین و معاندین کو سمجھاتا ہے اور راہ حق دکھاتا ہے اگر ان لوگوں میں تھوڑا سا شعور بھی ہو تو وہ عقلی اور نقلی دلائل کو دیکھ کر اللہ پر ایمان لے آئیں، رسولوں پر ایمان لے آئیں، اللہ کی آخری کتاب قرآن کریم پر ایمان لے آئیں، اللہ کے آخری رسول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم المرسلینی اور نبوت کو تسلیم کر لیں، مگر عقل و شعور سے عاری اور خالی لوگ کب آسانی سے تسلیم کرتے اور مانتے ہیں۔

اس دنیا میں انسان کی آزمائش کا تمام تر دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے

یا نہیں جس کو ایمان بالغیب کہتے ہیں اور ماننے کے بعد اتنی اخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کی طاقت رکھنے کے باوجود فرنبرداری اختیار کرے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعثیت میں، کتابوں کی تنزیل میں عقل کے امتحان اور اخلاقی قوت کی آزمائش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح بے نقاب نہیں کیا کہ آدمی کے لئے مانے بغیر چارہ ہی نہ رہے کیونکہ اس سے تو آزمائش بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور امتحان و آزمائش کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہتا، غیب اور حقیقت کے مشاہد ہونے کے بعد تو بڑے سے بڑا منکر بھی ایمان لے آتا ہے مگر اس ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے اسی بنا پر یہاں فرمایا جارہا ہے کہ اس وقت کا انتظار نہ کرو، جب اللہ تعالیٰ اور اس کی سلطنت کے کارکن فرشتے خود سامنے آجائیں گے کیونکہ پھر تو فیصلہ ہی کر ڈالا جائے گا۔

ایمان لانے اور سر جھکانے کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت تمہارے حواس سے پوشیدہ ہے اور تم محض دلیل سے اس کو تسلیم کر کے اپنی اخلاقی طاقت کا ثبوت دیتے ہو، ورنہ جب حقیقت بے پردہ ہو کر سامنے آجائے اور تم بچشم سر دیکھ لو کہ خدا اپنے تخت جلال پر متمکن ہے اور یہ ساری کائنات کی سلطنت اس کے فرمان پر چل رہی ہے اور یہ فرشتے زمین و آسمان کے انتظام میں لگے ہوئے ہیں اور یہ تمہاری ہستی اس کے قبضہ قدرت میں پوری بے بسی کے ساتھ جکڑی ہوئی ہے اس وقت تم ایمان لائے تو اس ایمان اطاعت کی قیمت ہی کیا ہے؟ اس وقت تو کٹر سے کٹّر کافر اور بڑے سے بڑا فرعون اور بدتر سے بدتر مجرم بھی انکار و نافرمانی کی جرأت نہیں کر سکتا، ایمان لانے اور اطاعت قبول کرنے کی مہلت بس اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت بے نقاب ہونے کی وہ ساعت نہیں آتی، اور جب وہ ساعت آگئی تو پھر نہ مہلت ہے نہ آزمائش بلکہ وہ فیصلے کا وقت ہے۔ (جلالین)

صاحب تفسیر حقانی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مشرکین اور یہود و نصاری کو خطاب ہے کہ تم ہماری آیتیں اور نشانیاں دیکھنے کے باوجود ہماری طرف رجوع کرنے میں حیلے بہانے کرتے ہو، اب اور کیا باقی رہ گیا ہے سوائے اس کے کہ تمہارے اعتقاد کے مطابق اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے تمہارے

سامنے آجائیں، تب تم مانو گے، ہم قادر مطلق ہیں یہ بھی کر سکتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے علماء سے پوچھو کہ ہم نے ان کو کیا کچھ نشانیاں نہیں دکھائیں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی لکڑی کا سانپ بن جانا، ان کے ہاتھ کا روشن اور چمکدار ہو جانا، ان کے لئے دریا کو چیر دینا، ان پر سخت گرمیوں میں ابر کا سایہ کر دینا، من وسلویٰ اتارنا، وغیرہ، یہ سب معجزات میری قدرت کاملہ کو ظاہر کرنے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو سچ ثابت کرنے کے لئے کافی تھے، اس کے باوجود انہوں نے میری نعمتوں کا کفر کیا اور ایمان لانے کی بجائے کفر پر اڑے رہے اور میری نعمتوں پر شکر کی بجائے ناشکری کرتے رہے جس پر میں نے ان کو ہلاک کر دیا اور جو ہماری نعمتوں کی قدر نہیں کرتا ہم اس کو سخت عذاب دیتے ہیں۔ (حقانی)

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ مختلف کفار اور خاص طور پر یہود مدینہ اس قسم کے مطالبات کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ براہ راست ہمیں نظر آکر ہمیں ایمان لانے کا حکم کیوں نہیں دیتا؟ یہ آیت اس قسم کے مطالبات کا جواب دے رہی ہے اور وہ یہ کہ یہ دنیا آزمائش کے لئے بنائی گئی ہے کہ انسان اپنی عقل استعمال کرے اور کائنات میں پھیلے ہوئے واضح دلائل کی روشنی میں اللہ کی توحید اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اسی لئے اس آزمائش میں اصل قیمت ایمان بالغیب کی ہے، اگر اللہ تعالیٰ براہ راست نظر آجائیں تو آزمائش کیا ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب غیب کی چیزیں انسان کو آنکھوں سے نظر آجائیں تو پھر ایمان معتبر نہیں ہوتا اور ایسا اسی وقت ہو گا جب یہ کائنات ختم کر کے سزا اور جزاء کا مرحلہ آجائے گا۔ (توضیح القرآن)

ناشکر گزار یہودی، نعمتوں کی تبدیلی اور عذاب الٰہی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُمْ مِنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ {۲۱۱} البقرۃ

جواب ترجمہ: بنی اسرائیل سے پوچھو ہم نے ان کو کتنی ساری کھلی نشانیاں دی تھیں، اور جس شخص کے پاس اللہ کی نعمت آچکی ہو، پھر وہ اس کو بدل ڈالے، تو (یاد رکھنا چاہیے کہ) اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔

مخالفین و معاندین کو واضح دلائل کے ساتھ راہ حق اختیار کرنے کی دعوت دی گئی، ان میں سے کچھ اکڑبازوں اور سینہ تان کر چلنے والوں کو متنبہ کیا گیا، ان کی بری خصلتوں اور عادات کو عالم آشکار کیا گیا، ان کی ضد اور ہٹ دھرمی پر یہاں تک کہا گیا کہ کیا تم تب مانو گے جب رب ذوالجلال کا عذاب آجائے، وہ خود سامنے آکر تمہیں کہے کہ اب مان لو، یہاں بھی اسی طرح کی تہدید وزجر ہے۔

نبی کریم ﷺ سے جو یہ فرمایا گیا کہ آپ ﷺ بنی اسرائیل سے ان دلائل و معجزات کے بارے میں سوال کریں جو ان کے آباؤاجداد نے دیکھے تھے تو اس سے مقصد یہ بالکل نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کی زبانی ان دلائل و معجزات کا نبی ﷺ کے علم میں کوئی اضافہ ہو گا یا آپ ﷺ اطلاع پائیں گے کہ بنی اسرائیل کو کیا کیا معجزات ملے اور کیا کیا دلائل دکھائے گئے، کیونکہ نبی کریم ﷺ تو ان تمام حالات، واقعات، معجزات اور دلائل سے باخبر ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو ساری باتیں بتلادی ہوئی ہیں، مقصود صرف ان بنی اسرائیل کی زجر و توبیخ اور تہدید میں مبالغہ کی حد تک جانا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ تم اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، انہیں اسلام لانے اور کفر اختیار کرنے سے منع کیا، پھر انہیں واضح دلائل آنے کے بعد پھسل جانے اور اعراض کرنے سے منع کیا گیا، پھر انہیں ڈرایا دھمکایا گیا کہ اگر تم پھر بھی پھسلے تو اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

شیخ بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد ﷺ! یہود مدینہ سے سوال کیجیے۔ (تفسیر بغوی) علامہ ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہود مدینہ سے کیا جانے والا سوال خبر معلوم کرنے کے لیے نہیں تھا بلکہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے تھا۔ (النکت والعیون)

زجاج کہتے ہیں کہ یہاں خطاب تو حضرت نبی کریم ﷺ سے ہے لیکن اس سے مراد تمام اہل ایمان اوران کے علاوہ لوگ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں واضح دلائل، واضح نشانیاں اور معجزات عطا کیے گئے، وہ نبی کریم ﷺ کے معاملے کو بہتر طریقے سے جانتے تھے اس کے باوجود انہوں نے انکار کیا، حالانکہ وہ ساری حقیقت سے آگاہ اور واقف تھے۔ (معانی القرآن)

بنی اسرائیل سے مراد یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کی اولاد ہے اوران کی طرف نسبت رکھنے والے ہیں، خاص سلبی یا نسبی اولاد مراد نہیں ہے۔ (تفسیر ابن عثیمین) پھر بنی اسرائیل سے یہاں کون لوگ مراد ہیں؟ اس بارے میں اہل تفسیر کی رائے یہ ہے کہ ان کے انبیاء، ان کے علماء اور ان کے تمام لوگ اس سے مراد ہیں۔ (النکت والعیون)

كَمْ آتَيْنَاهُمْ مِنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ: ہم نے ان بنی اسرائیل کو کتنی ساری نشانیاں دی تھیں؟ یہاں بَيِّنَةٍ میں دو قول ہیں ایک یہ کہ اس سے مراد حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریا پھٹ گیا تھا تو وہ اس کے اندر سے گزر گئے تھے، میدان تیہ میں ان کے لوگوں پر بادل سایہ فگن رہے، ان کے لوگوں کے کھانے پینے کی خاطر من وسلویٰ جیسی نعمت تھی، اللہ نے منکرین تورات ورسالت موسوی کے سروں پر پہاڑ معلق کر دیا تھا، بادلوں کے اندر سے اللہ تعالیٰ کا موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہونا بھی معجزہ تھا، تورات کا اتارا جانا بھی معجزہ تھا، کفر سے ہدایت کو واضح کرنا بھی معجزہ تھا، یہ ساری فہرست واضح دلائل، معجزات اور بینات کی ہے۔ دوسرا قول، اس سے مراد یہ ہے کہ کتنے سارے واضح دلائل و معجزات ہم نے محمد ﷺ کو عطا کیے، تاکہ ان کی صداقت اوران کی شریعت کی صحت کو واضح کیا جائے۔

وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ: اور جس شخص کے پاس اللہ کی نعمت آچکی ہو، پھر وہ اس کو بدل ڈالے، اللہ کی نعمت کے بارے یہاں دو قول ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ کی نشانیاں اوراس کے دلائل ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بڑی اقسام میں سے ہیں، اس لیے کہ یہ ہدایت

کے اسباب اور ذرائع ہیں، گمراہی اور ضلالت سے نجات پانے کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں، اس قول کے مطابق نعمت اللہ کی تبدیلی میں دو وجوہات بیان کی گئی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانی جو عطا فرمائی تھی وہ ان کے معجزات تھے، ان میں تبدیلی کیسے کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ معجزات موسیٰ علیہ السلام کو اس لیے عطا کیے تھے تاکہ یہ ان لوگوں کی ہدایت کا سبب بن جائیں مگر ان لوگوں نے انہیں گمراہی کے اسباب بناڈالا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَزَادَتْهُمْ رِجْساً إِلَى رِجْسِهِمْ اس کاریگری نے ان کے عذاب کو ہی ان کے لیے بڑھایا۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ واضح نشانی سے مراد وہ ہے جو کچھ تورات اور انجیل میں بیان کیا گیا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل و معجزات سے متعلق، اسے تبدیل کیسے کیا کہ اس میں تحریف کر ڈالی، اس میں شکوک و شبہات ڈال دیے۔

دوسرا قول: نعمت اللہ سے مراد وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں صحت، امن اور کفایت کے اسباب مہیا فرمائے تھے تو اللہ کی ذات وہ ہے جس نے ان کے کفر کی وجہ سے ان اسباب نعمت کو نقمت و ناراضی کا ذریعہ بنادیا، لیکن اس نعمت کی تبدیلی کی نسبت ان لوگوں کی طرف کردی کیونکہ یہ لوگ اس تبدیلی کا سبب بن گئے تھے، جس کام کا انہیں حکم دیا گیا تھا وہ اس پر کھڑے نہیں ہوئے تھے، جو ان دلائل وبینات کی روشنی میں ان کے ذمہ تھا اس کو انہوں نے پورا نہیں کیا تھا اس لیے وہ نعمت ان سے چھن گئی۔

شیخ اثیر الدین اندلسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں نعمت اللہ کی تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ وہ واضح دلائل ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر پر دلالت کرتے ہیں، جنہیں ان لوگوں نے تشبیہ و تاویل سے بدل ڈالا، کتاب اللہ میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت و منقبت بیان ہوئی انہوں نے اسے دجال کی تعریف و ستائش میں بدل ڈالا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اعتراف کرنے کی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کر دیا، حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی تورات اور انجیل میں بیان کیے گئے احکامات کو تبدیل کر دیا۔ (البحر المحیط فی التفسیر)

ابو العباس بن عجیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یا ہر سننے والے سے فرمارہے ہیں کہ بنی اسرائیل سے ایک سوال کیجیے اوران سے پوچھیے کہ کتنی ساری نشانیاں ہیں جو ہم نے انہیں دیں؟یعنی بہت ساری نشانیاں انہیں عطا کی ہیں،جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس پر واضح دلیل ہیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے سچا ہونے پر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بلندی شان پر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم کام پر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام پر توجہ دینے والوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پالینے والوں کی نعمت پر دلالت ہیں، پھر ان لوگوں نے اس نعمت اللہ کو کفر سے بدل ڈالا اورانکار کر دیا، ان نعمتوں کو انہوں نے چھپایا اور انکار کیا، توجو شخص اللہ کی نعمتیں آنے کے بعد انہیں بدل دیتا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا سخت عذاب ہے، جو اس کی نعمتوں کا انکار کرے، اس کے رسولوں کا انکار کرے۔(البحر المدید)

فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ: جنہوں نے اللہ کا انکار کیا، جنہوں نے اس کے رسولوں کا انکار کیا، جس نے اس کی کتابوں کا انکار کیا، جس نے ان کتابوں میں نازل ہونے والے احکامات کا انکار کیا، یاان میں تبدیلی و تحریف کی، جس نے اللہ کے حکموں کو بدلنے کی ناروا کوشش کی، جس نے اللہ اوراس کے رسولوں کی مخالفت ومعاندت کی، جس نے اس کے اوامر کی مخالفت کی چاہے وہ ایسا کام تھا جس کو اس نے حرام قرار دیا تھا یاایسا کام تھا جس کو اس نے لازم قرار دیا تھا، ایسا شخص اللہ کی گرفت میں آئے گا، وہ شدید العقاب کا شکار ہو گا۔

شیخ علی بن زید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب حضرت مطرف رحمہ اللہ نے اس آیت کی تلاوت کی اور شدید العقاب پڑھاتو فرمانے لگے اگر لوگ اللہ کی سزا اور ناراضگی کا اندازہ کرلیں، للہ کی پکڑ کا اندازہ کرلیں، اللہ کی عبرت کا اندازہ کرلیں تو کوئی اپنے آنسو نہ تھام سکے، کسی کی آنکھیں کسی چیز سے ٹھنڈی نہ ہوں۔(الکفایہ فی التفسیر بالماثور والدرایہ)

علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کی حرمت کو توڑتا ہے اللہ اسے شدید گرفت میں لیتا ہے، علامہ زمنین فرماتے ہیں کہ اللہ جس سے انتقام لیناچاہتا ہے اسے سخت گرفت میں لیتا ہے۔

(الکفایہ فی التفسیر بالماثور والدرایہ)شدید العقاب کا مطلب یہ ہے کہ وہ دردناک عذاب دیتا ہے اور سخت پکڑ والا ہے۔(الکفایہ فی التفسیر بالماثور والدرایہ)

علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سخت سزا ملتی ہے ان لوگوں کو جو اس کا انکار کرتے ہیں اور دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ مل جانے کے باوجود اس کے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں۔ (الکفایہ فی التفسیر بالماثور)

اللہ تعالیٰ جس انداز میں کفار مکہ اور یہود مدینہ کے سامنے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار فرمارہے ہیں اس سے یہ بات ہر دانا وبینا کو جان لینا چاہیے کہ موجودہ کفار بھی پہلے کافروں کی طرح ہی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ اپنے بندوں کے ساتھ یہ ہے کہ اس کا اس کی مخلوق کے ساتھ کسی قسم کا رشتہ عبد ومعبود کی نسبت کے علاوہ نہیں ہے، کوئی نسبی تعلق مخلوق کے ساتھ نہیں ہے جس کی وہ رعایت کرے اور اس کے باعث وہ کسی سے محبت رکھے، سارے لوگ اللہ کے نزدیک ایک ہی جیسے ہیں، ہاں اللہ کے ہاں عزت والا، بزرگی والا، شرافت والا، محبوب اور پسندیدہ وہ بندہ ہے جو ان لوگوں میں سب سے زیادہ تقویٰ والا، اللہ سے ڈرنے والا، اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھنے والا، اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حلال جاننے والا، اللہ کے اوامر کی اتباع کرنے والا، اللہ کے مناہی سے رک جانے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ شدید العقاب ہے، اس کی عقوبت وسزا کا علم حاصل کرنا یہ تمام علوم میں اہم ترین علم ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ عقوبت اللہ کا علم جب انسان کو ہو گا تو وہ اس میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرے گا، جب عقوبت اللہ کا علم انسان کو ہو گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچے گا۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ تو غفور ہے، اللہ تو تواب ہے، اللہ تو رحمان ہے، اللہ تو رحیم ہے، وہ مہربان ذات کیونکر شدید العقاب ہو سکتی ہے؟ تو ایسے خیالاتِ رکھنے والوں کو تسلی رکھنی چاہیے کہ واقعی وہ غفور بھی ہے تواب بھی، وہ رحیم بھی رحمان بھی اور وہ ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندوں سے پیار ومحبت

کرنے والا بھی ہے، مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ گناہوں پر گوشمالی اور سزا دینا رحمت، توابی، غفوریت اور رحمان ورحیم کی رحمت ومہربانی کے بالکل خلاف نہیں ہے، اگرچہ اس نے فرمارکھا ہے کہ میری رحمت میرے جلال اور غصے پر حاوی ہے، لیکن جب کسی سزا کے مستحق گناہ گار کو اس کے کیے کی سزا ملتی ہے تو یہ سزا دینے والے کی رحمت اور مہربانی ہوتی ہے، کیونکہ دنیا میں ملنے والی سزا اس گناہ گار کے گناہ کا کفارہ ہوتا ہے اور آخرت میں شرک کے علاوہ کسی گناہ گار کو وہ چاہے تو معافی کا پروانہ دے دے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا۔

اللہ شدید العقاب ہے، اللہ کی پکڑ اور گرفت کو عقاب کہا گیا ہے، عقاب عقب سے ہے، اللہ کی گرفت و پکڑ کو عقاب اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس کی گرفت، اس کا مؤاخذہ گناہ گار کے گناہ کرنے کے بعد ہوتا ہے، جو شخص اللہ کے عقاب و سزا سے ڈرے گا وہ ان چیزوں سے بچے گا جو سزا اور عقاب کو لازم کرتی ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ سے ثواب و جزا کی امید رکھنے والا بندہ وہ کام کرتا ہے جو اسے ثواب کے کاموں تک پہنچادے، اور جو شخص اللہ کی سزا اور عقاب سے خوف زدہ نہیں ہوتا، جو ثواب و جزا کی امید نہیں رکھتا پھر وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں میں جاگھستا ہے اور اللہ کی طرف سے لازم وواجب کی ہوئی چیزوں کو چھوڑنے کی جرأت کرتا ہے۔

قرآن کریم میں جہاں بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ کے لیے رحمان، رحیم، کریم، رؤف، حلیم، تواب استعمال ہوا ہے اسی طرح اللہ کے لیے شدید العقاب بھی آیا ہے کہ اللہ کی پکڑ بڑی سخت ہے، ایک مقام پر واضح طور پر بَطْشِ شَدِیْد استعمال ہوا کہ اللہ کی گرفت بڑی سخت ہے، اسی لیے تو ایک مومن کے لیے لازم ہے کہ وہ ہمیشہ دو حالتوں خوف اور امید کے بیچ بیچ میں زندگی بسر کرے، اللہ تعالیٰ سے اس بات کا خوف رکھے کہ کہیں وہ اس کے گناہ کی بدولت سزا نہ دے دے، ڈرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بخشش کی امید بھی رکھے۔

رحمت کائنات ﷺ ایک انصاری نوجوان کی جان کنی کے عالم میں عیادت کی غرض سے

تشریف لے گئے، آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ تیرا کیا حال ہے؟ تو کیسا ہے؟ اس نے کہا یارسول اللہ! میں امید بھی رکھتا ہوں اور ڈرتا بھی ہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے دل میں اس مقام پر یہ دو چیزیں ہوں گی اللہ تعالیٰ اسے وہی عطا فرمائیں گے جس کی وہ امید رکھتا ہے اور اللہ اسے اس سے محفوظ رکھیں گے جس سے وہ ڈرتا ہے۔

تو امید و خوف کی یہ دو حالتیں ایسی ہیں جو ہر صاحب ایمان کو ہمیشہ لازمی رکھنی چاہییں، ایک حالت خوف ہے اور دوسری حالت رجا (امید) ہے، کیونکہ یہ حالتیں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ہوتی ہیں، جیسے سورۃ الانبیاء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ [الأنبياء:۹۰] وہ لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں، وہ ہمیں امید و خوف میں پکارتے ہیں اور وہ ہم سے ڈرنے والے ہیں۔

سابقہ امتوں کی طرف اللہ نے اپنے رسول اور نبی بھیجے، جو دلائل واضحہ، حجج قاطعہ اور براہین ساطعہ لے کر آئے، ایسے ایسے معجزات دکھائے کہ عقل انسانی حیران ہو جاتی ہے، مگر بدقسمت و بدبخت لوگوں نے انہیں ماننے اور تسلیم کرنے کی بجائے ان کا انکار کیا، انہیں جادوگر کہا، انہیں پاگل تک کہہ ڈالا، انہیں مجنون کہا، ان کی کتابوں کا انکار کیا، ان کی شخصیات کی تضحیک و توہین کی، ان کی ان سیاہ اعمالیوں کی بناء پر اللہ نے انہیں گرفت میں لیا، اس لیے کہ وہ بہت قوت والی ذات ہے، اسے القوی کہتے ہیں، اسے شدید العقاب کہتے ہیں۔

وہ جب نافرمانوں، بے ایمانوں اور حرماں نصیبوں کو پکڑنے پر آیا تو انہیں تباہ و برباد کر ڈالا، اس لیے کہ اس نے ان کی طرف اس تباہی و بربادی سے پہلے اپنے فرستادے اور اپنے رسول بھیجے تھے، جنہوں نے بڑے پیار اور میٹھے انداز میں انہیں سمجھانے اور راہ راست پر لانے کی کوشش کی مگر انہوں نے ان کی ایک نہ مانی، جس پر اس ذات کا جلال اس کے جمال پر غالب آ گیا، اللہ نے ان لوگوں کو بھی اپنی اپنی امتوں کی طرف آسمانی پیام دے کر بھیجا تھا، جیسے ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کو تمام

مخلوق کی طرف نبی بنا کر بھیجا، اسی طرح پہلے نبیوں اور رسولوں کو دلائل، واضح علامات، ادلہ کاشفات، اور اپنی قدرت کاملہ اور وحدانیت کے ثبوت کے طور پر معجزات عطا کیے، مگر لوگوں نے انکار کر دیا، جس پر اللہ شدید العقاب نے انہیں پکڑا اور تباہ و برباد کر دیا، اسی لیے اللہ کو شدید العقاب کہتے ہیں، اس ذات کو القوی کہتے ہیں جس سے زیادہ قوت والا کوئی نہیں ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ شدید العقاب ہے، دردناک عذاب سے نافرمانوں کو دوچار کرتا ہے، جسے اس نے پکڑ لیا وہ ایک دن بھی آرام سے نہیں گزار سکتا، جس کو اس نے گرفت میں لے لیا سمجھ لیں کہ وہ اپنی دنیا اور آخرت تاخت و تاراج کر بیٹھا، وہ اپنی جان، مال اور اولاد کو تباہ کر بیٹھا۔

اللہ گناہوں کو معاف کرنے والا، توبہ قبول کرنے والا ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ شدید العقاب بھی ہے، وہ باوجودیکہ کریم و رحیم ذات ہے مگر کافروں کے لیے اس کا واضح اعلان ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، مشرک کی بخشش نہیں ہے وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، باوجودیکہ کافروں کا کفر اللہ کو کوئی نقصان نہیں دیتا، وہ شدید العقاب سزاؤں، امتحانوں، بیماریوں، علتوں، فقر و فاقوں کو اپنے تمام بندوں پر مسلط کرتا ہے حالانکہ وہ ان کو ختم کرنے پر بھی قادر ہے۔

جب وہ ذات انسان کو اپنے خوف سے ڈراتی ہے تو انسان کیوں نہیں ڈرتا، وہ کیوں نافرمانیوں اور گناہوں پر جرأت کرتا ہے، انسان کیوں اس کے خوف سے بے نیاز ہو کر دھوکے میں مبتلا ہے؟ اللہ کو کریم، رحیم، غفور، تواب سمجھ کر گناہوں میں جتے رہنا، گناہوں کی دلدل میں دھنسے رہنا یہ کوئی امید نہیں ہے بلکہ یہ اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے، یہ حماقت ہے، یہ بے وقوفی ہے کیونکہ خوف اور امید دو ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو عمل پر کھڑا کرتی ہیں، جو چیز انسان کو عمل پر کھڑا نہ کر سکے جان لیجیے کہ وہ تزیین ہے، غرور ہے، وہ دھوکہ ہے، وہ ملمع کاری ہے، وہ زہر کے اوپر گڑ چڑھا ہوا ہے، وہ پیتل، لوہے اور تانبے پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے۔

بہت سی مخلوق اپنی کوتاہ اعمالیوں اور سیاہ کاریوں کی وجہ سے دنیا میں مشغول ہے، وہ یہ سمجھتی ہے کہ اللہ معاف کر دے گا، اللہ بخش دے گا، وہ اسی امید سے اللہ کی ذات سے منہ پھیرتی ہے اور آخرت کی کوشش نہیں کرتی، یہ دھوکہ اور اپنے آپ کو مغالطے میں ڈالنا ہے۔ ایک روایت میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اس امت کے آخری لوگوں کے دلوں پر دھوکہ غالب ہو گا، دیکھا جائے تو یہ ہو چکا ہے، پہلے زمانوں میں لوگ عبادات پر ہمیشگی کرتے تھے، جو کچھ انہیں بتایا جاتا تھا اس پر عمل کرتے تھے، ان کے دل اللہ سے ڈرتے رہتے تھے، وہ اللہ سے ڈرتے دل کے ساتھ بخشش کی امید رکھتے تھے۔

وہ اپنی جانوں پر خوف کھاتے تھے، وہ دن رات اللہ تعالیٰ کی اطاعت وبندگی میں صرف کرتے تھے، وہ ہمیشہ تقویٰ والی زندگی گزارتے تھے، وہ شکوک وشبہات اور نفسانی شہوات سے بچ بچ کر چلتے تھے، لیکن عصر حاضر میں لوگ بڑے مطمئن ہیں، دلیر ہیں، خرمستیوں میں مست ومگن ہیں، دنیا کی رنگ رلیوں پہ اتراتے ہیں، انہیں کوئی خوف اور ڈر نہیں رہا، وہ گناہوں کی دلدل میں سر تا پیر ڈوبے ہوئے ہیں، دنیا کی رنگینیوں اور بھول بھلیوں میں مدہوش اور مست ہیں، وہ اللہ سے اس امید پر منہ موڑے ہوئے ہیں انہیں اللہ کے کرم وفضل کی امید ہے، وہ اس کی معافی اور مغفرت کی امید لگائے ہوئے یوں زندگی گزار رہے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ اس کے فضل وکرم کو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، حضرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم سے بھی زیادہ جانتے ہیں۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم ان لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو کریم جانتے تھے مگر انہوں نے تو ایسا نہیں کیا جیسا یہ لوگ کرتے ہیں، اگر معاملہ صرف امیدوں اور آرزوؤں پر ہوتا تو پھر یہ لوگ راتوں کی تاریکیوں اور سناٹوں میں کیوں آہ وبکا اور زاریاں کرتے تھے؟ یہ سب کچھ ان کو اسی لیے کرنا پڑتا تھا کہ وہ اللہ سے خوف رکھتے تھے۔

قرآن کریم ابتدا سے لے کر آخر تک تحذیر (ڈرانا) ہی تحذیر ہے، تخویف (خوف دلانا) ہی تخویف ہے، اس میں جب بھی کوئی فکر کرنے والا فکر کرے گا تو اس کا حزن وملال زیادہ ہو گا، اس کا

خوف زیادہ ہو گا، یہ سب کچھ اس وقت ہو گا جب غور و فکر کرنے والے کے دل میں ایمان وایقان کی دولت ہو گی، لیکن افسوس لوگ اس عظیم الشان کتاب کی قدر نہیں کرتے، جلدی جلدی اسے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس میں کوئی غور و تدبر نہیں کرتے۔

اب تو بہت سے لوگ ایسے ہیں جو قرآنی الفاظ و کلمات کو بڑی ترتیل، تجوید، مخارج کی ادائیگی اور بڑے احسن اور اجمل لہجوں میں تلاوت کرتے ہیں، ایسی لے اور ایسی سر میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں کہ انسان کا جی چاہتا ہے سنتا ہی رہے کچھ لوگ اس انداز میں پڑھتے ہیں کہ گویا قرآن کریم شعر و شاعری کی کتاب ہے۔

بہت سے لوگ اس وقت دنیا میں ایسے ہیں جو بہت سے قاریوں کی نقالی کرتے ہیں، ان کا اندازِ تلاوت اختیار کرتے ہیں مگر افسوس صد افسوس کہ قرآن کریم کے معانی، مطالب اور مفاہیم کی طرف ان کا بالکل دھیان نہیں ہوتا، اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کے مطابق ان کی زندگی نہیں ہوتی، یہ لوگ اپنے کو سخت دھوکے میں رکھے ہوئے ہیں۔

بنی اسرائیل کو کہا گیا تھا کہ تورات کے بے عمل حاملین ایسے ہیں کہ گویا گدھے پر کتابوں کے پلندے اور طومار لادے گئے ہیں، اس امت کے بے عمل قاریانِ قرآن کے بارے میں کہا گیا کہ بہت سے قرآن پڑھنے والے قرآن کریم پڑھتے ہیں مگر قرآن کریم ان پر لعنت کر رہا ہوتا ہے، اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ وہ خدا خوفی سے خالی اور عمل سے عاری ہوتے ہیں۔

وہ شدید العقاب ہے، جسے پکڑ لے کوئی اس سے چھڑا نہیں سکتا، وہ ایسا شدید العقاب ہے کہ کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، تاب مقاومت لا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کی گرفت سے اپنے کو چھڑا کر بھاگ سکتا ہے، مجرم جس طرح کا جرم کرے گا وہ اسی طرح کی گرفت کرے گا اور اسے سزا دے گا، جس قدر جرم سخت ہو گا اس کی پکڑ اور سزا بھی اسی قدر سخت ہو گی۔

اہل ایمان وایقان خدا خوفی کا جذبہ رکھتے ہیں، جب کہ مشرکین بے خوف ہوتے ہیں، کافر

بے خوف ہوتے ہیں، مکہ کے مشرکین اور امم سابقہ کی باقیات کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس سرزمین کی پشت پر ان کے قدم پڑتے ہیں، جن پہاڑوں کے دامن سے یہ گزرتے ہیں، جن صحراؤں کو یہ عبور کرتے ہیں ان پر پہلے ان کے پیشوا رہا اور پھرا کرتے تھے، چلا کرتے تھے، وہ ان سے زیادہ قوت والے تھے، وہ طاقت رکھتے تھے، انہیں اپنی جان وجثہ اور تن وتوش پر بڑا فخر وناز تھا، وہ پہاڑوں کو کرید کر ان میں عالی شان محلات تعمیر کر لیتے اور مکانات بنا لیتے تھے، وہ چٹانوں کے سینے چیر کر ان میں بسیرے کر لیا کرتے تھے، بڑے قد وقامت کے مالک تھے۔

اسی بناء پر وہ ترنگ میں آکر کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے؟ لیکن جب انہوں نے اللہ کی نافرمانی کی تو اللہ نے انہیں گرفت میں لے لیا، کسی کو ایک چیخ نے تباہ کر ڈالا، کسی کو چنگھاڑ نے برباد کر ڈالا، کسی پر ہوا کے جھونکے مسلط کیے گئے، کسی پر پتھروں کی بارش کی گئی، کسی کو پانی میں غرقاب کر دیا گیا، کسی کو بندر بنا دیا گیا، کسی کو دنیا میں نشان عبرت بنا دیا گیا، یہ ہے وہ قوی ذات جسے سخت گیری کے باعث ہی شدید العقاب کہا گیا۔ قرآن کریم نے واضح کر دیا کہ جب وہ پکڑنے پر آتا ہے تو اس کی گرفت اور شکنجے سے کوئی بچا نہیں سکتا، وہ ڈبونا چاہے تو کوئی پانی سے بچا نہیں سکتا، وہ پتھروں کی بارش کرنا چاہے تو کوئی اسے تھام نہیں سکتا، وہ طوفان، جھکڑ چلائے اور انسانوں کو موت کے منہ میں پہنچائے تو کوئی روک نہیں سکتا۔

کفار کے لیے حیات دنیا کی دلکشی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے۔

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ {۲۱۲} البقرۃ

جواب ترجمہ: جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کے لیے دنیوی زندگی بڑی دلکش بنا دی گئی ہے، اور وہ اہل ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں، حالانکہ جنہوں نے تقوی اختیار کیا ہے وہ قیامت کے دن ان سے

کہیں بلند ہوں گے، اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ان کفار کا حال بیان کیا جو اللہ کی نعمت ملنے کے بعد اسے بدل ڈالتے تھے، ان کافروں نے دلائل اور انبیاء کرام علیہم السلام کو جھٹلایا، ان سے منہ پھیرا اور روگردانی کی، یہاں اللہ تعالیٰ نے اس سبب کا ذکر فرمایا جس کے نشہ میں چور ہو کر وہ اس طرح کا طریقہ اختیار کرتے تھے، فرمایا کہ کافروں کے لیے حیات دنیوی مزین کی گئی، مسلمانوں کی تعریف کی گئی کہ وہ دنیا کی زندگانی کو ترجیح نہیں دیتے جس طرح کافر ترجیح دیتے ہیں اور اتراتے ہیں، مسلمانوں کو حقیر جانتے ہیں، مسلمان باقی کو فانی پر ترجیح دیتے ہیں جو کہ آخرت کے بلند درجات ہیں۔

شانِ نزول: اس آیت کے شانِ نزول میں تین روایات ہیں، پہلی روایت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ابو جہل اور سردارانِ قریش کے بارے میں نازل ہوئی، وہ مسلمان فقیروں کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے، جیسے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، ابو حذیفہ کے غلام سالم رضی اللہ عنہ، عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ، ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، یہ غریب لوگ تھے اسی بناء پر کافروں نے ان لوگوں کو مختلف قسم کی آزمائشوں اور ابتلاؤں سے دوچار کیا، کیونکہ کافر لوگ خوش عیش اور خوش حال تھے۔

دوسری روایت: یہ آیت بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قینُقاع کے یہودی سرداروں اور ان کے علماء کے بارے میں نازل ہوئی جو مسلمان فقرا، مہاجرین سے ٹھٹھا کیا کرتے تھے، کیونکہ انہیں ان کے گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا، جس کے باعث ان کے پاس دولت نہیں تھی، غریب تھے۔

تیسری روایت: حضرت مقاتل رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت عبد اللہ بن ابی اور اس کے دوسرے منافق ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی، وہ کمزور مسلمانوں اور مہاجر فقراء سے ٹھٹھے کیا کرتے تھے۔ ان تینوں روایات میں کوئی منافات نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ ان تینوں طبقات کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہو، کیونکہ سبھی مسلمان فقراء اور مہاجرین سے ٹھٹھا مذاق کیا کرتے تھے۔

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا: کافر لوگ دنیا کی چمک دمک سے دھوکہ کھا گئے، اسی دھوکہ کی وجہ سے وہ اس دنیا فانی کے دیوانے اور عاشق بن گئے، چونکہ کافر کا غم وفکر، غرض وطلب دنیا ہی ہے اس لیے اس کے لیے دنیا مزین کی گئی، اسے خوبصورت بنایا گیا کیونکہ جو شخص کسی چیز کا طلب گار اور شیدائی ہوتا ہے وہ چیز اس کے لیے مزین کی جاتی ہے، اہل ایمان وایقان کی نگاہوں میں دنیا کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں کافروں کا خصوصیت سے ذکر فرمایا کہ ان کے لیے دنیا مزین کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو دنیا کی کوئی چیز اچھی لگتی تو آپ ﷺ فرماتے تھے کہ زندگانی دراصل آخرت کی زندگانی ہے تاکہ نفس انسانی اللہ کی طرف متوجہ رہے، نفس انسانی اللہ کی آواز پر لبیک کہتا رہے نہ نفسانی رغبت وشوق کی طرف اور یہ عجیب بات ہے کہ جو شخص آخرت کی زندگانی کا طلب گار ہوتا ہے اس کی دنیوی زندگانی اچھی گزرتی ہے اور جو شخص دنیا کی زندگانی کا طلب گار ہوتا ہے وہ اپنی دنیا اور آخرت دونوں ہی ضائع کر بیٹھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا کہ نقصان اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں اور اپنے اہل وعیال کو قیامت کے دن ضائع کر دیا، یہی تو وہ خسارہ اور نقصان ہے جو انہوں نے کیا کیونکہ ان کا انجام کار دوزخ کی آگ ہے۔

کافروں کے لیے دنیا کی شہوات، لذتیں، اس کی نعمتیں مزین کی گئی ہیں یہاں تک کہ وہ آخرت کو بھول گئے، کافروں کے لیے دنیا کی زندگانی حسین بنادی گئی ہے، اس کی محبت ان کے دلوں میں انڈیل دی گئی ہے، یہی وجہ تھی کہ وہ دنیا پر گر پڑے اور لگاتار اس میں گرتے جارہے ہیں، دین سے منہ موڑ گئے انہوں نے اس وقت یہ سمجھا کہ اس کے منافع ختم ہو جائیں گے۔

دنیوی زندگی کو مزین کس نے کیا؟ کافروں کے لیے دنیوی زندگانی کو مزین کس نے کیا؟ خوبصورت وحسین کس نے بنایا؟ اس بارے میں اہل تفسیر نے تین قول نقل فرمائے ہیں، پہلا قول: حضرت حسن بصری رحمہ اللہ، ابن کیسان رحمہ اللہ اور زجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حیات دنیا کو کافروں

کے لیے شیطان نے یوں مزین کیا کہ انہیں خوب آرزوئیں دلائیں، انہیں ان کی شہوتوں کے پیش نظر عہد وپیمان کیے۔

دوسرا قول: معتزلہ کہتے ہیں کہ کافروں کے لیے حیات دنیا کو جنوں اور انسانوں میں سے ان لوگوں نے مزین کیا جنہوں نے انہیں گمراہ کیا تھا۔

امام رازی رحمہ اللہ نے معتزلہ کے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حیات دنیا کو کافروں کے لیے شیطان نے اپنے وسوسوں کے ذریعے مزین کیا ہے۔ تیسرا قول: اللہ تعالیٰ نے ان کی حیات دنیا کو شہوات کے ذریعے مزین کیا ہے وہ شہوات جو ان کے لیے اس نے پیدا کی ہیں۔ علامہ واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دنیا کی زندگانی کو ان کے لیے مزین کیا ہے۔

وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا: یہاں اللہ تعالیٰ ان کافروں کی ایک بہت بری خصلت کا ذکر فرما رہے ہیں کہ وہ اہل ایمان سے مذاق کرتے ہیں، ان کا تمسخر اڑاتے ہیں، ان کے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہیں، اگرچہ یہاں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے مسلمانوں کے ساتھ کیے جانے والے ٹھٹھے مذاق کی کیفیت بیان نہیں فرمائی لیکن تیسویں پارہ کی سورۃ المطففین میں اللہ تعالیٰ نے اس کی کچھ وضاحت فرمائی ہے،

{إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ * وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ} [المطففین:۲۹، ۳۰] جو لوگ مجرم تھے، وہ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے اور جب ان کے پاس سے گزرتے تھے تو ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتے تھے۔

آنکھوں کے ساتھ نفرت آمیز اشارے کرتے تھے اور اہل ایمان پر پھبتیاں کستے تھے، ان پر ہنستے تھے، یہیں پہ ان کا ٹھٹھا ختم نہیں ہو جاتا تھا، قرآن کریم نے مزید بتایا کہ **وَإِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا فَكِهِينَ * وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ** اور جب اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر جاتے تھے، تو دل لگی کرتے ہوئے جاتے تھے اور جب ان (مومنوں) کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ

لوگ یقیناً گمراہ ہیں۔

قرآنی تعلیمات ہمیں بتاتی ہیں کہ کسی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو پراگندہ حالت میں غریبی اور فقیری کی وجہ سے دیکھے تو اس کے ساتھ ٹھٹھا مذاق کرے، قرآن کریم میں پابندی عائد کی گئی ہے کہ اے اہل ایمان ! کوئی قوم کسی قوم سے مذاق نہ کرے، کوئی مرد کسی مرد سے مذاق و ٹھٹھا نہ کرے، قرآن کریم میں قوم کا لفظ رجال کے معنیٰ میں ہے، رجال مردوں کو کہتے ہیں، کہ اپنے آپ کو برتر و بالا، افضل و اعلیٰ سمجھتے ہوئے دوسروں کو حقارت کے ساتھ نیچا دکھایا جائے، ان کا تمسخر اڑایا جائے، کیونکہ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ ہو سکتا ہے جس کے ساتھ مذاق کیا جارہا ہے وہ اس سے افضل و بہتر ہو جو مذاق کر رہا ہے، اسی طرح کوئی عورت کسی عورت سے ٹھٹھا مذاق نہ کرے، ہو سکتا ہے کہ جس عورت کے ساتھ ٹھٹھا کیا جارہا ہے وہ ٹھٹھا کرنے والی سے بہتر ہو۔

یہاں ایک نکتہ ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ کوئی مرد کسی عورت سے ٹھٹھا نہ کرے اور نہ یہ فرمایا کہ کوئی عورت کسی مرد سے ٹھٹھا نہ کرے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ اس بات کی اطلاع دینا ہے کہ مردوں کی کسی اجنبی عورت کے ساتھ بیٹھک اور مجلس شرعی لحاظ سے قبیح اور بری سمجھی گئی ہے، کیونکہ انسان ٹھٹھا مذاق عموماً اگر کسی سے کرتا ہے تو اس سے کرتا ہے جس سے مجلس یا بیٹھک کرتا ہے، مرد مردوں سے بیٹھک کرتا ہے، عورت عورتوں سے بیٹھک کرتی ہے، مسلمان معاشرے میں مردوں اور عورتوں کا باہمی اختلاط ممنوع ہے۔

اس بنیاد پر یہ احتمال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی مرد اور اجنبی عورت کے درمیان اس طرح کی محفل آرائی اور ٹھٹھا مذاق ہو، لیکن ہم لوگ اس زمانے میں دیکھتے ہیں کہ مرد و زن کے باہمی اختلاط نے مسلمانوں کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں، مرد و زن ایک دوسرے سے عام ملتے جلتے اور خوش گپیوں میں مشغول ہوتے ہیں، مرد عورتوں کے ساتھ کام کاج کرتے ہیں، اجنبی مرد اور اجنبی عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح معاملات کرتی ہیں جیسے وہ ایک دوسرے کے بھائی بہن ہیں، باپ بیٹی

ہیں، دفتروں میں عورتیں کام کرتی ہیں، شاہراؤں پر، گلیوں میں حتی کہ ہر جگہ پر مرد وزن کا بے محابا اختلاط ہوتا ہے کہ شریعت اسلامیہ کی عائد کی گئی پابندیاں ہوا میں اڑتی دکھائی دیتی ہیں، پھر مرد عورتوں کی اور عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کر لیتی ہیں۔

وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: یعنی وہ لوگ جنہوں نے تقوی اختیار کیا ان کی شان اور رتبہ قیامت کے دن ان سے بلند ہو گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کسی نے کسی مومن مرد یا مومنہ عورت کو ذلیل سمجھا یا اسے اس کے فقر و افلاس اور قلت مال کی وجہ سے حقیر جانا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے مشہور کرے گا، پھر اسے رسوا کر دے گا اور جس نے کسی مومن مرد یا عورت پر بہتان لگایا یا اس کے بارے وہ کچھ کہا جو اس میں نہیں تھا، تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آگ کے ٹیلے پر کھڑا کرے گا، یہاں تک کہ وہ اس سے نکل جائے جو اس نے اس کے بارے میں کہا یعنی بندہ مومن سے اپنے قول کی معذرت کر لے اور معافی مانگ لے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندہ مومن کی عظمت، عزت اور اکرام مقرب فرشتے سے بھی زیادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنے والے مومن مرد اور توبہ کرنے والی مومنہ عورت سے زیادہ محبوب اور کوئی شے نہیں اور بلاشبہ مومن آدمی کی پہچان آسمان میں اسی طرح ہوتی ہے جس طرح ایک آدمی کی پہچان اس کے گھر والوں اور اس کی اولاد میں ہوتی ہے۔ (تفسیر قرطبی)

اس کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ وہ درجہ میں ان سے بلند ہوں گے، کیونکہ وہ جنت میں ہوں گے اور کفار جہنم میں ہوں گے اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد بلند مکان ہو، اس اعتبار سے کہ جنت آسمان میں ہے اور جہنم اسفل سافلین میں ہے یعنی پرہیز گار لوگ بلند مکان جنت میں ہوں گے اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ فضیلت اس پر ہو جو کچھ کافر ان کے بارے میں گمان کر رہے ہیں، یعنی قطعاً ایسا نہ ہو گا جیسا کافر گمان کرتے ہیں بلکہ ان کی شان اس سے کہیں بلند ہو گی، کیونکہ کفار تو کہتے ہیں، اگر آخرت ہوئی تو اس میں ہمارے لئے حصہ (خیر و فضل) تمہاری نسبت کہیں زیادہ ہو گا۔ (تفسیر قرطبی)

یہاں اللہ تعالیٰ نے پہلے مِنَ الَّذِینَ آمَنُوا فرمایا پھر وَالَّذِینَ اتَّقَوْا فرمایا اس کی وجہ کیا ہے؟ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے تاکہ اس چیز کو ظاہر کیا جائے کہ عظیم الشان سعادت مومن متقی کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں جو فرمایا وَالَّذِینَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ اس فوقیت سے کیا مراد ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں کئی توجیہات ہیں، ایک توجیہ یہ ہے کہ فوقیت سے یہاں مراد مکان کی فوقیت ہے، کیونکہ ایمان والے آسمان کے مقام علیین میں ہوں گے، جب کہ کافر زمین کے مقام سجین میں ہوں گے، یہ بھی احتمال ہے کہ فوقیت سے مراد بزرگی اور درجہ میں فوقیت ہو۔ (تفسیر کبیر للرازی)

اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو آخرت کی سعادتوں سے سرفراز فرمائے گا، جو دنیوی سعادتوں سے فوقیت رکھتی ہیں، جو دنیا میں کافروں کو حاصل تھیں، پھر اہل ایمان کی کافروں پر فوقیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اہل ایمان حجت اور دلیل میں قیامت کے دن کافروں سے فوقیت رکھیں گے، کیونکہ دنیا میں کافر بعض اوقات مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈالتے ہیں جو کبھی کبھی ان کے دلوں میں بیٹھ جاتے ہیں، پھر وہ ان کو اللہ کی توفیق، مدد اور نصرت سے دور کرتے ہیں، لیکن قیامت کے دن ان میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہے گی، تمام شکوک وشبہات ختم ہو جائیں گے، شیطانی وسوسے اثر انداز نہیں ہوں گے۔

پھر کافر دنیا میں اہل ایمان سے تمسخر کرتے ہیں، ٹھٹھا کرتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں، قیامت کے دن جب اہل ایمان کافروں کے اس مذاق کا جواب دیں گے تو ان کا مذاق کافروں کے دنیوی مذاق سے کہیں زیادہ اوپر ہو گا، کیونکہ کافر کا مسلمان کے ساتھ ٹھٹھا اور مذاق یہ باطل ہے جب مسلمان کا کافر سے آخرت میں مذاق حقیقی ہو گا جو اپنی حقیقت کے ساتھ ہمیشہ رہے گا اور باقی رہے گا۔

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ: اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے، دنیوی رزق مسلمان

اور کافر سب کو حاصل ہوتا ہے، بقول شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ گبر و ترسا وظیفہ خور داری دوستاں را کجا کنی محروم کافر تیرا رزق کھاتے ہیں تو اپنوں کو کب محروم رکھتا ہے، سب کو کھلاتا ہے، جب کہ دلوں کا رزق علم، ایمان، اللہ کی محبت، اللہ کا ڈر اور اس کی امید ہے، یہ سب انہیں دیتا ہے جن سے محبت رکھتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان گرامی میں رزق کا مفہوم بہت وسیع ہے، مادی امور پر اس کا اکتفا نہیں ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمیں صادق و مصدوق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا

إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يُرْسَلُ إِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ، وَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ: بِكَتْبِ رِزْقِهِ، وَأَجَلِهِ، وَعَمَلِهِ، وَشَقِيٌّ أَمْ سَعِيدٌ، فَوَاللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ غَيْرُهُ إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا (مسلم)

تم میں سے کسی کی تخلیق اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفہ کی شکل میں جمع کی جاتی ہے پھر وہ لوتھڑے کی شکل میں اسی طرح ہوتا ہے، پھر بوٹی ہوتا ہے اسی طرح، پھر اس کی طرف فرشتہ بھیجا جاتا ہے پھر وہ اس میں روح پھونکتا ہے اور چار کلمات کا حکم دیا جاتا ہے، اس کا رزق لکھنے، اس کی عمر لکھنے، اس کے عمل لکھنے اور اس کے نیک بخت یا بد بخت ہونے کو لکھنے کا، پس قسم اللہ کی وہ ذات جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، بے شک تم میں سے کوئی شخص اہل جنت کے کام کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے، چنانچہ اس پر تقدیر غالب آجاتی ہے، پھر وہ عمل کرتا ہے دوزخ والوں کے پھر وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے، اور تم میں کوئی عمل کرتا ہے دوزخ والوں کے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس پر تقدیر غالب آجاتی

ہے، پھر وہ اہل جنت کے سے عمل کرتا ہے یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

اہل تفسیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے دیتا ہے، یہ نیکو کار اہل ایمان کا بدلہ اور جزا ہے جن کے دلوں، اعمال اور اقوال کو اللہ تعالیٰ نے روشن کر رکھا ہے، اللہ نے ان کو قرآن، اسلام اور ہدایت الٰہیہ اور دین محمد ﷺ کے ساتھ روشن کر رکھا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے منور کیا تو یہ اللہ کے گھروں کو منور کرتے ہیں، اس کے گھروں میں ذکر کرتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، زکوٰتیں دیتے ہیں، اللہ سے ڈرتے ہیں، اللہ ان کے اعمال کو قبول کرتے ہوئے ان کی نیکیوں کی جزا میں کئی گناہ اضافہ کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے اس سے مقصود وسیع پیمانے پر رزق دینا ہے، جو وسیع بھی ہو اور بافراغت بھی ہو نہ فنا ہو اور نہ انقطاع ہو، جیسے اہل جنت جب جنت میں چلے جائیں گے تو انہیں وہاں بغیر حساب کے رزق دیا جائے گا، اللہ حساب کے بغیر دیتا ہے اور دے گا، کیونکہ جو چیز حساب کے نیچے آجاتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے، جو چیز ختم ہونے والی نہیں ہوتی وہ حساب سے باہر ہوتی ہے، تو اللہ کی طرف سے نہ ختم ہونے والا ثواب ملے گا، کیونکہ جب ثواب حساب میں آئے گا تو محصور اور معدود ہو گا، جب بغیر حساب کے ہو گا تو وہ نہ ہی ختم ہو گا اور نہ ہی محدود ہو گا۔ بعض اہل تفسیر فرماتے ہیں کہ بغیر حساب کے دو مفہوم ہیں، ایک یہ کہ اس خوف کے بغیر دیتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا، اس لیے کہ اس کے خزانے بھرے ہوئے ہیں کبھی کم یا ختم نہیں ہوں گے، دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنے بندے کو اس کے حساب کے بغیر دیتا ہے، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ بغیر حساب کے رزق اس لیے دیتا ہے کہ اسے حساب کی ضرورت ہی نہیں ہے، کیونکہ وہ بے پرواذات جانتی ہے، اس کی مقدار کا کوئی اختتام نہیں ہے۔ حساب وہ کرے جسے اندیشہ ہو کہ کسی کو کچھ دینے سے خزانے میں کمی آجائے گی، اس لیے حساب سے دیا جائے، مگر اللہ کے خزانوں میں کبھی بھی کمی نہیں آتی اس لیے وہ اپنے بندوں کو بغیر حساب کے دیتا ہے اور دیتا چلا جاتا ہے، دنیا میں بھی اس

کا فیض کرم بہہ رہا ہے اور آخرت میں بھی اس کا دست کرم اسی طرح بانٹتا اور دیتا رہے گا۔

تاریخ انسانی کا عروج وزوال

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتایئے کہ امت واحدہ سے کیا مراد ہے؟ امت واحدہ میں اختلافات کیسے رونما ہوئے؟

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ {۲۱۳} البقرہ

جواب ترجمہ: (شروع میں) سارے انسان ایک ہی دین کے پیرو تھے، پھر (جب ان میں اختلاف ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے جو (حق والوں کو) خوشخبری سناتے، اور (باطل والوں کو) ڈراتے تھے، اور ان کے ساتھ حق پر مشتمل کتاب نازل کی، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں ان کا اختلاف تھا۔ اور (افسوس کی بات یہ ہے کہ) کسی اور نے نہیں بلکہ خود انہوں نے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی، روشن دلائل آجانے کے بعد بھی، صرف باہمی ضد کی وجہ سے اسی (کتاب) میں اختلاف نکال لیا، پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انہیں اپنے حکم سے حق کی ان باتوں میں راہ راست تک پہنچایا جن میں انہوں نے اختلاف کیا تھا، اور اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست تک پہنچا دیتا ہے۔

کفار اپنے کفر پر کیوں ڈٹے رہتے ہیں؟ کیوں دنیا کے الجھیڑوں اور بکھیڑوں میں الجھے رہتے ہیں؟ اس کی وجہ اس سے پہلے والی آیت میں بیان کی گئی کہ حیات دنیا کی محبت، دنیوی اسباب ومتاع کی محبت اور شہوات دنیویہ انہیں دنیا میں مشغول رکھتی ہیں، انہیں آخرت کی فکر ہی نہیں ہوتی کہ وہ اللہ پر، اس کے رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کی بتائی ہوئی تعلیمات پر عمل کریں، اسی بناء پر یہ لوگ اہل ایمان کو بہ نظر حقارت دیکھتے ہوئے ان کا تمسخر اڑاتے ہیں اور یہ بات کسی ایک زمانہ کے ساتھ

مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ میں ایسا ہوا ہے، اس لیے کہ پہلے لوگ ایک ہی امت تھے، جو حق پر قائم تھے، پھر انہوں نے دین اور دینی عقائد و نظریات میں اختلافات کے بیج ڈالے، ان اختلافات کی وجہ اور سبب ان کی سرکشی تھی اور دنیا طلبی کے باعث باہمی حسد اور تنازع تھا۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابن زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اَلنَّاسُ سے مراد اولاد آدم ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں روحوں کی صورت میں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اَلنَّاسُ سے مراد صرف حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَلنَّاسُ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت اماں حوا ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ اَلنَّاسُ سے مراد اس زمانے کے لوگ ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان تھا اور یہ دس صدیاں ہیں۔

ابن ابی خیثمہ رحمہ اللہ نے کہا: اس سے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کے قرن مراد ہیں اور یہ پانچ ہزار آٹھ سو سال کے زمانہ پر محیط لوگ ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے زیادہ زمانہ کے لوگ مراد ہیں، حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان بارہ سو سال گزرے، حضرت آدم علیہ السلام نو سو ساٹھ سال زندہ رہے، وَكَانَ اَلنَّاسُ فِي زَمَانِهِ أَهْلَ مِلَّةٍ وَاحِدَةٍ، مُتَمَسِّكِينَ بِالدِّينِ، تُصَافِحُهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَدَامُوا عَلَى ذَلِكَ إِلَى أَنْ رُفِعَ إِدْرِيسُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَاخْتَلَفُوا ان کے زمانہ میں تمام لوگ ایک دین پر تھے، دین کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے، فرشتے ان سے مصافحہ کرتے تھے، لوگ اسی حال میں رہے یہاں تک کہ حضرت ادریس علیہ السلام اٹھا لیے گئے، پھر اس کے بعد لوگوں نے اختلاف کیا۔ (الجامع الاحکام القرآن)

لفظ امت: امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ لفظ أُمَّةً عربی لغت کے اعتبار سے ہر ایسی جماعت کو کہا جاتا ہے جس میں کسی وجہ سے رابطہ و اتحاد اور وحدت قائم ہو خواہ یہ وحدت نظریات و عقائد کی ہو یا ایک زمانہ میں یا کسی ایک خطہ ملک میں جمع ہونے کے یا کسی دوسرے علاقہ یعنی نسب، زبان، رنگ

وغیرہ کے، مفہوم اس جملہ کا یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان باہم متفق و متحد ایک جماعت تھے۔ (مفردات القرآن، معارف القرآن) علامہ قفال رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امت اس قوم کو کہتے ہیں جو کسی ایک چیز پر متفق ہو، لوگ ایک دوسرے کی اقتدا اور پیروی کرتے ہوں، یہ لفظ ائتمام سے ماخوذ ہے۔

لوگ کس چیز میں امت واحدہ تھے؟ اس آیت سے یہ تو پتا چلتا ہے کہ پہلے لوگ ایک ہی امت تھے، لیکن اس آیت سے یہ پتا نہیں چلتا کہ لوگ حق میں امت واحدہ تھے یا باطل میں امت واحدہ تھے، جب کہ اہل تفسیر کا اس بارے میں اختلاف ہے اور کئی اقوال ہیں۔

پہلا قول یہ ہے کہ وہ دین واحد پر تھے اور وہ ایمان اور حق تھا، یہ اکثر محققین کا قول ہے، اس کی کئی توجیہات ہیں، پہلی توجیہ: علامہ قفال رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس پر دلالت اس کے بعد والا آیت کا حصہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ پھر اللہ تعالیٰ نے خوشخبری سنانے اور ڈرانے والے نبی بھیجے، ان کے ساتھ برحق کتاب اتاری تاکہ وہ لوگوں کے باہمی اختلاف کے درمیان فیصلہ کریں۔

یہ ارشاد بتاتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اس وقت بھیجے گئے جب ان کے درمیان اختلافات رونما ہوئے، اس کی تائید قرآن کریم کی سورۃ یونس کی اس آیت سے ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا [یُونُس: ۱۹] لوگ ایک ہی امت تھے پھر انہوں نے اختلاف کیا۔ پھر اللہ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجا تاکہ لوگوں کے درمیاں جو اختلاف رونما ہوا اس کا فیصلہ کریں۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ میں فاء اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت ان اختلافات کے بعد ہوئی، اگر وہ اس سے پہلے کفر میں امت واحدہ تھے تو پھر اس اختلاف کی رونمائی سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت اَولیٰ اور بہتر تھی جب سب لوگ باطل اور کفر پر اصرار کر رہے تھے۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ دیا کہ لوگ امت واحدہ تھے، پھر ہم نے اس دلیل اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت کی وجہ سے فَاخْتَلَفُوا کو اس میں درج کر دیا۔ پھر فرمایا کہ اس میں ان لوگوں نے اس کے بعد اختلاف کیا جب انہیں واضح دلائل وبینات دی گئیں، آپس کی بغاوت وسرکشی کی وجہ سے، تو اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ مراد اس اختلاف سے یہی ہے جو اس اتفاق کے بعد ہوا جس کی طرف كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً میں اشارہ کیا گیا ہے، تو یہ اختلافی وصف تو مذاہب باطلہ کے لائق ہے، تو آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مذاہب باطلہ سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں، اس بات سے پتا چلتا ہے کہ اس اختلاف سے پہلے جو اتفاق تھا وہ حق میں تھا باطل میں نہیں تھا، تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ لوگ دین حق میں امت واحدہ تھے نہ کہ دین باطل میں۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو وہ سارے کے سارے مسلمان تھے اور اللہ کے تابعدار تھے، ان کا دین میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا، یہاں تک کہ قابیل نے اپنے ہی بھائی ھابیل کو حسد اور سرکشی کی بنیاد پر قتل کر ڈالا اور یہ معنیٰ تو نقل متواتر سے ثابت ہو رہا ہے، جس پر قرآن کریم کی یہ آیت بھی فٹ آتی ہے، کیونکہ یہاں اَلنَّاسُ سے مراد آدم علیہ السلام اور ان کی مذکر اور مؤنث اولاد ہے، جو ایک ہی امت تھے، جو حق پر قائم تھے۔

پھر سرکشی اور حسد کی وجہ سے ان میں اختلاف پیدا ہو گیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ [الْمَائِدَة: ۲۷] وہ وقت یاد کرو جب آدم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں نے قربانی کی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک کی قربانی قبول کر لی۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا، تو یہ قتل کفر باللہ کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ سرکشی اور حسد کی وجہ سے تھا، تو یہ مفہوم نقل متواتر سے ثابت ہے جس پر آیت بھی فٹ آتی ہے۔

چوتھی توجیہ یہ ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا تو کوئی بھی روئے زمین پر زندہ

نہیں بچا تھا سوائے ان لوگوں کے جو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار تھے، یہ سارے کے سارے لوگ حق پر اور دین صحیح پر تھے، پھر اس کے بعد اختلاف رونما ہوا، اس کا ثبوت دلائل قاطعہ اور نقل متواتر سے ہے، کہ ان لوگوں نے اس کے بعد اختلاف کیا، تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ لوگ امت واحدہ تھے، جو حق پر قائم تھے پھر اس کے بعد اختلاف رونما ہوا، لیکن یہ بات یقینی طور پر دلائل کے ساتھ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ یہ لوگ کفر اور باطل پر ڈٹے ہوئے تھے، جب بات اس طرح کی ہے تو پھر یہ بات ضروری ہے کہ لفظ کو اس چیز پر محمول کیا جائے جو دلیل کے ساتھ ثابت ہو اور جو دلیل کے ساتھ ثابت نہ ہو اس پر محمول نہ کیا جائے۔

پانچویں توجیہ یہ ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ وَيُمَجِّسَانِهِ (بخاری) ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی بنادیں، نصرانی بنادیں یا مجوسی بنادیں۔ یہ حدیث شریف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بچے کو اگر اپنی فطرت اصلیہ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ باطل ادیان میں سے کوئی چیز قبول نہیں کرتا، وہ اگر باطل ادیان کی طرف آئے گا اور کوئی چیز قبول کرے گا تو بیرونی اسباب کی وجہ سے کرے گا اور وہ اس کے والدین کی کوششیں، سرکشی اور حسد جیسی فاسد اغراض کا حصول ہے۔

چھٹی توجیہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرات مفسرین کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں انسانی روحوں سے سوال کیا تھا کہ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى [الأعراف: ۱۷۲] کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ یہ وہ دن تھا جب لوگ امت واحدہ تھے، دین حق پر قائم تھے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے سات توجیہات ذکر کی ہیں، ان میں ایک توجیہ فلسفیانہ اور منطقیانہ مباحث پر مشتمل تھی جسے ہم نے یہاں عمداً نقل نہیں کیا ہے۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ لوگ دین باطل میں امت واحدہ تھے، یہ قول حضرت حسن بصری رحمہ اللہ، عطاء رحمہ اللہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرات مفسرین کرام میں سے ایک طبقہ کا ہے، ان کی دلیل آیت اور

حدیث شریف ہے، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ قرآنی آیت فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ یہی بتاتی ہے کہ لوگ دین باطل میں امت واحدہ تھے، جب کہ حدیث شریف میں ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى نَظَرَ إِلَى أَهْلِ الْأَرْضِ فَمَقَتَهُم عَربهم وعجمهم فَبَعَثَهم إِلَّا بَقَايَا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف دیکھا، ان کے عربوں، ان کے عجموں سے ناراض ہوا سوائے اہل کتاب کے کچھ بقایا لوگوں کے، جو اپنے دین پر کمربستہ رہے، انہوں نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی اور یہ بہت ہی تھوڑی تعداد میں تھے۔ (تفسیر ابن رجب حنبلی)

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بات بھی اس کی ضد (دین حق) کے لائق ہے جیسا ہم بیان کر چکے ہیں، یہ اس لیے کہ اختلاف کے وقت نبی کی بعثت ضروری نہیں ہوتی اگر یہ اتحاد واتفاق کفر و باطل پر تھا تو اس وقت نبیوں کی بعثت بہتر تھی اور جہاں نبیوں کی بعثت نہیں ہوتی وہاں ہمیں پتا ہے کہ جو اتفاق ہو گا وہ اتفاق علی الحق ہو گا باطل پر نہیں ہو گا، پھر جو کہتے ہیں کہ لوگ باطل پر امت واحدہ تھے ان میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ کس زمانہ میں لوگ کفر پر متحد تھے؟

بعض یہ کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات سے لے کر نوح علیہ السلام کے زمانہ تک لوگ کفر و باطل پر امت واحدہ تھے، یہ کافر لوگ تھے، پھر یہ لوگ اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا ان میں ہابیل، شیث، ادریس کی طرح کوئی شخص مسلمان بھی تھا؟ تو اس کا جواب یہ لوگ دیتے ہیں کہ ان میں غالب اکثریت کافروں کی تھی، کفر غالب تھا، تو غالب کا حکم یہ ہے کہ قلیل کی کثیر کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی، اس کا کوئی شمار نہیں ہوتا، جس طرح بہت سی گندم میں جو کا شمار نہیں ہوتا، جس طرح کہا جاتا ہے دارالاسلام باوجودیکہ وہاں غیر مسلم لوگ بھی رہتے ہیں اور دارالحرب کہتے ہیں باوجودیکہ وہاں مسلمان بھی رہتے ہیں۔

تیسرا قول: یہ ابو مسلم رحمہ اللہ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ کا پسندیدہ ہے، یہ کہتے ہیں کہ لوگ عقلی شریعت کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے اور یہ شریعت وہ تھی جس میں اللہ تعالیٰ کے وجود کا اعتراف اور اس کی صفات

کا اعتراف تھا، اللہ کے دین کی خدمت میں مشغولی تھی، اس کی نعمتوں کا شکر بجالانا تھا، عقل جن چیزوں کو برا سمجھتی ہے ان سے اجتناب کیا جاتا تھا، جیسے ظلم، جھوٹ، جہالت، لایعنی باتیں اور ان جیسی اور چیزوں میں وہ لوگ امت واحدہ تھے۔

چوتھا قول: آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ لوگ تو ایک ہی امت تھے مگر اس میں یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان پر تھے یا کفر پر، یہ بات دلیل پر موقوف ہے۔

پانچواں قول: یہاں اَلنَّاسُ سے وہ اہل کتاب مراد ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے، امام رازی رحمہ اللہ نے اس آیت کو یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً والی آیت سے متعلق مانا ہے۔ کیونکہ بہت سے مفسرین کرام کا خیال ہے کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے، تو اس آیت میں امت واحدہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے، وہ امت واحدہ ہیں، جو دین واحد پر تھے، جو مذہب واحد پر تھے، پھر سرکشی اور حسد کی بناء پر انہوں نے اختلاف کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا، یہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد تشریف لائے اور ان پر اللہ نے کتاب بھی نازل فرمائی، جیسے داؤد علیہ السلام پر زبور نازل فرمائی، موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی، انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی اور فرقان حمید حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، تاکہ یہ کتابیں ان کے درمیان ان چیزوں بارے فیصلہ کریں جن میں وہ اختلاف کرتے تھے، امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول پہلے اور بعد والی آیت کے نظم کے موافق ہے، اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ: اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو خوشخبری سنانے اور ڈرانے والے بنا کر مبعوث فرمایا، امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں اضمار ہے، یعنی عبارت یوں ہے کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً- فاختلفوا- فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لوگ ایک ہی امت تھے، پھر انہوں نے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد انبیاء کرام علیہم السلام بھیجے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تین صفات بیان فرمائی ہیں۔

پہلی صفت یہ ہے کہ وہ خوش خبری سنانے والے ہیں، دوسری صفت یہ ہے کہ وہ ڈرانے والے ہیں، یہاں خوشخبری کو ڈرانے سے مقدم کیا گیا، کیونکہ خوش خبری صحت کی حفاظت کے قائم مقام ہے اور ڈراوا یہ بیماری کے ازالہ کے قائم مقام ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مقصود بالذات صحت ہے جس کی حفاظت ضروری ہے، اس لیے یہاں خوشخبری کو پہلے ذکر کرنا ضروری تھا۔ تیسری صفت یہ ہے کہ ان کے ساتھ کتاب بالحق نازل فرمائی۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام انسانوں کو نیک اعمال اختیار کرنے اور ان پر اللہ کی طرف سے بطور انعام وجزا جنت ملنے کی بشارت سناتے ہیں، جنت میں رکھی گئی ایسی ایسی نعمتوں کی بشارت دیتے ہیں جو کسی انسان کی آنکھ نے دیکھی نہیں، کسی کان نے ان کے تذکرے سنے نہیں اور کسی دل پر ان کا خیال تک نہیں گزرا، پھر انہی یقینی بشارتوں کو سامنے رکھتے ہوئے انسان نیک اعمال میں شوق ذوق سے مشغول ومصروف رہتا ہے، وہ دن رات اپنے اللہ کو راضی کرنے اور اس کی پیدا کردہ ان نعمتوں کی خاطر لگا رہتا ہے۔

اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام دوزخ کی دھکتی اور شعلہ زن آگ اور اللہ کی نافرمانی پر کہیں عذاب عظیم، کہیں عظیم الیم اور کہیں عذاب مہین کی اطلاع دیتے ہیں، لوگوں کو ان مشکلات ومصائب سے بچانے کی تگ ودو میں مصروف رہتے ہیں، اسی کو انذار کہا گیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو! میں تمہارے ازار بند سے پکڑ پکڑ کر تمہیں دوزخ کی آگ سے پیچھے کھینچتا ہوں مگر تم لوگ دوزخ کی طرف لپکتے ہو، انبیاء کرام علیہم السلام خوشخبری سنانے اور ڈرانے میں اپنی امتوں پر شفیق اور مہربان ہوتے ہیں، پھر انہیں کتاب دی جاتی ہے، جو آسمانی پیام ہوتا ہے، جس میں بیان کردہ باتیں سو فیصد درست ہوتی ہیں، ان کتابوں میں بیان کردہ چیزیں موقع بہ موقع ان لوگوں کو اطلاع دیتی ہیں کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ درست ثابت ہو رہا ہے۔

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ: تاکہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے، امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لِيَحْكُمَ

فعل ہے اور فعل کے لیے ضروری ہے کہ اس کا استناد کسی ایسی چیز کی طرف ہو جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہو اور اس سے پہلے تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے، ان تین میں اس لفظ کے زیادہ قریب الْكِتَابُ ہے، پھر النَّبِيُّونَ ہے، پھر اللّٰهُ ہے، تو یقیناً ان میں سے ہر ایک میں اِضمار کا ہونا درست ہے، تو معنیٰ یہ ہو گا لِيَحْكُمَ اللّٰهُ اللہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، یا لِيَحْكُمَ النَّبِيُّ نبی ان کے درمیان فیصلہ کرے، یا لِيَحْكُمَ الْكِتَابُ کتاب ان کے درمیان فیصلہ کرے، ان تینوں احتمالات میں سے ہر ایک احتمال کسی وجہ ترجیح کے ساتھ مخصوص ہو گا، اگر کتاب ہے تو اس لیے کہ ان بیان کردہ چیزوں میں کتاب سب سے زیادہ قریب ہے، اگر اللہ ہے تو اس لیے کہ وہ پاک ذات وہی حقیقی فیصلہ کرنے والی ہے نہ کہ کتاب، اور اگر نبی ہے تو اس لیے کہ نبی وہ ہستی ہوتی ہے جو اظہار کرنے والی ہے، تو یہ بات بعید نہیں کہ یوں کہا جائے کہ اسے کتاب پر محمول کرنا بہتر ہے اور ان کے درمیان اختلافی اور نزاعی باتوں میں فیصلہ کرنے کی نسبت اللہ کی طرف کرنا بعید ہے، تو کتاب کی طرف فیصلے کی نسبت کرنا مجازی ہے، مگر دو وجوہات کی بناء پر اس کو مجاز پر محمول کرنا اچھا ہے۔

پہلی وجہ: یہ ہے کہ یہ مجاز مشہور ہے، کہا جاتا ہے کتاب نے وہ فیصلہ کیا، اللہ کی کتاب نے وہ فیصلہ کیا، ہم اللہ کی کتاب پر راضی ہیں، اور جب یہ بات جائز ہے کہ کتاب اللہ شریف سامان ہدایت ہے اور انسانی دلوں کے لیے شفاء ہے تو پھر یہ بات بھی جائز ہے کہ کتاب اللہ فیصلہ کرنے والی بھی ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ [الْإِسْرَاءِ: ۹] بیشک یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت دیتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ایمان والوں کو بشارت دیتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی عظمت شان اور اس کے تعظیم حال کے لیے یہی مفید ہے۔

فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ: یہاں فیہ میں ھا ضمیر کا مرجع یا تو الکتاب ہے، یا الحق ہے دونوں میں سے کسی ایک کی طرف ہونا ضروری ہے، کیونکہ دونوں کا ذکر اکٹھا ہو چکا ہے، لیکن اس کا مرجع الحق کو بنانا بہتر ہے، کیونکہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان ان

چیزوں میں فیصلہ کرے جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں، پس کتاب فیصلہ کرنے والی ہوئی اور جن چیزوں میں اختلاف کیا گیا وہ محکوم علیہ ہیں، جن پر فیصلہ کیا گیا، پتا چلا کہ حاکم اور محکوم علیہ دونوں کے درمیان مغائرت ہوتی ہے، حاکم اور ہوتا ہے محکوم علیہ اور ہوتا ہے۔

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ: آیت کے اس حصہ میں فِيهِ میں ضمیر ہے اور أُوتُوهُ میں بھی ضمیر ہے، فیہ کی ضمیر الْحَقِّ کی طرف لوٹتی ہے جب کہ أُوتُوهُ کی ضمیر الکتاب کی طرف لوٹتی ہے۔ تو عبارت یوں ہوگی کہ وَمَا اخْتَلَفَ فِي الْحَقِّ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ ان لوگوں نے حق میں اختلاف کیا جو کتاب دیے گئے تھے۔

اکثر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں، قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر اسی لفظ کے ساتھ کیا ہے، جیسے سورۃ المائدہ میں ارشاد ہے وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ [الْمَائِدَةِ: ۵] سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ [آلِ عِمْرَانَ: ۶۴]

اختلاف سے کیا مراد ہے؟ اہل کتاب نے واضح دلائل اور براہین آنے کے بعد اختلاف کیا، اس اختلاف میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ وہ اختلاف مراد ہو جس میں وہ ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے تھے وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَى عَلَى شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَى شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ [الْبَقَرَةِ: ۱۱۳] جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں ارشاد فرمایا کہ یہود نے کہا کہ نصاریٰ کسی دین پر نہیں ہیں، نصاریٰ نے کہا کہ یہود کسی دین پر نہیں ہیں، حالانکہ وہ دونوں ہی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، یہ بھی احتمال ہے کہ اس اختلاف سے مراد ان کی تحریف اور تبدیلی کا اختلاف ہو۔

مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ: آیت کے اس حصہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو سمجھانے اور ان کے باہمی اختلافات مٹانے کے لیے بینات بھیجیں، جب ان لوگوں نے اس

کے باوجود اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کرنے کے لیے کتاب بھیجی تاکہ اس کے ذریعہ ان کے باہمی اختلافات کے درمیان خلیج حائل کر دی جائے، انہیں سمجھایا جائے۔ پتا چلا کہ یہ بینات اور دلائل الگ تھے اور کتاب الگ تھی، اب یہ بینات کیا تھے؟ یہ دلائل کیے تھے؟ امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان دلائل کو عقلی دلائل کے علاوہ کسی چیز پر محمول نہیں کیا جاسکتا اور یہ انہیں کتاب دیے جانے سے پہلے دیے گئے۔

بَغْياً بَيْنَهُمْ: بغی سے مراد حسد ہے، لالچ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ہے، حرص میں مقابلہ اور خواہشات نفسانیہ کی بناء پر حسد ہے، غرض یہ حسد اور منافست ہی ہے جس نے لوگوں کو اسلامی تصورِ حیات اور اسلامی نظام زندگی کے بارے میں اختلاف کو ہوا دینے پر آمادہ کیا، لوگ تفرقہ بازی، عناد اور بحث و تکرار میں مبتلا رہے، اس اصول کے مطابق مذہبی اختلافات کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر اصول دین کے بارے میں کبھی دو آدمیوں کے درمیان اختلاف ہوا ہے تو دو میں سے ایک کے دل میں حسد ضرور تھا، یا دونوں ہی حسد کا شکار تھے لیکن اگر ان فریقین میں ایمانی قوت موجود ہو تو پھر اتحاد و اتفاق کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ (فی ظلال القرآن)

فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ: اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے احوال بیان کیے کہ بینات ملنے کے باوجود ان لوگوں نے ایک دوسرے سے بغاوت کی، حسد کی آگ میں جلنے والوں نے اختلافات کی بھٹی کو بھڑکایا، یہاں اللہ تعالیٰ اپنے پیارے حبیب نبی کریم ﷺ کی امت کے حال کو بیان کرتے ہیں جو پہلے والوں سے بالکل مختلف ہے۔

پہلے والوں نے دلائل و بینات ملنے کے باوجود کفر اور جہالت پر اصرار کیا، اس کا سبب بغاوت و حسد تھا، جو ان میں پایا جاتا تھا، مگر نبی کریم ﷺ کی امت کی اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے متعلق حق کی طرف راہنمائی کی ہے جن میں اہل کتاب اختلاف کرتے تھے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا نَحْنُ الآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ القِيَامَةِ، وَنَحْنُ أَوَّلُ النَّاسِ دُخُولًا

الْجَنَّةَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بَيْدَ أَنَّهُمْ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا، وَأُوتِينَاهُ مِنْ بَعْدِهِمْ فَهَدَانَا اللّٰهُ لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ، فَاخْتَلَفُوا فِيهِ، فَهَدَانَا اللّٰهُ، فَالنَّاسُ لَنَا فِيهِ تَبَعٌ الْيَهُودُ غَدًا، وَالنَّصَارَى بَعْدَ غَدٍ» (بخاری) ہم اول ہیں اور آخر ہیں، اول ہوں گے قیامت کے دن اور اول ہوں گے لوگوں سے پہلے جنت میں داخل ہونے کے لحاظ سے ان لوگوں سے جو ہم سے پہلے کتاب دیئے گئے اور ہم ان کے بعد کتاب دیئے گئے، (پھر) ہم کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت عطا فرمائی، جب لوگوں نے حق کے بارے میں اختلاف کیا، سو آج یہ وہ دن ہے جس کے متعلق لوگوں کا اختلاف ہوا اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت عطا فرمائی، لوگ اس میں ہمارے تابع ہیں، کل یہود کے لئے ہے اور پرسوں نصاری کے لئے ہے۔

اختلاف کس کس چیز میں کیا؟ ابن زید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انہوں نے قبلہ کی طرف منہ کرنے میں اختلاف کیا، یہود نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، نصاری نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، اللہ تعالیٰ نے ہماری راہنمائی کعبہ کی طرف کر دی، انہوں نے روزے میں اختلاف کیا، اللہ نے ماہ رمضان کی طرف ہماری راہنمائی کی، انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا، یہودیوں نے کہا کہ وہ یہودی تھے، نصاریٰ نے کہا کہ وہ نصرانی تھے، ہماری راہنمائی کی گئی کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے نہ نصرانی وہ تو مسلمان تھے، انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا، یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تفریط (ان کی شان کو گھٹایا) اور نصاریٰ نے ان کے بارے میں افراط (ان کی شان کو بہت اوپر لے گئے یہاں تک کہ انہیں اللہ کا بیٹا کہہ دیا) کیا، مگر ہماری راہنمائی ہمارے پروردگار نے کی کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے، اللہ کے کلمہ، اللہ کی روح اور اللہ کے رسول تھے۔

بِإِذْنِهِ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انہیں اپنے حکم سے حق کی ان باتوں میں راہ راست تک پہنچایا جن میں انہوں نے اختلاف کیا تھا، یہاں بِاِذْنِهِ کا معنیٰ یہ کیا جائے کہ اللہ نے اپنی اجازت سے ایمان والوں کو ہدایت

دی تو پھر إِذْنِهِ کہنا یہاں درست نہیں ہو گا، امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں یقیناً اضمار ہو گا، تو تقدیر عبارت کی یہ ہو گی فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ فَاهْتَدَوْا بِإِذْنِهِ، کہ پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انہیں حق کی ان باتوں میں راہ راست تک پہنچایا جن میں انہوں نے اختلاف کیا تھا، پھر وہ اس کی اجازت سے ہدایت پا گئے، امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہدایت اور اھتدی دونوں ایک دوسرے کے مغائر ہیں، لیکن ہم نے اس آیت کے ذیل میں جو معنیٰ لکھا ہے وہ شیخ الاسلام مولانا مفتی تقی عثمانی کے آسان ترجمہ قرآن سے لیا ہے، جہاں انہوں نے إِذْنِهِ کا معنیٰ اپنے حکم سے کیا ہے، اس معنیٰ کی موجودگی میں کوئی اشکال یا لمبی بحث کی ضرورت نہیں رہتی۔

وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ: اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے عدل اور مخلوق پر حجت قائم کرنے کے لئے تمام انسانوں کو صراط مستقیم کی طرف عام دعوت دی ہے، تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ وَّلَا نَذِيرٍ (المائدہ ۱۹) ہمارے پاس تو کوئی خوشخبری دینے والا اور کوئی ڈرانے والا ہی نہیں آیا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت اور لطف و اعانت سے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہا ہدایت سے نوازا، پس ہدایت سے نوازنا، یہ اس کا فعل و احسان ہے اور ساری مخلوق کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دینا، یہ اس کا عدل اور اس کی حکمت ہے۔ (تفسیر السعدی)

دین کی خاطر ابتلا و آزمائش

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتّٰى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيبٌ (۲۱۴) البقرہ

جواب ترجمہ: مسلمانو! کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تمہیں اس جیسے حالات پیش نہیں آئے جیسے ان لوگوں کو پیش آئے تھے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں، اور انہیں ہلا ڈالا گیا، یہاں تک کہ رسول اور ان کے ایمان والے ساتھی بول اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ یاد رکھو! اللہ کی مدد نزدیک ہے۔

شانِ نزول: اس آیت کے شانِ نزول سے متعلق کئی اقوال منقول ہیں، بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ ہجرت کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی، بعض فرماتے ہیں کہ جنگ اُحد کے موقع پر نازل ہوئی، امام ابن جریر طبری نے قتادہ کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ یہ آیت جنگ خندق کے موقع پر نازل ہوئی۔ (جامع البیان)

جب ۵ ہجری میں کفار کی بہت سی جماعتیں مدینہ پر حملہ آور ہوئیں اور مسلمانوں نے شہر کے گرد خندق کھود کر مدینہ کا دفاع کیا، ان دنوں میں سخت سردی پڑ رہی تھی اور مسلمانوں کے پاس ہتھیار اور خوراک کی بہت کمی تھی اور یہود کے تعاون سے مشرکین کے بہت سے قبائل نے مدینہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے سورۃ احزاب میں اس وقت مسلمانوں کی حالت کو یوں بیان فرمایا، اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا (۱۰) هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (۱۱) (الاحزاب: ۱۱-۱۰) یاد کرو جب وہ تم پر تمہارے اوپر سے بھی چڑھ آئے تھے اور تمہارے نیچے سے بھی اور جب آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آ گئے تھے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سوچنے لگے تھے، اس موقع پر ایمان والوں کی بڑی آزمائش ہوئی اور انہیں ایک سخت بھونچال میں ڈال کر ہلا ڈالا گیا۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ: ابتلاؤں، آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرے بغیر جنت میں داخلے کی آس اور امید لگانا عجیب ہے، پہلی امتوں کو سخت ترین امتحانوں سے گزارا گیا، پھر جا کر ان کے لیے جنت کی راہیں ہموار ہوئیں، اس لیے اہل اسلام کو بھی آزمائشوں سے گزرنا ہو گا، امتحانات سے

دوچار ہونا ہو گا۔

وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ: پہلے لوگوں کے عجیب حالات زندگی اور مصائب سے بھرپور واقعات کا مطالعہ کرلینا چاہیے، حضرت وہب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مکہ اور طائف کے درمیان میں ستر انبیاء کرام علیہم السلام آسودہ خاک ہیں، جن کی موت کا سبب بھوک اور جوئیں تھیں۔ (تفسیر قرطبی)

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے سایہ میں اپنی چادر سے تکیہ لگائے تشریف فرما تھے، ہمیں مشرکین کی طرف سے سخت تکلیف کا سامنا ہوا تھا، میں نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی بارگاہ میں دعا نہیں کردیتے؟ یہ سنتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ بیٹھے درانحالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا

لَقَدْ كَانَ مَنْ قَبْلَكُمْ لَيُمْشَطُ بِمِشَاطِ الحَدِيدِ، مَا دُونَ عِظَامِهِ مِنْ لَحْمٍ أَوْ عَصَبٍ، مَا يَصْرِفُهُ ذَلِكَ عَنْ دِينِهِ، وَيُوضَعُ المِنْشَارُ عَلَى مَفْرِقِ رَأْسِهِ، فَيُشَقُّ بِاثْنَيْنِ مَا يَصْرِفُهُ ذَلِكَ عَنْ دِينِهِ، وَلَيُتِمَّنَّ اللَّهُ هَذَا الأَمْرَ حَتَّى يَسِيرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ إِلَى حَضْرَمَوْتَ، مَا يَخَافُ إِلَّا اللَّهَ (بخاری، ابوداؤد، احمد، درمنثور)

بلاشبہ وہ لوگ جو تم سے پہلے تھے ان میں سے کسی آدمی کے سر کی مانگ پر آرہ رکھ دیا جاتا تھا، جو اس کے گوشت سے اس کی ہڈیوں اور پٹھوں تک اتر جاتا تھا، یہ (امتحان) بھی اس کو اپنے دین سے نہیں پھیر تا تھا اور لوہے کی کنگھی اس کے سر کی مانگ پہ رکھی جاتی تھی، پھر وہ دو ٹکڑے کر دیا جاتا، یہ بات بھی اسے اس کے دین سے نہیں پھیر سکتی تھی، پھر فرمایا اللہ کی قسم! یہ کام مکمل ہو گا (یعنی اسلام غالب آئے گا) یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک چلے گا وہ (راستہ میں) اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے گا۔ ایک روایت میں یہاں تک فرمایا کہ اسے بھیڑیا کا خوف ہو گا اپنی بکریوں پر ڈاکوؤں اور

چوروں کا نہیں لیکن تم جلدی کرتے ہو۔

مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا: باساء بؤس سے اسم ہے، اس کا معنیٰ شدت ہے جو کہ فقر ومسکنت کی صورت میں ہوتی ہے، عربی محاورہ میں یوں کہا جاتا ہے فُلَانٌ فِي بُؤْسٍ وَشِدَّةٍ فلاں شخص بؤس وشدت میں ہے یعنی سختی میں ہے۔ ضراء کا معنیٰ بھی اس کے بہت ہی قریب قریب ہے، اس کا مطلب ہے مصائب، بھوک اور خوف کی اقسام اس پر پڑنا، امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں باساء کہتے ہیں خیر وبھلائی کی جہتوں کو تنگ کرنا، خیر وبھلائی کی منفعت کا کسی پر تنگ ہونا، جب کہ ضراء کا معنیٰ ہے شر، آفت اور مصیبت کی جہتوں کا کسی پر کھلنا۔ زلزلو کا معنیٰ ہے امتحان کی مختلف قسموں سے انہیں جھنجوڑا گیا، علامہ زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ زلزلہ کا لغوی معنیٰ کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹانے کے ہیں۔

حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ: یہاں آزمائشوں، امتحانوں اور مصائب کی شدت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام اور رسل علیہم السلام انتہائی درجہ میں ثابت قدم رہنے والے، مضبوط ترین شخصیات تھیں، مگر ان پر مصائب کے پہاڑ اس قدر ٹوٹے کہ ان کی آہیں اور زاریاں عرش بریں تک جا پہنچیں اور اللہ کی مدد اور نصرت کی طرف ان کی نگاہیں مرکوز ہو گئیں کہ نصرت الٰہی کب آسمانوں سے اترتی ہے؟

اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ: جب انبیاء ورسل علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں پر سخت ترین اور شدید ترین امتحانات آئے، اس کے بعد انہوں نے اپنے پروردگار کی طرف مدد ونصرت کے لیے نگاہیں اٹھائیں تو اللہ نے ان کی ڈھارس بندھائی کہ میری مدد اور نصرت قریب ہے، گویا کہ آچکی ہے، انہوں نے مصائب وآلام کی جو سختیاں برداشت کی ہیں وہ اب ختم ہونے والی ہیں، جو دکھ سہے وہ اب ختم ہونے والے ہیں، جو زخم برداشت کیے وہ اب مندمل ہونے والے ہیں، شب دیجور کی تاریکیاں چھٹنے والی ہیں اور سحر کا اجالا ہونے والا ہے، اس لیے رحمت کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مصائب برداشت کرنے والوں کو بھی تسلی رکھنا چاہیے کہ ان پر بھی مدد ونصرت آنے والی ہے، پریشانیاں ختم ہونے والی

ہیں، کافروں کا زور ٹوٹنے والا ہے، جابر کا جبر، ستمگروں کا ستم ختم ہونے والا ہے۔

مال کہاں اور کن پر خرچ کیا جائے؟

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲۱۵)(البقرہ)

جواب ترجمہ: لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ (اللہ کی خوشنودی کے لیے) کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجیے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو وہ والدین، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہونا چاہیے، اور تم بھلائی کا جو کام بھی کرو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

شانِ نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت عمرو بن جموح انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، وہ بوڑھے آدمی تھے اور بہت مال والے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم کیا صدقہ کریں اور کس پر خرچ کریں؟ اس پر آیت نازل ہوئی۔ (اسباب النزول)

مکہ مکرمہ کے مشرکین نے بے بس مسلمانوں پر جو ظلم ڈھا رکھے تھے ان کا سلسلہ مدینہ منورہ جا کر بھی ختم نہیں ہوا لہٰذا جہاد فرض ہونے کے بعد ان کی پوری توجہ مکہ کو مشرکین کے قبضہ سے آزاد کرانا تھا اس لئے مسلمانوں کی پوری پوری توجہ اس طرف تھی، اس توجہ کی وجہ سے والدین، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے حقوق متاثر ہونے لگے تھے اس لئے یہ سوال کیا گیا، جواب میں فرمایا کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں اور جدوجہد کرنے میں اعتدال و توازن کو قائم رکھو کہ جس طرح تم اللہ کی راہوں میں جدوجہد کرتے ہو وہ ضرور کرو لیکن اس کا خیال رہے کہ والدین، رشتہ داروں، کمزوروں، بے بسوں اور مسکینوں کے حقوق بھی متاثر نہ ہونے پائیں جو تمہاری امداد اور تعاون کے مستحق ہیں۔ (تفسیر بصیرت قرآن)

خرچ میں ترتیب کی رعایت: اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے میں ترتیب کا بہت خیال رکھا ہے، والدین کو سب لوگوں سے مقدم رکھا ہے، اس لیے والدین عالم اسباب میں اسے عدم سے وجود میں لانے کا سبب ہیں، پھر اس کی پرورش اس حال میں انہوں نے کی جب یہ بہت ہی کمزور حالت میں تھا، والدین کا احسان وانعام اپنی اولاد پر کسی اور کے انعام واحسان سے بڑھ کر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب قرآن کریم میں جہاں اپنی بندگی اور عبادت کا حکم دیا ہے وہاں ساتھ ہی والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر فرمایا ہے، جس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کی رعایت کے بعد والدین ہی وہ عظیم ہستیاں ہیں جن کے حقوق کی رعایت رکھنا بہت ہی ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ حقیقت میں اس انسان کو عدم سے وجود میں لائے ہیں، جب کہ والدین عالم اسباب ظاہری میں اس کے عدم سے وجود میں لانے کا سبب ہیں، اس سے پتا چلا کہ والدین کا حق سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہے، اس لیے ان کا ذکر باقیوں سے پہلے کرنا ضروری تھا۔

والدین کے بعد قریبی رشتہ داروں کا ذکر فرمایا ہے اس لیے کہ تمام فقراء اور مساکین کا خیال رکھنا انسانی بس میں نہیں ہے تو کس کس کو وہ دوسروں پر ترجیح دیتا رہے گا، ترجیح دینے کے لیے مرجح کا ہونا ضروری ہے، جب کہ قریبی رشتہ داروں میں کئی وجوہ سے کسی نہ کسی کو ترجیح دی جاسکتی ہے، کہ کس رشتہ دار کی کس بناء پر خدمت کی جائے، رشتہ داروں کا چونکہ باہمی میل جول ہوتا ہے جس سے ایک دوسرے کے احوال کا علم ہوتا رہتا ہے، ان میں سے کوئی فقیر ہے اور کوئی مالدار ہے تو سب کو ایک دوسرے کا علم ہوتا ہے، اس لیے انسان جن مقامات پر خرچ کرے ان میں قوی ترین موقع و محل قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر رشتہ داروں میں کسی فقیر کا خیال نہیں رکھا گیا تو وہ اپنی ضروریات کے لیے دوسروں کے دروازے پر دستک دے گا، جو اس مالدار رشتہ دار کے لیے شرم وعار کی بات ہے، اس لیے اپنے رشتہ دار فقیروں کا خیال رکھے تاکہ اسے شرم وعار اور تکلیف کا سامنا نہ کرنا

پڑے۔ تیسری بات یہ ہے کہ انسان کے قریبی رشتہ دار جو ہیں وہ اسی کا حصہ ہیں، اس کے اپنے ہیں تو اپنے اوپر خرچ کرنا دوسروں پر خرچ کرنے سے بہتر ہے، یہی وجہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرنا دور والوں پر خرچ کرنے سے بہتر ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے قریبی رشتہ داروں کے ذکر کے بعد یتیموں کا ذکر کیا ہے کہ ان پر خرچ کیا جائے، کیونکہ وہ چھوٹی عمر کے باعث کمائی کرنے پر قدرت نہیں رکھتے ہیں اور یتیم ہونے کی وجہ سے ان کے لیے کمائی کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے، چنانچہ وہ بچہ جس کا باپ فوت ہو جائے اس کی کمائی کا سلسلہ نہ رہا اور کمانے والے کا سلسلہ بھی نہ رہا، اس لیے اس کا خیال رکھا جائے اور اس پر مال خرچ کیا جائے، روایات میں یتیموں کا خیال رکھنے کے بہت سے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

یتیموں کے بعد مسکینوں پر خرچ کرنے کا ذکر ہے، مسکینوں کی ضرورت یتیموں کی بہ نسبت کم ہے، کیونکہ ان کے پاس مال حاصل کرنے کے مواقع یتیم سے زیادہ ہوتے ہیں، اس کے بعد ابن السبیل یعنی مسافر کا ذکر فرمایا ہے کہ مسافر پر خرچ کرو کیونکہ وہ اپنے وطن سے دور ہے، جہاں اس کو مدد کی ضرورت ہے، یہ وہ درست ترتیب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مرتب فرمایا ہے، کہ کس ترتیب سے خرچ کیا جائے، سوالی کے سوال کا تسلی بخش جواب دیا گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انفاق فی سبیل اللہ سے دو باتیں مقصود ہوتی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ انسان کو تہذیب نفس حاصل ہوتی ہے، انسان کا نفس بخل جیسی رذیل خصلت سے پاک ہوتا ہے اور یہ شخص بارگاہ رب العزت میں پیش ہونے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس سے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان بنی نوع انسان کی خدمت کر سکتا ہے، غربا و مساکین کی اعانت بحیثیت مجموعی انسانیت کی ترقی کے لئے ضروری ہے، لہٰذا کسی مستحق کی مالی مدد سے بنی نوع انسان کی ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔ (معالم العرفان)

وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ: خیر سے مراد مال خرچ کرنا ہے، سورۃ العادیات میں بھی مال

کے لیے اللہ تعالیٰ نے خیر کا لفظ استعمال فرمایا ہے، سورۃ البقرہ میں ایک مقام پر خیر الوصیہ جو فرمایا اس سے مراد مال ہی ہے، مطلب یہ ہے کہ تم تھوڑا مال خرچ کرو یا زیادہ اللہ اسے جانتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے یہ تفصیل عمدہ طریقہ سے بیان کر دی تو اس کے بعد اجمالاً فرمایا کہ ان لوگوں کے ساتھ جو کچھ تم بھلائی اور خیر کا معاملہ کروگے اجر جزیل وثواب عظیم کی خاطر، اللہ کے عذاب دردناک سے بچنے کی خاطر تو اللہ تعالیٰ اس سب کو خوب جانتا ہے، علیم یہ عالم سے مبالغے کا صیغہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین وآسمان کا کوئی ذرہ بھی اس سے اوجھل اور پوشیدہ نہیں ہے، جو کچھ تم بھلائی کروگے وہ اس پر تمہیں بہترین جزا عطا کرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا کہ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ (آل عمران ۱۹۵) میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کروں گا مرد ہو یا عورت۔ اسی طرح فرمایا کہ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ جو شخص یہاں خیر و بھلائی کا ایک ذرہ بھی کرے گا وہ اسے بروز محشر دیکھ لے گا۔

فرضیت جہاد

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۲۱۶) البقرہ

جواب ترجمہ: تم پر (دشمنوں سے) جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے، اور وہ تم پر گراں ہے، اور یہ عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو برا سمجھو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو، اور (اصل حقیقت تو) اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔

نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں موجود تھے اس وقت آپ ﷺ کو جہاد کا حکم نہیں تھا، باوجودیکہ مکہ میں مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے جاتے تھے، مگر اللہ کی طرف سے حکم تھا کہ تم

لوگ اپنے ہاتھوں کو روک کر رکھو، جوابی کارروائی نہیں کرنی، جب آپ ﷺ کفار کے مظالم سے تنگ آکر مکہ مکرمہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ مشرکین میں سے جو شخص آپ سے لڑائی کرے آپ ﷺ بھی اس سے لڑائی کریں، پھر اس کے بعد عام مشرکوں سے بھی لڑائی کا حکم دیا گیا، پھر جہاد کی فرضیت کا حکم نازل ہوا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے، اس کے مفہوم میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت تمام لوگوں پر جہاد کی فرضیت کا تقاضا کرتی ہے، حضرت مکحول خانہ کعبہ میں کھڑے ہو کر قسم کھا کر فرماتے تھے کہ جہاد فرض ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عطاء رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ یہ آیت صرف اسی زمانہ میں اصحاب رسول ﷺ پر جہاد کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے، جو کہتے ہیں جہاد فرض ہے ان کی دلیل یہاں کتب کا لفظ ہے جو فرضیت پر دلالت کرتا ہے، جب کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم پر جہاد کی فرضیت کے لیے تھی وہ کہتے ہیں کہ اس میں علیکم ضمیر خطاب کی اس بات کا تقاضا کرتی ہے، جب کہ علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ علیکم میں خطاب کی ضمیر جہاد کی فرضیت کو غیر موجودین سے مانع نہیں ہے، جس طرح روزہ کی فرضیت اور قصاص کی فرضیت کے لیے علیکم سے خطاب کیا گیا مگر وہ سب پر فرض ہے۔

فرض عین اور فرض کفایہ: یہاں پر لفظ کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ قتال ہر شخص پر لازم ہے جیسے رمضان المبارک کے متعلق آیا کُتِبَ عَلَیکُمُ الصِّیَامُ تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں ظاہر ہے کہ روزوں کی فرضیت ہر مرد وزن کے لئے ہے اسی طرح یہاں پر ہے کُتِبَ عَلَیکُمُ القِتَالُ تم پر قتال فرض کیا گیا ہے۔ مگر قرآن پاک کے بعض دوسرے مقامات سے اور خود حضور ﷺ کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ جہاد اور قتال کے فرض ہونے کی دو صورتیں ہیں یعنی فرض عین اور فرض کفایہ۔

فرض عین : فرض کی وہ صورت ہوتی ہے، جس سے کوئی مسلمان مرد وزن مستثنیٰ نہ ہو، یہ حالات و واقعات پر منحصر ہے اگر دشمن کا اس قدر غلبہ ہو کہ ہر مرد، عورت، چھوٹے بڑے، آزاد اور غلام کی خدمت کی ضرورت ہے تو پھر ہر ایک پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے، سب کو شامل ہونا ہو گا اگر کوئی اعراض کرے گا تو گنہگار ہو گا، ایسی حالت میں اولاد کے لئے والدین کی جازت کی ضرورت بھی نہیں ہے، ہر فرد بلا چون وچرا جنگ میں کود پڑے گا۔

البتہ عام حالات میں قتال کا فریضہ فرض کفایہ کے طور پر ادا کیا جاتا ہے، جب جنگ کے لئے فوجی جوان کافی ہوں اور وہ اپنا دفاع کر سکتے ہوں اور بوقت ضرورت دشمن پر کاری ضرب لگا سکتے ہوں، تو ایسی صورت میں صرف ان خاص مجاہدین کا شریک جنگ ہونا ہی تمام مسلمانوں کے لئے کفایت کرے گا اور یہ فرض کفایہ ہو گا ہر ایک کا قتال میں شامل ہونا ضروری نہیں ہو گا، بالکل اسی طرح جس طرح میت کا جنازہ پڑھنا فرض کفایہ ہے، جب بعض لوگ جنازے میں شامل ہو جائیں، تو باقیوں سے فرض ساقط ہو جاتا ہے، البتہ اگر کوئی بھی شریک نہ ہو سب کے سب لوگ گنہگار ہوں گے۔ (تفسیر معالم العرفان)

عام حالات میں اگر جہاد کے لئے جانا ہو، تو والدین کی اجازت ضروری ہے، کیونکہ بعض اوقات ماں باپ کی خدمت کرنا فرض عین ہوتا ہے جبکہ جہاد میں شمولیت فرض کفایہ ہوتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضور! میں جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کیا تیرے ماں باپ موجود ہیں؟ عرض کی ہاں فرمایا پھر والدین کی خدمت کرو، تمہیں جہاد کا ثواب مل جائے گا، یاد رہے کہ والدین کی خدمت اس وقت فرض عین ہو جاتی ہے، جب کوئی دوسرا ان کی دیکھ بھال کرنے والا موجود نہ ہو۔ (معالم العرفان)

جہاد کے بعض احکام: صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ جب مسلمان کافروں کے ملک میں داخل ہوں اور ان کے کسی شہر یا قلعہ کا محاصرہ کر لیں تو ان کو اسلام کی دعوت دیں اگر وہ دعوت قبول کر لیں اور

اسلام لے آئیں تو جنگ کرنے سے رک جائیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کی گواہی دیں اور مجھ پر اور میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائیں۔ (کمارواہ مسلم) اور اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کریں تو ان کو جزیہ ادا کرنے کی دعوت دیں، اگر وہ جزیہ ادا کرنا منظور کرلیں تو پھر ان کے وہی حقوق ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں اور ان کی وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو (ملک کی حفاظت کے سلسلے میں) مسلمانوں پر عائد ہوں گی (لیکن جزیہ کی دعوت مشرکین عرب کو نہیں دی جائے گی ان کے لیے اسلام ہے یا تلوار ہے) جن لوگوں کو دعوت اسلام نہیں پہنچی ان کو دعوت دیئے بغیر جنگ کرنا جائز نہیں، اور جن لوگوں کو دعوت اسلام پہنچ چکی ہے ان کے بارے میں مستحب ہے کہ پہلے ان کو دعوت دی جائے پھر قتال کیا جائے، اگر کفار قبول اسلام سے بھی انکاری ہوں اور جزیہ دینے پر بھی راضی نہ ہوں تو اللہ سے مدد طلب کرکے ان سے جنگ کی جائے اور عورتوں کو اور بچوں کو اور بہت بوڑھے کو اور اپاہج کو اور اندھے کو قتل نہ کیا جائے، ہاں اگر ان میں سے کوئی شخص امور حرب میں رائے رکھنے والا ہو یا عورت بادشاہ بنی ہوئی ہو تو ان کو قتل کردیا جائے (من الھدایۃ باب کیفیۃ القتال بحوالہ انوار البیان)

وَھُوَ کُرۡہٌ لَّکُمۡ: برے لگنے کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو دشوار اور گراں معلوم ہوتا ہے یہ نہیں کہ قابل رد و انکار نظر آئے اور مخالف حکمت و مصلحت سمجھا جائے اور موجب ناخوشی اور تنفر ہو سو اتنی بات میں کوئی الزام نہیں جب انسان کو بالطبع زندگی سے زیادہ کوئی چیز مرغوب نہیں تو ضرور مقاتلہ سے زیادہ دشوار کوئی شے نہ ہونی چاہیے۔

وَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَھُوۡا شَیۡئًا وَّھُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ: یعنی یہ بات ضروری نہیں کہ جس چیز کو تم اپنے حق میں نافع یا مضر سمجھو وہ واقعہ میں بھی تمہارے حق میں ویسی ہی ہوا کرے بلکہ ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو اپنے لیے مضر سمجھو اور وہ مفید ہو اور کسی چیز کو مفید خیال کرلو اور وہ مضر ہو تم نے تو سمجھ لیا کہ جہاد میں جان و مال سب کا نقصان ہے اور ترک جہاد میں دونوں کی حفاظت اور یہ نہ جانا کہ جہاد میں دنیا اور آخرت

کے کیا کیا منافع ہیں اور اس کے ترک میں کیا کیا نقصان ہیں تمہارے نفع نقصان کو خدا ہی خوب جانتا ہے تم اسے نہیں جانتے اس لیے وہ جو حکم دے اس کو حق سمجھو اور اپنے اس خیال کو چھوڑو۔ (عثمانی)

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: کس حکم کو جاری کرنے میں کیا حکمت و مصلحت ہے، کیا فائدہ ہے اور کیا نقصان ہے یہ سب اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں تم لوگ نہیں جانتے ہو، تم بس حکم کے پابند ہو، حکم مانو گے تو کامیاب و کامران ہو جاؤ گے اور نہیں مانو گے تو ناکام و نامراد ہو جاؤ گے۔

فضائل جہاد و مجاہدین: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام کو نکلنا ساری دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے اس سے بہتر ہے۔ (بخاری) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور میری خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ (بخاری)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی بندے کے قدم اللہ کی راہ میں غبار آلود ہو گئے اسے دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی۔ (بخاری) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو بھی کوئی شخص جنت میں داخل ہو گا وہ دنیا میں واپس آنے کی آرزو نہ کرے گا خواہ اس کو وہ سب کچھ مل جائے جو دنیا میں ہے سوائے شہید کے، وہ وہاں جو اپنا اعزاز دیکھے گا اس کی وجہ سے آرزو کرے گا کہ دنیا میں واپس چلا جاتا اور دس مرتبہ قتل کیا جاتا۔ (بخاری)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ کی راہ میں ایک دن ایک رات اسلامی ملک کی سرحد کی حفاظت میں گزارنا ایک ماہ کے روزے رکھنے اور راتوں رات ایک ماہ نمازوں میں قیام کرنے سے بہتر ہے۔ اگر یہ شخص اسی حالت میں وفات پا گیا تو (ثواب کے اعتبار سے) اس کا وہ عمل جاری رہے گا جو عمل وہ کیا کرتا تھا اور اس کا رزق جاری رہے گا (اور قبر میں) فتنہ ڈالنے والوں سے پر امن رہے گا۔ (مسلم) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو

شخص اس حال میں مر گیا کہ اس نے جہاد نہیں کیا اور اس کے نفس میں جہاد کا خیال بھی نہ آیا تو وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مر گیا۔ (مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں زخمی ہوا اور اللہ ہی کو معلوم ہے کہ اس کی راہ میں کون زخمی ہوتا ہے تو وہ شخص قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہو گا، رنگ تو خون کا ہو گا اور خوشبو مشک کی ہو گی۔ (بخاری، مسلم)

جہاد میں مال خرچ کرنے کا ثواب: اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا بھی بڑا ثواب ہے۔ ایک شخص نے جہاد کے لیے ایک اونٹنی پیش کر دی جس کو مہار لگی ہوئی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تیرے لیے اس کے عوض قیامت کے دن سات سو اونٹنیاں ہوں گی ہر ایک کو مہار لگی ہوئی ہو گی (مسلم) یعنی مہار لگی ہوئی سات سو اونٹنیاں خرچ کرنے کا ثواب ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی فی سبیل اللہ جہاد کرنے والے کو سامان دیا اس نے (بھی) جہاد کیا اور جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے گھر والوں کی خدمت میں خیر کے ساتھ رہا اس نے بھی جہاد کیا۔ (بخاری)

حرمت والے مہینوں میں قتال

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۱۷) البقرہ

جواب ترجمہ: لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں جنگ کرنا کیسا ہے؟ آپ فرما دیجیے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے، مگر لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا، اس

کے خلاف کفر کی روش اختیار کرنا، مسجد حرام پر بندش لگانا اور اس کے باسیوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا اللہ کے نزدیک زیادہ بڑا گناہ ہے اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت چیز ہے اور یہ کافر تم لوگوں سے برابر جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو یہ تم کو تمہارا دین چھوڑنے پر آمادہ کر دیں، اور اگر تم میں سے کوئی شخص اپنا دین چھوڑ دے، اور کافر ہونے کی حالت ہی میں مرے تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو جائیں گے، ایسے لوگ دوزخ والے ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

شان نزول: رسول اللہ ﷺ نے ایک جماعت کو بھیجا اور اس کا امیر حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بنایا جب وہ جانے لگے تو حضور ﷺ سے جدائی کے صدمہ سے رو دیئے آپ نے انہیں روک لیا اور ان کے بدلے حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو سردار لشکر مقرر کیا اور انہیں ایک خط لکھ کر دیا اور فرمایا کہ جب تک بطن نخلہ نہ پہنچو اس خط کو نہ پڑھنا اور دو دن کے سفر تک اسے نہ کھولنا اور وہاں پہنچ کر جب اس مضمون کو دیکھو تو ساتھیوں میں سے کسی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کرنا۔

چنانچہ حضرت عبد اللہ اس مختصر سی جماعت کو لے کر چلے جب اس مقام پر پہنچے تو فرمان نبی پڑھا اور کہا میں فرمانبرداری کے لئے تیار ہوں پھر اپنے ساتھیوں کو پڑھ کر سنایا اور واقعہ بیان کیا دو شخص تو لوٹ گئے لیکن اور سب ساتھ چلنے کے لئے آمادہ ہو گئے آگے چل کر عمرو ابن الحضرمی کافر کو انہوں نے پایا جو طائف سے واپس آرہا تھا، چونکہ یہ علم نہ تھا کہ جمادی الاخری کا یہ آخری دن ہے یا رجب کا پہلا دن ہے انہوں نے اس لشکر پر حملہ کر دیا عمرو ابن الحضرمی مارا گیا اور صحابہ کی یہ جماعت وہاں سے واپس ہوئی اب مشرکین نے مسلمانوں پر اعتراض کرنا شروع کیا کہ دیکھو انہوں نے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کی اور قتل بھی کیا اس بارے میں یہ آیت اتری (ابن ابی حاتم، تفسیر ابن کثیر)

نبی کریم ﷺ کا بھیجا ہوا یہ سریہ سات افراد پر مشتمل تھا، ان کے سربراہ حضرت عبد اللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہ تھے، ان میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی

وقاص رضی اللہ عنہ، عتبہ بن غزوان سلمی رضی اللہ عنہ، عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ، واقد بن عبد اللہ یربوعی رضی اللہ عنہ شامل تھے، اس سریہ میں شریک تمام لوگ مہاجرین تھے، انصار میں سے کوئی شخص اس سریہ میں شامل نہیں تھا۔ (ابن کثیر)

حرمت والے مہینے: رجب کا مہینہ ان چار مہینوں میں شمار ہوتا تھا جن میں جنگ کرنا ممنوع تھا (زمانہ جاہلیت میں ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب میں قتل نہیں کرتے تھے اور ابتدائے اسلام میں بھی ان میں قتل کرنے کی ممانعت تھی) حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو یہ حملہ کر دیا تھا اس میں رجب کا شروع ہونا متحقق نہیں تھا لیکن قریش مکہ نے اس کو اپنے اعتراض کا نشانہ بنالیا اور کہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں قتال حلال کر لیا جو اشہر حرام میں سے ہے، اس مہینہ میں لوگ امن کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں اور اپنی روزیوں کے لیے منتشر ہو جاتے ہیں اور انہوں نے اس ماہ کی بے حرمتی کی ہے، اس اعتراض کو انہوں نے بہت اہمیت دی۔

مسلمانوں کی جس جماعت نے حملہ کیا تھا ان کو قریش مکہ نے عار دلائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کا حملہ آور ہونا پسند نہ آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تو تمہیں اشہر حرام میں قتال کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، آپ نے یہ سامان اور دونوں قیدیوں کا معاملہ موقوف رکھا اور اس مال میں سے کچھ بھی نہیں لیا، جس جماعت نے یہ کاروائی کی تھی انہیں بڑی ندامت ہوئی انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! جس دن ہم نے عمرو بن حضرمی کو قتل کیا ہے اس دن شام کو جو چاند نظر آیا تو اس کے اعتبار سے ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں کہ یہ قتل ہم سے جمادی الاخری میں ہوا یا رجب میں؟ اس پر اللہ جل شانہ نے آیت بالا نازل فرمائی۔

نزول آیت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قافلہ کا سامان لے لیا اور اس میں سے خمس علیحدہ کر لیا جو مال غنیمت کا اصول ہے اور باقی مال اسی جماعت پر تقسیم کر دیا جنہوں نے قافلہ سے مال چھین لیا تھا، جو دو قیدی مسلمانوں نے پکڑ لیے تھے مال دے کر ان کو مکہ والوں نے چھڑا لیا، پھر ان دونوں میں سے

حکم بن کیسان تو مسلمان ہوگئے اور مدینہ منورہ میں رہے اور بیر معونہ کے غزوہ میں شہید ہوئے اور دوسرا قیدی عثمان بن عبداللہ نامی مکہ معظمہ واپس جاکر حالت کفر میں مر گیا۔ (اسباب النزول)

سوال کس نے کیا؟ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے حرمت والے مہینوں میں قتال کرنے سے متعلق کس شخص نے سوال کیا تھا؟ اس بارے میں امام رازیؒ نے دو قول بیان کیے ہیں، ایک قول یہ بیان کیا ہے کہ سوال کرنے والا شخص مسلمان تھا، کیونکہ نبی کریم ﷺ کے پاس زیادہ تر مسلمان ہی تھے، جو حساس نوعیت سے متعلق سوالات کرتے تھے، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت بیان کی ہے اس میں بھی خیر کے سوالات کی نسبت اصحاب رسول ﷺ کی طرف کی ہے، پھر اس آیت کے سیاق وسباق سے بھی پتا چلتا ہے کہ ان آیات کے مخاطب مسلمان ہی تھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سوال کرنے والے کافر لوگ تھے، انہوں نے سوال کیا تھا کہ حرمت والے مہینوں میں قتال کرنا کیسا ہے؟ تاکہ جب انہیں ہاں میں جواب ملے تو وہ ان مہینوں میں لڑائی کریں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، کہ ان مہینوں میں قتال بڑی جسارت کی بات ہے، لیکن اللہ کے راستے سے روکنا اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ: مشرکین نے جو اعتراض کیا تھا اس کے جواب میں اللہ جل شانہ نے آیت کریمہ نازل فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ آپ فرما دیجیے اشہر حرام میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے لیکن مشرکین کو اپنے کرتوت نظر نہیں آتے، اللہ کی راہ سے روکنا دین حق قبول کرنے والوں کو منع کرنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام کے ساتھ کفر کرنا اور اہل مسجد حرام کو وہاں سے نکالنا (جیسا کہ مشرکین مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے اصحاب کو مکہ معظمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا حالانکہ مسجد حرام کے تقدس کو باقی رکھنے والے اور نمازوں سے اسے معمور کرنے والے یہی حضرات تھے) یہ سب چیزیں اللہ کے نزدیک اشہر حرام میں قتل کرنے سے گناہ

گاری میں بڑھ کر ہیں جن کا ارتکاب کیا ہے۔ (انوار البیان)

وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ: کفار مسلمانوں کو ان کے دین کے حوالے سے فتنہ میں ڈالتے تھے، یہاں تک کہ ان پر مصائب وآلام کے پہاڑ توڑتے، انہیں دین اسلام سے پھر جانے پر مجبور کرتے، یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک قتل کرنے سے بڑا جرم ہے کہ کسی مسلمان کو اس طرح جبر وقہر کے ساتھ اس کے دین سے ہٹانے کی شرارت کی جائے۔

مرتد کا شرعی حکم: وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ، اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے، پھر حالت کفر میں مر جائے تو دنیا و آخرت میں ان لوگوں کے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

اس میں مرتد کے بعض احکام بتائے ہیں، دین اسلام قبول کرنے کے بعد جو شخص اس کو چھوڑ کر کوئی سا بھی دین اختیار کرے۔ (اور اسلام کے علاوہ ہر دین کفر ہی ہے) تو اس نے زمانہ اسلام میں جو اعمال کیے تھے وہ سب ضائع ہو گئے، کفر کی وجہ سے ان سب کا اجر وثواب ختم ہو گیا دنیا میں بھی ان اعمال کا کوئی فائدہ نہ ہو گا جو زمانہ اسلام میں کیے تھے اور آخرت میں بھی ان کا کوئی اجر وثواب نہ ملے گا اور دوسرے کافروں کی طرح وہ بھی ہمیشہ دوزخ میں جائے گا۔

سورۃ مائدہ میں فرمایا وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ اور جو شخص ایمان کا منکر ہو جائے تو اس کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا، جو شخص مرتد ہو جائے (العیاذ باللہ) اس سے بات کی جائے، اس کا جو کوئی شبہ ہو دور کیا جائے اور تین دن اسے بند رکھا جائے، اگر تین دن گزر جانے پر اسلام قبول نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے اور اگر عورت مرتد ہو جائے (العیاذ باللہ) اور باوجود سمجھانے کے دوبارہ اسلام نہ لائے تو اسے بند کر دیا جائے یہاں تک کہ مسلمان ہو جائے اگر اسلام قبول نہ کرے تو موت آنے تک جیل ہی میں

رکھی جائے، یہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اسے بھی تین دن کی مہلت دینے کے بعد قتل کر دیا جائے، جب کسی نے اسلام کے بعد کفر اختیار کر لیا تو اس کے مرتد ہونے کی وجہ سے اس کے تمام اموال اس کی ملک سے نکل گئے، پھر اگر مسلمان ہو گیا تو واپس اس کی ملک میں آجائیں گے، اگر حالت کفر میں مر گیا یا مرتد ہونے کی وجہ سے قتل کر دیا گیا تو اس کے وہ اموال جو اس نے زمانہ اسلام میں کسب کیے تھے اس کے مسلمان وارثوں کو مل جائیں گے اور جو مال اس نے مرتد ہونے کی حالت میں کمایا اس پر مال فئی کے احکام جاری ہوں گے۔ (یعنی اس کا مال بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا اور وہ حسب قواعد مسلمانوں کی ضرورتوں میں خرچ کر دیا جائے گا، یہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دونوں قسم کے اموال پر فئی کے احکام جاری ہوں گے۔

اور جیسے ہی کوئی شخص مرتد ہو جائے اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی، اگر کوئی ایسا شخص مر جائے جس کی اسے میراث پہنچی تھی تو اس کی میراث سے یہ شخص محروم ہو گا، مرتد کی نہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا اور اس کا ذبیحہ بھی حرام ہو گا۔

ارتداد سے پہلے جو بھی نیک کام نماز، روزہ، حج، عمرہ وغیرہ کیا تھا یہ سب ضائع ہو گیا، آخرت میں اس کا کوئی ثواب نہیں ملے گا اور ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر یہ شخص دوبارہ مسلمان ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ سو اس کے بارے میں جان لینا چاہیے کہ آخرت میں دوزخ سے بچ جائے گا اور دنیا میں بھی آئندہ احکام اسلام اس پر جاری ہوں گے اور اسے خود بھی احکام اسلام پر عمل پیرا ہونا لازم ہو گا اور عام مسلمان بھی اس سے مسلمانوں جیسا معاملہ کریں گے۔

رہی یہ بات کہ اس کے گزشتہ اعمال صالحہ کا ثواب پھر سے واپس ملے گا یا نہیں اور جو حج کر لیا تھا اس کی فرضیت دوبارہ عود کرے گی یا نہیں، اس بارے میں حضرات آئمہ کرام کا اختلاف ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مرتد ہو جانے کی وجہ سے جو اس کے اعمال خبط ہو گئے تھے،

اب دوبارہ مسلمان ہونے سے ان کا ثواب واپس نہ ہو گا اور جو حج کر لیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا، اب حج فرض دوبارہ ادا کرنا ہو گا، مرتد ہونے کی وجہ سے جو بیوی نکاح سے نکل گئی تھی دوبارہ اسلام قبول کرنے سے پھر باہمی رضامندی سے نکاح کریں تو ہو سکتا ہے دوبارہ نکاح نہ کیا تو اس کی بیوی نہ ہو گی۔ (انوار البیان

ایمان، ہجرت، جہاد اور رحمت خداوندی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (۲۱۸)البقرہ

جواب ترجمہ: بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا یہ لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

شان نزول: جب واقد بن عبد اللہ تمیمی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن حضرمی کو شہر حرام میں قتل کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کا خمس لینے سے توقف فرمایا جو آپ کے لئے مال اور دو قیدیوں کی صورت میں حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو عطا کیا گیا تھا، تو مسلمانوں نے حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں سخت رویہ اختیار کیا یہاں تک کہ وہ ان پر شاق گزرنے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے شہر حرام میں اس آیت کے ساتھ ان کی تلافی فرمائی اور ان سے غم اور پریشانی کو دور فرما دیا اور یہ خبر دی کہ ان کے لیے ہجرت کرنے والے اور جہاد کرنے والے کا ثواب ہے، انہی کی طرف اس قول میں اشارہ فرمایا ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا پھر یہ آیت ہر اس کے حق میں باقی رہی جس نے وہ عمل کیا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگرچہ انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب تو نہیں کیا لیکن ان کے لئے کوئی اجر بھی نہیں ہے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (تفسیر قرطبی)

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا: ایمان تمام اعمال صالحہ کی قبولیت اور ترقی کے لیے شرط اولین ہے، ایمان والوں کی جگہ جگہ قرآن کریم میں تعریف کی گئی ہے۔

هَاجَرُوا: ہجرت سے ہے یعنی وہ لوگ جنہوں نے اپنے اوطان اور اپنے قبائل چھوڑ دیے، یہ لفظ اصل میں ہجر سے ہے، ہجر وصل کی ضد ہے، عربی زبان میں قبیح اور برے کلام کے لیے هُجرٌ بولا جاتا ہے کیونکہ قبیح اور برا کلام اس لائق ہوتا ہے کہ اسے چھوڑ ہی دیا جائے، عربی میں هَاجِرَہ اس وقت کو کہا جاتا ہے جس میں کام کاج چھوڑ دیا جاتا ہے، مُهَاجَرہ ہجرت سے باب مفاعلہ ہے، اس کا معنٰی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس شخص کو اس کے دوست احباب کنبے اور قبیلے والے لوگ اس کے دین کی وجہ سے اسے چھوڑ دیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ شخص دین کی وجہ سے اپنے رشتہ داروں، عزیزوں، کنبے قبیلے والوں کو چھوڑ دے، اسی کو مہاجرہ کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے پہلے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرض تھی، بعد میں منسوخ ہو گئی، فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے، ہاں جہاد اور نیت ہے۔ (بخاری)

علماء کرام فرماتے ہیں کہ ہاں جب کہیں مکہ مکرمہ جیسے حالات مسلمانوں کو پیش آئیں تو وہ اب بھی ہجرت کر سکتے ہیں۔

وَجٰهَدُوا: مجاہدہ کا اصل جہد ہے، جہد مشقت اٹھانے کو کہتے ہیں، مجاہدہ کا یہ معنٰی ہو سکتا ہے کہ اپنی محنت، کوشش اور مشقت کو دین کی نصرت اور سربلندی کے لیے دوسروں کی محنت وجہد کے ساتھ ملانا، جیسے عربی میں مساعدہ کا مطلب ہے ایک شخص کا اپنے بازو کو دوسرے کے بازو کے ساتھ ملانا تاکہ اسے قوت اور مضبوطی حاصل ہو۔

اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ: یہی ہیں جو اللہ کی رحمت کی امید وار ہیں یعنی اللہ کے اجر دینے کے (امید وار ہیں) امید کو ان کے لیے اس لیے ثابت کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ عمل نہ موجب ثواب ہے اور نہ ثواب کے ثبوت کا یقین دلانے والا ہے خاص کر اس صورت میں کہ اعتبار خاتموں ہی کا ہوتا ہے۔ (مظہری)

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اور اللہ بخشنے والا ہے یعنی ان کی خطا کو اور مہربان ہے یعنی ثواب عطا کرنے میں۔

شراب، جوا اور انفاق

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (۲۱۹) البقرہ

جواب ترجمہ: لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ بھی ہے، اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں، اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اور لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ (اللہ کی خوشنودی کے لیے) کیا خرچ کریں؟ آپ فرما دیجیے کہ جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو، اللہ اسی طرح اپنے احکام تمہارے لیے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر سے کام لو۔

شانِ نزول: جب شراب کی حرمت کی آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یا اللہ تو اس کا واضح بیان فرما ان پر سورۃ بقرہ کی یہ آیت يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ (البقرہ۲۱۹)) نازل ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلوایا گیا اور انہیں یہ آیت پڑھ کر سنائی گئی لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر بھی یہی دعا کی کہ یا اللہ! اسے ہمارے لیے اور زیادہ صاف بیان فرما اس پر سورۃ نساء کی آیت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا (النسآء:۴۳)

نازل ہوئی اور ہر نماز کے وقت پکارا جانے لگا کہ نشے والے لوگ نماز کے قریب بھی نہ آئیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلوایا گیا اور ان کے سامنے اس آیت کی بھی تلاوت کی گئی آپ نے پھر بھی یہی دعا کی یا اللہ ہمارے لئے اس کا بیان اور واضح کر اس پر سورۃ مائدہ کی آیت اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اتری جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بلا کر یہ آیت بھی سنائی گئی اور

جب ان کے کان میں آیت کے آخری الفاظ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (المائدہ:۹۱) پڑے تو آپ بول اٹھے اِنْتَهَيْنَا اِنْتَهَيْنَا ہم رک گئے ہم باز آئے۔(ابن کثیر)

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ : امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں خمر ہر وہ چیز ہے جو عقل کو ڈھانپ لے۔ میسر کہتے ہیں جوئے بازی کو، شراب نوشی اور جوابازی گناہ کے کام ہیں، ان کا وبال اُخروی ہے اور فائدہ صرف دنیاوی ہے کہ بدن کو کچھ نفع پہنچے یا غذا ہضم ہو یا فضلے برآمد ہوں یا بعض ذہن تیز ہو جائیں یا ایک طرح کا سرور حاصل ہو جیسے کہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا جاہلیت کے زمانہ کا شعر ہے

وَنَشْرَبُهَا فَتَتْرُكُنَا مُلُوكًا ...وَأُسْدًا لَا يُنَهْنِهُهَا اللِّقَاءُ

شراب پی کر ہم بادشاہ اور دلیر بن جاتے ہیں، اسی طرح اس کی خرید و فروخت اور کشید میں بھی تجارتی نفع ممکن ہے ہو جائے۔ اسی طرح جوئے بازی میں ممکن ہے جیت ہو جائے، لیکن ان فوائد کے مقابلہ میں نقصانات ان کے بکثرت ہیں کیونکہ اس سے عقل کا مارا جانا، ہوش و حواس کا بیکار ہونا ضروری ہے، ساتھ ہی دین کا برباد ہونا بھی ہے۔

یہ آیت گویا شراب کی حرمت کا پیش خیمہ تھی مگر اس میں صاف صاف حرمت بیان نہیں ہوئی تھی اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی چاہت تھی کہ کھلے لفظوں میں شراب کی حرمت نازل ہو، چنانچہ آخرکار سورۃ مائدہ کی آیت میں صاف فرما دیا گیا کہ شراب اور جوا اور پانسے اور تیر سے فال لینا سب حرام اور شیطانی کام ہیں، اے مسلمانو! اگر نجات کے طالب ہو تو ان سب سے باز آجاؤ، شیطان کی تمنا ہے کہ شراب اور جوئے کے باعث تم میں آپس میں عداوت و بغض ڈال دے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے کیا اب تم ان شیطانی کاموں سے رک جانے والے بن جاؤ گے؟(ابن کثیر)

مفسرین تابعی فرماتے ہیں کہ شراب کے بارے میں پہلے یہی آیت نازل ہوئی، پھر سورۃ نساء کی آیت نازل ہوئی پھر سورۃ مائدہ کی آیت اتری اور شراب مکمل طور پر حرام ہو گئی۔(ابن کثیر)

وَ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا گیا ہے کہ جب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم ہوا تو چند صحابہ (معاذ بن جبل اور حضرت ثعلبہ) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم نہیں جانتے کہ ہمارے مالوں میں جو مقرر فرمایا گیا ہے وہ کس قدر ہے ہم اس میں کتنا خرچ کریں ان کے سوال کے جواب میں اللہ جل شانہ نے آیت کریمہ وَ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ نازل فرمائی اور سوال کرنے والوں کے جواب میں فرمایا کہ جو مال اپنی ضروریات سے زائد ہو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ (لباب النقول، انوار البیان) کہ تم خرچ کرنے میں غور و فکر سے کام لو، آخرت کی ضروریات دیکھو اور دنیاوی ضروریات کو سمجھو، ایسا بھی نہ ہو کہ خرچ ہی نہ کرو کہ ضروریات سے جس قدر بھی زائد ہو وہ پڑا ہی رہے اور جمع ہی ہوتا رہے اور ایسا بھی نہ ہو کہ سب خرچ کر کے بیٹھ رہو اور فقر و فاقہ میں مبتلا ہو کر کل کو دوسروں سے مانگنے کی نوبت آجائے۔

نیز جوش سخاوت میں ایسا بھی نہ ہو کہ اہل و عیال جن کے حقوق واجب ہیں ان کا کوئی حق ضائع ہو جائے، ضرورت سے زیادہ جو مال جمع ہو جائے اگر اس میں سے فرض زکوٰۃ اور صدقات و نفقات واجبہ ادا ہوتے رہیں تو اس کا جمع کرنا جائز تو ہے لیکن خرچ کر دینا افضل ہے اس میں احوال بھی مختلف ہوتے ہیں، کسی میں زہد غالب ہے اور جتنا زائد ہو سب خرچ کر دیتا ہے اس کی بھی گنجائش ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل کے لیے کچھ نہیں رکھتے تھے، اگر کوئی شخص فرائض اور واجبات ادا کرنے کے بعد زائد مال میں سے للہ فی اللہ کچھ خرچ کر دے اور کچھ رکھ لے تو اس کی بھی گنجائش ہے جیسا کہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہت زیادہ خرچ کرتے تھے لیکن ان کے پاس مال جمع بھی رہتا تھا اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکیر نہیں فرمائی۔ (انوار البیان)

یتیم کے ساتھ بھلائی اور مال کی حفاظت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَإِن تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۲۰) البقرہ

جواب ترجمہ: دنیا کے بارے میں بھی اور آخرت کے بارے میں بھی۔ اور لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ ان کی بھلائی چاہنا نیک کام ہے، اور اگر تم ان کے ساتھ مل جل کر رہو تو (کچھ حرج نہیں کیونکہ) وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ کون معاملات بگاڑنے والا ہے اور کون سنوارنے والا، اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈال دیتا۔ یقیناً اللہ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل ہے۔

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ: واضح فرمادیا کہ یہ دنیا ڈھلتی چھاؤں ہے، اسے بقاء اور دوام نہیں ہے، مگر کیا کیا جائے جب اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو بنایا، سجایا اور سنوارا ہے، اس میں انسان آباد کیے ہیں تو ان کی ضروریات بھی تو رکھی ہیں، اس لیے خوب سوچ سمجھ کر یہاں اتنا کرنا ہے جتنا یہاں رہنا ہے، آخرت کی زندگی دائمی ہے، باقی رہنے والی ہے اس لیے اس کے لیے اتنی محنت کرنا ہے جتنا وہاں رہنا ہے، آخرت کو مد نظر رکھ کر سارے کام انجام دینا ہیں۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں پہلے یہ حکم ہوا تھا کہ آیت وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (الانعام: ۱۵۲) یعنی یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جو بہترین طریقہ ہو اور فرمایا گیا تھا اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا (النسآء: ۱۰)۔ یعنی جو لوگ ظلم سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اور وہ بھڑکتی ہوئی جہنم میں عنقریب داخل ہوں گے تو ان آیتوں کو سن کر ان لوگوں نے جو یتیموں کے والی تھے یتیموں کا کھانا اور ان کا پانی اپنے گھر کے

کھانے اور گھر کے پانی سے بالکل جدا کر دیا اب اگر ان کا پکا ہوا کھانا بچ جاتا تو اسے یا تو وہ خود ہی دوسرے وقت کھائے یا خراب ہو جائے تو یوں ایک طرف تو ان یتیموں کا نقصان ہونے لگا دوسری جانب والیان یتیم بھی تنگ آ گئے کہ کب تک ایک ہی گھر میں اس طرح رکھ رکھاؤ کیا کریں تو ان لوگوں نے آ کر نبی کریم ﷺ سے عرض کی جس پر یہ آیت قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (البقرۃ:۲۲۰) نازل ہوئی اور نیک نیتی اور دیانت داری کے ساتھ ان کے مال کو اپنے مال میں ملا لینے کی رخصت دی گئی۔

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں یتیم کے مال کی اس طرح دیکھ بھال سخت مشکل ہے کہ اس کا کھانا پینا ملا جلا رکھنے کی اجازت دی گئی اس لئے کہ وہ بھی دینی بھائی ہیں یا نیت نیک ہونی چاہیے، قصد اور ارادہ اگر یتیم کی نقصان رسانی کا ہے تو وہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ سے پوشیدہ نہیں اور اگر مقصود یتیم کی بھلائی اور اس کے مال کی نگہبانی ہے تو اسے بھی وہ علام الغیوب بخوبی جانتا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ: اللہ تمہیں تکلیف ومشقت میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا جو تنگی اور حرج تم پر یتیم کا کھانا پینا بالکل جدا رکھنے میں تھا وہ اللہ تعالیٰ نے دور فرما دیا اور تم پر تخفیف کر دی اور ایک ہنڈیا رکھنا اور ملا جلا کام کرنا تمہارے لئے مباح قرار دیا، بلکہ یتیم کا نگران اگر تنگ دست مسکین محتاج ہو تو دستور کے مطابق اپنے خرچ میں لا سکتا ہے اور اگر کسی مالدار نے بوقت ضرورت اس کی چیز کام میں لے لی تو پھر ادا کر دے۔

مشرکہ اور مشرک سے شادی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ

(۲۲۱)البقرہ

جواب ترجمہ: اور مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ یقیناً ایک مومن باندی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے، خواہ وہ مشرک عورت تمہیں پسند آرہی ہو اور اپنی عورتوں کا نکاح مشرک مردوں سے نہ کراؤ جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور یقیناً ایک مومن غلام کسی بھی مشرک مرد سے بہتر ہے خواہ وہ مشرک مرد تمہیں پسند آرہا ہو۔ یہ سب دوزخ کی طرف بلاتے ہیں جبکہ اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اور اپنے احکام لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

شانِ نزول: حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عناق نامی ایک عورت سے نکاح کرنے کی اجازت مانگی، یہ عورت قریشیہ تھیں اور بہت ہی خوبصورت تھیں، لیکن مشرکہ تھیں اور ابو مرثد مسلمان تھے، ابو مرثد نے عرض کیا یارسول اللہ! وہ میرے دل کو بھاتی ہے، اس پر قرآن کریم کی یہ آیت وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ نازل ہوئی۔ (اسباب النزول)

② حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی ایک سیاہ فام باندی تھی انہوں نے غصہ میں اس کو ایک طمانچہ مار دیا پھر گھبرائے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ سنایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اے عبداللہ! وہ کیسی عورت ہے؟ عرض کیا یارسول اللہ! وہ روزہ رکھتی ہے نماز پڑھتی ہے اور اچھی طرح وضو کرتی ہے اور اللہ کی توحید کی اور آپ کی رسالت کی گواہی دیتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عبداللہ! وہ مومنہ ہے، انہوں نے عرض کیا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں ضرور اس کو آزاد کردوں گا اور اس سے نکاح کرلوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اس پر بعض مسلمانوں نے ان پر طعن کیا اور کہا کہ اس نے باندی سے نکاح کرلیا، جو لوگ چاہتے تھے کہ مشرکین سے مناکحت ہوتی رہے (کیونکہ ان لوگوں میں کچھ مال و جمال نظر آتا تھا) ان کی تردید میں اللہ تعالیٰ شانہ نے آیت وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ نازل فرمائی۔

اس آیت شریفہ میں مسلمانوں کو اس بات سے منع فرمایا ہے کہ مشرک عورتوں سے نکاح کریں، ہاں اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو ان سے نکاح کرنا جائز ہوگا مشرک عورتیں بعض مرتبہ حسن و جمال یا اموال کے اعتبار سے اچھی معلوم ہوتی ہیں اور ان سے نکاح کرنے کی خواہش ہوتی ہے، اس کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ تم مشرکہ سے نکاح نہ کرو، اگر کوئی باایمان لونڈی مل جائے تو اس سے نکاح کرلو، وہ تمہارے لیے مشرک عورت سے بہتر ہے، پھر دوسرا حکم ارشاد فرمایا کہ مشرکوں سے اپنی عورتوں کا نکاح نہ کرو، مشرک کی نسبت مومن غلام بہتر ہے (تم اس سے اپنی عورتوں کا نکاح کرو) ہاں اگر کوئی مشرک مسلمان ہو جائے تو وہ تمہارا دینی بھائی ہو گیا اس سے اپنی عورتوں کا نکاح کرسکتے ہو۔

آخر میں مشرکوں سے بچنے اور ان سے ازدواجی تعلقات قائم نہ کرنے کی علت بتادی کہ مشرکین دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، مشرکین سے مرد ہوں یا عورت ازدواجی میل جول رکھنے میں خطرہ ہے کہ مسلمان مرد ہو یا عورت خدانخواستہ ان کے عقائد سے متاثر ہو جائے اور کسی دن ایمان کھو بیٹھے اور مستحق دوزخ ہو جائے، پھر مسئلہ اولاد کا بھی پیدا ہو گا مرد مشرک ہو یا عورت وہ اولاد کو ضرور اپنے دین پر لگائیں گے، اگر اولاد مشرک ہو گئی تو دوزخی ہو گی، لامحالہ مؤمن مرد و عورت مشرک مرد و عورت سے بہتر ہے چاہے وہ مومن غلام یا باندی ہی ہو، چونکہ نہ تو وہ اپنے جوڑے کو دوزخ کی دعوت دیتا ہے اور نہ اولاد کو دوزخ کے راستہ پر ڈالتا ہے۔ (انوار البیان)

فائدہ: آیت کے عموم الفاظ سے ظاہر ہے کہ کسی مومن عورت کا کسی مشرک مرد سے اور کسی مومن مرد کا کسی مشرک عورت سے نکاح درست نہیں ہے اور اس عموم میں ہر طرح کے کافر داخل ہیں، ملحد زندیق دہریئے بھی اسی حکم میں آجاتے ہیں، ایسے مردوں اور عورتوں سے کسی مرد مومن اور عورت مومنہ کا نکاح درست نہیں اگر نکاح کرلیا تو وہ نکاح شرعی نکاح نہ ہو گا اور اس کی بنیاد پر ازدواجی تعلقات حرام ہوں گے، البتہ کتابی عورت (یہودیہ ہو یا نصرانیہ) سے مسلمان مرد کا نکاح درست ہے اور اس کا جواز سورۃ مائدہ کے پہلے رکوع میں بیان فرمادیا ہے،

اگرچہ یہود یہ و نصرانیہ عورت سے مسلمان کا نکاح درست ہے لیکن ان سے بچنا افضل ہے خاص کر اس زمانہ میں جبکہ یہ عورتیں مسلمانوں سے نکاح کرتی ہی اس لیے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے دین پر لے آئیں اور اولاد کو بھی اپنے دین پر ڈال دیں اور مسلمانوں کی اندرونی خبریں دشمنان اسلام کو پہنچایا کریں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں اس نزاکت کو بھانپ لیا تھا اور اپنے عہد خلافت میں صحابہؓ کو اس سے روکتے تھے۔ (کمافی کتاب الآثار لامام محمد بن الحسن الشیبانی ص ۸۹)

بہت سے ممالک میں جہاں مسلمان مل جل کر رہتے ہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہر مذہب اور مسلک کے لڑکے لڑکیاں یکجا جمع ہو کر کلاسوں میں بیٹھتے ہیں وہاں ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیاں مقامی حکومت کے قانون کے مطابق کورٹ میں جا کر نکاح کر لیتے ہیں، اگر لڑکا مسلمان ہو اور لڑکی کتابی ہو تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے بشرطیکہ ایجاب و قبول گواہوں کے سامنے ہوا ہو اور اگر لڑکی کتابی نہیں، ہندو، سکھ، بدھسٹ، آتش پرست ہو تو یہ نکاح ہونے ہی کا نہیں اور کسی مسلمان عورت کا نکاح کسی بھی کافر سے نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ کافر یہودی و نصرانی ہو، بہت سے فرقے ایسے بھی ہیں جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں لیکن وہ اپنے عقائد کی وجہ سے کافر ہیں، مثلاً وہ لوگ جو ختم نبوت کے منکر ہیں اور وہ لوگ جو تحریف قرآن کے قائل ہیں اور وہ لوگ جو اپنے امام کے اندر خدائے پاک کا حلول مانتے ہیں یہ سب لوگ بھی کافر ہیں ان سے کسی مسلمان لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا اور نہ کسی مسلمان مرد کا اس طرح کی کسی عورت سے نکاح ہو سکتا ہے۔ (انوار البیان)

ماہواری میں عورتوں سے علیٰحدگی کا حکم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ {۲۲۲} البقرۃ.

جواب ترجمہ: اور آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دو وہ گندگی ہے پس حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہو اور ان کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ پاک ہو لیں پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے بیشک اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور بہت پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

شان نزول: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہود کے ہاں جب کسی عورت کو حیض آتا تو اسے گھر سے نکال دیتے نہ اس کے ساتھ کھاتے پیتے نہ ہی اس سے جماع کرتے اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (مسلم)

حیض نجاست ہے سو ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو اور جب تک وہ غسل کر کے پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو ہاں جب پاک ہو جائیں تو جس طریق سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ان کے پاس جاؤ کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔ (قرطبی)

حیض کے دوران عورت جو کام نہیں کر سکتی، وہ درج ذیل ہیں۔ ① وہ نماز نہیں پڑھ سکتی اور حیض کے دوران اسے نماز معاف ہے، اس کی قضا اس پر واجب نہیں۔ ② وہ روزے بھی نہیں رکھ سکتی۔ لیکن روزے اسے معاف نہیں بلکہ بعد میں ان کی قضا دینا واجب ہے۔ ③ وہ ماسوائے طواف کعبہ کے حج کے باقی سب ارکان بجالا سکتی ہے اور واجب طواف کعبہ کے لیے اسے اس وقت تک رکنا پڑے گا جب تک پاک نہ ہو لے۔

④ وہ کعبہ میں یا کسی بھی مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی۔ ⑤ وہ قرآن کو چھو نہیں سکتی، البتہ زبانی قرآن کریم کی تلاوت کی اسے اکثر علماء کے نزدیک اجازت ہے۔ ⑥ استحاضہ حیض سے بالکل الگ چیز ہے، استحاضہ بیماری ہے جبکہ حیض بیماری نہیں بلکہ عورت کی عادت میں شامل ہے۔ لہذا استحاضہ میں وہ تمام پابندیاں اٹھ جاتی ہیں، جو حیض کی صورت میں تھیں، حتیٰ کہ اس سے صحبت بھی کی جا سکتی ہے۔

میاں بیوی کا خصوصی ملاپ

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۲۳)البقرہ

جواب ترجمہ: تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں لہذا اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو جاؤ اور اپنے لیے (اچھے عمل) آگے بھیجو، اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ تم اس سے جا کر ملنے والے ہو اور مومنوں کو خوشخبری سنادو۔

صاحب توضیح القرآن اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک لطیف کنایہ استعمال کر کے میاں بیوی کے خصوصی ملاپ کے بارے میں چند حقائق بیان فرمائے ہیں، پہلی بات تو یہ واضح فرمائی ہے کہ میاں بیوی کا یہ ملاپ صرف لذت حاصل کرنے کے مقصد سے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اسے انسانی نسل کی بڑھوتری کا ذریعہ سمجھنا چاہیے، جس طرح ایک کاشتکار اپنی کھیتی میں بیج ڈالتا ہے تو اس کا اصل مقصد پیداوار کا حصول ہوتا ہے اسی طرح یہ عمل بھی دراصل انسانی نسل باقی رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔

دوسری حقیقت یہ بیان فرمائی ہے کہ جب اس عمل کا اصل مقصد یہ ہے تو یہ عمل نسوانی جسم کے اسی حصہ میں ہونا چاہیے جو اس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے، پیچھے کا جو حصہ اس کام کے لئے نہیں بنایا گیا، اس کو فطرت کے خلاف جنسی لذت کے لئے استعمال کرنا حرام ہے۔ تیسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ نسوانی جسم کا جو اگلا حصہ اس غرض کے لئے بنایا گیا ہے اس تک پہنچنے کے لئے راستہ کوئی بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، یہودیوں کا خیال یہ تھا کہ اس حصے میں مباشرت کرنے کے لئے بس ایک ہی طریقہ جائز ہے یعنی سامنے کی طرف سے، اگر مباشرت آگے ہی کے حصے میں ہو لیکن اس تک پہنچنے کے لئے راستہ پیچھے کا اختیار کیا جائے تو وہ کہتے تھے کہ اولاد بھینگی پیدا ہوتی ہے، اس آیت نے یہ غلط فہمی دور

کر دی۔ (توضیح القرآن للشیخ تقی عثمانی)

قسموں کے لیے اللہ کے نام کو تختہ مشق بنانے کی ممانعت

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۲۴) البقرہ

جواب ترجمہ: اور اللہ کے نام کو تختۂ مشق نہ بناؤ اپنی قسموں کے لیے کہ بھلائی نہ کرو گے، پرہیز گاری نہ کروگے اور لوگوں کے درمیان صلح نہ کراؤ گے اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

شان نزول: امام کلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی اس میں انہیں اپنے داماد بشیر بن نعمان رضی اللہ عنہ سے قطع تعلقی سے منع کیا گیا حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے قسم اٹھالی تھی کہ أَنْ لَا يَدْخُلَ عَلَيْهِ أَبَدًا، وَلَا يُكَلِّمَهُ، وَلَا يُصْلِحَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ امْرَأَتِهِ وَيَقُولُ: قَدْ حَلَفْتُ بِاللّٰهِ أَنْ لَا أَفْعَلَ، وَلَا يَحِلُّ لِي إِلَّا أَنْ أَبِرَّ فِي يَمِينِي میں اس کے گھر کبھی بھی نہ جاؤں گا نہ اس سے کبھی کلام کروں گا اور نہ اس سے اس کی بیوی کے درمیان صلح کرواؤں گا اور کہتے تھے کہ میں نے یہ کام نہ کرنے کی قسم کھالی ہے اور میرے لیے قسم کو پورا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اس پر اللہ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ (اسباب النزول للواحدی)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بعض مرتبہ کوئی شخص قسم کھالیتا تھا کہ فلاں نیکی اور تقویٰ کا کام نہیں کرونگا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ (تفسیر در منثور)

اگر کوئی شخص قسم کھائے تو خیر کی قسم کھائے یعنی نیک کام کے ارادہ کو مؤکد کرنے کے لیے قسم کھائی جاسکتی ہے، لیکن نیکی نہ کرنے پر قسم کھانا اور گناہ کرنے پر قسم کھانا شرعاً ممنوع ہے، بعض لوگ جو قسم کھالیتے تھے کہ میں فلاں عزیز کے گھر نہیں جاؤں گا یا فلاں مسلمان بھائی کی دعوت قبول نہیں کروں گا یا جماعت سے نماز نہیں پڑھوں گا یا فلاں گناہ کروں گا ایسے لوگوں کو آیت بالا میں ہدایت دی

گئی ہے اور فرمایا کہ اللہ کے نام کو نیکیوں سے بچنے اور تقویٰ چھوڑنے کا ذریعہ مت بناؤ، قسم کھا بیٹھے اب کہتے ہیں کہ قسم کے خلاف کیسے کریں؟ حالانکہ قسم اس لیے نہیں ہے کہ اس کو خیر سے بچنے کا ذریعہ بنایا جائے، اگر کوئی شخص گناہ کی قسم کھالے تو قطع رحمی کی یا کسی بھی قسم کے گناہ کی قسم کھالے تو اس پر لازم ہے کہ قسم توڑ دے اور اس کے خلاف کرلے اور قسم کا کفارہ دیدے۔ (انوار البیان)

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ میں اپنے چچا کے پاس جاتا ہوں اس سے کچھ سوال کرتا ہوں، وہ مجھے نہیں دیتا اور صلہ رحمی نہیں کرتا، پھر اسے حاجت در پیش ہو جاتی ہے تو مجھ سے آکر سوال کرنے لگتا ہے حالانکہ میں نے قسم کھار کھی ہے کہ اسے کچھ نہ دوں گا اور صلہ رحمی نہیں کروں گا، اس کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں وہ کام کروں جو خیر ہو اور قسم کا کفارہ دیدوں۔ (مشکوۃ المصابیح)

لغو قسم کھانے کا حکم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے نیز بتایئے کہ کیا لغو قسم کھانے پر اللہ تعالیٰ ہماری گرفت کرے گا؟ جب کہ قسم کھانے کا ارادہ ہی نہ ہو، جیسے اللہ کی قسم وغیرہ، اللہ تعالیٰ کس قسم کی قسم پر گرفت فرماتے ہیں؟

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ أَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ {۲۲۵} البقرۃ

جواب ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمہاری لغو (بلا ارادہ یا عادتاً) قسم کی قسموں پر گرفت نہیں کرے گا لیکن جو تم سچے دل سے قسم کھاتے ہو اس پر ضرور گرفت کرے گا اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بردبار ہے۔

قسم تین طرح کی ہوتی ہے ① لغو ② غموس ③ منعقدہ ① حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أَنَّ اللَّغْوَ هُوَ أَنْ يَحْلِفَ عَلَى شَيْءٍ يَعْتَقِدُ أَنَّهُ كَانَ ثُمَّ بَانَ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ فَهٰذَا هُوَ اللَّغْوُ، لغو قسم یہ ہے کہ کسی گزرے ہوئے امر پر اپنے خیال میں صحیح جان کر قسم کھائے اور درحقیقت وہ اس کے

خلاف ہو، یہ معاف ہے اور اس پر کفارہ نہیں۔ ② غموس کا لغوی معنی ہے انتہائی سنگین اور سخت معاملہ، غمس کا لغوی معنی ہے غوطہ لگانا، گویا کہ جھوٹی قسم کھانے والا دوزخ کی آگ میں غوطہ لگاتا ہے، یمین غموس وہ قسم جو جھوٹی ہو اور قسم کھانے والے کو گناہ گار بنادے، اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ کسی گزرے ہوئے امر پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائے اس میں گنہ گار ہو گا، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلْیَمِیْنُ الْغَمُوْسُ تَذَرُ الدِّیَارَ بَلَاقِع جھوٹی قسم آبادیوں کو ویرانے بنادیتی ہے۔

③ منعقدہ یہ ہے کہ کسی آئندہ امر پر جان بوجھ کر قسم کھائے اس قسم کو اگر توڑے تو گنہ گار بھی ہے اور کفارہ بھی لازم ہے۔

ایلاء یعنی بیویوں سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھانا

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۲۲۶) وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۲۲۷) البقرہ

جواب ترجمہ: جو لوگ اپنی بیویوں سے ایلا کرتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، چنانچہ اگر وہ (قسم توڑ کر) رجوع کر لیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ اور اگر انہوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو (بھی) اللہ سننے جاننے والا ہے۔

شان نزول: حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں نے عورتوں کو تکلیف پہنچانے کے لیے ایلاء کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ جو شخص اپنی بیوی کو نہیں چاہتا تھا اور ساتھ یہ بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے تو یہ قسم کھالیتا تھا کہ کبھی بھی اس کے پاس نہیں جائے گا پھر اس کو اسی حال پر چھوڑے رکھتا تھا اور عورت کی زندگی اس طرح گزرتی تھی کہ نہ وہ شوہر والی ہے اور نہ بے شوہر والی ہے۔ اللہ جل شانہ نے ایلاء کی ایک مدت مقرر فرمادی اور آیت شریفہ لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ (آخر تک) نازل فرمادی۔ (معالم التنزیل)

ایلاء کا لغوی واصطلاحی معنی: ایلاء کا لغوی معنٰی ہے قسم کھانا، اور اصطلاح شرع میں اس کا معنی ہے مدت مخصوصہ تک اپنی منکوحہ سے جماع نہ کرنے کی قسم کھانا اور زیادہ صحیح تعریف یہ ہے کہ اپنی منکوحہ سے چار مہینے تک جماع نہ کرنے کی قسم کھانا۔ علامہ مرغینانی حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں، جب کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہے کہ اللہ کی قسم! میں تم سے مقاربت نہیں کروں گا، یا کہے: اللہ کی قسم! میں تم سے چار مہینے مقاربت نہیں کروں گا تو وہ ایلاء کرنے والا ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے

"جو لوگ اپنی عورتوں سے مباشرت نہ کرنے کی قسم کھالیتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، اگر انہوں نے (اس مدت میں) رجوع کر لیا تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا بڑا بردبار ہے اور اگر انہوں نے طلاق ہی کا ارادہ کر لیا ہے تو بیشک اللہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے۔ (البقرہ: ۲۲۷، ۲۲۶)

اگر اس نے چار مہینے کے اندر اپنی بیوی سے مباشرت کر لی تو اس کی قسم ٹوٹ جائے گی اور اس پر کفارہ لازم ہو گا اور ایلاء ساقط ہو جائے گا اور اگر اس نے چار مہینے اپنی بیوی سے مقاربت نہیں کی تو اس کی بیوی پر از خود طلاق بائنہ واقع ہو جائے گی، جس کا حکم یہ ہے کہ اب بلا نکاح ثانی کے رجوع نہیں ہو سکتا، آپس کی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔

مسائل ایلاء: ایلاء یعنی بیوی سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھانے سے متعلق چند مسائل بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ مسئلہ: ہمیشہ کے لیے صحبت نہ کرنے کی قسم نہیں کھائی بلکہ فقط چار مہینے کے لیے قسم کھائی اور یوں کہا خدا کی قسم چار مہینے تک تجھ سے صحبت نہ کروں گا تو اس سے ایلاء ہو گیا اس کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر چار مہینے تک صحبت نہ کرے تو طلاق بائن پڑ جائے گی اور اگر چار مہینے سے پہلے صحبت کر لے تو قسم کا کفارہ دے۔ (مسائل بہشتی زیور)

مسئلہ: اگر چار مہینے سے کم کے لیے قسم کھائی تو اس کا کچھ اعتبار نہیں، اس سے ایلاء نہ ہو گا، چار مہینے سے ایک دن بھی کم کر کے قسم کھائے تب بھی ایلاء نہ ہو گا البتہ جتنے دنوں کی قسم کھائی ہے اتنے دنوں سے پہلے پہلے صحبت کرے گا تو قسم توڑنے کا کفارہ دینا پڑے گا اور اگر صحبت نہ کی تو عورت کو طلاق نہ

پڑے گی اور قسم بھی پوری رہے گی۔

مسئلہ: کسی نے فقط چار مہینے کے لیے قسم کھائی پھر اپنی قسم نہیں توڑی اس لیے چار مہینے کے بعد طلاق پڑ گئی اور طلاق کے بعد پھر اسی مرد سے نکاح ہو گیا تو اب اس نکاح کے بعد اگر چار مہینے تک صحبت نہ کرے تو کچھ حرج نہیں اب کچھ نہ ہو گا، اور اگر ہمیشہ کے لیے قسم کھائی جیسے یوں کہہ دیا میں قسم کھاتا ہوں کہ اب تجھ سے صحبت نہ کروں گا یا یوں کہا خدا کی قسم تجھ سے کبھی صحبت نہ کروں گا پھر اپنی قسم نہیں توڑی اور چار مہینے بعد طلاق پڑ گئی، اس کے بعد پھر اس سے نکاح کر لیا اور نکاح کے بعد پھر چار مہینے تک صحبت نہیں کی تو اب پھر دوسری طلاق پڑ گئی، اگر تیسری دفعہ پھر اسی سے نکاح کر لیا تو اس کا بھی یہی حکم ہے کہ اس نکاح کے بعد اگر چار مہینے تک صحبت نہ کرے گا تو تیسری طلاق پڑ جائے گی اور دوسرا خاوند کیے بغیر اس سے نکاح بھی نہ ہو سکے گا، البتہ اگر دوسرے یا تیسرے نکاح کے بعد صحبت کر لیتا تو قسم ٹوٹ جاتی اور پھر طلاق نہ پڑتی ہاں قسم توڑنے کا کفارہ دینا ہوتا۔ تین طلاقیں پوری ہونے کے بعد دوسرے خاوند سے نکاح کرنے اور پھر اس کے طلاق دینے کے بعد دوبارہ پہلے شوہر سے نکاح کرے گی تو اب ایلاء نہ رہے گا۔

مسئلہ: ہمیشہ کی قسم کھانے کے بعد چار مہینے گزر گئے اور عورت کو ایک طلاق بائنہ ہو گئی، عدت کے بعد عورت نے کسی دوسرے مرد سے نکاح کر لیا، پھر اس سے طلاق ملنے کے بعد اور عدت گزارنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح کر لیا تو ایلاء باقی ہے۔

مسئلہ: اگر عورت کو طلاق بائن دے دی پھر اس سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھائی تو ایلاء نہیں ہوا، اب پھر سے نکاح کرنے کے بعد اگر صحبت نہ کرے تو طلاق نہ پڑے گی لیکن جب صحبت کرے گا تو قسم توڑنے کا کفارہ دینا پڑے گا، اگر طلاق رجعی دے دینے کے بعد عدت کے اندر ایسی قسم کھائی تو ایلاء ہو گیا، اب اگر رجعت کر لے اور صحبت نہ کرے تو چار مہینے کے بعد طلاق پڑ جائے گی اور اگر صحبت کرے تو قسم کا کفارہ دے۔

مسئلہ: خدا کی قسم نہیں کھائی بلکہ یوں کہا کہ اگر تجھ سے صحبت کروں تو تجھ کو طلاق ہے تب بھی ایلاء ہو گیا، صحبت کرے گا تو ابھی طلاق پڑ جائے گی اور قسم کا کفارہ اس صورت میں نہ دینا پڑے گا اور اگر صحبت نہ کی تو چار مہینے کے بعد طلاق بائن پڑ جائے گی۔

مسئلہ: اور اگر یوں کہا اگر تجھ سے صحبت کروں تو میرے ذمہ ایک حج ہے یا ایک عمرہ ہے یا ایک روزہ ہے یا ہزار روپے خیرات ہے یا ایک قربانی ہے یا سو رکعت نماز ہے یعنی ایسی بات جو مشقت والی بھی ہو اور نذر سے لازم بھی ہو جاتی ہو، ان صورتوں میں بھی ایلاء ہو گیا، اگر صحبت کرے گا تو جو بات کہی ہے وہ کرنا ہو گی اور کفارہ نہ دینا پڑے گا اور اگر صحبت نہ کی تو چار مہینے گزرنے پر طلاق بائن پڑ جائے گی اور اگر کوئی ایسی بات کہی جو مشقت والی نہ ہو اگرچہ لازم ہو جاتی ہو مثلاً یوں کہا اگر میں تجھ سے صحبت کروں تو میرے ذمہ دو رکعت نماز ہے یا ایک روپیہ خیرات ہے تو ایلاء نہ ہو گا، اسی طرح اگر کوئی ایسی بات کہی جو مشقت والی تو ہو لیکن لازم نہ ہو مثلاً یوں کہا اگر میں تجھ سے صحبت کروں تو میرے ذمہ ایک ہزار مرتبہ وضو ہے تو اس سے بھی ایلاء نہ ہو گا۔

مسئلہ: اگر شوہر بیوی سے صحبت کرنے سے حقیقتاً عاجز ہو مثلاً دونوں میں سے کوئی ایک مریض ہو یا ایک نابالغ ہو یا شوہر نامرد ہو یا مقطوع الذکر ہو یا عورت کی شرم گاہ میں دخول سے مانع کوئی رسولی ہو یا شوہر بیوی کا مدت ایلاء میں ملاپ ممکن نہ ہو مثلاً شوہر ناحق قید میں ہو اور قید خانے میں ایسا کوئی موقع نہ ہو کہ بیوی اس کے پاس چلی جائے اور شوہر اس سے صحبت کر سکے یا شوہر دور کے سفر میں ہو اور مدت ایلاء میں اس کا واپس پہنچنا ممکن نہ ہو تو اس وقت ایلاء سے رجوع کی صورت یہ ہے کہ شوہر زبان سے کہے کہ میں نے بیوی سے رجوع کر لیا یا میں نے اپنے کہے سے رجوع کیا یا میں نے ایلاء کو باطل کیا، اس طرح کہنے سے مدت ایلاء ختم ہونے پر طلاق نہ پڑے گی البتہ پھر صحبت کرے گا تو قسم کا کفارہ دینا پڑے گا، پھر اگر ایلاء کی مدت میں کسی طرح سے صحبت کرنے پر قدرت ہو گئی تو زبانی رجوع کالعدم ہو جائے گا اور اب رجوع بالفعل صحبت کرنا ہو گی۔ (مسائل بہشتی زیور)

طلاق یافتہ عورت کی عدت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلاَثَةَ قُرُوَءٍ وَلاَ يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِن كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُواْ إِصْلاَحاً وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ {۲۲۸} البقرہ

جواب ترجمہ: اور طلاق دی ہوئی عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھیں اور ان کے لیے جائز نہیں کہ چھپائیں جو اللہ نے ان کے پیٹوں میں پیدا کیا ہے اگر وہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں اور ان کے خاوند اس مدت میں ان کو لوٹا لینے کے زیادہ حق دار ہیں اگر وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہیں اور دستور کے مطابق ان کا ویسا ہی حق ہے جیسا ان پر ہے اور مردوں کو ان پر فضیلت دی ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

شان نزول: حضرت اسماء بنت یزید بن سکن سے روایت ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں طلاق دے دی گئی اس زمانہ میں مطلقہ کے لیے عدت نہ تھی تو اللہ نے اس آیت مبارکہ میں عدت طلاق کی مدت نازل فرمائی۔ (اسباب النزول)

عدت کے لفظی معنی شمار کرنے کے ہیں، شریعت میں عدت اس مدتِ انتظار کو کہا جاتا ہے جو نکاح کے ختم ہونے کے بعد شریعت نے مقرر کی ہے، اسی طرح طلاق پا جانے یا خاوند کے فوت ہو جانے کے بعد ایک مدت تک دوسرے نکاح سے عورت کے رکے رہنے اور سوگ منانے کو عدت کہا جاتا ہے، عدت دو طرح کی ہوتی ہے ایک طلاق کی اور دوسری خاوند کے فوت ہونے کی۔

اس آیت مبارکہ میں بتایا گیا کہ جس عورت کو طلاق مل جائے وہ تین حیض تک انتظار کرے پھر اس کے بعد چاہے تو دوسرے خاوند سے شادی کر لے، جس گھر میں اسے طلاق ملی ہے اسی گھر میں اسے عدت گزارنا ہو گی یہاں سے بلا ضرورت باہر نہیں نکل سکتی، کسی دوسرے گھر جا سکتی اور نہ ہی کسی

دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے، جس عورت کو رجعی طلاق ملی ہو وہ بناؤ سنگھار کر سکتی ہے، تاکہ خاوند کو اس میں رغبت پیدا ہو اور وہ طلاق سے رجوع کر لے۔

البتہ طلاق مغلظہ اور بائن کی صورت میں بناؤ سنگھار نہیں کر سکتی، ہاں مغلظہ اور بائن کی صورت میں عدت تین حیض ہی ہے، بائن اور مغلظہ کی صورت میں بھی عدت کے دوران کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس گھر سے نکل سکتی ہے جس میں اسے طلاق دی گئی ہے اور نہ ہی اسے کہیں ادھر ادھر جانا چاہیے۔

جس عورت کو طلاق بائن دی گئی ہے وہ اس عدت کے اندر اسی شوہر سے نکاح کر سکتی ہے، لیکن دوسرے کسی سے اگر عدت کے اندر نکاح کرے گی تو سخت گناہ گار ہو گی اور نکاح بھی نہیں ہو گا۔ جس عورت کو طلاق بائن یا مغلظہ مل جائے، اسے طلاق ملتے ہی خاوند سے ہر قسم کے تعلقات ختم کر کے غیر مردوں کی طرح پردہ شروع کر دینا چاہیے، ہاں عدت بھر اسی کے گھر رہنا چاہیے، عدت بھر اس عورت کا نان و نفقہ (عورت کا خرچ) مرد کے ذمہ ہو گا، اس عدت کے دوران اسے بناؤ سنگھار کر کے نہیں رہنا چاہیے، بلکہ اس کے رشتہ کے ختم ہو جانے کے غم میں بہت ہی معمولی طرح سے رہنا چاہیے۔

طلاق رجعی میں عدت تک عورت کو خاوند کے گھر میں رہنے کا حق ہے، لیکن عدت گزر جانے کے بعد اب عورت کو خاوند کا گھر چھوڑ دینا چاہیے، اب یہ طلاق رجعی بائن ہو گئی، اب اگر دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں تو اس طرح نکاح کریں جس طرح شروع میں ان کا نکاح ہوا تھا، عدت کے بعد رجوع نہیں ہو سکتا۔

نکاح و طلاق اور خلع کا شرعی حکم

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا

افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۲۹) البقرہ

جواب ترجمہ: طلاق (زیادہ سے زیادہ) دوبار ہونی چاہیے، اس کے بعد (شوہر کے لیے دو ہی راستے ہیں) یا تو قاعدے کے مطابق (بیوی کو) روک رکھے (یعنی طلاق سے رجوع کرلے) یا خوش اسلوبی سے چھوڑ دے (یعنی رجوع کے بغیر عدت گزر جانے دے) اور (اے شوہرو) تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ تم نے ان (بیویوں) کو جو کچھ دیا ہو وہ (طلاق کے بدلے) ان سے واپس لو، الا یہ کہ دونوں کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (نکاح باقی رہنے کی صورت میں) اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ چنانچہ اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں کے لیے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت مالی معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرلے، یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود ہیں، لہٰذا ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ برے ظالم لوگ ہیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں بہت ہی خوبصورت انداز میں نکاح، طلاق اور خلع کی شرعی حکمتیں بیان فرمائی ہیں، انہیں ملاحظہ فرمائیں، نکاح کی ایک حیثیت تو ایک باہمی معاملے اور معاہدے کی ہے جیسے بیع وشراء اور لین دین کے معاملات ہوتے ہیں دوسری حیثیت ایک سنت اور عبادت کی ہے اس پر تو تمام امت کا اتفاق ہے کہ نکاح عام معاملات معاہدات سے بالاتر ایک حیثیت شرعی عبادت وسنت کی رکھتا ہے اسی لئے نکاح کے منعقد ہونے کے لئے باجماع امت کچھ ایسی شرائط ضروری ہیں جو عام معاملات بیع وشراء میں نہیں ہوتیں۔

اول تو یہ کہ ہر عورت سے اور ہر مرد سے نکاح نہیں ہو سکتا اس میں شریعت کا ایک مستقل قانون ہے جس کے تحت بہت سی عورتوں اور مردوں کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا۔ دوسرے تمام معاملات ومعاہدات کے منعقد اور مکمل ہونے کے لئے کوئی گواہی شرط نہیں، گواہی کی ضرورت اس وقت پڑتی

ہے جب فریقین میں اختلاف ہو جائے لیکن نکاح ایسا معاملہ نہیں یہاں اس کے منعقد ہونے کیلئے بھی گواہوں کا سامنے ہونا شرط ہے اگر دو مرد و عورت بغیر گواہوں کے آپس میں نکاح کر لیں اور دونوں میں کوئی فریق کبھی اختلاف و انکار بھی نہ کرے اس وقت بھی شرعاً وہ نکاح باطل کالعدم ہے جب تک گواہوں کے سامنے دونوں کا ایجاب و قبول نہ ہو اور سنت یہ ہے کہ نکاح اعلان عام کے ساتھ کیا جائے اسی طرح کی اور بہت سی شرائط اور آداب ہیں جو معاملہ نکاح کے لئے ضروری یا مسنون ہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور بہت سے دوسرے حضرات ائمہ کے نزدیک تو نکاح میں معاملہ اور معاہدہ کی حیثیت سے زیادہ عبادت و سنت کی حیثیت غالب ہے اور قرآن و سنت کے شواہد اس پر قائم ہیں۔ (معارف القرآن)

طلاق کی شرعی حیثیت

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نکاح کی اجمالی حقیقت معلوم کرنے کے بعد طلاق کو سمجھئے، طلاق کا حاصل نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ختم کرنا ہے جس طرح شریعت اسلام نے نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ایک عبادت کی حیثیت دے کر عام معاملات و معاہدات کی سطح سے بلند رکھا ہے اور بہت سی پابندیاں اس پر لگائی ہیں اسی طرح اس معاملہ کا ختم کرنا بھی عام لین دین کے معاملات کی طرح آزاد نہیں رکھا کہ جب چاہے جس طرح چاہے اس معاملہ کو فسخ کر دے اور دوسرے سے معاملہ کر لے بلکہ اس کے لئے ایک خاص حکیمانہ قانون بنایا ہے جس کا بیان آیات مذکورہ میں کیا گیا ہے۔

اسلامی تعلیمات کا اصل رخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لئے ہو اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ اس معاملہ کے انقطاع کا اثر صرف فریقین پر نہیں پڑتا نسل و اولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں میں فساد تک کی نوبت پہونچتی ہے اور پورا معاشرہ بری طرح اس سے متاثر ہوتا ہے اسی لئے جو اسباب اور وجوہ اس معاملہ کو توڑنے کا

سبب بن سکتے ہیں قرآن وسنت کی تعلیمات میں ان تمام اسباب کو راہ سے ہٹانے کا پورا انتظام کیا ہے، زوجین کے ہر معاملے اور ہر حال کے لئے جو ہدایتیں قرآن وسنت میں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے ٹوٹنے نہ پائے ناموافقت کی صورت میں اول افہام وتفہیم کی پھر زجر وتنبیہ کی ہدایتیں دی گئیں۔

اور اگر بات بڑھ جائے اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان ہی کے چند افراد کو حکم اور ثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی آیت حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا (۳۵: ۴) میں خاندان ہی کے افراد کو ثالث بنانے کا ارشاد کس قدر حکیمانہ ہے کہ اگر معاملہ خاندان سے باہر گیا تو بات بڑھ جانے اور دلوں میں زیادہ بعد پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

لیکن بعض اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ اصلاح حال کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں اور تعلق نکاح کے مطلوبہ ثمرات حاصل ہونے کے بجائے طرفین کا آپس میں مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے ایسی حالت میں اس ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی طرفین کے لئے راحت اور سلامتی کی راہ ہو جاتی ہے اس لئے شریعت اسلام نے بعض دوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کیا کہ رشتہ ازدواج ہر حال میں ناقابل فسخ ہی رہے بلکہ طلاق اور فسخ نکاح کا قانون بنایا طلاق کا اختیار تو صرف مرد کو دیا جس میں عادۃً فکر وتدبر اور تحمل کا مادہ عورت سے زائد ہوتا ہے عورت کے ہاتھ میں یہ آزاد اختیار نہیں دیا تاکہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہو جانا جو عورت میں بہ نسبت مرد کے زیادہ ہے وہ طلاق کا سبب نہ بن جائے۔

لیکن عورت کو بھی بالکل اس حق سے محروم نہیں رکھا وہ شوہر کے ظلم وستم سہنے ہی پر مجبور ہو جائے اس کو یہ حق دیا کہ حاکم شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے اور شکایات کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کرا سکے یا طلاق حاصل کر سکے پھر مرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار تو دے دیا مگر اول تو یہ کہہ دیا کہ اس اختیار کا استعمال کرنا اللہ کے نزدیک بہت مبغوض ومکروہ ہے صرف مجبوری کی حالت میں

اجازت ہے حدیث میں ارشاد نبوی ہے، اَبْغَضُ الحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ: یعنی حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔

دوسری پابندی یہ لگائی کہ حالت غیظ وغضب میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اختیار کو استعمال نہ کریں اسی حکمت کے ماتحت حالت حیض میں طلاق دینے کو ممنوع قرار دیا اور حالت طہر میں بھی جس طہر میں صحبت وہمبستری ہو چکی ہے اس میں طلاق دینے کو اس بناء پر ممنوع قرار دیا کہ اس کی وجہ سے عورت کی عدت طویل ہو جائے گی اس کو تکلیف ہو گی ان دونوں چیزوں کے لئے قرآن کریم کا ارشاد یہ آیا: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (۱: ۶۵) یعنی طلاق دینا ہو تو ایسے وقت میں دو جس میں بلا وجہ عورت کی عدت طویل نہ ہو حیض کی حالت میں طلاق ہوئی تو موجودہ حیض عدت میں شمار نہ ہو گا اس کے بعد طہر اور پھر طہر کے بعد حیض سے عدت شمار ہو گی اور جس طہر میں ہمبستری ہو چکی ہے اس میں یہ امکان ہے کہ حمل رہ گیا ہو تو عدت وضع حمل تک طویل ہو جائے گی طلاق دینے کے لئے مذکورہ وقت طہر کا مقرر کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ اس انتظار کے وقفہ میں بہت ممکن ہے کہ غصہ فرو ہو معافی تلافی ہو کر طلاق کا ارادہ ہی ختم ہو جائے۔

تیسری پابندی یہ لگائی کہ معاہدہ نکاح توڑنے اور فسخ کرنے کا طریقہ بھی وہ نہیں رکھا جو عام بیع وشراء کے معاملات ومعاہدات کا ہے کہ ایک مرتبہ معاہدہ فسخ کر دیا تو اسی وقت اسی منٹ میں فریقین آزاد ہو گئے اور پہلا معاملہ بالکل ختم ہو گیا ہر ایک کو اختیار ہو گیا کہ دوسرے سے معاہدہ کرلے بلکہ معاملہ نکاح کو قطع کرنے کے لئے اول تو اس کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے پھر اس پر عدت کی پابندی لگادی کہ عدت پوری ہونے تک معاملہ نکاح کے بہت سے اثرات باقی رہیں گے عورت کو دوسرا نکاح حلال نہ ہو گا مرد کے لئے بھی بعض پابندیاں باقی رہیں گی۔

چوتھی پابندی یہ لگائی کہ اگر صاف وصریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دی گئی ہے تو طلاق دیتے ہی نکاح نہیں ٹوٹا بلکہ رشتہ ازدواج عدت پوری ہونے تک قائم ہے دورانِ عدت میں اگر یہ اپنی طلاق

سے رجوع کرلے تو نکاح سابق بحال ہو جائے گا، لیکن یہ رجوع کرنے کا اختیار صرف ایک یا دو طلاق تک محدود کر دیا گیا تا کہ کوئی ظالم شوہر ایسا نہ کر سکے کہ ہمیشہ طلاق دیتا رہے پھر رجوع کر کے اپنی قید میں رکھتا رہے اس لئے حکم یہ دے دیا کہ اگر کسی نے تیسری طلاق بھی دے دی تو اب اس کو رجوع کرنے کا بھی اختیار نہیں بلکہ اگر دونوں راضی ہو کر آپس میں دوبارہ بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر ایک مخصوص صورت کے جس کا ذکر آگے آتا ہے دوبارہ نکاح بھی آپس میں حلال نہیں۔ (معارف ا)

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ، فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ: ابتدا میں مردوں کو اختیار تھا کہ وہ جتنی جی چاہے طلاقیں دے دیتے، وہ بعد میں رجوع کر سکتے تھے، لیکن اب اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ مقرر فرما دیا، ماضی میں عورتوں پر ظلم ہوتا تھا ان کی حق تلفی ہوتی تھی اور ان کو ایذا پہنچانے کے لیے بار بار طلاق دی جاتی تھی، پھر رجوع کیا جاتا تھا، اب ضابطہ بتلا دیا گیا کہ اب دو طلاق کے بعد تو رجوع کر سکتے ہو، لیکن تیسری طلاق کے بعد رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے، اب اگر کسی اور جگہ عورت کی شادی ہو جاتی ہے اور اتفاقاً دوسرا شوہر بھی طلاق دے دیتا ہے یا خدانخواستہ فوت ہو جاتا ہے تو عدت گزار کر وہ عورت پہلے شوہر کے نکاح میں عقد ثانی سے آسکتی ہے۔ (تفسیر محمود)

شیخ الحدیث مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس طلاق کے بعد رجعت ہو سکتی ہے وہ دو مرتبہ ہے پھر دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد تم کو دو اختیار ہیں یا تو دستور اور حسن اسلوب کے ساتھ روک لو یعنی رجعت کر کے اس کو اپنے نکاح میں رہنے دو اور یا حسن اسلوب کے ساتھ اس کو چھوڑ دو کہ اس کی عدت گذر جائے اور جہاں چاہے وہ نکاح کرلے تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالو۔ (معارف)

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ (تا) اَلظّٰلِمُوْن: اگر بیوی سے خلع کی نوبت آئے تو اس کو حسن سلوک اور خوبصورتی کے ساتھ رخصت کرو یعنی مہر وغیرہ جو کچھ اس کو دے چکے ہو وہ اس سے واپس نہ لو، دیئے ہوئے کو واپس لینا تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کے خلاف ہے چنانچہ فرماتے ہیں اور تمہارے لیے یہ حلال نہیں کہ بیبیوں سے چھوڑنے کے وقت ان سے

اس مال میں سے کوئی شے واپس لو جو تم ان کو نکاح کی حالت میں دے چکے ہو، مگر جب کہ میاں بیوی دونوں کو یہ خوف ہوا کہ ہم اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے یعنی آپس میں حقوق زوجیت نہ ادا کر سکیں گے تو ایسی صورت میں اگر مرد عورت سے کچھ مال لے کر اس کو چھوڑ دے اور عورت مال دے کر اپنے آپ کو اس کے نکاح سے چھڑا لے تو کوئی گناہ نہیں شریعت کی اصطلاح میں اس کو خلع کہتے ہیں سو اگر تم کو اندیشہ ہو کہ میاں اور بیوی باہمی منافرت اور کدورت کے باعث حقوق زوجیت کے بارے میں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں کہ عورت کچھ فدیہ دے کر نکاح سے اپنا پیچھا چھڑا سکے تاکہ دونوں گناہ سے بچ جائیں۔

ایسی صورت میں عورت کے لیے مال کا دینا اور مرد کے لیے مال کا لینا جائز ہے بشرطیکہ مہر سے زیادہ نہ ہو یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں پس ان سے آگے نہ بڑھنا اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ سراسر ظالم ہیں اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

شان نزول: حبیبہ بنت سہل انصاریہ رضی اللہ عنہا حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن صبح کی نماز کیلئے اندھیرے اندھیرے نکلے تو دیکھا کہ دروازے پر حضرت حبیبہ رضی اللہ عنہا کھڑی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کون ہے؟ کہا میں حبیبہ بنت سہل ہوں، فرمایا کیا بات ہے؟ کہا یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ثابت بن قیس کے گھر میں نہیں رہ سکتی یا وہ نہیں یا میں نہیں، آپ سن کر خاموش رہے۔ جب ثابت رضی اللہ عنہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری بیوی صاحبہ کچھ کہہ رہی ہیں، حضرت حبیبہؓ نے کہا یارسول اللہ! میرے خاوند نے مجھے جو کچھ دیا ہے وہ سب میرے پاس ہے اور میں اسے واپس کرنے پر تیار ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو فرمایا سب لے لو، چنانچہ انہوں نے لے لیا اور حضرت حبیبہؓ آزاد ہو گئیں۔ (مؤطا امام مالک، تفسیر ابن کثیر)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے انہیں مارا تھا اور اس مار سے کوئی ہڈی ٹوٹ گئی

تھی، حضور ﷺ نے جب انہیں یہ فرمایا اس وقت انہوں نے دریافت کیا کہ کیا میں یہ مال لے سکتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایاہاں، کہامیں نے اسے دو باغ دیئے ہیں، یہ سب واپس دلوا دیجئے۔ وہ مہر کے دونوں باغ واپس کئے گئے اور جدائی ہو گئی۔ (ابن جریر، ابن کثیر)

ایک روایت میں ہے کہ حبیبہؓ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مَا أَعْتِبُ عَلَيْهِ فِي خُلُقٍ وَلَا دِينٍ، وَلَكِنْ أَكْرَهُ الْكُفْرَ فِي الْإِسْلَامِ میں اس کے اخلاق اور دین میں عیب گیری نہیں کرتی لیکن میں اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں چنانچہ مال لے کر حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے طلاق دے دی۔ (تفسیر ابن کثیر، نسائی)

بعض روایات میں ان کا نام جمیلہ بنت سلول بھی آیا ہے، بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ مجھے اب غصہ برداشت کرنے کی طاقت نہیں رہی، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو دیا ہے لے لو، زیادہ نہ لینا، ایک روایت میں ہے کہ حضرت حبیبہؓ نے فرمایا تھا وہ صورت کے اعتبار سے بھی کچھ حسین نہیں، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ إِنَّ أَوَّلَ خُلْعٍ كَانَ فِي الْإِسْلَامِ فِي أُخْتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أُبَيٍّ اور سب سے پہلا عبداللہ بن ابی کی بہن کا خلع تھا جو اسلام میں ہوا۔

ایک وجہ یہ بھی بیان کی تھی کہ یارسول اللہ! إِنِّي رفعتُ جَانِبَ الْخِبَاءِ، فَرَأَيْتُهُ أَقْبَلَ فِي عِدَّةٍ، فَإِذَا هُوَ أَشَدُّهُمْ سَوَادًا، وَأَقْصَرُهُمْ قَامَةً وَأَقْبَحُهُمْ وَجْهًا میں نے ایک مرتبہ خیمے کے پردہ کو جو اٹھایا تو دیکھا کہ میرے خاوند چند آدمیوں کے ساتھ آرہے ہیں، ان تمام میں یہ سیاہ فام چھوٹے قد والے اور بدصورت تھے، حبیبہ کے خاوند نے عرض کی یارسول اللہ! إِنِّي قَدْ أَعْطَيْتُهَا أَفْضَلَ مَالِي، حَدِيقَةً لِي، فَإِنْ رَدَّتْ عليَّ حَدِيقَتِي میں نے اسے اپنے مال میں سے بہترین مال دیا جو کہ میرا باغ تھا، کیا وہ میرا باغ واپس کرے گی؟ نبی کریم ﷺ نے حبیبہ سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ جی ہاں! اگر آپ فرمائیں تو میں اس سے زیادہ بھی واپس کر سکتی ہوں اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کے درمیان جدائی کروادی تھی۔ (ابن کثیر، ابن جریر)

ابن ماجہ کی روایت کے مطابق حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ خوبصورت بھی نہیں تھے اور ان کا قد بھی چھوٹا تھا، جس پر ان کی بیوی حبیبہ بنت سہل انصاریہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ!

وَاللّٰهِ لَوْلَا مَخَافَةُ اللّٰهِ إِذَا دَخَلَ عَلَيَّ بَصَقْتُ فِي وَجْهِهِ! فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَتَرُدِّينَ عَلَيْهِ حَدِيقَتَهُ؟ قَالَتْ: نَعَمْ. فَرَدَّتْ عَلَيْهِ حَدِيقَتَهُ. قَالَ فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اگر مجھے اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہوتا تو جب یہ میرے پاس آتا تو اس وقت میں اس کے منہ پر تھوک دیتی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تو اس کا باغ واپس کر دے گی؟ حبیبہ نے عرض کیا کہ جی ہاں! چنانچہ حبیبہ نے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کا باغ انہیں واپس کر دیا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان جدائی کروادی۔

خلع لینے کی مذمت

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ وَأَمَّا إِذَا تَشَاقَقَ الزَّوْجَانِ، وَلَمْ تَقُمِ الْمَرْأَةُ بِحُقُوقِ الرَّجُلِ وَأَبْغَضَتْهُ وَلَمْ تَقْدِرْ عَلَى مُعَاشَرَتِهِ، فَلَهَا أَنْ تَفْتَدِيَ مِنْهُ بِمَا أَعْطَاهَا، وَلَا حَرَجَ عَلَيْهَا فِي بَذْلِهَا، وَلَا عَلَيْهِ فِي قَبُولِ ذَلِكَ مِنْهَا

اور جب میاں بیوی میں نااتفاقی بڑھ جائے عورت اس سے خوش نہ ہو اور اس کے حق کو نہ بجالاتی ہو ایسی صورت میں وہ کچھ لے دے کر اپنے خاوند سے طلاق حاصل کرلے تو اسے دینے میں اور اسے لینے میں کوئی گناہ نہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ اگر عورت بلاوجہ اپنے خاوند سے خلع طلب کرتی ہے تو وہ سخت گنہگار ہے چنانچہ ترمذی وغیرہ میں حدیث ہے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا طَلَاقَهَا مِنْ غَيْرِ بَأْسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ جو عورت اپنے خاوند سے بے سبب طلاق طلب کرے اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔ (ابن جریر، ترمذی)

حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اَلْمُخْتَلِعَاتُ هُنَّ الْمُنَافِقَاتُ خلع لینے والیاں منافق عورتیں ہیں۔(ابن کثیر) اگرچہ امام ترمذی نے اس سند کے ساتھ اس روایت کو غریب قرار دیا ہے، جس کی سند قوی نہیں ہے۔ایک اور روایت میں ہے کہ جو عورت بلاوجہ اپنے خاوند سے طلاق لے اسے جنت کی خوشبو بھی نصیب نہیں ہوگی حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی دوری سے آتی ہے۔(ابن کثیر)

ائمہ سلف وخلف کی ایک بڑی جماعت کا فرمان ہے کہ خلع صرف اسی صورت میں ہے کہ نافرمانی اور سرکشی عورت کی طرف سے ہو، اس وقت مرد فدیہ لے کر اس عورت کو الگ کر سکتا ہے جیسے قرآن پاک کی اس آیت میں ہے اس کے سوا کسی صورت میں یہ سب جائز نہیں، بلکہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں کہ اگر عورت کو تکلیف پہنچا کر اس کے حق میں کمی کر کے اسے مجبور کیا گیا اور اس سے کچھ مال واپس لیا گیا تو اس کا لوٹا دینا واجب ہے، امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حالت اختلاف میں جائز ہے تو حالت اتفاق میں بطور اولی جائز ٹھہرے گا۔

عدالتی یا جبری خلع: ہمارے ملک میں عائلی قوانین کے تحت جب کوئی عورت اپنی پریشانی میں عدالت سے رجوع کرتی ہے اور خلع کی بنیاد پر تفریق حاصل کرنا چاہتی ہے اور عدالت اس کے حق میں فیصلہ کرنا چاہتی ہے تو یہ حکم جاری کرتی ہے کہ خلع کی بنیاد پر نکاح فسخ کیا جاتا ہے جب کہ شوہر سے خلع پر رضا مندی بھی حاصل نہیں کی جاتی، خلع بیوی خاوند کے درمیان ایک معاہدہ ہے اور عدالت یک طرفہ طور پر جبری خلع نہیں کرا سکتی، اس سے نکاح ختم نہیں ہوتا اور عورت کا آگے کسی اور سے نکاح کرنا صحیح نہیں ہوتا۔

تیسری طلاق کے بعد کیا ہوگا؟

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ

يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۲۳۰)البقرہ

جواب ترجمہ: پھر اگر شوہر (تیسری) طلاق دیدے تو وہ (مطلقہ عورت) اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہو گی جب تک وہ کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرے، ہاں اگر وہ (دوسرا شوہر بھی) اسے طلاق دیدے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پاس (نیا نکاح کر کے) دوبارہ واپس آجائیں، بشرطیکہ انہیں یہ غالب گمان ہو کہ اب وہ اللہ کی حدود قائم رکھیں گے، اور یہ سب اللہ کی حدود ہیں جو وہ ان لوگوں کے لیے واضح کر رہا ہے جو سمجھ رکھتے ہوں۔

اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے بہت ہی عمدہ پیرائے میں تین طلاق کے مسئلہ کی وضاحت فرمائی ہے، جو ہمارے ہاں بڑا معرکۃ الآراء سمجھا جاتا ہے، جس پر مناظرے، مجادلے، مباحثے اور اشتعال انگیز تقاریر کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہتا ہے، مدارس اسلامیہ کے دارالافتاء میں بہت سے لوگ تین طلاقیں دینے کے بعد فتویٰ لینے کے لیے رجوع کرتے ہیں، حضرت مفتی رحمہ اللہ کی تحریر ملاحظہ فرمائیں

یہ مسئلہ ضمنی بیان فرمانے کے بعد پھر تیسری طلاق کا ذکر اس طرح فرمایا: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی (جو شرعاً پسندیدہ نہ تھی) تو اب نکاح کا معاملہ بالکلیہ ختم ہو گیا اس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا اور چونکہ اس نے شرعی حدود سے تجاوز کیا کہ بلاوجہ تیسری طلاق دے دی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عورت (عدت طلاق پوری کر کے) کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوق زوجیت ادا کر کے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دے دے (یا مر جائے) تو اس کی عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے آیت کے آخری جملے فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ کا یہی مطلب ہے۔ (معارف القرآن للمفتیؒ)

تین طلاق اور اس کے بعد احکام کی تفصیل

یہاں قرآن کریم کے اسلوب بیان پر غور کرنے سے یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک پہنچا جائے، تیسری طلاق تک نوبت پہونچانا مناسب نہیں الفاظ آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کے بعد تیسری طلاق کو حرف اِنْ کے ساتھ فَاِنْ طَلَّقَهَا فرمانے میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے ورنہ سیدھی تعبیر یہ تھی کہ اَلطَّلَاقُ ثَلٰثٌ کہا جاتا اس کو چھوڑ کر یہ تعبیر اختیار کرنے میں واضح اشارہ ہے کہ تیسری طلاق تک پہنچنا نہیں چاہیے یہی وجہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ اور بہت سے فقہاء نے تیسری طلاق کی اجازت ہی نہیں دی وہ اس کو طلاق بدعت کہتے ہیں، اور دوسرے فقہاء نے تین طلاق کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں ان فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بھی طلاق سنت کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے مگر اس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینا مسنون اور محبوب ہے بلکہ طلاق بدعت کے مقابلے میں اس کو طلاق سنت اس معنی سے کہہ دیا گیا کہ یہ صورت بھی بدعت میں داخل نہیں۔ (معارف القرآن)

قرآن وسنت کے ارشادات اور تعامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین سے عدد طلاق کے متعلق جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے تو طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ صرف ایک طلاق حالت طہر میں دے دے جس میں مجامعت نہ کی ہو اور یہ ایک طلاق دے کر چھوڑ دے عدت ختم ہونے کے ساتھ رشتہ نکاح خود ٹوٹ جائے گا اس کو فقہاء نے طلاق احسن کہا ہے، اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی کو طلاق کا بہتر طریق قرار دیا ہے۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم طلاق دینے میں اس کو پسند کرتے تھے کہ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دی جائے اور عدت طلاق تین حیض پورے ہونے دیئے جائیں تاکہ عورت آزاد ہو جائے۔

قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ سے اس کی بھی اجازت نکلتی ہے کہ دو طلاق تک دے دی جائیں مگر مَرَّتَانِ کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ دو طلاق بیک لفظ وبیک وقت نہ ہوں بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں الطَّلَاقُ طَلَاقَانِ سے بھی طلاق کی اجازت ثابت ہو سکتی تھی مگر مَرَّتٰنِ ایک ترتیب وتراخی کی طرف مشیر ہے جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں مثال سے یوں سمجھئے کہ کوئی شخص کسی کو دو روپیہ ایک دفعہ دے دے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہتے، الفاظ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہر میں دو طلاق دی جائیں۔ (روح المعانی)

بہر حال دو طلاقوں تک قرآن حکیم کے الفاظ سے ثابت ہے اس لئے باتفاق ائمہ وفقہاء یہ طلاق سنت میں داخل ہے یعنی بدعت نہیں، تیسری طلاق کے غیر مستحسن ہونے کی طرف تو خود اسلوب قرآن میں واضح اشارہ پایا جاتا ہے اس کے غیر مستحسن ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے ایک ارشاد سے تیسری طلاق کا مبغوض ومکروہ ہونا ثابت ہوتا ہے امام نسائی نے بروایت محمود بن لبید نقل کیا ہے

أُخْبِرَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثَ تَطْلِيقَاتٍ جَمِيعًا، فَقَامَ غَضْبَانًا ثُمَّ قَالَ: أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ؟ حَتّٰى قَامَ رَجُلٌ وَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَلَا أَقْتُلُهُ؟ رسول اللہ ﷺ کو ایک آدمی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں آپ غصہ ہو کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جاتا ہے حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں، اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا اے اللہ کے رسول کیا میں اس کو قتل نہ کر دوں؟ (نسائی کتاب الطلاق ص ۹۸ جلد ۲)

اس حدیث کی اسناد کو حافظ ابن قیم نے صحیح علیٰ شرط مسلم قرار دیا ہے (زاد المعاد) اور جوہر نقی میں علامہ ماوردی نے اس حدیث کی سند کو صحیح اور ابن کثیر نے اسناد جید، ابن حجر نے رواتہ موثقون فرمایا ہے۔ اسی بناء پر حضرت امام مالک رحمہ اللہ اور بعض دوسرے ائمہ فقہاء نے تیسری طلاق کو مطلقاً

ناجائز اور طلاق بدعت قرار دیا ہے دوسرے ائمہ نے تین طہروں میں تین طلاقوں کو اگرچہ طلاق سنت میں داخل کہہ کر طلاق بدعت سے نکال دیا ہے مگر اس کے غیر مستحسن ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت اسلام نے جو طلاق کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں درجوں کو عبور کرنا ضروری یا بہتر ہے بلکہ منشاء شریعت کا تو یہ ہے کہ اول تو طلاق پر اقدام ہی ایک مبغوض و مکروہ فعل ہے اگر بمجبوری اس اقدام کی نوبت آجائے تو اس کے کم سے کم درجے یعنی ایک طلاق پر اکتفاء کیا جائے اور عدت گذرنے دیں تو عدت ختم ہوتے ہی یہی ایک طلاق رشتہ زوجیت قطع کرنے کے لئے کافی ہو جائے گی اور عورت آزاد ہو کر دوسرے شخص سے نکاح کر سکے گی یہی طریقہ طلاق احسن کہلاتا ہے اس طریقہ میں یہ حکمت اور فائدہ بھی ہے کہ صریح الفاظ طلاق سے ایک طلاق دینے کی صورت میں طرفین کے لئے مصالحت کی راہیں کھلی رہیں گی عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے تو صرف طلاق سے رجوع کر لینا بقاء نکاح کے لئے کافی ہو گا اور عدت ختم ہو جانے کے بعد اگرچہ نکاح ٹوٹ چکے گا اور عورت آزاد ہو جائے گی مگر پھر بھی یہ گنجائش باقی رہے گی کہ اگر دونوں میں اب مصالحت ہو جائے اور باہم نکاح کرنا چاہیں تو نکاح جدید اسی وقت ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص اس طلاق احسن کے طریقے پر اکتفاء نہ کرے دوران عدت میں مزید ایک طلاق صریح اور صاف لفظوں میں دیدے تو اس نے قطع نکاح کے دو درجے طے کر لئے جس کی ضرورت نہ تھی اور ایسا کرنا شرعاً پسندیدہ بھی نہ تھا مگر بہر حال دو درجے طے ہو گئے مگر ان دو درجوں کے طے ہو جانے تک بھی بات وہیں رہی کہ دوران عدت میں رجعت کا اختیار باقی ہے اور عدت ختم ہو جانے کے بعد بتراضی طرفین نکاح جدید ہو سکتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ دو طلاق تک پہنچنے میں شوہر نے اپنے اختیارات کی ایک کڑی اور توڑ ڈالی اور اس سرحد پر پہنچ گیا کہ اگر اب ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے تو معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ جس شخص نے یہ دو درجے طلاق کے طے کر لئے

اس کے لئے آگے یہ ہدایت دی گئی فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ اس میں فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ کے لفظوں میں دو حکم بتلائے گئے اول یہ کہ عدت کے دوران رجعت کرلینا نکاح جدید کا محتاج نہیں بلکہ صرف امساک یعنی طلاق سے رجعت کرکے روک لینا کافی ہے اگر ایسا کرلیا تو سابق نکاح ہی کی بنیاد پر تعلق زوجیت بحال ہو جائے گا۔

دوسرے اس میں شوہر کو یہ ہدایت دی گئی کہ اگر اس کا ارادہ اصلاح حال اور صلح و صفائی کے ساتھ زندگی گذارنے کا ہے تب تو رجعت پر اقدام کرے ورنہ چھوڑ دے کہ عدت گذر کر تعلق زوجیت ختم ہو جائے ایسا نہ ہو کہ بغیر ارادہ اصلاح کے محض عورت کو پریشان کرنے کے لئے رجعت کرے۔

اس کے بالمقابل اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ فرمایا تسریح کے معنے کھول دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں اس سے اشارہ کر دیا کہ قطع تعلق کے لئے کسی مزید طلاق یا دوسرے کسی عمل کی ضرورت نہیں بغیر رجعت کے عدت ختم ہو جانا ہی تعلقات زوجیت ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔

امام حدیث ابو داؤد رحمہ اللہ نے بروایت ابو رزین اسدی رحمہ اللہ نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول پر ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فرمایا تیسری طلاق کا یہاں کیوں ذکر نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ جو بعد میں مذکور ہے وہی تیسری طلاق ہے، (روح المعانی) مطلب اس کا جمہور علماء کے نزدیک یہ ہے کہ جو کام تعلقات زوجیت کے کلی انقطاع کا تیسری طلاق سے ہوتا وہی کام اس طرز عمل سے ہو جائے گا کہ عدت کے اندر رجعت نہ کرے اور جس طرح فَاِمْسَاكٌ کے ساتھ بِمَعْرُوْفٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت فرمادی کی رجعت کرکے بیوی کو روکا جائے تو حسن سلوک کے ساتھ روکا جائے اسی طرح تَسْرِيْحٌ کے ساتھ بِاِحْسَانٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت دے دی کہ طلاق ایک معاملہ کا فسخ ہے شریف انسان کا کام یہ ہے کہ جس طرح معاملہ اور معاہدہ خوش دلی اور حسن سلوک کے ساتھ کیا جاتا ہے اسی طرح اگر فسخ معاہدہ کی ضرورت پیش

آجائے تو اس کو بھی غصہ یا لڑائی جھگڑے کے ساتھ نہ کریں بلکہ وہ بھی احسان و سلوک کے ساتھ کریں کہ رخصت کے وقت مطلقہ بیوی کو کچھ تحفہ کپڑے وغیرہ دے کر رخصت کریں جس کا ذکر قرآن کریم کی دوسری آیت میں ہے مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (۲۳۶: ۲) یعنی مطلقہ بیوی کو کچھ جوڑا کپڑے کا دے کر رخصت کریں مالی حیثیت کے مطابق اور اگر اس نے اس پر بھی ایسا نہ کیا بلکہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب اس نے اپنے سارے اختیارات شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کر کے بلاوجہ اور بلاضرورت ختم کر دیئے تو اب اس کی سزا یہ ہے کہ نہ رجعت ہو سکے اور نہ بغیر دوسری شادی کے آپس میں نکاح ہو سکے۔

اگر کسی نے غیر مستحسن یا غیر مشروع طریقہ سے تین طلاق دے دی تو اس کا اثر کیا ہو گا؟ اس کا جواب عقلی اور عرفی طور پر تو یہی ہے کہ کسی فعل کا جرم و گناہ اس کے مؤثر ہونے میں کہیں بھی مانع نہیں ہوتا قتل ناحق جرم و گناہ ہے مگر جس کو گولی یا تلوار مار کر قتل کیا گیا ہے وہ تو قتل ہو ہی جاتا ہے اس کی موت تو اس کا انتظار نہیں کرتی کہ یہ گولی جائز طریقہ سے ماری گئی ہے یا ناجائز طریقہ سے، چوری کرنا باتفاق مذاہب جرم و گناہ ہے مگر جو مال اس طرح غائب کر دیا گیا وہ تو ہاتھ سے نکل ہی جاتا ہے اسی طرح تمام معاصی اور جرائم کا یہی حال ہے کہ ان کا جرم و گناہ ہونا ان کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں ہوتا۔

اس اصول کا مقتضیٰ یہی ہے کہ شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرنا اور بلاوجہ اپنے سارے اختیارات طلاق کو ختم کر کے تین طلاق تک پہنچنا اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی ناراضی کا سبب ہوا اور اسی لئے جمہور امت کے نزدیک یہ فعل غیر مستحسن اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے مگر ان سب باتوں کے باوجود جب کسی نے ایسا اقدام کر لیا تو اس کا وہی اثر ہونا چاہیے جو جائز طلاق کا ہوتا یعنی تین طلاق واقع ہو جائیں اور رجعت ہی کا اختیار نہیں نکاح جدید کا اختیار بھی سلب ہو جائے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ اس پر شاہد ہے کہ اظہار غضب کے باوجود آپ نے تینوں طلاقوں کو نافذ فرمایا جس کے

بہت سے واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں۔

محمود بن لبید کی روایت جو بحوالہ نسائی اوپر لکھی گئی ہے اس میں تین طلاقیں بیک وقت دینے پر انتہائی ناراضگی کا اظہار تو منقول ہے یہاں تک کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس شخص کو مستوجب قتل سمجھا مگر یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کی طلاق کو ایک رجعی قرار دے کر بیوی اس کے حوالے کر دی ہو، بلکہ دوسری روایت جو آگے آتی ہے جس طرح اس میں اس کی تصریح موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر رضی اللہ عنہ کی بیک وقت تین طلاق کو باوجود ناراضی کے نافذ فرمادیا اسی طرح مذکورہ حدیث محمود بن لبید کے متعلق قاضی ابو بکر بن عربی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر رضی اللہ عنہ کی تین طلاقوں کی طرح اس کی بھی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا ان کے الفاظ یہ ہیں: فَلَم يَرُدَّهُ النَّبِي (صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ) بَل اَمضَاهُ كَمَا فِي حَدِيثِ عُوَيمَرِ العَجلَانِي فِي اللِّعَانِ حَيثُ اَمضَى طَلَاقَه الثَّلَاث وَلَم يَرُدَّهُ (تہذیب سنن ابی داؤد طبع مصر ص ۱۲۹ جلد ۳) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رد نہیں کیا بلکہ اسے نافذ فرمادیا جیسا کہ عویمر عجلانی کی لعان والی حدیث میں ہے کہ آپ نے ان کی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا اور رد نہیں کیا تھا۔

دوسری حدیث صدیقہ عائشہ کی صحیح بخاری میں بالفاظ ذیل ہے: أَنَّ رَجُلًا طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثًا، فَتَزَوَّجَتْ فَطَلَّقَ، فَسُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَتَحِلُّ لِلْأَوَّلِ؟ قَالَ: لاَ، حَتَّى يَذُوقَ عُسَيْلَتَهَا كَمَا ذَاقَ الأَوَّلُ (صحیح بخاری ص ۷۹۱ ج ۲)

ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اس عورت نے دوسری جگہ نکاح کیا تو اس دوسرے شوہر نے بھی اسے طلاق دے دی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے ہم بستری کر کے لطف اندوز نہ ہو جائے جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا، اس وقت تک طلاق دینے سے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہو گی۔

الفاظ روایت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ تینوں طلاق بیک وقت دی گئی تھیں شروح حدیث فتح الباری عمدۃ

قسطلانی وغیرہ میں روایت کا مفہوم یہی قرار دیا گیا ہے کہ بیک وقت تین طلاق دی تھیں اور حدیث میں یہ فیصلہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان تین طلاق کو نافذ قرار دے کر حکم دیا کہ جب تک شوہر ثانی سے ہمبستری اور صحبت نہ ہو جائے تو اس کے طلاق دینے سے شوہر اول کے لئے حلال نہیں ہو گی۔

تیسری روایت حضرت عویمر عجلانی کی ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا اور اس کے بعد عرض کیا: فَلَمَّا فَرَغَا، قَالَ عُوَيْمِرٌ: كَذَبْتُ عَلَيْهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنْ أَمْسَكْتُهَا، فَطَلَّقَهَا ثَلَاثًا، قَبْلَ أَنْ يَأْمُرَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (صحیح بخاری مع فتح الباری ص ۳۰۱ ج ۹ صحیح مسلم ص ۲۸۹ ج ۱) پس جب وہ دونوں لعان سے فارغ ہو گئے تو عویمر نے کہا اے اللہ کے رسول میں اس پر جھوٹ بولنے والا ہوں گا اگر میں نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا، تو عویمر نے اس کو تین طلاقیں دے دیں قبل اس کے رسول اللہ ﷺ انہیں حکم دیتے۔

اور ابو ذر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کو بروایت حضرت سہل بن سعد نقل کر کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

فَأَنْفَذَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَكَانَ مَا صُنِعَ عِنْدَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم سُنَّةٌ، قَالَ سَهْلٌ: حَضَرْتُ هَذَا عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَمَضَتِ السُّنَّةُ بَعْدُ فِي الْمُتَلَاعِنَيْنِ أَنْ يُفَرَّقَ بَيْنَهُمَا ثُمَّ لَا يَجْتَمِعَانِ أَبَدًا (ابو داؤد ص ۳۰۲)

تو رسول اللہ ﷺ نے اسے نافذ فرما دیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے جو کچھ پیش آیا وہ سنت قرار پایا، سعد فرماتے ہیں اس موقع پر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھا پس اس کے بعد لعان کرنے والوں کے بارے میں یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ ان کے درمیان تفریق کر دی جائے اور پھر وہ کبھی بھی جمع نہ ہوں۔

اس حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عویمر کی بیک وقت تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ فرمایا ہے اور محمود بن لبید کی سابقہ روایت میں بھی ابو بکر ابن عربی کی روایت کے مطابق تین طلاقوں کو نافذ کرنے کا ذکر موجود ہے اور بالفرض یہ بھی نہ

ہوتا یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کو ایک طلاق رجعی قرار دے کر بیوی اس کے سپرد کر دی ہو۔ الحاصل مذکورہ تینوں احادیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ اگرچہ تین طلاق بیک وقت رسول اللہ ﷺ کے نزدیک سخت ناراضی کا موجب تھیں مگر بہر حال اثر ان کا یہی ہوا کہ تینوں طلاقیں واقع قرار دی گیئں۔ (معارف القرآن)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ اور اس پر اشکال و جواب: مذکور الصدر تحریر سے یہ ثابت ہوا کہ بیک وقت تین طلاق کو تین قرار دینا خود رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ تھا مگر یہاں ایک اشکال حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ سے پیدا ہوتا ہے جو صحیح مسلم اور اکثر کتب حدیث میں منقول ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ، طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً، فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: إِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرٍ قَدْ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَنَاةٌ، فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ، فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کا یہ طریقہ تھا کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ میں جس میں ان کے لئے مہلت تھی تو مناسب رہے گا ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں تو آپ نے ان پر نافذ کر دیا۔ (صحیح مسلم)

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ اعلان فقہاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے صحابہ و تابعین کے مجمع عام میں ہوا کسی سے اس پر انکار یا تردد منقول نہیں اسی لئے حافظ حدیث امام ابن عبد البر مالکی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے زرقانی شرح مؤطاء میں یہ الفاظ ہیں: وَالْجُمْهُورُ عَلَى وُقُوعِ الثَّلَاثِ بَلْ حَكَى ابْنُ عَبْدُ الْبَرِ الْإِجْمَاعَ قَائِلًا إِنَّ خِلَافَهُ لَا يُلْتَفَتُ إِلَيْهِ (زرقانی شرح مؤطاء ص ۱۶۷ ج ۳) اور جمہور

امت تین طلاقوں کے واقع ہونے پر متفق ہیں بلکہ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کر کے فرمایا کہ اس کا خلاف شاذ ہے جس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔

اور شیخ الاسلام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں فرمایا: فَخَاطَبَ عُمَرُ بِذَلِكَ النَّاسَ جَمِيعاً وَفِيهِم اَصحَابُ رَسُولِ اللهِ (صلى الله عليه وآله وسلم) الَّذِينَ قَد عَلِمُوا مَا تَقَدَّمَ مِن ذَلِكَ فِي زَمَنِ رَسُولِ اللهِ (صلى الله عليه وآله وسلم) فَلَم يُنكِر عَلَيهِ مِنهُم مُنكِرٌ وَلَم يَدفَعهُ دَافِعٌ (شرح معانی الآثار ص ۲۹ ج ۲)

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ لوگوں کو مخاطب فرمایا اور ان لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی تھے جن کو اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے کا علم تھا تو ان میں سے کسی انکار کرنے والے نے انکار نہیں کیا اور کسی رد کرنے والے نے اسے رد نہیں کیا۔ مذکورہ واقعہ میں اگرچہ امت کے لئے عمل کی راہ باجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین مقرر ہو گئی کہ تین طلاقیں بیک وقت دینا اگرچہ غیر مستحسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہے مگر اس کے باوجود جس نے اس غلطی کا ارتکاب کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی اور بغیر دوسرے شخص سے نکاح و طلاق کے اس کے لئے حلال نہ ہو گی۔

لیکن علمی اور نظری طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں اول تو یہ کہ سابقہ تحریر میں متعدد روایات حدیث کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینے والے پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کو نافذ فرمایا ہے اس کو رجعت یا نکاح جدید کی اجازت نہیں دی پھر اس واقعہ میں حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس کلام کا کیا مطلب ہو گا کہ عہد رسالت میں اور عہد صدیقی میں اور دو سال تک عہد فاروقی میں تین طلاق کو ایک ہی مانا جاتا تھا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تین طلاق کا فیصلہ فرمایا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ اسی طرح تسلیم کر لیا جائے کہ عہد رسالت عہد صدیقی میں تین طلاق کو ایک مانا جاتا تھا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کو کیسے بدل دیا اور بالفرض

ان سے کوئی غلطی بھی ہو گئی تھی تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو کیسے تسلیم کر لیا؟

ان دونوں سوالوں کے حضرات فقہاء و محدثین نے مختلف جوابات دیئے ہیں ان میں صاف اور بے تکلف جواب وہ ہے جس کو امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں اصح کہہ کر نقل کیا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان اور اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع طلاق ثلاث کی ایک خاص صورت کے متعلق قرار دیا جائے وہ یہ کہ کوئی شخص تین مرتبہ تجھ کو طلاق، تجھ کو طلاق، تجھ کو طلاق، کہے یا میں نے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی کہے۔

یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے معنی میں دو احتمال ہوتے ہیں ایک یہ کہ کہنے والے نے تین طلاق دینے کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہوں دوسرے یہ کہ تین مرتبہ محض تاکید کے لئے مکرر کہا ہو تین طلاق کی نیت نہ ہو اور یہ ظاہر ہے کہ نیت کا علم کہنے والے ہی کے اقرار سے ہو سکتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صدق و دیانت عام اور غالب تھی اگر ایسے الفاظ کہنے کے بعد کسی نے یہ بیان کیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی بلکہ محض تاکید کے لئے یہ الفاظ مکرر بولے تھے تو آپ اس کے حلفی بیان کی تصدیق فرما دیتے اور اس کو ایک ہی طلاق قرار دیتے تھے۔

اس کی تصدیق حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو لفظ البتہ کے ساتھ طلاق دے دی تھی یہ لفظ عرب کے عرف عام میں تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا مگر تین اس کا مفہوم صریح نہیں تھا اور حضرت رکانہ نے کہا کہ میری نیت تو اس لفظ سے تین طلاق کی نہیں تھی بلکہ ایک طلاق دینے کا قصد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قسم دی انہوں نے اس پر حلف کر لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی طلاق قرار دیدی۔ یہ حدیث ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ، دارمی میں مختلف سندوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے بعض الفاظ میں یہ بھی ہے کہ حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی تھی مگر ابو داؤد نے ترجیح اس کو دی ہے کہ دراصل رکانہ نے لفظ البتہ سے طلاق دی تھی یہ لفظ چونکہ عام طور پر تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا اس کے کسی راوی نے اس کو

تین طلاق سے تعبیر کر دیا ہے۔

بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہے کہ حضرت رکانہ کی طلاق کو رسول اللہ ﷺ نے ایک اس وقت قرار دیا جب کہ انہوں نے حلف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے ورنہ پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید ان میں آپ نے حلفی بیان پر ایک قرار دے دیا کیونکہ زمانہ صدق دیانت کا تھا اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار گھٹ رہا ہے اور آئندہ حدیث کی پیشگوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہو گئی کہ تین مرتبہ الفاظ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں اور بیوی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی فراست اور انتظام دین میں دور بینی کو سبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے درست سمجھ کر اتفاق کیا یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کے مزاج شناس تھے انہوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ ﷺ موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب دلوں کی مخفی نیت اور صاحب معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے اس لئے قانون یہ بنا دیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مذکور الصدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں انہوں نے فرمایا۔ إِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرٍ قَدْ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَنَاةٌ، فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ، فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ میں جس میں ان کے لئے مہلت تھی تو مناسب رہے گا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں۔

حضرت اعظم رضی اللہ عنہ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے اور اس سے ان دونوں سوالوں کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہدِ رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرار طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالت میں بھی تین ہی قرار دی جاتی تھی ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا اقرار نہ ہو بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔ اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تھا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے معاذ اللہ آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف کا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔ اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے والحمد للہ۔ (معارف)

حلالہ کیا ہوتا ہے؟: شریعت اسلامیہ میں طلاق دینا ناپسندیدہ عمل ہے، شریعت طلاق دینے کے خلاف ہے، جب شریعت طلاق دینے کے خلاف ہے تو شریعت تین طلاقیں دینے کی اجازت کیسی دے سکتی ہے؟ پھر شریعت میں ایک ہی مجلس میں ایک ہی کلمہ سے تین طلاقیں دینے سے تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص عدت گزرنے سے پہلے مختلف اوقات میں تین طلاقیں دے دے یا ہر پاکی کے زمانے میں ایک طلاق دیا کرے تو اس طرح سے تین طلاقیں ہو جاتی

ہیں، تین طلاقوں کے بعد رجوع کا حق نہیں رہتا بلکہ باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح بھی نہیں ہو سکتا، تین طلاق پانے والی عورت اس طلاق دینے والے شوہر کے نکاح میں دوبارہ اسی صورت میں جا سکتی ہے کہ عدت گزار کر کسی دوسرے مسلمان سے اس کا نکاح ہو، پھر وہ اس سے میاں بیوی والا کام کرنے کے بعد طلاق دے دے یا مر جائے اس کے بعد عدت گزار کر پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے، اسے حلالہ کہا جاتا ہے۔ (ملخص تحفۃ المسلمین ص ۶۳۷)

حلالہ کے بعد نکاح: قرآن کریم کی اس آیت سے یہ بات سمجھ آئی ہے کہ جب خاوند نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں تو اس کے بعد اس کے ساتھ اس وقت تک دوبارہ نکاح نہیں ہو سکتا جب تک یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کر لے، تین طلاق دینے کو شریعت میں پسند نہیں کیا گیا، تین طلاقیں دینا بہتر نہیں ہے، ہاں اگر کوئی ایسی صورت بن جائے کہ بیوی میاں دونوں کا آپس میں کسی صورت میں نباہ نہ ہو سکے تو عورت کو طہر (پاکی کے زمانے میں) میں ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، اگر پچھتاوا ہو تو عدت کے اندر اندر رجوع کر لے، اگر عدت کے اندر رجوع نہ کیا تو یہ رجعی طلاق بائن ہو جائے گی، اس کے بعد اگر خیال آئے تو آپس میں باہمی رضامندی سے دوبارہ نئے مہر پر نکاح کر لیں، اس طرح کرنے سے کوئی دقت اور مصیبت پیش نہیں آئے گی۔

لیکن اس کے برخلاف لوگ یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں، ایک ہی زبان میں اور ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیتے ہیں، اس طرح کرنے سے شرعاً تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور رجوع کا راستہ بالکل ختم ہو جاتا ہے، تین طلاقوں کے بعد آپس میں حلالہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہو سکتا، اس لیے مرد کو چاہیے کہ کسی مسلمان عورت سے نکاح کر لے جس سے نباہ ہو سکے اور عورت کسی دوسرے مسلمان سے نکاح کر لے جس کے ساتھ اس کا گزارا ہو سکے۔

جب تین طلاقیں ملنے والی عورت نے عدت گزار کر کسی دوسرے مرد سے نکاح کر لیا اور اس شوہر نے اس عورت کے ساتھ نکاح کے بعد ہمبستری کر لی، پھر طلاق دے دی یا فوت ہو گیا تو عدت

گزار کر پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے، قرآن کریم اس مقام پر اسی طرح کرنے کا حکم دے رہا ہے، اگرچہ قرآنی اسلوب بیان سے یہ بات سمجھ نہیں آرہی کہ قرآن کریم انہیں اس طرح حلالہ کرنے کی ترغیب دے رہا ہے، مگر وہ تین طلاقیں دینے کے بعد پچھتاوے میں ہیں، گھر اجاڑ چکے ہیں، پریشانیوں نے ان کے گرد ڈیرے ڈال دیے ہیں، اب چاہتے ہیں کہ اس غلطی کا ازالہ ہو جائے تو قرآن کریم اس کا حل پیش کرتا ہے کہ ان کے لیے پہلے والا دور دوبارہ کیسے آسکتا ہے۔

اگر خاوند نے بیوی کو تین طلاقیں دے دیں تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہ ہو گی جب تک اس کے علاوہ دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے، اگر دوسرے خاوند سے صرف نکاح ہو جائے اور وہ نکاح کر کے طلاق دے دے یا خاوند فوت ہو جائے تو پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں ہو گی، تین طلاقوں کے بعد پہلے خاوند کے لیے حلال ہونے کی یہ شرط ہے کہ دوسرا خاوند اس عورت سے ہمبستری اور جماع بھی کرے، اس کے بعد طلاق دے دے یا وفات پا جائے اور عدت بھی گزر جائے، اسی بات کی طرف نبی کریم ﷺ نے اشارہ دیا ہے، بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں حضرت رفاعہ قرظی کا واقعہ یہی واضح کرتا ہے، اس واقعہ میں نبی کریم ﷺ نے جس طرح کے الفاظ استعمال فرمائے ان سے یہی بات واضح ہوتی ہے، ان الفاظ سے ہی قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر ہوتی ہے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بخاری اور مسلم میں روایت ہے أَنَّ رِفَاعَةَ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ، فَتَزَوَّجَهَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الزَّبِيرِ القُرَظِيُّ، قَالَتْ عَائِشَةُ: وَعَلَيْهَا خِمَارٌ أَخْضَرُ، فَشَكَتْ إِلَيْهَا وَأَرَتْهَا خُضْرَةً بِجِلْدِهَا، فَلَمَّا جَاءَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَالنِّسَاءُ يَنْصُرُ بَعْضُهُنَّ بَعْضًا، قَالَتْ عَائِشَةُ: مَا رَأَيْتُ مِثْلَ مَا يَلْقَى المُؤْمِنَاتُ؟ لَجِلْدُهَا أَشَدُّ خُضْرَةً مِنْ ثَوْبِهَا. قَالَ: وَسَمِعَ أَنَّهَا قَدْ أَتَتْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَجَاءَ وَمَعَهُ ابْنَانِ لَهُ مِنْ غَيْرِهَا، قَالَتْ: وَاللَّهِ مَا لِي إِلَيْهِ مِنْ ذَنْبٍ، إِلَّا أَنَّ مَا مَعَهُ لَيْسَ بِأَغْنَى عَنِّي مِنْ هَذِهِ، وَأَخَذَتْ هُدْبَةً مِنْ ثَوْبِهَا، فَقَالَ: كَذَبَتْ وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي لَأَنْفُضُهَا نَفْضَ الأَدِيمِ، وَلَكِنَّهَا نَاشِزٌ،

تُرِيدُ رِفَاعَةَ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَإِنْ كَانَ ذٰلِكِ لَمْ تَحِلِّي لَهُ، أَوْ: لَمْ تَصْلُحِي لَهُ حَتّٰى يَذُوقَ مِنْ عُسَيْلَتِكِ قَالَ: وَأَبْصَرَ مَعَهُ ابْنَيْنِ لَهُ، فَقَالَ: بَنُوكَ هٰؤُلَاءِ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: هٰذَا الَّذِي تَزْعُمِينَ مَا تَزْعُمِينَ، فَوَاللّٰهِ لَهُمْ أَشْبَهُ بِهِ مِنَ الْغُرَابِ بِالْغُرَابِ (بخاری)

حضرت رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی، پھر ان سے عبد الرحمٰن بن زبیر قرظی رضی اللہ عنہ نے نکاح کر لیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ وہ خاتون سبز اوڑھنی اوڑھے ہوئے تھیں، انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے (اپنے شوہر کی) شکایت کی اور اپنے جسم پر سبز نشانات (چوٹ کے) دکھائے پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو (جیسا کہ عادت ہے عورتیں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں) عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کسی ایمان والی عورت کا میں نے اس سے زیادہ برا حال نہیں دیکھا ان کا جسم ان کے کپڑے سے بھی زیادہ سبز ہو گیا ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ ان کے شوہر نے بھی سن لیا تھا کہ (ان کی) بیوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئی ہے چنانچہ وہ بھی آ گئے اور ان کے ساتھ ان کے دو بچے ان سے پہلی بیوی کے تھے، ان کی بیوی نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے ان سے کوئی اور شکایت نہیں البتہ ان کے ساتھ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جس سے میرا کچھ نہیں ہوتا۔ انہوں نے اپنے کپڑے کا پلو پکڑ کر اشارہ کیا (یعنی ان کے شوہر جنسی لحاظ سے کمزور ہیں، عضو تناسل میں طاقت نہیں ہے) اس پر ان کے شوہر نے کہا: وَاللّٰهِ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنِّي لَأَنْفُضُهَا نَفْضَ الْأَدِيمِ یا رسول اللہ! واللہ یہ جھوٹ بولتی ہے، میں تو اس کو (جماع کے وقت) چمڑے کی طرح ادھیڑ کر رکھ دیتا ہوں، مگر یہ نافرمان ہے، یہ مجھے پسند نہیں کرتی اور رفاعہ قرظی کے پاس دوبارہ جانا چاہتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو تمہارے لیے وہ (رفاعہ) اس وقت تک حلال نہیں ہو گا جب تک یہ (عبد الرحمٰن دوسرے شوہر) تمہارا مزا نہ چکھ لیں۔ راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد الرحمٰن کے ساتھ دو بچے بھی دیکھے تو دریافت فرمایا کیا یہ تمہارے بچے ہیں؟ انہوں نے

عرض کیا جی ہاں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اچھا، اس وجہ سے تم یہ باتیں سوچتی ہو۔ اللہ کی قسم یہ بچے ان سے اتنے ہی مشابہ ہیں جتنا کہ کوا کوے سے مشابہ ہوتا ہے۔

بخاری شریف میں ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت ہے جس میں اس عورت نے اپنے خاوند کی شکایت کرتے ہوئے ان کی مردانہ کمزوری کی طرف اس طرح اشارہ کیا کہ اپنے دوپٹے کو حرکت دی اور کہا کہ وہ اس طرح ہے، جس پر نبی کریم ﷺ مسکراتے ہوئے ہنس دیے، یہ وہ موقع تھا جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں موجود تھے۔

اتنے میں حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ حجرے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے، انہیں ابھی اندر آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی، انہوں نے دروازے کے قریب سے ہی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو متوجہ کیا کہ یہ عورت کس طرح حضور ﷺ کے سامنے اونچا بول رہی ہے، اسے ڈانٹتے کیوں نہیں؟ اس روایت میں بھی نبی کریم ﷺ نے رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ کی بیوی سے فرمایا کہ حَتّٰى تَذُوقِي عُسَيْلَتَهُ، وَيَذُوقَ عُسَيْلَتَكِ جب تک تو اس نئے خاوند سے لطف اٹھانہ لے اور وہ تجھ سے لطف اٹھانہ لے تب تک تو رفاعہ کے پاس دوبارہ نہیں جاسکتی۔ (بخاری، باب التبسم والضحک)

یہاں نبی کریم ﷺ نے جو الفاظ استعمال فرمائے ان پر غور فرمایئے حَتّٰى تَذُوقِي عُسَيْلَتَهُ وَيَذُوقَ عُسَيْلَتَكِ یہاں دونوں مقام پر تصغیر استعمال ہوئی ہے، بخاری و مسلم دونوں میں یہ روایت موجود ہے، دونوں میں عسیلہ تصغیر ہے، عسیلہ یہ عسل کی تصغیر ہے، عسل مؤنث ہے جب کہ لغت کے اعتبار سے مذکر ہے، علامہ ازھری فرماتے ہیں کہ عسل مذکر اور مؤنث دونوں طور پر استعمال ہوتا ہے، یہ بھی ہے کہ جب عرب کسی چیز کو کریدتے ہیں تو اس میں ھاء تانیث کی داخل کرتے ہیں، اسی سے وہ تحقیر کے لیے درھم کی تصغیر دریھمات بناتے ہیں، اسی طرح ھند کی تصغیر ھنیدہ ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ وطی کا اعتبار کرتے ہوئے عسل کی تصغیر عسیلہ ہے، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے عورت کا پہلے خاوند کے لیے حلال ہونے کے لیے اتنی ہی وطی (ہم بستری) کافی ہے، بعض یہ کہتے

ہیں کہ عسیلہ سے مراد عسل کا ٹکڑا ہے جس سے تقلیل کی طرف اشارہ ہے یعنی اس قدر ہم بستری بھی اس کے لیے پہلے خاوند کے لیے حلال ہونے کے لیے کافی ہے۔

علامہ ازھری کہتے ہیں کہ درست بات یہ ہے کہ عسیلہ کا معنٰی ہے جماع کی لذت جو صرف حشفہ کے شرم گاہ میں چھپ جانے سے حاصل ہوتی ہے اور اسے مؤنث بنانے کی وجہ عسل کے ٹکڑے کے ساتھ تشبیہ کی وجہ سے ہے۔ علامہ داؤدی فرماتے ہیں کہ عسیلہ کو تصغیر بنانے کی وجہ عسل کے ساتھ اس کی سخت ترین مشابہت کی وجہ سے ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے عسیلہ کا معنٰی نطفہ ہے، حضرت حسن بصری بھی یہی کہتے ہیں۔ جمہور علماء کہتے ہیں ذوق العسیلہ جماع سے کنایہ ہے اور وہ مرد کے حشفہ کا عورت کی شرم گاہ میں چھپ جانا ہے، جب کہ حضرت حسن بصری تو اس کا معنٰی قطرہ منی کا شرم گاہ میں ٹپکنا بھی مراد لیتے ہیں، لیکن یہ ان کی اپنی اکیلی اور تنہا رائے ہے۔

فقہاء کرام تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ مرد کے حشفہ کا اس قدر فرج میں چھپ جانا مقصود ہے جس سے کسی پر حد واجب ہوتی ہے، جس سے کامل مہر لازم آتا ہے، جس سے حج فاسد ہو جاتا ہے، جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، جب کہ ابو عبید کہتے ہیں عسیلہ لذت جماع کو کہا جاتا ہے، کیونکہ عرب جس چیز سے لذت حاصل کرتے ہیں اسے عسل کہہ دیا کرتے ہیں، ابن منذر کہتے ہیں کہ علماء کرام کا اس پر اجماع ہے کہ جماع پہلے خاوند کے لیے حلال ہونے کے لیے شرط ہے، علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اور علامہ ابن حجر عسقلانی نے بخاری کی شرح فتح الباری میں اس مقام پر کافی وضاحت کی ہے۔

قرآن و سنت کی روشن تعلیمات میں تیسری طلاق ملنے کے بعد کی ساری صورتحال واضح کر دی گئی ہے، جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیتا ہے تو پھر وہ مختلف دارالافتاؤں اور مفتیان کرام کے دروازے پر دستک دیتا ہے کہ وہ اس کی تسلی کرا دیں کہ اب اگلا قدم کیا اور کس طرح اٹھانا ہے؟ کیونکہ اپنے طور پر اب دونوں کے پاس نکاح کرنے کا کوئی راستہ نہیں بچا، سوائے اس بات کے کہ عورت دوسرے مرد سے نکاح کرے، اب یہ عورت پہلے خاوند کے حکم یا اشارہ کی پابند نہیں رہتی کہ وہ

کہاں اور کس سے نکاح کرے، جب کہ یہاں مرد عورت کو راستہ بتاتا ہے کہ تو فلاں مرد سے نکاح کرلے، جب کہ عورت جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے، جتنے مہر پر چاہے کر سکتی ہے، اب اگر اس عورت نے کسی مرد سے نکاح کر لیا، اس نے اسے بعد میں طلاق بھی دے دی یا وہ فوت ہو گیا تب بھی عورت کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ پہلے خاوند سے نکاح کرے۔

فرض کیجیے کہ اگر ایک عورت عدت گزارنے کے بعد کسی اور شخص سے نکاح کرلے پھر حلالہ کی شرطیں پوری کرنے کے بعد پہلے خاوند سے نکاح کرنے پر راضی ہو جائے تو تب بھی یہ جائز نہیں ہے کہ کسی شخص سے یہ عہد و پیمان کیا جائے کہ تم اس عورت سے نکاح کرلو اور حلالہ کی شرط پوری کر کے چھوڑ دینا تاکہ پہلے خاوند سے نکاح ہو سکے، ایسا معاملہ اور ایسا عہد و پیمان شریعت اسلامیہ میں ممنوع ہے، اس طرح حلال کرنے والے اور حلالہ کروانے والے پر نبی کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

مُحَلِّل وہ ہے جو حلال کر کے دے یعنی جو اس شرط کو منظور کرلے کہ وہ حلالہ کی شرط پوری کر کے چھوڑ دے گا اور مُحَلَّلٌ لَہٗ وہ ہے جس نے تین طلاقیں دی تھیں یعنی پہلا خاوند جو یہ شرط لگا کر کسی سے اپنی طلاق دی ہوئی بیوی کا نکاح کراتا ہے کہ تم اس کو ایک دورات رکھ کر چھوڑ دینا، ایسا کرنے والے دونوں لوگوں پر نبی کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، اس لیے حلالہ کی شرط پر نکاح کرنا اور کرانا گناہ ہے، لیکن اگر اس طرح کی شرط لگا کر کسی نے نکاح کرا دیا اور حلالہ کی شرطیں پوری ہو گئیں تو پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے گی، یعنی وہ اس سے نکاح کر سکے گا جو عورت کی رضامندی سے ہو گا۔

مطلقات کے بارے احکامات

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۳۱)البقرہ

جواب ترجمہ: اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو پھر وہ اپنی عدت گزر جانے کے قریب پہنچ جائیں تو ان کو روک لو بھلائی کے ساتھ یا ان کو چھوڑ دو خوبی کے ساتھ اور ضرر پہنچانے کے لیے انہیں روک کر کے نہ رکھو تاکہ تم زیادتی کرو، اور جو شخص ایسا کرے گا سو اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور مت بناؤ اللہ کی آیتوں کو مذاق کی چیز اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں، اور جو کچھ اللہ نے تم پر نازل فرمایا ہے کتاب اور حکمت اس کو بھی یاد کرو۔ اللہ اس کے ذریعہ تم کو نصیحت فرماتا ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بیشک ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا تھا پھر اس کی عدت گزرنے سے پہلے اس سے رجوع کر لیتا تھا پھر اس کو طلاق دے دیتا تھا پھر رجوع کر لیتا تھا اور وہ اس طرح اس کو تکلیف دینے اور دوسرے کسی مرد سے نکاح سے روکنے کے لئے ایسا کرتا تھا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (تفسیر در منثور)

یہ آیت انصار قبیلہ کے ایک آدمی ثابت بن یسار رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئے، اس نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور جب اس کی عدت گزرنے میں دو یا تین دن رہ جاتے تو اس سے رجوع کر کے پھر طلاق دیدیتا، وہ ایسا کرتا رہا یہاں تک کہ اس کو تکلیف دیتے ہوئے نو ماہ گزر گئے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی۔ (در منثور)

فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ: اس میں بَلَغْنَ کا معنی قَارَبْنَ ہے یعنی جب وہ اپنی عدت پوری کرنے کے قریب ہو جائیں، اس پر علماء کا اجماع ہے، کیونکہ معنی اس کا محتاج ہے کیونکہ عدت مکمل ہونے کے بعد اسے روکنے کا کوئی اختیار نہیں ہے (المحرر الوجیز ج ۱) اور اس کے بعد والی آیت میں یہ لفظ انتہا کو پہنچنے کے معنی میں ہے، کیونکہ وہاں معنی اس کا تقاضا کرتا ہے، پس یہ لفظ دوسری آیت میں حقیقت ہے اور پہلی

میں مجاز ہے۔ (تفسیر قرطبی)

فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ: امساک بالمعروف کا معنی ان حقوق کے ساتھ قیام ہے جو عورت کی جانب سے مرد پر واجب ہوتے ہیں۔ اسی لئے علماء کی جماعت نے کہا ہے: بیشک اِمسَاك بالمَعرُوف میں سے ہے کہ خاوند جب وہ مال نہ پائے جسے وہ بیوی پر خرچ کرے گا تو وہ اسے طلاق دے دے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ معروف کی حد سے خارج ہو گیا، پھر اس کی جگہ حاکم طلاق دے دے گا اس ضرر اور اذیت کی وجہ سے جو عورت کو ایسی حالت میں اس کے پاس رہنے سے لاحق ہو رہی ہے، جس میں وہ اس کے نفقہ پر قادر نہیں اور بھوک ایسی شے ہے جس پر صبر نہیں۔ (قرطبی)

اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ: یعنی اسے چھوڑ دے تاکہ اس کی عدت گزر جائے، پھر اسے اپنے گھر سے اچھے طریقے سے نکالے، کوئی لڑائی جھگڑا، گالم گلوچ نہ کرے۔ انہیں معروف طریقے سے رخصت کر دو تا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح کر سکیں سرَح کا معنی چھوڑ دینا یا آزاد کر دینا ہے جانوروں کو جنگل میں چرنے کے لیے چھوڑ دینا تسریح کہلاتا ہے۔ اور جب جانور شام کے وقت جنگل سے واپس پلٹتے ہیں تو اس وقت تریح کا لفظ استعمال ہوتا ہے، حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تُسۡرِحُونَ یعنی جب تم جانوروں کو واپس پلٹاتے ہو اور جب انہیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو، کنگھی کرنے کو بھی تسریح کہتے ہیں، اس سے بالوں کی الجھن دور ہو جاتی ہے، بہر حال اگر علیحدگی کا حتمی فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر مطلقہ عورتوں کو بلاوجہ مت روکو بلکہ انہیں احسن طریقہ سے کچھ دے دلا کر رخصت کر دو، انہیں طعن تشنیع کا نشانہ نہ بناؤ، گالی گلوچ نہ کرو بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ علیحدہ کرو۔ (معالم العرفان)

وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا: اور انہیں تکلیف پہنچانے کی خاطر مت روکو یہ زیادتی کی بات ہے، عورتوں پر زیادتی مت کرو، اس طریقہ سے انہیں روکنا حرام ہے اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہے، اس سے بچ جاؤ، وَمَن يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ جو ایسا کرے گا فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ اس نے اپنی جان پر ظلم کیا اور اللہ تعالیٰ ظلم کو بالکل پسند نہیں کرتے، دوسری جگہ واضح طور پر آتا ہے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ ہاں اللہ تعالیٰ

بعض اوقات ظالموں کو مہلت دے دیتا ہے مگر بالآخر وہ گرفت میں آجاتے ہیں۔ (معالم العرفان)

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا: اللہ کی آیات کو اور اس کے احکام کو کھیل اور مذاق محل ٹھٹھانہ بناؤ، ایسا نہ کرو کہ جی چاہا عمل کیا چاہا نہ کیا اور احکام کی رعایت کا دھیان نہ رکھا، بلکہ آیات قرآنیہ میں جو احکام بیان کیے گئے ہیں ان کی پابندی کرو اور عزم وہمت وارادہ کے ساتھ عمل پیرا ہو۔ حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شخص کے بارے میں خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دیں، آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم غصہ میں کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ اللہ عزوجل کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جائے گا حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں، آپ کا غصہ دیکھ کر ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا میں اس شخص کو قتل نہ کردوں۔ (مشکوٰۃ)

اکٹھی تین طلاقیں دینا شرعاً مذموم ہے، ایک سے زیادہ طلاق دے تو الگ الگ کرکے دے اور ہر طہر میں (پاکی کے زمانے میں) ایک ایک طلاق دے، کیونکہ اس شخص نے اکٹھی تین طلاقیں دے دیں، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگواری ہوئی، موطا امام مالک میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دیں اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تیری بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں اور ستانوے طلاقوں کے ذریعہ تو نے اللہ کی آیات کا مذاق بنایا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸۲، انوار البیان)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس میں وہ تمام نعمتیں شامل ہیں جو بندے کو دین ودنیا کے اعتبار سے ملتی ہیں، نعمت اللہ میں عموم ہے، زبان سے اللہ کی حمد وثناء کرے، دل سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اقرار واعتراف کرے اور اعضاء جسمانی کو اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری میں لگائے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نعمت اللہ سے مراد اسلام لیتے ہیں اور اسلامی احکام لیتے ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ نعمت اللہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کو یاد کرو جو اس نے تمہارے پر کیے ہیں، اس نے تمہیں مرد بنایا ہے، تمہارے لیے عورتیں بنائی ہیں، ان عورتوں سے

تمہیں سکون میسر آتا ہے اس انعام کو یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ نے نکاح، طلاق اور رجوع تمہارے ہاتھ میں رکھا ہے، تمہارے اوپر اللہ نے کوئی اس طرح کی تنگی نہیں کی جس طرح پہلے لوگوں پر تنگی کی تھی، ان پہلے لوگوں کے لیے ایک ہی عورت حلال تھی انہیں عورت کے فوت ہو جانے کے بعد دوسری سے نکاح کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔

وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ: دنیوی نعمتوں کا بھی کوئی حساب وشمار نہیں ہے اور دینی نعمتوں سے بڑھ کر کون سی نعمتیں ہوں گی کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب جیسی نعمت عطا کی، اس الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور اس الحکمت سے مراد نبی کریم رؤوف ورحیم ﷺ کی سنت ہے، جو نبی کریم ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو سکھائی اور اس سنت پر انہیں گامزن کیا، بعض کہتے ہیں کہ حکمت سے مراد قرآنی مواعظ ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہمیں نصیحت فرماتے ہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرو، جن چیزوں کا اس نے حکم دیا ہے ان پر عمل کرو اور جن چیزوں سے اس نے روکا ہے ان سے رک جاؤ، ان کے قریب تک نہ جاؤ۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ کی اطاعت ونافرمانی میں جس جس چیز کو تم لوگ چھپاتے ہو اللہ تعالیٰ اسے بھی خوب جانتا ہے اور جو عمل نیکی اور بدی کا تم علی الاعلان کرتے ہو اللہ اسے بھی خوب جانتا ہے اس سے کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔

مطلقہ عورتوں کو شادی کرنے سے بلاوجہ شرعی نہ روکو

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۳۲) البقرہ

جواب ترجمہ: اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی ہو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو (اے میکے والو!) انہیں اس بات سے منع نہ کرو کہ وہ اپنے (پہلے) خاوندوں سے (دوبارہ) نکاح کریں، بشرطیکہ وہ بھلائی کے ساتھ ایک دوسرے سے راضی ہو گئے ہوں، ان باتوں کی نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی جارہی ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں، یہی تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ: اور جب تم عورتوں کو طلاق دیدو اور وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں (یعنی ان کی عدت پوری ہو جائے) تو تم انہیں نہ روکو) یعنی منع نہ کرو، عضل کے معنی منع کرنے کے ہیں اور اصلی معنی اس کے ضیق اور شدت کے ہیں (چنانچہ) الداء العضال عرب میں اس بیماری کو کہتے ہیں جس کا علاج نہ ہو سکے۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ دونوں کلاموں کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جگہ بلوغ کے الگ الگ معنی ہیں۔ (مظہری)

اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ: (اس سے کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کریں) اس کے مخاطب (عورت کے) اولیا (یعنی ورثاء ہیں یہ آیت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن جملاء بنت یسار کے بارے میں نازل ہوئی ہے بداح بن عاصم بن عجلان نے اسے طلاق دیدی تھی بخاری۔ ابو داؤد ترمذی وغیرہ نے معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں نے اپنی بہن کا نکاح ایک شخص سے کر دیا تھا پھر اس نے اسے طلاق دیدی اور جب اس کی عدت پوری ہو گئی تو وہ پھر پیغام لے کر آئے، میں نے اس سے یہ بات کہی کہ پہلے تو میں نے تم سے اس کا نکاح کر دیا تھا تمہارا گھر بسا دیا تھا، سب طرح تمہاری آبرو تھی لیکن تم نے اسے طلاق دیدی اور اب پھر پیغام لے کر آئے ہو، ایسا نہیں ہو سکتا خدا کی قسم! اب وہ تمہارے ہاں ہرگز نہیں جاسکتی اور وہ آدمی کچھ برا نہ تھا اور میری بہن بھی پھر اس کے ہاں جانا چاہتی تھی اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ أَنْ يَّنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ تب میں نے (حضور کی خدمت میں) عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اب میں ضرور کر دوں گا۔ چنانچہ پھر اسی سے نکاح

کر دیا۔(مظہری)

إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ: کا مطلب یہ ہے کہ دونوں راضی ہو جائیں مہر میں، گواہی میں، نکاح میں۔ ابن ابی شیبہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بغیر شوہر والی عورتوں کا نکاح کر دو ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان کے درمیان مہر کیا ہو گا تو انہوں نے فرمایا جس پر ان دونوں کے گھر والے راضی ہو جائیں۔(تفسیر در منثور)

ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ الخ: اس میں ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ فرمایا کہ اس حکم کے ماننے میں تمہاری بہت بڑی صفائی اور پاکیزگی ہے کیونکہ اس کی خلاف ورزی میں فتنہ فساد اور گناہوں میں مبتلا ہونے کے مواقع نکل سکتے ہیں اور مرد و عورت کی عفت بھی خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔(انوار البیان)

ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ: یعنی ان احکام کی پابندی تمہارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے اس میں اشارہ فرمایا گیا کہ ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ گناہوں کی غلاظت میں آلودگی اور فتنہ و فساد ہے کیونکہ عاقلہ بالغہ جوان لڑکیوں کو مطلقاً نکاح سے روکا گیا تو ایک طرف ان پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہے اور دوسری طرف ان کی عفت و عصمت کو خطرہ میں ڈالنا ہے تیسرے اگر خدانخواستہ وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں تو اس کا وبال ان لوگوں پر بھی عائد ہو گا جنہوں نے ان کو نکاح سے روکا اور وبال آخرت سے پہلے بہت ممکن ہے کہ ان مجبور عورتوں کا یہ ابتلاء خود مردوں میں جنگ و جدال اور قتل و قتال تک نوبت پہنچا دے جیسا کہ رات دن میں مشاہدہ میں آتا ہے اس صورت میں وبال آخرت سے پہلے ان کا عمل دنیا ہی میں وبال بن جائے گا اور اگر مطلقاً نکاح سے تو نہ روکا مگر ان کی پسند کے خلاف دوسرے شخص سے نکاح پر مجبور کیا گیا تو اس کا نتیجہ بھی دائمی مخالفت اور فتنہ و فساد یا طلاق و خلع ہو گا جس کے ناگوار اثرات ظاہر ہیں اس لئے فرمایا گیا کہ ان کو ان کے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکنا ہی تمہارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔(معارف القرآن للمفتیؒ)

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ ان دونوں کی ایک دوسرے سے کس قدر محبت ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری دنیوی اور اخروی مصلحتیں جانتے ہیں۔

بچوں کو دودھ پلانے کے احکام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲۳۳) البقرہ

جواب ترجمہ: اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں، یہ مدت ان کے لیے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہیں اور جس باپ کا وہ بچہ ہے اس پر واجب ہے کہ وہ معروف طریقے پر ان ماؤں کے کھانے اور لباس کا خرچ اٹھائے، (ہاں) کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی، نہ تو ماں کو اپنے بچے کی وجہ سے ستایا جائے، اور نہ باپ کو اپنے بچے کی وجہ سے اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے پھر اگر وہ دونوں (یعنی والدین) آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے (دو سال گزرنے سے پہلے ہی) دودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں بھی ان پر کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کو کسی انا سے دودھ پلواؤ تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جب کہ تم نے جو اجرت ٹھہرائی تھی وہ (دودھ پلانے والی انا کو) بھلے طریقے سے دے دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سارے کاموں کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ : اس آیت میں بچوں کو دودھ پلانے اور پلوانے کے بارے میں چند احکام مذکور ہیں۔ جب میاں بیوی خوشی کے ساتھ آپس میں مل جل کر رہ رہے ہوں اور اولاد پیدا ہو جائے تو چونکہ ماں اور باپ دونوں کو بچہ پر شفقت ہوتی ہے اور دونوں اس کی تربیت کرتے ہیں اور دکھ تکلیف سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے بچے ماں باپ کے سایہ میں خوب اچھی طرح پرورش پاتے ہیں اور ایسی صورت میں والدہ اس کے دودھ پلانے یا پرورش کرنے پر اس کے باپ سے کسی طرح کی اجرت بھی طلب نہیں کرتی۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بچے کی والدہ جب اپنے شوہر کے نکاح میں ہے اور بحق زوجیت کھانا کپڑا اسے مل رہا ہے تو اس کے لیے یہ درست نہیں کہ دودھ پلانے کے سلسلے میں کوئی اجرت طلب کرے اور بعض مرتبہ ایسا ہو جاتا ہے کہ شوہر طلاق دے دیتا ہے۔

اس میں اول تو یہ اختلاف رونما ہوتا ہے کہ بچہ کون لے، اصول یہ ہے کہ لڑکا جب تک سات برس کا نہ ہو جائے اور لڑکی نو سال کی نہ ہو جائے اس وقت تک والدہ کو پرورش کا حق ہے، لڑکا یا لڑکی کی پرورش کا حق مطلقہ عورت کو اس وقت تک ہے جب تک کہ کسی ایسے شخص سے نکاح نہ کر لے جو بچے کا محرم نہ ہو، والدہ کی پرورش میں بچہ کے رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بچہ کے اخراجات بھی والدہ ہی کے ذمہ ہوں بلکہ اخراجات بچے کے والد پر ہی واجب ہوں گے۔

جب کسی مرد نے کسی عورت کو طلاق دے دی اور ماں نے بچہ کو پرورش کے لیے لیا اور ابھی دودھ پلانے کا زمانہ باقی ہے تو جب تک عدت نہ گزر جائے اس وقت تک بچہ کو دودھ پلانے کی اجرت وہ نہیں لے سکتی کیونکہ اسے طلاق دینے والے شوہر کی طرف سے زمانہ عدت کا نان و نفقہ مل رہا ہے، دوہرا خرچہ نہیں دیا جائے گا اور جب عدت گزر جائے اور ابھی دودھ پلانے کا زمانہ باقی ہے تو اب بچہ کی ماں بچہ کے باپ سے دودھ پلانے کی اجرت لے سکتی ہے، بچہ کے دوسرے اخراجات اس کے سوا ہوں گے اور دودھ پلانے کی اجرت کا مطالبہ بچہ کی عمر دو سال (قمری مہینوں کے اعتبار سے) ہو جانے تک طلب

کیا جاسکتا ہے اس کے بعد بچہ کا باپ دودھ پلانے کی اجرت نہ دے تو دودھ پلانے والی والدہ دودھ پلانے کی اجرت طلب نہیں کر سکتی۔ (انوار البیان)

رضاعت: رضاعت کا لفظی معنی دودھ پلانا ہے، چونکہ بچہ مرد کا حق ہوتا ہے اور دودھ عورت پلاتی ہے، اس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ مرد وزن کی علیحدگی کی صورت میں بچے کی پرورش کیسے ہوگی، جب کہ اصولاً بچے کو مرد کی تحویل میں چلے جانا چاہیے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ یہ اس شخص کے لیے حکم ہے جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہتا ہے۔

علیحدگی کی صورت میں اپنی ماں کا دودھ پلانے میں خاص حکمت کارفرما ہے اگر بچہ اپنی ماں کی بجائے کسی دوسری عورت کا دودھ پیئے گا، تو وہ عورت اس کی رضاعی ماں بن جائے گی، نکاح کے متعلق رضاعی ماں کے بھی وہی احکام ہیں جو حقیقی ماں کے ہیں، لہٰذا جب بچہ نکاح کے قابل ہوگا تو جس طرح اس کا نکاح حقیقی ماں کی رشتہ داری کی وجہ سے بعض عورتوں سے حرام ہے، اسی طرح رضاعی ماں کی وجہ سے جو رشتہ دار بہن، چچی، بھتیجی، خالہ، بھانجی وغیرہ ہوں گے، ان سے بھی نکاح نہیں ہو سکے گا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ترغیب دی کہ طلاق کی صورت میں جہاں تک ممکن ہو مطلقہ عورت کا بچہ اپنی ماں کا دودھ پیئے۔ (معالم العرفان)

مدت رضاعت: رضاعت یعنی دودھ پلانے کی مدت کے متعلق فقہائے کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ جن فقہائے کرام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے، وہ رضاعت کی مدت دو سال بتاتے ہیں حولین کاملین مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ دو سال تین ماہ کے قائل ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ رضاعت کی انتہائی مدت اڑھائی سال ہے۔ وہ سورۃ احقاف کی آیت وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا یعنی حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ ہے جو کہ اڑھائی سال بنتے ہیں، امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جو دو سال کا ذکر آیا ہے تو یہ قانونی مدت رضاعت ہے، قانونی حیثیت سے دو سال تک

دودھ پلانا ضروری ہے تاہم زیادہ سے زیادہ مدت اڑھائی سال ہے، تاہم کسی کو دو سال سے زیادہ عرصہ کے لیے دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اخلاقی طور پر اگر ماں رضامند ہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن)

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: اس آیت کریمہ میں دودھ پلانے کا حکم سب سے پہلے حقیقی ماؤں کو دیا گیا وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ اور حقیقی ماں کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ عورت اپنے خاوند کے نکاح میں ہے، دودھ بھی ٹھیک ٹھاک ہے کوئی بیماری بھی لاحق نہیں تو ایسی حالت میں دودھ پلانا ماں پر واجب ہے اور اس کے خرچہ کی ذمہ داری باپ پر ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کو طلاق ہو چکی ہے مگر ابھی عدت میں ہے تو اس حالت میں بھی دودھ پلانے کی ذمہ داری ماں پر ہے، البتہ ماں اور بچے کا خرچہ مرد کے ذمے ہے، جب تک عدت ختم نہ ہو ہر قسم کا خرچہ خوراک، لباس، رہائش علاج وغیرہ سب آدمی کی ذمہ داری ہے۔

اب تیسری صورت یہ ہے کہ عورت کو طلاق ہو کر عدت ختم ہو چکی ہے تو اس حالت میں عورت کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے بچے کی پرورش کی ساری ذمہ داری اس کے باپ پر عائد ہوتی ہے اگر بچے کی حقیقی ماں دودھ پلانے پر رضامند ہو تو باپ کو چاہیے کہ اسے اولیت دے اور اس کا خرچہ معمول کے مطابق برداشت کرے ہاں اگر عورت معمول سے زیادہ خرچہ طلب کرے تو پھر اس کی خدمات حاصل کرنا ضروری نہیں، مرد کسی دوسری عورت کو اجرت دے کر بچے کو دودھ پلوا سکتا ہے۔

بعض اوقات حقیقی ماں کا دودھ کسی عارضہ کی وجہ سے مضر صحت ہوتا ہے، یا دودھ اتنا کم ہے کہ بچے کی پرورش ٹھیک طور سے نہیں ہو سکتی، تو ایسی صورت میں بھی باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ مناسب معاوضہ ادا کر کے کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائے۔

فرمایا وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ جب یہ طے ہو جائے کہ ماں ہی دودھ پلائے گی تو پھر ایسی ماؤں کی خوراک اور لباس کی ذمہ داری دستور کے مطابق بچے کے باپ پر ہو گی، عورت

خواہ مرد کے نکاح میں ہے یا مطلقہ ہو کر عدت گزار رہی ہے، اس کے اخراجات مرد برداشت کرے گا اور اگر عورت عدت پوری کر کے بالکل جدا ہو چکی ہے تو پھر اس کو اسی طرح اجرت دی جائیگی جس طرح کسی غیر عورت کو دی جاتی ہے اور یہ اجرت یا معاوضہ دستور کے مطابق معقول ہونا چاہیے، نہ کم نہ زیادہ۔ (معالم العرفان)

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا: کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جائے گی، مثلاً عورت کو کوئی عارضہ ہے اور دودھ پلانے کے قابل نہیں ہے یا دودھ پلانے سے اس کی صحت کو خطرہ ہے تو ایسی صورت میں اسے دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اسی طرح اگر مرد کی مالی حالت کمزور ہے تو اس کی حیثیت سے زیادہ اُجرت طلب نہیں کی جائے گی اسی لیے فرمایا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا والدہ کو اس کا اپنا بچہ ہونے کی بناء پر نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، چونکہ اس کو بچے سے محبت ہے اور اس کی ماں کا تقاضا ہے کہ اسے خود دودھ پلائے تو اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ماں کو کم اُجرت پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن للسواتیؒ)

وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ: اور نہ باپ کو محض اس وجہ سے تکلیف دی جائے گی کہ وہ بچے کا باپ ہونے کی وجہ سے اس کی پرورش کرنے پر مجبور ہے، مگر وہ اپنی حیثیت سے زیادہ اجرت نہیں دے سکتا، لہٰذا ماں کو اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بچے کے باپ کو تنگ نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ معاملہ افہام و تفہیم کے ذریعے دستور کے مطابق اور باپ کی مالی حالت کے پیش نظر طے کرنا چاہیے، اسلام میں یہ ایک عام قانون ہے کہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دینی چاہیے، اللہ تعالیٰ کا اپنا دستور بھی یہ ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفساً اِلَّا وُسعَهَا اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ (معالم العرفان)

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ: یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بچے کا باپ فوت ہو چکا ہو تو اس کی رضاعت کی ذمہ داری کس پر عائد ہو گی؟ فرمایا وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ جس طرح باپ بچے کی

پرورش کا ذمہ دار تھا اسی طرح اس کی عدم موجودگی میں وارث اس کی ذمہ داری قبول کرے گا، اب وارث سے کون سا وارث مراد ہے؟ اس ضمن میں مختلف اقوال ہیں وارث اگر بطور اسم جنس لیا جائے تو اس کے معنی تمام وارث ہوں گے، ہر وارث ترکہ سے جس قدر وراثت کا حق دار ہے اسی نسبت سے وہ یتیم بچے کی پرورش کا خرچ بھی برداشت کرے گا۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وارث سے مراد باپ کے وارث ہیں اور ان میں خود بچہ بھی شامل ہے، اس لحاظ سے بچے کی پرورش یعنی اس کی ماں کا نان نفقہ بچے کی جائیداد سے ادا کیا جائے گا، تفسیر روح البیان میں ہے کہ وارث سے مراد بچے کے وارث بھی ہوسکتے ہیں، یعنی اگر بچہ فوت ہو جائے تو اس کا ترکہ کن کن وارثوں کو پہنچتا ہے اس لحاظ سے جو وارث بنتے ہیں، وہی رشتہ دار بحساب حصہ رسدی وارثت بچے کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے، یعنی جس وارث کو بچے کی جائیداد سے آدھا حصہ مل سکتا ہے، وہ بچے کے نصف خرچہ کا ذمہ دار ہو گا اور جس کو ایک تہائی، چھٹا حصہ یا آٹھواں حصہ پہنچتا ہے، وہ اسی قدر بچے کا خرچہ برداشت کرنے کا ذمہ دار ہو گا، مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر بچے کی اپنی جائیداد نہ ہو تو پھر اس کے مالدار عزیزوں میں سے جو اس کے وارث اور محرم ہوں وہ اس کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔

محرم سے مراد یہ ہے کہ اگر بچے اور اس کے عزیزوں میں سے ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت فرض کر لیا جائے تو دونوں کا نکاح درست نہ ہو اس لحاظ سے بچے کی ماں پر بھی ذمہ داری آتی ہے مثلاً یتیم بچے کی ماں موجود ہے اور اس کا دادا بھی ہے تو وراثت کے حصہ رسدی کے مطابق بچے کی کفالت ایک تہائی ماں کے ذمہ اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہو گی، اس لحاظ سے بچے کے بھائی، چچا، تایا وغیرہ بھی بحیثیت وارث اور محرم اس کی پرورش کے ذمہ دار ہیں تفسیر روح البیان کے مطابق متوفی کے عصبات بھی ذمہ دار ہوسکتے ہیں، اس لحاظ سے بھی چچا، تایا، دادا وغیرہ کو یہ ذمہ داری قبول کرنا ہو گی۔

یہاں پر مطلق وارث کا لفظ استعمال کرنے میں یہ حکمت کار فرما ہے کہ حالات کے مطابق شرعی

عدالت یتیم بچے کی پرورش کی ذمہ داری کسی بھی وارث پر ڈال سکتی ہے تاہم عدالت کو یہ بات مد نظر رکھنا ہو گی کہ سب سے پہلے یہ ذمہ داری بچے کی اپنی جائیداد پر ڈالی جائے پھر بچے کے قریبی وارثوں پر اور پھر متوفی کے عصبات پر کیونکہ یہ مسلمہ اصول ہے کہ حق ادا کرنے کا حق بھی اسی پر عائد ہوتا ہے جو حق وصول کرنے کا حق رکھتا ہے، ایک صورت اور بھی ہو سکتی ہے کہ نہ تو بچے کی اپنی کوئی جائیداہو اور نہ اس کا کوئی وارث ہو، ایسی صورت میں بچے کی پرورش کی ذمہ داری حکومت وقت پر ہو گی، اگر دین سے بے بہرہ حکومت یہ ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ ہو تو پھر یہ ذمہ داری مسلمانوں کی عام جماعت کے سر پر ہے کیونکہ اگر مناسب دیکھ بھال کے بغیر بچہ ضائع ہو گیا تو مسلمانوں کی پوری جماعت عند اللہ ماخوذ ہو گی۔ (بیضاوی، روح البیان، بحوالہ معالم العرفان)

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا: یعنی اگر بچے کے ماں باپ دونوں آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے یہ ارادہ کریں کہ شیر خوارگی کی مدت یعنی دو سال سے کم میں ہی دودھ چھڑا دیں خواہ ماں کی معذوری کے سبب یا بچے کی کسی بیماری کے سبب تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں آپس کے مشورے اور رضامندی کی شرط اس لئے لگائی کہ دودھ چھڑانے میں بچے کی مصلحت پیش نظر ہونی چاہیے آپس کے لڑائی جھگڑے کا بچے کو تختہ مشق نہ بنائیں۔ (معارف القرآن)

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ: یعنی اگر تو یہ چاہو کہ اپنے بچوں کی کسی مصلحت سے ماں کی بجائے کسی انا کا دودھ پلواؤ تو اس میں بھی کچھ گناہ نہیں شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے والی کی جو اجرت مقرر کی گئی تھی وہ پوری پوری ادا کر دیں اور اگر اس کو مقررہ اجرت نہ دی گئی تو اس کا گناہ ان کے ذمہ رہے گا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے پر راضی ہے لیکن باپ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کا دودھ بچے کے لئے مضر ہے تو ایسی حالت میں اس کو حق ہے کہ ماں کو دودھ پلانے سے روک دے اور کسی انا سے پلوائے، اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جس عورت کو دودھ پلانے پر رکھا جائے اس سے معاملہ تنخواہ یا اجرت کا پوری صفائی کے ساتھ

طے کرلیا جائے کہ بعد میں جھگڑا نہ پڑے اور پھر وقت مقررہ پر یہ طے شدہ اجرت اس کو سپرد بھی کردے اس میں ٹال مٹول نہ کرے۔(معارف القرآن)

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ: اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو پوری طرح دیکھنے والا ہے، اس میں تنبیہ ہے کہ احکام شرعیہ کی پابندی کرو اور اللہ سے ڈرو، خلاف ورزی کرکے مواخذہ اور عذاب کے مستحق نہ بنو۔(انوارالبیان) یہ ہے وہ آخری ضمانت، پختہ گارنٹی اور یہی وہ آخری ضمانت ہے جو قابل اعتماد ہے۔(ظلال القرآن)

اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کھلے اور چھپے اور ظاہر وغائب کو پوری طرح دیکھ رہے ہیں اور وہ تمہارے دلوں کے مخفی ارادوں اور نیتوں سے باخبر ہیں اگر کسی فریق نے دودھ پلانے یا چھڑانے کے مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کی یا بچے کی مصلحت کو نظر انداز کرکے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو وہ مستحق سزا ہوگا۔(معارف القرآن)

جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت

سوال: اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجاً يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْراً فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ {۲۳۴}البقرۃ

جواب ترجمہ: اور جو تم میں سے مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو ان بیویوں کو چار مہینے دس دن تک اپنے نفس کو روکنا چاہیے پھر جب وہ اپنی مدت پوری کرلیں تو تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو وہ دستور کے مطابق اپنے حق میں کریں اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبر دار ہے۔

تین دن سے زیادہ کسی کے مرنے کا غم کرنا، سوگ منانا، سر میں تیل ڈالنا، کنگھی وغیرہ چھوڑنا درست نہیں ہے، بلکہ ایسا کرنا حرام ہے، لیکن بیوی اور خاوند کا رشتہ ایسا نازک اور پائیدار ہوتا ہے کہ اس کے فوت ہو جانے کی اتنی اہمیت ہے کہ عورت کئی ماہ تک غم کرسکتی ہے اور سوگ منا سکتی ہے،

شریعت میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کسی مسلمان عورت کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ افسوس کا اظہار کرے، لیکن اپنے خاوند کی موت پر وہ چار مہینے اور دس تک ایسا کر سکتی ہے۔ (بخاری)

عدت کا مطلب: خاوند کا رشتہ بیوی سے دو طرح سے ختم ہو جاتا ہے، ایک طلاق کی وجہ سے اور دوسرا فوت ہو جانے کی وجہ سے، قرآن کریم نے طلاق کی عدت الگ بیان کی اور خاوند کے فوت ہو جانے کی عدت الگ سے بیان کی، عدت کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو چکا ہے چار ماہ دس دن تک کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے، شادی شدہ عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار نہ کرے، گھر سے باہر بھی نہ جائے، گویا کہ اس مدت میں وہ ہر قسم کی دلچسپی اور شوقینی سے دور رہے۔

عدت کے احکامات: علماء کرام اور فقہاء عظام نے عدت کے بارے میں چند احکامات قرآن و سنت سے اخذ کر کے بیان فرمائے ہیں، ان کو ہمہ وقت ذہن میں رکھنا چاہیے، تاکہ شرعی حکم کی اس دوران میں خلاف ورزی نہ ہو سکے۔ ① جس عورت کا خاوند فوت ہو گیا ہو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ ② جس عورت کو طلاق بائن دی گئی ہو اس کی عدت تین حیض ہے۔ ③ عدت کے دوران ان عورتوں کو اس گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے جس میں ان کو طلاق ملی ہو یا جس میں ان کا خاوند فوت ہوا ہو، گھر سے باہر جانے کی صورت میں عدت کا خرچ نہیں ملے گا۔ (ہدایہ ج ۲ / ۴۱۸)

④ عدت کے دوران یہ عورتیں کسی دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتیں۔ ⑤ عدت کے دوران ان عورتوں کو زیبائش اور آرائش، بناؤ سنگھار سے پرہیز کرنا چاہیے، زیور نہیں پہن سکتیں، خوشبو نہیں لگا سکتیں، سر میں تیل نہیں ڈال سکتیں، کنگھی کر کے مانگ نہیں نکال سکتیں، سرمہ نہیں لگا سکتیں، پان نہیں کھا سکتیں، عمدہ اور شوخ لباس نہیں پہن سکتیں، یہ سب باتیں ان کے لیے حرام ہیں۔ (شرح الوقایہ ۲ / ۱۴۰) ہاں اگر سر میں جوئیں پڑ جائیں تو سر میں تیل ڈالنے اور کنگھی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہاں اس بات کا خیال رہے کہ خوشبو دار تیل نہ ڈالا جائے، پان نہ کھانے اور سرمہ نہ ڈالنے

کی صورت میں اگر دانت یا آنکھ میں درد محسوس کرے تو پان کھالینے اور سرمہ ڈالنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔(شرح الوقایہ ۲/ ۱۴۰)

⑥ کسی شدید ضرورت کے تحت عدت گزارنے والی گھر سے باہر جاسکتی ہے، لیکن نکاح کسی صورت میں عدت کے دوران دوسرے مرد سے نہیں کرسکتی۔(شرح وقایہ) ⑦ نہانے دھونے، بدن اور کپڑوں کو صاف ستھرا رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ⑧ سوگ کرنا بالغ عورت پر واجب ہے، نابالغ لڑکی پر واجب نہیں ہے، لیکن عدت کے پورے عرصے میں نہ تو نابالغ لڑکی کا نکاح کرنا چاہیے اور نہ ہی اسے گھر سے باہر جانے دینا چاہیے۔ ⑨ سوگ کا مطلب چیخنا، چلانا، چنگھاڑنا، نوحہ کرنا، ماتم کرنا، ماتمی لباس پہننا نہیں ہے، سینہ کوبی کرنا، سر میں خاک ڈالنا، گریبان چاک کرنا نہیں ہے، یہ سب وہ کام ہیں جو شریعت اسلامیہ میں حرام قرار دیے گئے ہیں۔

عدت کیوں گزاری جاتی ہے؟ عدت گزارنے کا حکم شریعت نے یونہی نہیں دیا، بلکہ اس کی وجہ سے کسی کو یہ چیز باور کرانا ہے کہ نکاح کا ٹوٹ جانا، کسی عورت کو طلاق ہو جانا کوئی معمولی کام نہیں ہے، یہ بڑی اہم بات ہے، دوسرا عدت اس لیے گزارنے کا حکم دیا گیا تاکہ پتا چل جائے کہ جس شخص نے اس عورت کو طلاق دی ہے اس سے یہ عورت حاملہ تو نہیں ہوئی، دو تین ماہ یہ بات معلوم کرنے کے لیے کافی ہیں، ہدایہ میں ہے کہ عدت اس لیے ضروری ہے تاکہ پتا چل جائے کہ اس کا رحم حمل سے خالی ہے، اس مدت میں یہ بات معلوم ہو جاتی ہے۔

مختلف عدتیں: جس عورت کو طلاق بائن یا مغلظہ مل چکی ہے، یا اس کا خاوند فوت ہو گیا ہے اور اسے اس خاوند سے حمل ہے تو اس حاملہ کی عدت وضع حمل ہے، یعنی جب تک بچہ بچی پیدا نہ ہو جائے یہ عورت دوسری جگہ نکاح نہیں کرسکتی، نہ یہ گھر چھوڑ کر ادھر ادھر جاسکتی ہے، اس کو بھی اس طرح سوگ کرنا چاہیے، قرآن کریم کی سورۃ الطلاق میں حاملہ عورت کی عدت وضع حمل بیان کی گئی ہے۔

اگر کوئی بدبخت عورت اور مرد زنا کرلیں، اس کے نتیجے میں عورت کو حمل ٹھہر جائے تو اگر ان

دونوں کا نکاح ہو تو حمل کی حالت میں بھی یہ دونوں نکاح کر سکتے ہیں، اس لیے کہ جب ان دونوں نے نکاح جیسی اہم قید کی پرواہ نہیں کی اور وہ کام کر بیٹھے جو نکاح کے بعد کرنا چاہیے، تو پھر ان کو جلد سے جلد نکاح کر لینے کی اجازت دے دینا ہی مناسب ہے، اس لیے کہ ایسے بے حیا جو نکاح کی قید توڑ سکتے ہیں وہ عدت کی پرواہ کب کریں گے، بلکہ مزید گناہ کریں گے، اس لیے انہیں جلد سے جلد گناہ سے بچانے کی یہی صورت ہے کہ عدت کی قید ان سے ہٹا کر جلد سے جلد ان کو گناہ سے بچا لیا جائے۔

بیوہ عورتوں کو صریح پیغام نکاح دینے کی ممانعت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (۲۳۵) البقرہ

جواب اور (عدت کے دوران) اگر تم ان عورتوں کو اشارے کنائے میں نکاح کا پیغام دو یا (ان سے نکاح کا ارادہ) دل میں چھپائے رکھو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے، اللہ جانتا ہے کہ تم ان (سے نکاح) کا خیال تو دل میں لاؤ گے، لیکن ان سے نکاح کا دو طرفہ وعدہ مت کرنا، الا یہ کہ مناسب طریقے سے کوئی بات کہہ دو اور نکاح کا عقد پکا کرنے کا اس وقت تک ارادہ بھی مت کرنا جب تک عدت کی مقررہ مدت اپنی میعاد کو نہ پہنچ جائے، اور یاد رکھو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے، لہٰذا اس سے ڈرتے رہو، اور یاد رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا بڑا بردبار ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ: جناح کا معنیٰ گناہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم عدت گزارنے والی عورتوں کو اشارے اور کنائے میں نکاح کا پیغام دو، مطلب یہ کہ صراحت کے بغیر نکاح کی چاہت کا اظہار کسی اچھے طریق پر عدت کے

اندر کرنے میں گناہ نہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تعریض کا معنیٰ یوں کرتے ہیں کہ یوں کہنا کہ میں نکاح کرنا چاہتا ہوں، میں ایسی ایسی عورت کو پسند کرتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ اللہ میرا جوڑا بھی ملا دے، انشاء اللہ میں تیرے سوا دوسری عورت سے نکاح کا ارادہ نہیں کروں گا، میں کسی نیک دیندار عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔

اسی طرح اس عورت سے جسے طلاق بائن مل چکی ہو عدت کے اندر ایسے مبہم الفاظ کہنا بھی جائز ہیں، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ بن قیس رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا جبکہ ان کے خاوند ابو عمرو بن حفص رضی اللہ عنہ نے انہیں آخری تیسری طلاق دے دی تھی کہ جب تم عدت ختم کرو تو مجھے خبر کر دینا، عدت کا زمانہ حضرت ابن مکتوم کے ہاں گزارو، جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عدت نکل جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح کرا دیا، ہاں رجعی طلاق کی عدت کے زمانہ میں بجز اس کے خاوند کے کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ اشارتاً کناتاً بھی اپنی رغبت ظاہر کرے۔ (ابن کثیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ یہ کہے: لَا تَسْبِقِينِي بِنَفْسِكِ تو اپنے بارے میں مجھ سے تجاوز نہ کرنا (جامع البیان) اور کوئی حرج نہیں کہ وہ اسے کوئی ہدیہ اور تحفہ دے اور یہ کہ عدت کے دوران اس کا کام کاج کر دے جب کہ وہ اس کی شان کے مطابق ہو، ابراہیم نے یہی کہا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اپنی مدح اور تعریف کرے اور وہ اپنے پسندیدہ افعال اور خاندانی شرافت کا ذکر کرے جس میں اشارۃ شادی کا تذکرہ بھی ہو۔

مفسر قرآن ابن عطیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس پر اجماع امت ہے کہ عدت گزارنے والی عورت کے ساتھ ایسی گفتگو کرنا جو اس کے نکاح کے بارے میں صریح نص ہو اور اس پر متنبہ کرنے والی ہو وہ جائز نہیں ہے اور اسی طرح اس پر بھی امت کا اجماع ہے کہ اس کے ساتھ ایسی کلام کرنا جو فحش ہو اور جماع کا ذکر کرنا یا ایسی گفتگو جو جماع پر ابھارتی ہو یہ بھی جائز نہیں ہے اور اسی طرح جو کلام بھی اس معنی

ومفہوم کے مشابہ ہو گا وہ جائز نہیں اور اس کے سوا جو گفتگو ہے اسے جائز قرار دیا گیا ہے اور وہ عورت جو طلاق رجعی کی عدت گزار رہی ہو بالاجماع اسے تعریضاً پیغام دینا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ زوجہ کی طرح ہے اور رہی وہ عورت جو طلاق بائن کی عدت میں ہو تو صحیح قول یہی ہے کہ اسے تعریضاً پیغام نکاح دینا جائز ہے۔ (قرطبی)

خِطْبَةٌ اور خُطْبَةٌ: خِطْبَةٌ خاء کے کسرہ کے ساتھ اس کا معنی ہے کلام اور قصد سے پیغام نکاح دینا اور فعل یا قول سے لطف اندوز ہونا، کہا جاتا ہے: خَطَبَهَا يَخْطُبُهَا خَطْبًا وَخِطْبَةً۔ (پیغام نکاح دینا) اور رَجُلٌ خَطَّابٌ کثرت سے پیغام نکاح دینے والا آدمی اور اس معنی میں شاعر کا قول بھی ہے۔

بَرَّحَ بِالْعَيْنَيْنِ خَطَّابُ الْكُثُبْ ... يَقُولُ إِنِّي خَاطِبٌ وَقَدْ كَذَبْ (المحرر الوجیز)

اور الخطیب اس کا معنی ہے الخاطب پیغام نکاح دینے والا، اور الْخِطِّيبَى کا معنی الْخِطْبَةُ (منگنی) ہے۔ اور الْخِطْبُ سے مراد وہ آدمی ہے جو عورت کو پیغام نکاح دیتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے: خِطْبُهُ وَخِطْبَتُهُ، یہ فلاں کی طرف منسوب ہے اور اس کی منگیتر ہے جسے وہ پیغام بھیجتا ہے اور الْخِطْبَةُ فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے جیسے جِلْسَةٌ وَقِعْدَةٌ اور الْخُطْبَةُ خاء کے ضمہ کے ساتھ اس سے مراد وہ کلام ہے جو نکاح وغیرہ میں کہا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا ہے خطبہ وہ ہے جو اس کے اول اور آخر میں ہو اور اسی طرح وہ جو فَعْلَةٌ کے وزن پر ہو جیسے الْأَكْلَةُ (خارش) اور الضَّغْطَةُ (تنگی، ایک دفعہ کا بھینچنا) ہے۔ (قرطبی)

اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ : اس کا معنی ہے اس کی عدت گزرنے کے بعد اس سے شادی کرنے کے بارے جو تم پوشیدہ رکھے ہوئے ہو اور چھپائے ہوئے ہو۔ اَلْإِكْنَانُ کا معنی ہے ڈھانپنا، چھپانا اور مخفی رکھنا عربی محاورے میں کہا جاتا ہے كَنَنْتُهُ وَأَكْنَنْتُهُ دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی میں نے اسے چھپائے رکھا اور کہا گیا ہے: كَنَنْتُهُ یعنی میں نے اسے محفوظ رکھا، یہاں تک کہ اسے کوئی آفت نہ آپہنچی، اگرچہ وہ مستور اور چھپا ہوا نہ بھی ہو اور اسی سے بَيْضٌ مَكْنُونٌ اور دُرٌّ مَّكْنُونٌ ہے (یعنی چھپایا ہوا انڈا اور چھپایا ہوا موتی) اور أَكْنَنْتُهُ کا معنی ہے میں نے اسے مخفی رکھا اور میں نے اسے

ڈھانپ لیا اور عربی محاورے میں کہا جاتا ہے أَكْنَنْتُ الْأَمْرَ فِي نَفْسِي: میں نے کام کو اپنے دل میں چھپائے رکھا، جب کہ اہل عرب سے كَنَنْتُهُ فِي نَفْسِي کا جملہ نہیں سنا گیا، پس اللہ تعالیٰ نے اس سے گناہ کو اٹھا دیا ہے جس نے اخفا اور تعریض کے ساتھ معتدہ سے شادی کرنے کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ایسا وعدہ لینے سے منع فرمایا ہے جو شادی کے بارے صریح ہو اور اس پر اس کی بناء ہو اور وعدے پر اتفاق ہو۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں عدت کے اندر چار فعل مذکور ہیں دو زبان کے اور دو دل کے اور ہر ایک کا حکم جدا ہے اول زبان سے تصریحاً پیغام دینا یہ حرام ہے لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا میں اس کا ذکر ہے، دوم زبان سے اشارہ کرنا جائز ہے لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اور قَوْلًا مَعْرُوفًا میں اس کا ذکر ہے، سوم دل سے یہ ارادہ کرنا کہ ابھی یعنی عدت کے اندر نکاح کر لیں گے یہ بھی حرام ہے کیونکہ عدت کے اندر نکاح کرنا حرام ہے اور ارادہ حرام کا حرام ہے۔ لَا تَعْزِمُوا میں اس کا ذکر ہے، چہارم دل سے یہ ارادہ کرنا کہ عدت کے بعد نکاح کریں یہ جائز ہے۔ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ میں اس کا ذکر ہے۔ (تفسیر بیان القرآن)

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ: اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے، چاہے وہ چھپا ہوا ہو تمہارے دلوں میں یا اعلانیہ ہو تمہاری زبانوں کے ساتھ، سو اللہ تعالیٰ نے تعریض کی رخصت دی ہے تصریح نہیں کی، حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو انہیں پیغام نکاح دو گے (المحرر الوجیز، قرطبی)

وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا: یعنی تم ان سے خفیہ طور پر معاہدہ نہ کرو، اس میں سِرًّا سے پہلے حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ فعل ان میں سے ہے جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور ان میں سے ایک حرف جر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور سِرًّا کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے: بعض نے کہا ہے اس کا معنی نکاح ہے یعنی کوئی آدمی اس معتدہ کو یہ نہ کہے تو مجھ سے شادی کر لے بلکہ تعریض کرے اگر ارادہ ہو اور اس سے خفیہ طور پر یہ عہد و پیمان نہ لے کہ وہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی،

اس تاویل پر سِرًّا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے بمعنی مستسرین (المحرر الوجیز، قرطبی)

جابر بن زید، اور ابو مجلز فرماتے ہیں کہ اَلسِّر سے مراد زنا ہے، یعنی تم میں سے کوئی عدت کے دوران زنا اور پھر عدت کے بعد نکاح کا وعدہ نہ لے اور ضحاک فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اَلسِّر بمعنی زنا ہے یعنی تم ان سے زنا کا وعدہ نہ لو (المحرر الوجیز، قرطبی)) ابن زید فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَلَكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا کا معنی یہ ہے کہ تم ان سے نکاح نہ کرو اور پھر تم اسے چھپاتے پھرو، بلکہ جب وہ حال ہو جائے تو تم اسے ظاہر کرو اور ان سے دخول کرو۔ (المحرر الوجیز، قرطبی)

إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قول معروف سے تعریض کا مباح ہونے کی طرف اشارہ ہے، جیسے معتدہ کو یوں کہے کہ مجھے تیرے اندر رغبت ہے، اسی طرح لڑکی کے ولی سے یوں کہے کہ آپ اس کی شادی کریں تو مجھے اطلاع کریں۔ (زادالمسیر)

وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ: اور تم عقد نکاح کا قصد نہ کرو، یہ عدت میں عقد نکاح سے منع کرنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ قصد عقد کے لیے لازم ہے اور اس نہی میں اس طرح کہنے سے زیادہ مبالغہ ہے کہ لَا تَعقِدُوا النِّكَاح یعنی عقد نکاح نہ کرو اور قصد کے حرام ہونے پر اس میں کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ دلی قصد کرنے پر بالاجماع مواخذہ نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد عَلِمَ اللهُ اَنَّكُم سَتَذكُرُونَهُنَّ سے اس کا مباح ہونا پہلے بیان ہو چکا ہے اور یہ ایسا ہے کہ کوئی کہے کہ: زَيدٌ طَوِيلُ النَّجَادِ اور كَثِيرُ الرَّمَادِ ہے (عرب ان دونوں لفظوں سے بہادر اور سخی کو بیان کیا کرتے ہیں) پس اگر زید لمبے قد کا اور مہمان نواز ہو تو اس کہنے والے کو جھوٹا نہیں کہہ سکتے اگرچہ نجاد اور رماد اس کے ہاں بالکل نہ ہو (اور یہ مجازی معنی ہوتے ہیں) اور ممکن ہے کہ اسے حقیقی ہی معنی پر حمل کر لیں اور یہ عدت میں عقد نکاح کے قصد کرنے سے نہیں ہو گی اس صورت میں یہ نہی تنزیہی ہے اس وجہ سے کہ جو شخص قصد کر لے تو عجب نہیں کہ وہ نکاح ہی کر بیٹھے کیونکہ جو چراگاہ کے قریب قریب گھومتا ہے وہ اس میں گھس بھی جاتا ہے۔ (مظہری) حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ جب تک کہ عدت

پوری نہ ہو جائے، عدت کا نام اس کے فرض ہونے کی وجہ سے کتاب رکھ دیا ہے (کیونکہ کتاب کے معنی فرض کے ہیں) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کُتِبَ عَلَیکُم یعنی تم پر فرض کر دیا گیا ہے (مظہری)

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ: جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے، اس کا لحاظ اور خوف رکھو اپنے دل میں عورتوں کے متعلق فرمان باری کیخلاف خیال بھی نہ آنے دو، ہمیشہ دل کو صاف رکھو، برے خیالات سے اسے پاک رکھو، ڈر، خوف کے حکم کے ساتھ ہی اپنی رحمت کی طمع اور لالچ بھی دلائی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خطاؤں کو بخشنے والا اور حلم و کرم والا ہے۔

اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پوشیدہ اور اعلانیہ سب باتوں کو جانتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ پوشیدہ اور اعلانیہ ہر حال میں اللہ سے ڈرو، یہاں فَاحْذَرُوهُ میں ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے، جب ضمیر اللہ کی طرف لوٹتی ہے تو پھر لازمی طور پر مضاف محذوف ہو گا یعنی فَاحذَرُوا عِقَابَہ اس کی سزا و عقوبت سے ڈرو، اس بات کا بھی احتمال ہے کہ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ کی ما کی طرف لوٹتی ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے دلوں میں جو ناجائز ارادے تھے۔ (کشاف، لباب)

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ: جان لو کہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ بخشنے والا حلم والا ہے، وہ اپنے احکامات کی نافرمانی اور اپنے نواہی سے اجتناب نہ کرنے پر جلدی سزا نہیں دیتا، وہ بندے کو مہلت دیتا ہے، اس کے باز آجانے کا انتظار کرتا ہے، جب بندہ تمام حدود پھلانگ جاتا ہے تو پھر وہ اسے گرفت میں لیتا ہے۔

مہر اور متاع کے احکام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَالَمْ تَمَسُّوهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ (۲۳۶) وَإِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ

بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲۳۷)البقرہ

جواب ترجمہ: تم پر اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم عورتوں کو ایسے وقت طلاق دو جبکہ ابھی تم نے ان کو چھوا بھی نہ ہو، اور نہ ان کے لیے کوئی مہر مقرر کیا ہو، اور (ایسی صورت میں) ان کو کوئی تحفہ دو، خوشحال شخص اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق بھلے طریقے سے یہ تحفہ دے۔ یہ نیک آدمیوں پر ایک لازمی حق ہے۔ اور اگر تم نے انہیں چھونے سے پہلے ہی اس حالت میں طلاق دی ہو جبکہ ان کے لیے (نکاح کے وقت) کوئی مہر مقرر کر لیا تھا تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا تھا اس کا آدھا دینا (واجب ہے) الا یہ کہ وہ عورتیں رعایت کر دیں (اور آدھے مہر کا بھی مطالبہ نہ کریں) یا وہ (شوہر) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، رعایت کرے (اور پورا مہر دیدے) اور اگر تم رعایت کرو تو یہ تقوی کے زیادہ قریب ہے، اور آپس میں فراخ دلی کا برتاؤ کرنا مت بھولو۔ جو عمل بھی تم کرتے ہو، اللہ یقیناً اسے دیکھ رہا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں چند مسائل بیان فرمائے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو صرف نکاح کر کے طلاق دیدے نہ اسے ہاتھ لگایا ہو نہ اس کے لیے مہر مقرر کیا ہو تو اس صورت میں مہر واجب نہیں ہے، البتہ بطور سلوک و احسان اور دلداری کے متعہ دینا واجب ہے، یہ متعہ ایک جوڑا کپڑوں کی صورت میں ہو گا، یعنی طلاق دینے والا مرد مطلقہ عورت کو تین کپڑے دے دے، ایک کرتہ، ایک دوپٹہ اور ایک خوب چوڑی چکلی چادر جو سر سے پاؤں تک ڈھانک سکے اور اس میں مرد کی حالت کا اعتبار ہو گا، مرد پیسے والا ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق دے اور تنگ دست ہے تو اپنے حالات کے مطابق دے دے، اس وجوب کو مؤکد فرمانے کے لیے ارشاد فرمایا: مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ کہ یہ نفع پہنچانا شرعی قاعدہ کے مطابق ہو جو محسنین پر واجب ہے، ہر مسلمان اپنے ایمان کی وجہ سے صفت احسان اختیار کرنے پر مامور ہے اور ہر مؤمن محسن ہے، لہٰذا اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ جو لوگ فاسق اور گناہ گار ہیں ان پر واجب نہیں، آیت بالا سے معلوم ہوا کہ اگر مہر مقرر کیے

بغیر نکاح کر لیا جائے تو نکاح ہو جاتا ہے، اب اس کے بعد اگر مذکورہ بالا صورت پیش آجائے (کہ مرد نے عورت کو ہاتھ بھی نہ لگایا اور طلاق دے دی) تو اس صورت میں متعہ دینا ہو گا جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور اگر مہر مقرر کیے بغیر نکاح کر لیا اور پھر میاں بیوی والی تنہائی بھی ہو گئی یا خلوت سے پہلے شوہر کی وفات ہو گئی تو مہر مثل دینا ہو گا۔ (انوار البیان)

صلوٰۃ الوسطیٰ کی حفاظت کا حکم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (۲۳۸) البقرہ

جواب ترجمہ: تمام نمازوں کا پورا خیال رکھو، اور (خاص طور پر) بیچ کی نماز کا اور اللہ کے سامنے باادب فرمانبردار بن کر کھڑے ہوا کرو۔

نماز اہم ترین عبادت ہے، جس کا قرآن کریم میں جگہ جگہ ذکر ہے، اللہ نے فرمایا کہ میری یاد کے لیے تم نماز ادا کرو، نماز اللہ سے لینے کا ذریعہ ہے، نماز نبی کریم ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے نمازوں کی حفاظت کا حکم دیا ہے، یعنی انہیں بروقت ادا کیا جائے، نمازوں پر ہمیشگی اختیار کی جائے، اس سے مراد پنجگانہ نمازیں ہیں، جو دن رات کے چوبیس گھنٹے میں پانچ اوقات میں فرض ہیں، اللہ نے کتاب موقوت قرار دیا کہ بروقت نمازوں کی ادائیگی فرض ہے، نماز کا طریقہ احادیث کی کتابوں میں متواتر روایات سے ثابت ہے۔

صلوٰۃ الوسطیٰ: اس آیت میں صلوٰۃ الوسطیٰ کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے، الوسطی الاوسط کی تانیث ہے اور کسی شے کا وسط اس کا بہترین، عمدہ اور متناسب ہونا ہے، صلوٰۃ الوسطیٰ سے صلوٰۃ متوسطہ مراد ہے جو کہ نماز عصر ہے کیونکہ یہی نماز ہے جو رات کی دو نمازوں اور دن کی دو نمازوں کے درمیان میں پڑھی جاتی ہے، نبی کریم ﷺ کے ایک فرمان گرامی سے بھی اس طرف واضح ثبوت ملتا ہے، جب جنگ خندق کے موقع پر آپ ﷺ کی نماز عصر متاثر ہوئی تو آپ ﷺ نے سخت کلمات ادا کرتے ہوئے

ارشاد فرمایا شَغَلُونَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوُسْطَى، صَلَاةِ الْعَصْرِ، مَلَأَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ وَبُيُوتَهُمْ نَارًا ان لوگوں نے ہمیں ہماری درمیانی نماز یعنی عصر کی نماز سے مشغول رکھا، اللہ ان کی قبروں اوران کے گھروں کو آگ سے بھر دے۔

صلوٰۃ الوسطیٰ کے بارے میں مختلف روایات آئی ہیں، جن میں سے بعض روایات نماز فجر، بعض نماز ظہر اور بعض دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ صلاۃ الوسطی سے کوئی اور نماز مراد ہے، جب کہ جمہور کا موقف یہ ہے کہ صلوٰۃ الوسطیٰ سے نماز عصر مراد ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

صلوٰۃ الوسطیٰ سے مراد نماز عصر اس کی فضیلت کی بناء پر لی گئی ہے، اسی طرح یہ وقت کاروبار اور روزگار کی مشغولیت و مصروفیت کا ہوتا ہے، اس وقت میں تجارت عروج پر ہوتی ہے، پھر یہ ایسا وقت ہوتا ہے جس میں رات اور دن کے فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے، پھر اس نماز کی اہمیت کا اس بات سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ فَاتَتْهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَكَأَنَّمَا وُتِرَ أَهْلَهُ وَمَالَهُ جس شخص کی نماز عصر فوت ہوگئی گویا کہ اس کا گھر بار اور مال برباد ہوگیا، مطلب یہ ہوا کہ نماز عصر کو ضائع کرنے سے اس طرح ڈرنا چاہیے جس طرح گھر بار کے تباہ ہونے سے ڈرا جاتا ہے۔

عصر کی نماز کی اہمیت اس روایت سے بھی معلوم ہوتی ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا بَكِّرُوا بِالصَّلَاةِ فِي يَوْمِ الْغَيْمِ، فَإِنَّهُ مَنْ تَرَكَ صَلَاةَ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ بادلوں والے دن عصر کی نماز جلدی پڑھ لیا کرو کیونکہ جس نے عصر کی نماز چھوڑی اس کے عمل برباد ہوگئے۔ (ابن کثیر) ایک مرتبہ حضور ﷺ نے عصر کی نماز قبیلہ غفار کی ایک وادی میں جس کا نام محمص تھا ادا کی پھر فرمایا إِنَّ هَذِهِ الصَّلَاةَ صَلَاةَ الْعَصْرِ عُرِضَتْ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ فَضَيَّعُوهَا، أَلَا وَمَنْ صَلَّاهَا ضُعِّفَ لَهُ أَجْرُهُ مَرَّتَيْنِ، أَلَا وَلَا صَلَاةَ بَعْدَهَا حَتَّى تَرَوُا الشَّاهِدَ یہ عصر کی نماز ہے یہی نماز تم سے اگلے لوگوں پر بھی پیش کی گئی تھی لیکن انہوں نے اسے ضائع کر دیا، سنو اسے پڑھنے والے کو دوہرا اجر ملتا ہے اس کے بعد کوئی نماز نہیں جب تک کہ تم تارے نہ دیکھ لو۔ (مسند احمد)

وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ: لفظ قانتین قنوت سے لیا گیا ہے۔ جو اسم فاعل کا صیغہ ہے اس کی تفسیر کئی طرح سے کی گئی ہے، مطیعین، خاشعین، ساکتین، یہ سب اس کی تفسیریں ہیں، جو سب حضرات سلف سے مشہور ہیں، حضرت زید ابن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ كَانَ الرَّجُلُ يُكَلِّمُ صَاحِبَهُ فِي عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فِي الْحَاجَةِ فِي الصَّلَاةِ، حَتّٰى نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نماز کے اندر ضرورت کی باتیں کرلیا کرتے تھے یہاں تک کہ آیت کریمہ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ نازل ہوگئی تو ہمیں خاموشی کا حکم ہوا اور آپس میں بات کرنے سے روک دیئے گئے۔ (بخاری)

نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہی پڑھا جائے اور آپس میں باتیں نہ کی جائیں۔ حضرت مجاہد تابعی نے فرمایا کہ قنوت یہ ہے کہ رکوع لمبا ہو نظر پست ہو اور خشوع حاصل ہو اور یہ کہ کسی طرف التفات نہ کیا جائے، اور کنکریوں کو الٹ پلٹ نہ کیا جائے (جو بعض مسجدوں میں فرش پر پڑی رہتی تھیں) اور دنیاوی امور کے وسوسے اپنے دل میں نہ لائے، بعض حضرات نے قانتین کی تفسیر کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے۔ مُكَمِّلِيْنَ الطَّاعَةَ وَ مُتَمِّمِيْهَا عَلٰى أَحْسَنِ وَجْهٍ مِنْ غَيْرِ اِخْلَالٍ بِشَيْءٍ مِمَّا يَنْبَغِي فِيْهَا کہ نہایت اچھے طریقہ پر طاعت کو درجہ کمال تک پہنچایا جائے اور جو چیزیں طاعت کے لیے چاہئیں ان میں سے کسی بھی چیز میں خلل نہ آنے دیا جائے۔ (روح المعانی ص ۱۰۷، ج ۲)

آیت مبارکہ کے اس حصہ میں یہ بتایا جارہا ہے کہ نماز کی حالت میں باہمی گفتگو، سلام کلام سب ممنوع ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ كُنَّا يُسَلِّمُ بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الصَّلَاةِ، فَمَرَرْتُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ، فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ، فَوَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهُ نَزَلَ فِيَّ شَيْءٌ، فَلَمَّا قَضَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاتَهُ قَالَ: وَعَلَيْكَ السَّلَامُ، أَيُّهَا الْمُسَلِّمُ، وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، إِنَّ اللّٰهَ، عَزَّ وَجَلَّ، يُحْدِثُ مِنْ أَمْرِهِ مَا يَشَاءُ فَإِذَا كُنْتُمْ فِي الصَّلَاةِ فَاقْنُتُوا وَلَا تَكَلَّمُوا (مسند ابویعلیٰ) ہم حالت نماز میں ایک دوسرے کو سلام کرلیا کرتے تھے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا تو انہیں سلام کیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا تو میرے دل

میں خیال آیا کہ اس بارے میں کوئی بات آپ ﷺ پر نازل ہوئی ہے، جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوگئے تو فرمایا وعلیک السلام، اے سلام کرنے والے، اور اس کی رحمتیں ہوں، بے شک اللہ تعالیٰ نے یہ نیا حکم نازل فرمایا ہے کہ نماز میں قنوت (عاجزی) اختیار کرو اور باتیں نہ کرو۔

سب کے سب مسلمانوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ نماز میں جان بوجھ کر کلام کرنا جبکہ نمازی جانتا ہو کہ وہ نماز میں ہے اور وہ کلام اس کی نماز کی اصلاح کے بارے میں نہ ہو تو وہ نماز کو فاسد کر دیتی ہے، امام اوزاعی کی یہ رائے نہیں ہے۔ (قرطبی)

علامہ ابن کثیر نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی جو یہ روایت نقل فرمائی ہے، جس میں آپ نے نبی کریم ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے سلام کا جواب حالت نماز میں نہیں دیا، سلام پھیرنے کے بعد دیا اور فرمایا کہ اللہ نے نماز میں گفتگو کرنے سے منع فرمایا ہے، اس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ ہجرت حبشہ سے پہلے نماز میں مسلمان گفتگو کر لیتے تھے، لیکن جب مسلمان ہجرت حبشہ سے واپس آئے تو اس کے بعد نماز میں گفتگو کا سلسلہ روک دیا گیا تھا۔

نماز خوف کیسے ادا کی جائے؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (۲۳۹) البقرہ

جواب ترجمہ: اور اگر تمہیں (دشمن کا) خوف لاحق ہو تو کھڑے کھڑے یا سوار ہونے کی حالت ہی میں (نماز پڑھ لو) پھر جب تم امن کی حالت میں آجاؤ تو اللہ کا ذکر اس طریقے سے کرو جو اس نے تمہیں سکھایا ہے، جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔

اس آیت میں خوف اور امن کے حالات میں نماز پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جہاں تک بھی ممکن ہو پانچوں نمازوں کو ہر حال میں اور ہر مقام میں ضرور پڑھیں، بعض مرتبہ دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑتا

ہے، اس موقع پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ باقاعدہ رکوع سجدہ کے ساتھ نماز پڑھنا ممکن نہیں ہوتا ایسی صورت میں کھڑے کھڑے اشارہ ہی سے نماز پڑھ لیا کریں، زمین پر اترنے کا موقع نہ ہو تو سواری ہی پر پڑھ لیں، پھر جب امن ہو جائے اور اطمینان نصیب ہو جائے تو اسی طرح نماز پڑھو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے امن و اطمینان کے حالات میں نماز پڑھنے کی تعلیم دی ہے اگر دشمنوں کا ہجوم ہو اور کوئی صورت کسی طرح نماز پڑھنے کی بن نہ پڑے تو مجبوراً نماز مؤخر کر دے اور بعد میں قضا پڑھ لے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنگ خندق کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور کفار قریش کو برا کہنے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں نماز نہیں پڑھ سکا یہاں تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ کی قسم! میں نے بھی عصر نہیں پڑھی پھر وادی بطحان کی طرف توجہ فرمائی اور آپ نے وضو کیا اور ہم نے بھی وضو کیا اس کے بعد آپ نے عصر کی نماز پڑھی جبکہ سورج غروب ہو چکا تھا، پھر اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی۔ (بخاری)

اس آیت میں نماز خوف کا طریقہ بتایا گیا ہے کہ اگر دشمن سے مقابلہ کے وقت تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ اگر ہم نماز پڑھیں گے تو کہیں دشمن ہم پر حملہ نہ کر دے تو تم رکوع و سجود اور سمت کعبہ کا لحاظ کئے بغیر خواہ سوار ہو یا پیدل ہر حال میں نماز پڑھو، پھر جب امن ہو تو اسی طرح نماز پڑھو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں نماز پڑھنے کا طریقہ بتایا ہے۔ صلوۃ خوف کا وہ طریقہ جو سورۃ نساء کی آیت۔ وَاِذَا كُنتَ فِيهِمْ۔ (نساء آیت ۱۰۲) میں بیان ہوا ہے وہ اس طریقہ کے علاوہ ہے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ (تفسیر احسن البیان)

مطلقہ عورتوں کے حقوق

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ

خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۴۰) البقرہ

جواب ترجمہ: اور تم میں سے جو لوگ وفات پاجائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جایا کریں کہ ایک سال تک وہ (ترکے سے نفقہ وصول کرنے کا) فائدہ اٹھائیں گی اور ان کو (شوہر کے گھر سے) نکالا نہیں جائے گا ہاں اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنے حق میں قاعدے کے مطابق وہ جو کچھ بھی کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہو گا اور اللہ صاحب اقتدار بھی ہے، صاحب حکمت بھی۔

زمانہ جاہلیت میں جب کسی عورت کا شوہر مر جاتا تھا تو اس کی عدت ایک سال تھی، وہ ایک سال تک کسی کوٹھڑی میں پڑی رہتی تھی اور ایک سال کے بعد اس کو ٹھڑی سے نکالتے تھے اور اس کی گود میں اونٹ کی مینگنیاں بھر دیتے تھے پھر اسے باہر گلی کوچے میں نکالتے تھے۔ وہ لوگوں پر مینگنیاں پھینکتی جاتی تھی اس سے لوگ سمجھ لیتے تھے کہ اس کی عدت ختم ہو گئی جیسا کہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد میں مذکورہ ہے۔ (انوار البیان)

اسلام میں ایسی عورت کی عدت چار ماہ دس دن مقرر فرمادی جس کا شوہر وفات پاجائے اور وہ حمل سے نہ ہو اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اس آیت میں حکم فرمایا کہ مرنے والا اپنی بیویوں کا خیال رکھے موت سے پہلے اس بات کی وصیت کر دے کہ شوہر کے ترکہ سے ایک سال تک اس کو نان و نفقہ دیا جائے، لفظ مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ میں اس کو بیان فرمایا ہے۔ یہ حکم پہلے تھا بعد میں منسوخ ہو گیا اور اس کے ساتھ یہ حکم تھا کہ وصیت میں یہ بھی شامل کر دیں کہ ایک سال تک اسے شوہر کے گھر سے نہ نکالا جائے، غَيْرَ اِخْرَاجٍ میں اس حکم کو بیان فرمایا ہے۔ لیکن عورت کو اختیار تھا کہ اگر وہ چاہے تو مرنے والے شوہر کے گھر میں رہے اور چاہے تو اپنے ماں باپ کے یہاں چلی جائے (فَاِنْ خَرَجْنَ الخ) میں اس مضمون کو بیان فرمایا ہے۔ یہ حکم آیت میراث نازل ہونے سے پہلے تھا۔ جب میراث کا حکم نازل

ہو گیا اور اس کے بعد یہ حکم ہو گیا کہ میراث لے لے اور خرچہ اسی میں سے کرے۔ البتہ عدت پوری ہونے تک شوہر ہی کے گھر میں رہے نہ اس میں سے نکلے نہ نکالی جائے۔ (انوار البیان)

مطلقہ عورتوں کو فائدہ پہنچانا

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (۲۴۱) كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲۴۲) البقرہ

جواب ترجمہ: اور مطلقہ عورتوں کو قاعدے کے مطابق فائدہ پہنچانا متقیوں پر ان کا حق ہے۔ اللہ اپنے احکام اسی طرح وضاحت سے تمہارے سامنے بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھ داری سے کام لو۔

مطلقہ عورتوں کو فائدہ پہنچانا ہے دستور کے مطابق، یعنی طلاق کی مختلف صورتوں کی نسبت سے ان کے حقوق ادا کرو۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ایسی عورت جسے مقاربت سے پہلے طلاق ہو گئی اور اس کا مہر بھی مقرر نہیں ہوا، اس کو اپنی مالی حیثیت کے مطابق ایک جوڑا کپڑے دو، جس میں ایک قمیص، ایک دوپٹہ اور ایک بڑی چادر ہو، یا ایک دوپٹہ اور دو چادریں ہوں، یہ واجب ہے، ایسی عورت جس کا مہر مقرر ہو چکا ہے مگر بغیر مقاربت کے طلاق ہو گئی، اس کو نصف مہر ملے گا، یہاں پر جن عورتوں کا ذکر ہے وہ عام طلاق یافتہ ہیں، جو مہر مثل یا پورے مہر کی حقدار ہیں فرمایا کہ ان کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچاؤ، یہ مستحب ہے ان کو کچھ دے دلا کر رخصت کرو، وہ طلاق کے غم میں مغموم ہیں ان کی دل جوئی ہونی چاہیے ان کے لیے بھی ایک جوڑا کپڑے تو ضرور ہونے چاہئیں، حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ یہ بات متقیوں پر لازم ہے۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن للسواتی رحمہ اللہ)

اللہ تعالیٰ نے جب آیت مبارکہ وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ نازل فرمائی تو مسلمانوں میں سے ایک شخص کہنے لگا کہ اگر میں ایسا کروں تو اچھا ہے اور نہ چاہوں تو نہ کروں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ طلاق یافتہ عورتوں کو رخصت کرتے وقت کچھ نہ کچھ دے دیا کرو۔ یہ اہل ایمان

پر حق ہے جو شرک سے اجتناب کرتے ہیں۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ : اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور تمہاری بیویوں کے لیے جو چیز لازم ہے اسے واضح کرتے ہیں، جیسا کہ تم میرے احکامات جانتے ہو اور اس حق کو جانتے ہو کہ تمہارا ایک دوسرے پر کیا حق ہے، اسی طرح میں اپنی اس کتاب میں تمہارے لیے وہ سارے احکامات جو میری آیات میں ہیں جنہیں میں محمد ﷺ پر اس کتاب میں نازل کرتا ہوں تاکہ تم لوگ سمجھو کہ میں فرائض واحکامات سے کیا چیز تمہارے لیے واضح کرتا ہوں،، وہ چیزیں جو تمہارے لیے درست ہیں اور تمہارے دین کے لیے صحیح ہیں۔ (خازن)

موت کے ڈر کی وجہ سے گھروں کو چھوڑنے والے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے نیز یہ بتائیے کہ وہ کون سے لوگ تھے جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود موت کے ڈر کی وجہ سے گھروں سے نکل گئے تھے؟

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُواْ مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوتُواْ ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يَشْكُرُونَ {۲۴۳} البقرۃ

جواب ترجمہ: کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے حالانکہ وہ ہزاروں تھے پھر اللہ نے ان کو فرمایا کہ مر جاؤ پھر انہیں زندہ کر دیا بیشک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

یہ بنی اسرائیل کی ایک قوم تھی، جن کے علاقے میں طاعون پھیلا تو یہ لوگ بھاگ گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو مرنے کا حکم دیا تو یہ سب مر گئے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ ہونے کا حکم دیا تو یہ سب زندہ ہو گئے، ان لوگوں نے بہت زمانہ موت کے ڈر سے اس طرح بسر کیا کہ کپڑوں کی بجائے گویا کفن میں لپٹے ہوئے ہیں، یہ سلسلہ ان کی نسلوں تک چلا۔

موت کے ڈر وخوف کی وجہ سے اپنے گھر بار چھوڑنے والے لوگوں کی تعداد کے بارے میں

اختلاف ہے، ① ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ لوگ چار ہزار تھے۔ ② اور روایت میں ہے کہ آٹھ ہزار تھے۔ ③ بعض نو ہزار کہتے ہیں۔ ④ بعض چالیس ہزار بتاتے ہیں۔ ⑤ بعض تیس ہزار سے کچھ اوپر بتاتے ہیں، یہ لوگ ذروروان نامی بستی کے تھے جو واسط کی طرف ہے، بعض کہتے ہیں اس بستی کا نام اذرعات تھا، یہ لوگ طاعون کے مارے اپنے شہر کو چھوڑ کر بھاگے تھے، ایک بستی میں جب پہنچے وہیں اللہ کے حکم سے سب مر گئے، ایک نبی اللہ کا وہاں سے گزر ہوا، ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر دوبارہ زندہ کر دیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں ایک چٹیل صاف ہموار کھلے پر فضا میدان میں ٹھہرے تھے اور دو فرشتوں کی چیخ سے ہلاک کئے گئے تھے جب ایک لمبی مدت گزر چکی ان کی ہڈیوں کا بھی چونا ہو گیا، اسی جگہ بستی بس گئی تب خزقیل نامی ایک نبی وہاں سے نکلے انہوں نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور حکم دیا کہ تم کہو کہ أَيَّتُهَا العِظَامُ البَالِيَةُ إِنَّ اللهَ يَأمُرُكِ أَن تَجتَمِعِي فَاجتَمَعَ عِظَامُ كُلُّ جَسَدٍ بَعضُهَا إِلَى بَعضٍ اے بوسیدہ ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم سب جمع ہو جاؤ، چنانچہ ہر ہر جسم کی ہڈیوں کا ڈھانچہ کھڑا ہو گیا پھر اللہ کا حکم ہوا ندا کرو کہ أَيَّتُهَا العِظَامُ إِنَّ اللهَ يَأمُرُكِ بِأَن تَكتَسِي لَحمًا وَعَصَبًا وَجِلدًا، فَكَانَ ذَالِكَ اے ہڈیو: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم گوشت پوست رگیں پٹھے بھی جوڑ لو۔

چنانچہ اس نبی کے دیکھتے ہوئے یہ بھی ہو گیا۔ پھر آواز آئی کہ أَيَّتُهَا الأَروَاحُ إِنَّ اللهَ يَأمُرُكِ أَن تَرجِعَ كُلُ رُوحٍ إِلَى الجَسَدِ الَّذِي كَانَت تَعمُرُه، فَقَامُوا أَحيَاءً يَنظُرُونَ قَد أَحيَاهُمُ اللهُ بَعدَ رَقدَتِهِمُ الطَّوِيلَة اے روحو: اللہ تعالیٰ کا تمہیں حکم ہو رہا ہے کہ ہر روح اپنے اپنے قدیم جسم میں آ جائے چنانچہ یہ سب جس طرح ایک ساتھ مرے تھے اسی طرح ایک ساتھ جی اٹھے اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا سُبحَانَكَ اللهم رَبَّنَا وَبِحَمدِكَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنتَ اے اللہ تو پاک ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

جہاد فی سبیل اللہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۲۴۴)البقرہ

جواب ترجمہ: اور اللہ کے راستے میں جنگ کرو، اور یقین رکھو کہ اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

جس طرح ان لوگوں کا بھاگنا انہیں موت سے نہ بچا سکا، اسی طرح جہاد سے منہ موڑنا بھی بیکار ہے، موت کا ایک دن مقرر ہے اور رزق اتنا ملے گا جتنا قسمت میں لکھ دیا گیا ہے،، اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، موت نہ پہلے آئے گی اور نہ پیچھے ہٹے گی، قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ارشاد ہے کہ الَّذِینَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ [آلِ عِمْرَانَ: ۱۶۸) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے (شہید) بھائیوں کے بارے میں بیٹھے بیٹھے یہ باتیں بناتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے، کہہ دو کہ: اگر تم سچے ہو تو خود اپنے آپ ہی سے موت کو ٹال دینا۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے کہ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلا أَخَّرْتَنَا إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالآخِرَةُ خَيْرٌ لِمَنِ اتَّقَى وَلا تُظْلَمُونَ فَتِيلا * أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ [النِّسَاءِ:۷۷،۷۸] اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی، تھوڑی مدت تک ہمیں مہلت کیوں نہیں دی؟ کہہ دیجیے کہ دنیا کا فائدہ تو تھوڑا سا ہے اور جو شخص تقوی اختیار کرے اس کے لیے آخرت کہیں زیادہ بہتر ہے، اور تم پر ایک تاگے کے برابر بھی ظلم نہیں ہو گا۔ تم جہاں بھی ہو گے (ایک نہ ایک دن) موت تمہیں جا پکڑے گی، چاہے تم مضبوط قلعوں میں کیوں نہ رہ رہے ہو۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا وہ فرمان ذہن میں رکھیے جو انہوں نے عین اپنے انتقال کے وقت

فرمایا تھا کہ کہاں ہیں موت سے ڈرنے والے، لڑائی سے جی چرانے والے نامرد، وہ دیکھیں کہ میرا جوڑ جوڑ اللہ تعالیٰ کی راہ میں زخمی ہو چکا ہے، سارے جسم میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں تلوار نیزہ برچھا نہ لگا ہو لیکن دیکھو کہ آج میں بستر میں فوت ہو رہا ہوں، میدان جنگ میں نہ رہا۔

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ: صاحب تفسیر حقانی لکھتے ہیں ان تمام مسائل کے بعد پھر خدا کی راہ میں جان دینے اور مال دینے کی تاکید شروع ہوتی ہے کیونکہ دنیا میں کوئی قوم قوم نہیں رہ سکتی تاوقتیکہ اس قوم میں اپنے ناموس اور مذہب محفوظ رکھنے کی قدرت نہ ہو، خاص وہ مذہب کہ جو تمام دنیا پر پھیلنے والا ہو جس کی توحید اور روشن احکام دنیا بھر کے شریروں کے خلاف نہ ہوں جس سے نہ صرف احتمال بلکہ یقین ہو کہ اس مذہب کے لیے اس کے گھر اور ملک میں بھی سخت سخت رکاوٹیں پیش آنی شروع ہوں گی بلکہ ہو گئیں، پھر آگے چل کر تو کیا کچھ نہ ہو گا اس لیے حکم دیا گیا کہ اللہ کی راہ میں لڑو جو رکاوٹ پیش آئے اس کو تلوار کی دھاروں سے مٹا دو مگر نیت نیک اور دلی اخلاص بھی ملحوظ رکھو، صرف خون ریزی اور بنی نوع انسان کا قتل کرانا ہی مقصود نہیں بلکہ یہ جہاد ایسا ہے جیسا مریض کے لیے فصد و فاسد مادہ کا اخراج و قطع برید ایسے معاملات میں دلی اخلاص و نیک نیتی ضرور ہے، اس لیے فرمایا کہ اللہ سنتا جانتا ہے۔ (تفسیر حقانی)

رضائے خداوندی کی خاطر صدقہ و خیرات کرنا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۴۵)البقرہ

جواب ترجمہ: کون ہے جو اللہ کو اچھے طریقے پر قرض دے، تاکہ وہ اسے اس کے مفاد میں اتنا بڑھائے چڑھائے کہ وہ بدرجہا زیادہ ہو جائے؟ اور اللہ ہی تنگی پیدا کرتا ہے اور وہی وسعت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم سب کو لوٹایا جائے گا۔

اللہ کو قرض دینے سے مراد اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے، اس میں غریبوں کی امداد بھی داخل ہے اور جہاد کے مقاصد میں خرچ کرنا بھی ہے، اسے قرض مجازاً کہا گیا ہے، کیونکہ اس کا بدلہ ثواب کی صورت میں دیا جائے گا، اور اچھے طریقے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دیا جائے، دکھاوا یا دنیا میں بدلہ لینا مقصود نہ ہو اور اگر جہاد کے لئے یا کسی غریب کی مدد کے طور پر قرض ہی دیا جائے تو اس پر کسی سود کا مطالبہ نہ ہو، کفار اپنی جنگی ضروریات کے لئے سود پر قرض لیتے تھے، مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ اگرچہ دنیا میں تو انہیں سود نہیں ملے گا، لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کا ثواب اصل سے بدرجہا زیادہ عطا فرمائیں گے، جہاں تک اس خطرے کا تعلق ہے کہ اس طرح خرچ کرنے سے مال میں کمی ہو جائے گی، اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ تنگی اور وسعت اللہ ہی کے قبضے میں ہیں، جو شخص اللہ کے دین کی خاطر اپنا مال خرچ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو تنگی پیش آنے نہیں دیں گے بشرطیکہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرے۔ (توضیح القرآن)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً نازل ہوئی تو حضرت ابو الدحداح انصاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض لینے کا ارادہ فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں اے ابو الدحداح! انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے اپنا ہاتھ دیجئے، آپ نے اپنا ہاتھ مبارک آگے بڑھایا تو اس نے کہا میں اپنے رب کو اپنا باغ قرض دیتا ہوں اور وہ باغ بھی جس میں چھ سو کھجوروں کے درخت ہیں اور اس میں ام الدحداح اور اس کے بچے بھی (رہتے ہیں) ابو الدحداح رضی اللہ عنہ آئے اور آواز لگائی اے ام دحداح اس نے کہا لبیک میں حاضر ہوں کیا کہتے ہو؟ پھر کہا یہاں سے نکل جاؤ میں (یہ باغ) اپنے رب عزوجل کو قرضہ دے چکا ہوں۔ (نوادر الاصول، شعب الایمان، در منثور)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابو الدحداح انصاریؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے دو باغ ہیں ان میں سے ایک سافلہ میں ہے اور دوسرا عالیہ میں ہے، ان

میں سے ایک کو میں نے اپنے رب کے لئے قرض دے دیا، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجھ سے قرض کو قبول کر لیا ہے، پھر نبی اکرم ﷺ نے یہ باغ ان یتیموں کو عطا فرما دیا جو ان کی پرورش میں تھے اور نبی اکرم ﷺ دعا فرماتے تھے اے میرے رب! ابو الدحداح رضی اللہ عنہ کے لئے جنت میں کھجور کے ایسے باغ ہوں کہ ان کے گچھے لٹکے ہوئے ہوں جن سے پھل آسانی سے توڑا جا سکے۔ (تفسیر در منثور)

قَرْضًا حَسَنًا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرض حسن سے مراد فی سبیل اللہ خرچ کرنا ہے، بعض فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد تسبیح وتقدیس ہے۔ (در منثور)

فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً: یحییٰ بن ابی کثیرؒ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً نازل ہوئی تو کثیر اللہ تعالیٰ کے نزدیک لاکھ دو لاکھ سے زیادہ ہے اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کو دو لاکھ نیکیوں تک بڑھا دیتے ہیں۔ سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت فمن جاء بالحسنة فله عشر امثالها (انعام ۱۶۰) نازل ہوئی، تو آپ ﷺ نے فرمایا اے میرے رب! میری امت کے لیے اور زیادہ کیجیے تو یہ آیت مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ نازل ہوئی، پھر آپ نے فرمایا اے میرے رب! میری امت کے لئے اور زیادہ کیجئے، تو آیت اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ نازل ہوئی۔ (تفسیر در منثور)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ پر فرشتہ کہتا ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کو آج کے دن قرض دے گا کل کے دن (یعنی قیامت کے دن) بدلہ دیا جائے گا اور دوسرے دروازہ پر فرشتہ آواز لگاتا ہے اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عنایت فرما اور روکنے والے کے مال کو تلف کر اور دوسرے دروازہ کا فرشتہ آواز لگاتا ہے

اے لوگو! اپنے رب کی طرف آجاؤ وہ مال جو تھوڑا ہو اور کافی ہو جائے وہ بہتر ہے اس مال سے جو بہت ہو اور (خدا کی یاد سے) غافل کر دے۔ اور (اس طرح) دوسرے دروازے کا فرشتہ آواز لگاتا ہے اے آدم کے بیٹے! موت کے لئے جنو اور عمارتیں بناؤ ویران ہونے کے لئے۔ (العظمت لابی الشیخ)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور آپ اس حدیث کو اپنے رب عزوجل سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں یَا ابْنَ آدَمَ، أَوْدِعْ مِنْ كَنْزِكَ عِنْدِي لَا حَرَقَ، وَلَا غَرَقَ، وَلَا سَرَقَ أُوفِيكَهُ أَحْوَجَ مَا تَكُونُ إِلَيْهِ اے آدم کے بیٹے! اپنے خزانے میں سے میرے پاس امانت رکھ دو اور میں تجھے پورا پورا واپس کر دوں گا جبکہ تو اس کا زیادہ محتاج ہو گا۔ (شعب الایمان)

حضرت کعب احبار رحمہ اللہ سے ایک شخص نے کہا میں نے ایک شخص سے یہ سنا ہے کہ جو شخص سورۃ آیت قل ھو اللہ) الخ، کو ایک دفعہ پڑھے اس کیلئے موتی اور یاقوت کے دس لاکھ محل جنت میں بنتے ہیں، کیا میں اسے سچ مان لوں؟ آپ نے فرمایا اس میں تعجب کی کون سی بات ہے، بلکہ بیس اور بھی اور بیس لاکھ اور بھی اور اس قدر کہ ان کی گنتی بجز جناب باری کے کسی کو معلوم ہی نہ ہو، پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا جب اللہ تعالیٰ آیت (اَضعَافًا كَثِيرَةً) فرماتا ہے تو پھر مخلوق اس کی گنتی کی طاقت کیسے رکھے گی؟ پھر فرمایا رزق کی کمی بیشی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہوئے بخیلی نہ کرو، وہ جسے دے اس میں بھی حکمت ہے اور نہ دے اس میں بھی مصلحت ہے، تم سب قیامت کے دن اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ: قتادہؒ سے روایت ہے کہ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ سے مراد ہے کہ اللہ صدقہ کو روکتے ہیں وَيَبْصُطُ یعنی اس کا بدلہ عطا فرماتے ہیں (اور) وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ یعنی ان کو مٹی سے پیدا فرمایا اور مٹی میں واپس لوٹا دے گا۔ (ابن ابی حاتم)

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیمت مہنگی ہو گئی تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارے لئے قیمت مقرر فرما دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیمت مقرر فرمانے والا ہے اور تنگی کرنے والا

کشادگی کرنے والا اور رزق دینے والا ہے، میں امید رکھتا ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ سے (اس حال میں) ملاقات کروں کہ تم میں سے کوئی بھی مجھ سے خون اور مال کے ظلم کا مقابلہ کرنے والا نہ ہوگا، قیمت بڑھانا گھٹانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ (احمد، ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا یارسول اللہ! ہر چیز کی قیمت مقرر کر دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلکہ میں دعا کرتا ہوں پھر آپ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا یارسول اللہ قیمت (مقرر کر دیجئے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بل اللہ یخفض ویرفع وإنّي لأرجو أن ألقی اللہ ولیس لأحد عندی مظلمۃ بلکہ اللہ تعالیٰ قیمت کو نیچے کرتے ہیں اور اونچا کرتے ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کروں کہ تم میں سے کسی کے لئے میرے اوپر ظلم کا دھبہ نہ ہوگا۔ (ابوداؤد، بیہقی)

قصہ طالوت وجالوت وحضرت داؤد علیہ السلام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (۲۴۶) وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۲۴۷) وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۲۴۸) فَلَمَّا

فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (۲۴۹) وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (۲۵۰) فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (۲۵۱) تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (۲۵۲) البقرہ

جواب ترجمہ: کیا تمہیں موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے گروہ کے اس واقعے کا علم نہیں ہوا جب انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا تھا کہ ہمارا ایک بادشاہ مقرر کر دیجیے تاکہ (اس کے جھنڈے تلے) ہم اللہ کے راستے میں جنگ کر سکیں۔ نبی نے کہا: کیا تم لوگوں سے یہ بات کچھ بعید ہے کہ جب تم پر جنگ فرض کی جائے تو تم نہ لڑو؟ انہوں نے کہا: بھلا ہمیں کیا ہو جائے گا جو ہم اللہ کے راستے میں جنگ نہ کریں گے حالانکہ ہمیں اپنے گھروں اور اپنے بچوں کے پاس سے نکال باہر کیا گیا ہے۔ پھر (ہوا یہی کہ) جب ان پر جنگ فرض کی گئی تو ان میں سے تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب پیٹھ پھیر گئے، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (آیت ۲۴۶)

اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ: اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا ہے۔ کہنے لگے: بھلا اس کو ہم پر بادشاہت کرنے کا حق کہاں سے آ گیا؟ ہم اس کے مقابلے میں بادشاہت کے زیادہ مستحق ہیں، اور اس کو تو مالی وسعت بھی حاصل نہیں۔ نبی نے کہا: اللہ نے ان کو تم پر فضیلت دے کر چنا ہے اور انہیں علم اور جسم میں (تم سے) زیادہ وسعت عطا کی ہے، اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ (آیت ۲۴۷)

اور ان سے ان کے نبی نے یہ بھی کہا کہ: طالوت کی بادشاہت کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (واپس) آجائے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے سکینت کا سامان ہے، اور موسیٰ اور ہارون نے جو اشیاء چھوڑی تھیں ان میں سے کچھ باقی ماندہ چیزیں ہیں۔ اسے فرشتے اٹھائے ہوئے لائیں گے اگر تم مومن ہو تو تمہارے لیے اس میں بڑی نشانی ہے۔ (آیت ۲۴۸)

چنانچہ جب طالوت لشکر کے ساتھ روانہ ہوا تو اس نے (لشکر والوں سے) کہا کہ: اللہ ایک دریا کے ذریعے تمہارا امتحان لینے والا ہے، جو شخص اس دریا سے پانی پیے گا وہ میرا آدمی نہیں ہو گا، اور جو اسے نہیں چکھے گا وہ میرا آدمی ہو گا، الا یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو کچھ حرج نہیں) پھر (ہوا یہ کہ) ان میں سے تھوڑے آدمیوں کے سوا باقی سب نے اس دریا سے (خوب) پانی پیا، چنانچہ جب وہ (یعنی طالوت) اور اس کے ساتھ ایمان رکھنے والے دریا کے پار اترے، تو یہ لوگ (جنہوں نے طالوت کا حکم نہیں مانا تھا) کہنے لگے کہ: آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی ہم میں بالکل طاقت نہیں ہے۔ (مگر) جن لوگوں کا ایمان تھا کہ وہ اللہ سے جا ملنے والے ہیں انہوں نے کہا کہ: نہ جانے کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں، اور اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں۔ (آیت ۲۴۹)

اور جب یہ لوگ جالوت اور اس کے لشکروں کے آمنے سامنے ہوئے تو انہوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار صبر و استقلال کی صفت ہم پر انڈیل دے، ہمیں ثابت قدمی بخش دے، اور ہمیں اس کافر قوم کے مقابلے میں فتح و نصرت عطا فرما دے۔ (آیت ۲۵۰) چنانچہ انہوں نے اللہ کے حکم سے ان (جالوت کے ساتھیوں) کو شکست دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا، اور اللہ نے اس کو سلطنت اور دانائی عطا کی اور جو علم چاہا اس کو عطا فرمایا، اگر اللہ لوگوں کا ایک دوسرے کے ذریعے دفاع نہ کرے تو زمین میں فساد پھیل جائے، لیکن اللہ تمام جہانوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ (آیت ۲۵۱) یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ کے سامنے ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں، اور آپ بیشک ان پیغمبروں میں

سے ہیں جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔(۲۵۲)

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ : اَلْمَلَا کا معنی ہے اشراف لوگ، گویا کہ وہ شرف وعزت سے بھرے ہوئے ہیں اور زجاج نے کہا ہے: انہیں یہ نام دیا گیا کیونکہ وہ ان چیزوں سے بھرے ہوئے تھے جن کی انہیں ضرورت اور احتیاج ہوتی تھی اور اس آیت میں اَلْمَلَا سے مراد قوم ہے، کیونکہ معنی اس کا تقاضا کرتا ہے اور اَلْمَلَا اسم جمع ہے جیسا کہ قوم اور رھط وغیرہ اور اَلْمَلَا کا معنی خلق بھی ہے اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: أَحْسِنُوا الْمَلَأَ كُلُّكُمْ سَيَرْوَى تم اخلاق اچھے کرلو تو تم تمام کے تمام سیر اب (خوشحال) ہو جاؤ گے۔(مسلم)

مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی: فرعون سے نجات پانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ان عمالقہ سے جہاد کرنے کی دعوت دی تھی، جو بنی اسرائیل کے وطن فلسطین پر قابض ہو گئے تھے، مگر بنی اسرائیل نے انکار کر دیا، جس کی سزاء میں انہیں صحرائے سینا میں محصور کر دیا گیا اور اسی حالت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو گئی، بعد میں حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں فلسطین کا ایک بڑا علاقہ فتح ہوا۔

حضرت یوشع علیہ السلام آخر عمر تک ان کی نگرانی کرتے رہے اور ان کے معاملات کے تصفیے کے لئے قاضی مقرر کئے، تقریباً تین سو سال تک نظام اسی طرح چلتا رہا کہ بنی اسرائیل کا کوئی بادشاہ یا حکمران نہیں بلکہ قبیلوں کے سردار حضرت یوشع علیہ السلام کے مقرر کئے ہوئے نظام کے تحت قاضی ہوا کرتے تھے، اسی لئے اس دور کو قاضیوں کا زمانہ کہا جاتا تھا، بائبل کی کتاب قُضاۃ میں اسی زمانہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے، چونکہ اس دور میں پوری قوم کا کوئی متفقہ حکمران نہیں تھا، اس لئے آس پاس کی قومیں ان پر حملہ آور ہوتی تھیں، آخر میں فلسطین کی بت پرست قوم نے ان پر حملہ کر کے انہیں سخت شکست دی اور وہ متبرک صندوق بھی اٹھا کر لے گئے جس میں موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی کچھ یادگاریں، تورات کا نسخہ اور آسمانی غذا مَن کا مرتبان محفوظ تھا اور جسے بنی اسرائیل تبرک کے لئے جنگوں کے موقع پر آگے رکھا کرتے تھے۔(توضیح القرآن)

جالوت جو کافر بادشاہ تھا اس نے بنی اسرائیل کے بہت سے شہروں پر قبضہ کر لیا اور سینکڑوں بچوں کو پکڑ کے لے گیا اور ان کو غلام اور لونڈی بنالیا اور بنی اسرائیل سے توریت بھی چھین کر لے گیا۔ (معارف للکاندھلوی)

إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ: جب ذلت اور رسوائی یہاں تک پہنچ گئی تو بنی اسرائیل کے اشراف اور سرداروں کو خیال پیدا ہوا کہ اس ذلت کا کوئی مداوی ہو اس لیے انہوں نے اپنے نبی سے ایک بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی جس کی قیادت میں وہ جہاد کریں۔

وہ نبی جن سے بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی گئی وہ حضرت شمویل بن بال بن علقمہ تھے اور وہ ابن العجوز کے لقب سے معروف تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت شمعون تھے، سدی نے یہی کہا ہے اور بلاشبہ کہا گیا ہے کہ ابن العجوز لقب اس لئے تھا کہ اس کی ماں بوڑھی تھی تو اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بیٹے کی التجا کی حالانکہ وہ بوڑھی اور بانجھ ہو چکی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹا عطا فرمادیا اور انہیں سمعون بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس بڑھیا نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ وہ اسے بیٹا عطا فرمائے، تو رب کریم نے اس کی دعا سن لی اور بڑھیا نے بچے کو جنم دیا، پس اس نے اس کا نام سمعون رکھا، وہ کہتی سَمِعَ اللّٰهُ دُعَائِي اللہ تعالیٰ نے میری دعا سن لی ہے اور سین عبرانی زبان میں شین ہو جاتی ہے اور وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ (قرطبی)

حالات کے اس پس منظر میں ایک قاضی حضرت سموئیل علیہ السلام (شمویل بن بال) کو نبوت کا منصب عطا ہوا، ان کے دور میں بھی فلسطینیوں کا ظلم و ستم جاری رہا تو بنی اسرائیل نے ان سے درخواست کی کہ ان پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیا جائے، اس کے نتیجے میں طالوت کو بادشاہ بنایا گیا۔ (توضیح القرآن)

قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا: حضرت شمویل نے ان کو یہ جواب دیا کہ کیا تم سے اس کی توقع ہے کہ اگر تم کو جہاد و قتال کا حکم ہو جائے تو نہ لڑو یعنی تمہاری حالت سے مجھے

توقع نہیں کہ اگر تم پر جہاد و قتال فرض ہو جائے تو تم بادشاہ کے ساتھ ہو کر جہاد و قتال کرو۔

قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا: بنی اسرائیل نے کہا کہ ہمیں کیا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد و قتال نہ کریں، حالانکہ جہاد کے لیے اس وقت ایک خاص سبب بھی موجود ہے وہ یہ کہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے بچوں سے جدا کر دیے گئے غرض یہ کہ اس طرح لوگوں نے جہاد پر اپنی پختگی اور آمادگی کو ظاہر کیا۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ: جب ان اشراف کے اصرار اور اظہار پختگی کے بعد ان پر جہاد و قتال فرض کیا گیا تو سوائے چند آدمیوں کے سب پھر گئے، ان کی نیتوں میں فتور آ گیا، ان کے حوصلے جواب دے گئے اور وہ چند آدمی وہ تھے کہ جو نہر سے پار اترے، اسی لیے ہمارے پیارے آقا و مولا نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَسَلُوا اللَّهَ الْعَافِيَةَ فَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فَاثْبُتُوا دشمن کا سامنا کرنے کی تمنا اور آرزو نہ کیا کرو ہاں جب مقابلہ کی نوبت آ جائے تو پھر ڈٹ کر کھڑے رہو۔

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ: اور اللہ تعالیٰ ظالموں اور ستم گروں کو خوب جانتا ہے ظلم اور معصیت آدمی کو بزدل بنا دیتی ہے اور ظلم و ستم کی اصل جڑ نبی پر اعتراض کرنا ہے جس نے نبی کی بات کو بے چون و چرا قبول کیا اس نے اپنی جان پر رحم کیا اور جس نے نبی کی بات پر اعتراض کیا اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا: اشراف بنی اسرائیل کی درخواست قبول کر لی گئی، نبی شمویل نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ بنایا ہے، حضرت طالوت نبی نہیں تھے، یہ حضرت بن یامین کی اولاد میں سے تھے، یہ فقیر آدمی تھے، ان کے پاس مال و دولت کی فراوانی نہیں تھی، بعض کہتے ہیں کہ آپ رنگریز تھے، بعض کہتے ہیں کہ آپ سقاء (پانی پلانے والے) تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم کی فراوانی اور جسمانی حسن و جمال سے نوازا ہوا تھا، اللہ نے آپ کو لمبا قد رعطا فرمایا تھا، لوگوں میں نمایاں دکھائی دیتے تھے، ان کی جسمانی ساخت کی وجہ سے ہی

انہیں طالوت کہا گیا۔

قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ: بنی اسرائیل کی اکھڑ مزاجی تاریخی ہے، وہ خلاف طبع اور خلاف مزاج بات کسی صورت قبول نہیں کرتے، یہاں انہوں نے نبی کی خدمت میں درخواست کی کہ ہمارے اوپر ڈھائے جانے والے مظالم کا قلع قمع کرنے کے لیے کسی کو بادشاہ مقرر کیجیے، چنانچہ جس وقت ان کے نبی نے ان کے جواب میں کہا اول تو یہ ہے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یعنی تمہاری عزت اور سرداری کے حصول کے لیے طالوت بادشاہ مقرر کیا ہے سنتے ہی نبی پر اعتراضات شروع کر دیے اور یہ کہا کہ طالوت کو ہم پر حکومت اور سلطنت کا کیا حق حاصل ہے، طالوت ایک فقیر آدمی ہے قوم کا سقاء یا رنگریز ہے شاہی خاندان سے نہیں اور ہم سلطنت کے اس سے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ ہم شاہی خاندان سے ہیں اس لیے کہ ہم یہود کی اولاد ہیں جس میں بادشاہت چلی آرہی ہے اور علاوہ ازیں طالوت کو مال دولت کی فراخی اور فروانی بھی حاصل نہیں اور ہم دولت مند اور اصحاب ثروت ہیں لہذا ایسے شخص کو کہ جس کو نہ خاندانی وجاہت حاصل ہے اور نہ مالی عزت حاصل ہے بادشاہ بنانا کسی طرح مناسب نہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کر دیا تو ان لوگوں نے تعجب کا اظہار کیا، ان کی اطاعت و فرمانبرداری سے اعراض وروگردانی کا اظہار کرنے لگے، یہ سوچنے لگے کہ حضرت طالوت ہمارے اوپر کیسے حکمرانی کریں گے، جب کہ ہم ان سے زیادہ اس کا استحقاق رکھتے ہیں، حضرت طالوت تو مال و دولت کی فراوانی بھی نہیں رکھتے، اس کی وجہ کیا تھی؟ حضرات مفسرین کرام نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ چونکہ نبوت بنی اسرائیل میں لاوی بن یعقوب کی اولاد کے ساتھ خاص سمجھی جاتی تھی، ان میں سے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون تھے، جب کہ مملکتی امور بادشاہی وغیرہ یہوذا کی اولاد میں مخصوص سمجھی جاتی تھی، ان سے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان تھے، جب کہ طالوت ان دونوں خاندانوں میں سے نہیں تھے کیونکہ وہ بنیامین کی اولاد میں سے تھے، اسی بناء پر انہوں نے ان

کے اپنے اوپر بادشاہ مقرر ہونے پر تعجب کا اظہار کیا تھا، ان کا خیال یہ تھا کہ بادشاہت کے حق دار تو ہم ہی ہیں، پھر اس شبہ کو انہوں نے ایک دوسرے شبہ کے ساتھ مضبوط کیا اور وہ یوں کہتے تھے کہ حضرت طالوت کو تو مال و دولت کی فراوانی بھی نہیں حاصل۔۔

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ: حضرت شمویل نبی نے ان کے اعتراض کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ تمہارے یہ اعتراضات سب مہمل اور لایعنی ہیں تحقیق اللہ تعالیٰ نے طالوت کو محض تمہارے نفع اور فائدہ کے لیے پسند فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ جس کو سلطنت کے لیے پسند فرمائیں گے اس سے بڑھ کر کوئی شخص سلطنت اور حکمرانی کا اہل نہیں ہو سکتا اور خصوصاً جب کہ ارادہ خداوندی تمہارے نفع اور خیر کا ہے جیسا کہ لفظ عَلَيْكُمْ سے صاف ظاہر ہے کہ تو ایسی صورت میں کسی شر اور فساد کا احتمال ہی نہیں رہتا معلوم ہوا کہ طالوت کی سلطنت تمہارے لیے سراپا خیر و برکت ہو گی اور دینی اور دنیوی ہر اعتبار سے تمہارے لیے باعث عزت ہو گی۔

حق جل شانہ جب کسی قوم کی تباہی اور بربادی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس پر ظالموں اور ستم گروں کو حاکم بناتے ہیں اور جب کسی قوم کی فلاح اور بہبودی کا ارادہ فرماتے ہیں تو پاکیزہ اور پسندیدہ حکمراں ان کے لیے مقرر فرماتے ہیں غرض یہ کہ طالوت کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری خیر اور نفع اور مصلحت کے لیے پسند فرمایا ہے اور تم اپنی مصلحتوں کو کما حقہ نہیں سمجھ سکتے اس لیے اس انتخاب خداوندی میں تم کو خدشہ اور وسوسہ نہ کرنا چاہیے اور دوسرے یہ کہ سلطنت اور بادشاہت کا اصل دار مدار عقل سلیم اور جسم سلیم پر ہے اور حسب و نسب اور مال دولت پر نہیں جس شخص کے قوائے عقلیہ ادراکیہ اور قوائے جسمانیہ صحیح اور تندرست ہوں وہی بادشاہ بنائے جانے کا مستحق ہے اور یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ نے طالوت کو عطا کی ہیں چنانچہ اللہ نے اس کو علم و فہم اور عقل و دانش میں وسعت اور فراخی عطا کی ہے اور قوت جسمانیہ اور بدنیہ میں بھی اس کو زیادتی عطا فرمائی ہے اور بادشاہ ہونے کے لیے انہی دو صفتوں کی ضرورت ہے علم اور فہم سے ملکی انتظام پر قدرت ہو گی اور بدنی قوت اور جسامت شجاعت اور بہادری

کی علامت ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب فہم و فراست کے ساتھ شجاعت بھی مل جائے گی تو کارخانہ سلطنت نہایت خیر و خوبی کے ساتھ چلے گا اس لیے کہ سلطنت چلانے کے لیے یہ نہات ضروری ہے کہ بادشاہ کی عظمت اور ہیبت لوگوں کے قلوب میں راسخ ہو اگر دلوں میں بادشاہ کی عظمت اور ہیبت نہ ہو تو لوگ اطاعت اور فرمانبرداری نہ کریں گے اور کارخانہ سلطنت نہ چلے گا اور حقیقی عظمت اور ہیبت کا مدار فہم و فراست اور قوت و شجاعت پر ہے اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ نے طالوت کو عطا کی ہیں۔

طالوت علم اور فہم میں بھی سب سے بڑھے ہوئے تھے اور قوت جسمانیہ کا یہ حال تھا کہ طالوت تمام بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ خوبصورت اور قد آور اور بہادر تھے اور اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طالوت مُلْھَم مِّنَ اللہ بھی تھے یعنی صاحب الہام بھی تھے اس لیے کہ قرآن کریم میں جس کسی کو شان اصطفاء سے حصہ ملا ہے وہ ضرور صاحب الہام اور صاحب کشف کرامت ہوا ہے۔ اور فِی الْعِلْمِ کا لفظ اپنے عموم اور اطلاق کی بناء پر علم ظاہری اور علم باطنی اور علم شریعت اور علم سلطنت اور علم سیاست سب کو شامل ہے کیونکہ ایسی سلطنت جس سے دین اور دنیا دونوں ہی درست ہوں وہ جب ہو سکتی ہے کہ جب بادشاہ اوصاف مذکورہ کا حامل ہو۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ: اور تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہیں اس کی عطا اور بخشش کے لیے کسی اہلیت اور قابلیت کی شرط نہیں بلکہ اہلیت و قابلیت کے لیے اس کی عطا شرط ہے کہ کسی کی مجال کیا ہے جو اس خداوند ذوالجلال سے سوال کر سکے، وہ مالک مطلق ہیں جس کو چاہتے ہیں بادشاہی عطا کرتے ہیں اور اگر وہ شخص بادشاہت کی ذرہ برابر لیاقت بھی نہ رکھتا ہو تو اس کو سلطنت کی لیاقت اور قابلیت عطا فرما دیتے ہیں اور غیب سے اس کی مدد فرماتے ہیں۔ (معارف القرآن) اہم بات یہ ہے کہ ملک اللہ کا ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں، وہ اپنا ملک اپنے بندوں میں سے جسے چاہے دے دے دوسروں کو اس کے فعل پر کسی قسم کے اعتراض کا حق نہیں ہے۔

وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ: اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت اور کشائش والے ہیں اور اس کے خزائن کی کوئی حد اور نہایت نہیں، انہیں کسی فقیر کو امیر بنادینا کیا مشکل ہے اور سب کچھ جاننے والے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ کون بادشاہت کے لائق ہے اور کون اس کے لائق نہیں۔ (معارف القرآن) اللہ تعالیٰ فضل ،رزق اور رحمت میں وسعت دینے والا ہے، اس میں اشارہ کر دیا کہ ان لوگوں نے حضرت طالوت کے فقیر ہونے پر تعجب کا اظہار کیا تھا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل ورحمت میں وسعت دینے والا ہے، جب اللہ تعالیٰ بادشاہی اسے عطاء کر رہے ہیں اور اس کے علم میں ہوا کہ ملک وبادشاہی مال کے بغیر نہیں چل رہی تو اللہ فضل ورزق اور مال میں وسعت کر دے گا۔ اسی طرح واسع کا ایک معنیٰ کشائش اور توسیع کرنے والا، یعنی اللہ جسے چاہے اپنی نعمتوں میں وسعت عطا کر دے۔ علیم کا معنیٰ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کسی سلطنت کے حال اور مستقبل میں چلنے میں کس چیز کی ضرورت ہے۔

طالوت کی بادشاہی کے چار اسباب: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں طالوت کی بادشاہی کے چار سبب بیان کیے ① اول اس کی خداداد صلاحیتیں جس کو اصطفاء سے تعبیر کیا۔ ② دوم وسعت علم جس پر حکمرانی اور تدبیر ملکی کا دارومدار ہے۔ ③ سوم توانا جسم جو شجاعت اور ہیبت اور قدرت علی المدافعت کا موجب ہے۔ ④ چہارم تائید غیبی جس کو وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ اور اِنَّ اٰیَۃَ مُلْکِہٖ، سے ظاہر فرمایا چونکہ بنی اسرائیل کے سرداروں نے طالوت کے بادشاہ بننے کو بہت بعید سمجھا اس لیے ان کے رد میں قدرے تفصیل فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے۔

① کہ بادشاہت کا اصلی اور حقیقی سبب اللہ کی عطاء اور بخشش اور اس کا اصطفاء اور پسندیدگی ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بادشاہت کے لیے پسند فرماتا ہے وہی بادشاہ ہے اور اللہ جس کو پسند فرمائے وہ کبھی ناپسندیدہ نہیں ہو سکتا۔

② اور اگر تمہاری نظر ظاہری اسباب پر ہے تو سمجھ لو کہ سلطنت کا مدار حسب ونسب اور مال ودولت پر نہیں اس لیے کہ مال آنے جانے والی چیز ہے، صبح آتا ہے اور شام جاتا ہے بلکہ سلطنت کا ظاہری

سبب یہ ہے کہ علم اور فہم ہو اور اس کے ساتھ قوت بدنیہ ہو تا کہ اس قوت جسمانیہ سے علم اور فہم کے موافق عمل کرنے کی قدرت حاصل ہو سکے ورنہ علم بغیر قدرت اور قوت کے بے کار ہے خصوصا کارخانہ سلطنت محض علم سے بدون قدرت کے نہیں چلتا۔

③ اور تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم کے بعد کسی کو مجال دم زندگی نہیں وہ تمام مصلحتوں کو تم سے زیادہ جانتا ہے اور وہ ارحم الراحمین ہے وہ تم پر تم سے زیادہ مہربان ہے اور اس لیے اب تم کو طالوت کی بادشاہت میں کوئی حجت نکالنا روا اور زیبا نہیں دیتا مگر یہ ظالم کب خاموش ہونے والے تھے اللہ کے نبی نے ان ظالموں کے اعتراض کا نہایت شافی اور کافی جواب دیا ہے لیکن یہ لوگ اپنے وسوسوں کی وادی تیہ میں بھٹکتے رہے

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ: اور بالآخر ان لوگوں نے حضرت شمویل سے یہ کہا کہ اچھا ہمیں طالوت کی بادشاہت اور ان کے برگزیدہ ہونے کی کوئی ظاہری نشانی بتلایئے جسے دیکھ کر ہمیں ان کے بادشاہ ہونے کا بالبداہت یقین آجائے اور قلب مطمئن ہو جائے اس وقت ان کے پیغمبر نے یہ فرمایا کہ تحقیق طالوت کے من جانب اللہ بادشاہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس بلا کسی ظاہری سبب کے وہ صندوق آجائے گا جو تم سے چھن گیا تھا اس صندوق کے اس طرح آنے میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری دل جمعی اور سکون قلب اور آرام دل کا سامان ہو گا اور اس صندوق میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے خاندان کے کچھ تبرکات بھی ہوں گے جن کو وہ چھوڑ گئے ہیں ان تبرکات کا تمہیں مل جانا صد ہزار خیرات وبرکات کا موجب ہو گا۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

اور اس صندوق کی آمد بھی عجیب شان سے ہو گی اور وہ یہ کہ فرشتے اس تابوت کو اٹھا کر لائیں گے اور طالوت کے سامنے لا کر رکھ دیں گے تحقیق اس صندوق کے اس طرح آنے میں تمہارے لیے ایک نشانی ہو گی جو طالوت کی بادشاہت اور میری نبوت کی صداقت کی دلیل ہو گی اگر تم باور کرو

صندوق کا اس خارق عادت طریق پر آنا جس طرح طالوت کی بادشاہت کی دلیل ہو گا اسی طرح حضرت شمویل کی نبوت اور صداقت کی دلیل ہو گا کہ اللہ کے نبی نے جس طرح خبر دی تھی اسی طرح ظہور ہوا اور فرشتوں نے وہ تابوت لا کر طالوت کے سامنے رکھ دیا بنی اسرائیل خوش ہو گئے اور ان کو بادشاہ مان لیا اور سب کے سب جہاد کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔

تابوت کے بارے میں حضرات مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت آدم علیہ السلام پر اتارا تھا، اور وہ آپ کے پاس رہا، یہاں تک کہ (وراثتاً) چلتے چلتے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچ گیا بنی اسرائیل اس کی برکت سے ان پر غالب آتے تھے جو کوئی ان سے جنگ لڑتے حتی کہ بنی اسرائیل نافرمان ہو گئے تو ان سے تابوت چھین لیا گیا اور عمالقہ نے اسے چھینا تھا، سدی کے قول کے مطابق وہ جالوت اور اس کے ساتھی تھے اور انہوں نے ان سے تابوت چھین لیا تھا۔

ایک نشانی اس تابوت میں یہ تھی کہ اس میں سے رونے کی آواز سنائی دیتی تھی، جب وہ اسے سنتے تو وہ جنگ کے لئے چل پڑتے تھے اور جب یہ آواز پر سکون ہو جاتی تو نہ وہ چلتے اور نہ ہی تابوت چلتا۔ وہ لوگ اس تابوت کو میدان جنگ میں رکھتے تھے اور وہ مسلسل غالب آتے رہے یہاں تک کہ وہ نافرمان اور گستاخ ہو گئے تو وہ مغلوب ہو گئے اور ان سے تابوت لے لیا گیا اور وہ ذلیل و رسوا ہو گئے۔

انہوں نے اسے اپنے کنیسہ (عبادتگاہ) میں رکھا، اس میں بت تھے تو وہ بت صبح کے وقت اوندھے پڑے تھے، اور ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اسے اپنے بت خانہ میں بڑے بت کے نیچے رکھا، پھر انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ وہ بت کے اوپر پڑا ہوا تھا تو انہوں نے اسے اٹھایا اور اسے بت کی ٹانگوں کے ساتھ باندھ دیا اور پھر صبح اس حال میں کی کہ بت کے دونوں ہاتھ اور اس کی دونوں ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں اور تابوت کے نیچے پڑی ہوئی تھیں، انہوں نے اسے اٹھایا اور ایک قوم کے گاؤں میں جا کر رکھ دیا تو اس قوم کی گردنوں میں درد ہونے لگی۔

مفسرین یہ بھی لکھتے ہیں کہ انہوں نے اسے ایک قوم کے بول و براز اور پاخانے والی جگہ رکھا تو وہ

بواسیر کی بیماری میں مبتلا ہو گئے، جب ان کی تکلیف بہت بڑھ گئی تو انہوں نے کہا: یہ تکلیف اسی تابوت کی تحقیر اور بے ادبی کرنے کی وجہ سے ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اسے بنی اسرائیل کی طرف واپس لوٹا دیں، چنانچہ انہوں نے اسے دو بیلوں کے درمیان ریڑھے پر رکھا اور انہیں بنی اسرائیل کے شہروں کی طرف بھیج دیا اور اللہ تعالیٰ نے چار فرشتے بھیجے وہ بیلوں کو ہانکتے رہے یہاں تک کہ وہ دونوں بنی اسرائیل میں داخل ہو گئے، یہ لوگ طالوت کی حکمرانی میں تھے تو انہیں مدد و نصرت کا یقین ہو گیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فرشتے آسمان و زمین کے درمیان اس تابوت کو اٹھائے ہوئے سب لوگوں کے سامنے لائے اور حضرت طالوت بادشاہ کے سامنے لا رکھا۔ اس تابوت کو ان کے ہاں دیکھ کر انہیں نبی کی نبوت اور طالوت کی بادشاہت کا یقین ہو گیا۔

اور وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تابوت (صندوق) لمبائی کے لحاظ سے تین ہاتھ لمبا تھا اور چوڑائی کے لحاظ سے دو ہاتھ چوڑا تھا، کلبی نے کہا ہے: یہ شمسار کی لکڑی سے بنا ہوا تھا جس سے کنگھیاں بنائی جاتی ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس تابوت (صدوق) میں حضرت موسیٰ علیہ السلام تورات رکھا کرتے تھے، یہ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔

فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سکینہ سے مراد رحمت ہے۔ (ابن المنذر، در منثور) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اور روایت ہے کہ سکینہ سے مراد اطمینان ہے۔ (در منثور) ابن عباس کی ایک اور روایت ہے کہ سکینہ ایک جانور ہے بلی کی آنکھوں جتنی اس کی دو آنکھیں ہیں، جن میں روشنی کی کرن ہے، جب دو لشکر (یعنی مؤمن اور کافر آپس میں آمنے سامنے ہوتے تو وہ جانور اپنے ہاتھ نکالتا اور ان کی طرف دیکھتا ہے تو اس کے رعب کی وجہ سے کافروں کا لشکر شکست کھا جاتا ہے۔ (در منثور) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سکینہ تیز چلنے والی ہوا ہے۔ (طبرانی الاوسط) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سکینہ تیز ہوا ہے اور اس کے دو سر ہیں۔ (ابن جریر، در منثور) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لفظ آیت فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ کے

بارے میں روایت ہے کہ وہ سائیں سائیں کرنے والی تیز ہوا ہے جس کی ایک صورت ہے اور اس کا چہرہ انسان کے چہرے کی طرح ہے۔(ابن جریر، در منثور)

حضرت نبی کریم ﷺ ایک مجلس میں جلوہ افروز تھے، آپ ﷺ نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف بلند فرمائی، پھر جھکالی، پھر بلند کی، اس کے بارے میں آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں یعنی مجلس والے جو آپ کے سامنے تھے پھر ان پر سکینہ نازل ہوئی فرشتے اس کو قبہ کی طرح اٹھائے ہوئے تھے۔ جب یہ فرشتے ان کے قریب ہوئے تو ان میں سے ایک آدمی نے غلط بات کی پس وہ ان سے اٹھالی گئی۔(ابن ابی حاتم، ابن عساکر، در منثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُم کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا وہ جنت میں سے سونے کا ایک طشت ہے جس میں انبیاء کے قلوب کو دھویا گیا تھا موسیٰ علیہ السلام نے اس میں تختیاں رکھی تھیں۔(ابن جریر، در منثور) وھب بن منبہ رحمہ اللہ سے سکینہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روح ہے جو بات کرتی ہے جب لوگ کسی چیز میں اختلاف کرتے ہیں تو وہ ان کو مراد بتاتی ہے۔(ابن جریر، ابن ابی حاتم)

امام رازی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول نقل کیا ہے کہ سکینہ زبرجد اور یاقوت کی ایک شکل ہے جس کا سر بلی کے سر کی طرح ہے، اس کی دم بلی کی دم جیسی ہے، جب یہ بلی کی طرح چلاتی ہے تو یہ تابوت دشمن کے مقابلے میں ہوتا ہے اور یہ لوگ اس کے ساتھ گزرتے ہیں، جب یہ تابوت ٹھہر جاتا ہے تو یہ بھی ٹھہر جاتے ہیں اور مدد اترتی ہے۔(مفاتیح الغیب)

ابو مسلم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سکینہ ایک چیز تھی جو تابوت میں رکھی ہوئی تھی اور یہ چیز اللہ کی طرف سے اتاری گئی کتابوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کے بعد والے انبیاء کو بشارتیں تھیں، جن میں کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ طالوت اور اس کے لشکر کی مدد و نصرت کرے گا اور دشمن کا خوف ان سے دور کر دے گا۔(مفاتیح الغیب)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ سے سکینہ کے بارے میں مروی ہے کہ اس میں کوئی ایسی چیز ہے کہ اس کی طرف ان کے دل سکون پاتے ہیں یعنی جو نشانیاں دیکھتے ہیں ان سے سکون پاتے ہیں۔ (در منثور) حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ سکینہ سے مراد وقار ہے۔ (عبد الرزاق، در منثور)

وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ: اس تابوت میں تمہارے پروردگار کی طرف سے سکینت کا سامان ہے اور موسیٰ اور ہارون نے جو اشیاء چھوڑی تھیں ان میں سے کچھ باقی ماندہ چیزیں ہیں، (اس میں) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت ہارون علیہ السلام کا عصا اور تختیوں کے ٹکڑے تھے کیونکہ وہ ٹوٹ گئی تھیں، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں پھینکا تھا۔ (قرطبی)

ابو صالح نے کہا ہے: بَقِيَّةٌ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، آپ کا لباس، حضرت ہارون علیہ السلام کے کپڑے اور تورات کی دو تختیاں ہیں۔ عطیہ بن سعد نے کہا ہے: اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا عصا، دونوں کے کپڑے اور تختیوں کے ٹکڑے ہیں۔ اور ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے: لوگوں میں سے کچھ کہتے ہیں کہ بَقِيَّةٌ سے مراد سونے کی طشتری میں دو قفیز من (وہ کھانا جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ شریف اور تختیوں کے ٹکڑے ہیں اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: عصا اور نعلین مراد ہیں۔ (المحرر الوجیز، قرطبی)

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کے پاس تختیاں لے کر آئے اور آپ نے انہیں بچھڑے کی عبادت کرتے ہوئے پایا تو آپ نے غصے میں آکر وہ تختیاں پھینک دیں اور وہ ٹوٹ گئیں، پس آپ نے ان میں جو صحیح تھیں انہیں نکال لیا اور جو ٹوٹ گئیں تھیں ان کے ٹکڑے اٹھا لیے اور انہیں تابوت میں رکھ دیا۔ ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے بَقِيَّةٌ سے مراد جہاد کرنا اور دشمنوں سے قتال کرنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: تابوت کے بارے میں ان میں سے کوئی امر ہو، یا تو اس میں لکھا ہوا ہے اور یا پھر اس کی ذات کو لانا ہی اس کے بارے امر کی طرح ہے، اور تبرک کی نسبت آل موسیٰ اور آل ہارون (علیہما السلام) کی طرف اس حیثیت سے کی گئی کہ حکم ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف لکھا ہوا تھا اور وہ تمام کے تمام

آل موسیٰ اور آل ہارون (علیہما السلام) ہی تھے اور کسی آدمی کی آل سے مراد اس کے پیروکار ہوتے ہیں۔ (المحرر الوجیز، قرطبی، کبیر) اس میں تمام انبیاء کی تصویریں تھیں ان کے مساکن و مکانات کی تصویریں تھیں اور آخر میں حضور سید انبیاء ﷺ کی اور حضور کی دولت سرائے اقدس کی تصویر ایک یاقوت سرخ میں تھی کہ حضور بحالت نماز قیام میں ہیں اور گرد آپ کے آپ کے اصحاب حضرت آدم علیہ السلام نے ان تمام تصویروں کو دیکھا یہ صندوق وراثتاً منتقل ہوتا ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچا۔ (کنزالایمان) اور بقیہ وہ تبرکات ہوں گے جو آل موسیٰ اور آل ہارون چھوڑ گئے ہیں) یعنی خود موسیٰ وہارون علیہما السلام چھوڑ گئے ہیں اور آل کا لفظ ان دونوں کی عظمت شان ظاہر کرنے کے لیے ہے یا ان دونوں کے آل سے مراد انبیاء بنی اسرائیل ہیں کیونکہ وہ ان دونوں کی چچا کی اولاد میں تھے۔ (مظہری)

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ: بیشک اس میں تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو، احتمال ہے کہ یہ شمویل نبی کے کلام کا بقیہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ علیحدہ خطاب ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ تابوت اور موسیٰ علیہ السلام کا عصا بحیرہ طبریہ میں ہیں اور یہ دونوں قیامت سے پہلے نکلیں گے، یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ سب کچھ ایک واضح معجزہ ہے اگر تم لوگ مدعی کی بات پر ایمان رکھتے ہو۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِیْكُمْ بِنَهَرٍ: جب حضرت طالوت ان فوجوں کو لے کر شہر سے باہر نکلے تو فوجوں سے یہ کہا کہ اللہ ایک نہر سے تمہارے صبر اور تحمل کی آزمائش فرمائیں گے ان لوگوں نے اللہ کے نبی پر اعتراضات کیے اور طالوت کی بادشاہت کی نشانی طلب کی اللہ نے ان کو ایک آزمائش میں مبتلا کیا بظاہر یہ ابتلاء اور آزمائش کا حکم بذریعہ وحی حضرت شمویل پر نازل ہوا اور پھر حضرت شمویل کی ہدایت کے مطابق طالوت نے اس حکم کا اعلان کیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت طالوت کو اس کا الہام ہوا ہو اس لیے کہ حضرت طالوت خدا کے پسندیدہ تھے اگرچہ نبی نہ تھے مگر ولی ضرور تھے الہام یا خواب کے ذریعہ سے اس کا القاء ہونا کوئی مستبعد نہیں اور ولی کا الہام اگرچہ فی حد ذاتہ

ظنی ہے مگر جب نبی اس کی تصدیق کر دے تو وہ قطعی ہو جاتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ایسے عظیم الشان امر کے متعلق طالوت کو کوئی الہام ہو اور اپنے اس الہام کا بغیر حضرت شمویل کی تصویب اور اجازت کے اعلان کریں نبی کی تصدیق اور تصویب تو بہت بڑی چیز ہے کسی چیز کے ہوتے دیکھ کر نبی کا انکار نہ کرنا یہ بھی اس امر کے جائز ہونے کی قطعی دلیل ہے اصطلاح شریعت میں اس کو تقریر نبوی کہتے ہیں یعنی نبی کے سکوت اور عدم انکار نے اس امر کو جائز اور درست قرار دیا جو باجماع امت حجت ہے۔(معارف القرآن)

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ: اس امتحان کی تفصیل ہے پس جو شخص اس نہر سے سیر ہو کر پانی پی لے گا اس کا میرے سے کوئی تعلق نہیں یعنی میرے گروہ سے نہیں رہا اور جس شخص نے اس کا مزہ بھی نہ چکھا یعنی پینا تو درکنار منہ سے بھی نہ لگایا تو وہ بلاشبہ میرے سے وابستہ ہے اور میرے خاص رفقاء اور ساتھیوں میں سے ہے مگر وہ شخص جو اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے سو میرے گروہ سے خارج نہ ہو گا، عزیمت اور اصل حکم تو یہی تھا کہ پانی کو بالکل نہ چکھتا بمقدار ایک چلو کے رخصت ہے یعنی جس نے سیر ہو کر پانی نہیں پیا اور صرف جان بچانے کے لیے برائے نام پی لیا تو وہ بھی فی الجملہ مقبول ہے اور غنیمت ہے۔

فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ: جب اس نہر پر پہنچے تو سب نے بے تحاشا اس نہر سے منہ لگا کر پانی پی لیا مگر تھوڑے آدمیوں نے جن کی تعداد تین سو تیرہ تھی انہوں نے عزیمت اور رخصت پر عمل کیا اور اجازت سے تجاوز نہ کیا جن لوگوں نے چلو سے پانی پیا ان کی پیاس بجھ گئی اور ان کا دل قوی ہو گیا اور جن لوگوں نے زیادہ پیا وہ بزدل اور نامرد ہو گئے اور نہ ان کی پیاس بجھی اور نہ وہ اس قابل رہے کہ نہر سے پار ہو سکیں۔(معارف القرآن)

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ: جب طالوت اور ان کے رفقاء مومنین نہر سے پار ہو گئے اور دیکھا کہ ہم ایک مٹھی بھر جماعت ہیں اور جالوت کا لشکر

ایک لاکھ سے متجاوز ہے اس لیے بعض ضعیف القلب یہ کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ کی تاب نہیں دشمن کی طاقت بہت ہے اور ہم بہت تھوڑے ہیں۔(معارف، کاندھلوی)

قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ: البتہ ان میں جو لوگ اولوالعزم اور اہل ہمت تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک دن خدا سے ملنا ہے اور اس کو منہ دکھانا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو فتح اور نصرت کا وعدہ کیا ہے وہ بالکل حق ہے اور ان لوگوں نے کمزوروں کو ہمت دلائی اور یہ کہا کہ گھبراؤ نہیں فتح و نصرت کا دارومدار قلت و کثرت پر نہیں بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ بہت تھوڑی اور چھوٹی سی جماعت بڑی سے بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے غالب آئی ہے اور وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور اللہ جس کے ساتھ ہو وہ کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ: اور جب جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلے کے لیے میدان میں نکلے تو اپنی ہمت اور شجاعت پر نظر نہیں بلکہ اللہ ذوالجلال کی طرف متوجہ ہوئے اور قَالُوْا یہ دعا مانگنی شروع کی رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر کو پانی کی طرح بہادے کہ سر سے پیر تک صبر کے پانی میں نہا جائیں اور صبر کی برودت اور سکینت ہمارے ظاہر اور باطن میں سرایت کر جائے اور کافروں کے مقابلے میں ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما اور ہمیں فتح دے۔(معارف القرآن)

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ: اس صبر اور تحمل اور اللہ پر اعتماد اور توکل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تھوڑے آدمیوں نے جالوت کی فوجوں اور لشکروں کو اللہ کی تائید سے شکست دی اور داود علیہ السلام نے جو اس وقت اپنے والد اور چھ بھائیوں کے لشکر میں تھے اور ابھی تک ان کو نبوت نہیں ملی تھی جالوت کو قتل کر ڈالا۔(معارف القرآن)

حضرت داؤد علیہ السلام کی شجاعت و بسالت

حضرت داود علیہ السلام اپنے سب بھائیوں میں چھوٹے تھے جب میدان کارزار سامنے آیا اور جالوت نہایت کروفر کے ساتھ زرہ اور خود پہن کر میدان میں آیا اور بنی اسرائیل سے مبارز اور مقابل طلب کیا حضرت داود علیہ السلام بغیر تلوار اور بغیر ہتھیار کے صرف تین پتھر لے کر اس کے مقابلہ کو نکلے۔

جب سامنے آئے تو ان پتھروں کو فلاخن میں رکھ کر جالوت کی پیشانی پر مارا وہ پتھر جالوت کی گدی کی جانب سے نکل گئے اور جالوت منہ کے بل زمین پر گرا فوراً اس کی تلوار نکال کر اس کا سر قلم کیا۔ (معارف)

کہا جاتا ہے کہ راستہ میں داود کو ایک پتھر نے آواز دی، اے داؤد مجھ کو اٹھالو میرے ذریعہ سے تم جالوت کو مارو گے پھر اسی طرح ایک اور پتھر نے آواز دی اور پھر ایک اور پتھر نے آواز دی داؤد علیہ السلام نے تینوں پتھروں کو اپنے تھیلے میں ڈال لیا اور روانہ ہوئے جب جالوت گھوڑے پر سوار ہو کر زرہ اور تلوار لگا کر میدان میں نکلا تو داؤد فقط یہ تین پتھر لے کر آگے بڑھے اور یہ کہا کہ اگر اللہ مدد نہ کرے تو تلوار اور گھوڑا اور ہتھیار بھی بے کار ہے جالوت نے داؤد سے کہا کہ تم تو فقط پتھر لے کر آئے ہو میرے سامنے جیسے کوئی کتے کو مارنے کے لیے نکلتا ہے فرمایا تو کتے سے بھی بدتر ہے اور اللہ کا نام لے کر وہ تینوں پتھر جالوت کے مارے جو ماتھے میں لگے اور گدی کے پیچھے سے نکل گئے (تفسیر قرطبی)

حضرت داؤد علیہ السلام و طالوت کی رشتہ داری: طالوت نے اس خوشی میں اپنی بیٹی حضرت داؤد علیہ السلام کے نکاح میں دے دی اور پھر اللہ نے وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ طالوت کے مرنے کے بعد داؤد علیہ السلام کو سلطنت عطا کی اور جو اللہ نے چاہا انہیں سکھایا اور طالوت کے مرنے کے بعد باتفاق بنی اسرائیل داؤد علیہ السلام بادشاہ مقرر ہوئے داود علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل کسی کی بادشاہت پر اتنے مجتمع نہیں ہوئے جتنا کہ داود علیہ السلام کی بادشاہت پر ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو سلطنت اور بادشاہت

کے علم اور حکمت یعنی نبوت عطا کی اور داؤد علیہ السلام سے پہلے کبھی کسی آدمی میں سلطنت اور نبوت جمع نہیں ہوئیں سلطنت شاہی خاندان میں رہتی تھی اور نبوت نبی کے خاندان میں رہتی تھی اور اس کے علاوہ اللہ نے داؤد کو جو امور چاہے سکھائے جیسے بغیر آلات کے زرہیں بنانا سکھایا اور لوہے کو مثلِ موم ان کے لیے نرم کر دیا پس اپنے ہاتھ سے کام کرتے اور اس کی مزدوری کھاتے اور پرندوں اور چیونٹیوں کی بولی اور زبان سکھائی اور خوش آوازی عطا کی۔ (قرطبی، کبیر، معارف القرآن)

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: اب اس واقعہ جہاد کے ذکر کے بعد جہاد کی عام حکمت اور مصلحت کو بیان فرماتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں یعنی کافروں کے شر اور فساد کو اپنے بعض خاص بندوں یعنی مومنین کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جائے اور کفر اور شرک غالب آجائے اور مسجدیں ویران ہو جائیں اور کوئی اللہ کا نام لینے والا باقی نہ رہے لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں تمام لوگوں پر اس لیے کہ اس نے تم پر جہاد فرض کیا تاکہ کفر کا فتنہ اور فساد دفع ہو جائے اس لیے کہ کفر اور شرک کو کافروں سے جہاد کا حکم نہ دیتے تو بڑا فساد پھیل جاتا جہاد اسی فساد کی اصطلاح اور انسداد کے لیے مقرر ہوا ہے اس لیے جہاد کو اللہ کا بڑا فضل سمجھو۔ (معارف القرآن)

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ: اس سارے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد رحمت کائنات، مفخر موجودات، آقائے نامدار، تاجدار مدینہ، مرادالمشتاقین، راحۃ للعاشقین حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا اثبات پیش کیا جارہا ہے، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی لکھتے ہیں کہ یہ واقعات جن کا ذکر کیا اللہ کی آیتیں ہیں جن کو سچائی کے ساتھ پڑھ کر ہم آپ کو سناتے ہیں جس میں ذرہ برابر شک نہیں یہ واقعات جس طرح ہم نے بیان کیے اسی طرح حق اور صدق ہیں اہل کتاب جس طرح بیان کرتے ہیں وہ قابل اعتبار نہیں اور یہ تمام واقعات اللہ کی قدرت اور پھر آپ کی نبوت کے دلائل ہیں کیونکہ ایسے قدیم زمانہ کے واقعات کا بغیر کسی سے پڑھے اور بغیر کسی سے سنے صحیح

صحیح بیان کرنا بغیر وحی خداوندی کے ممکن نہیں اور آپ بلاشبہ اللہ کے رسولوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے اپنے دشمنوں سے جہاد کا حکم دیا اور باوجود بے سروسامانی کے کافروں کے بڑے بڑے لشکروں کو ان کے خدام اور غلاموں کے ہاتھ سے تہ وبالا کرایا جہاد انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور وہ لوگ نادان ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جہاد وقتال نبیوں کا کام نہیں جہاد ہمیشہ رہا ہے اگر جہاد نہ ہو تو مفسد لوگ ملک کو ویران کر دیں۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

فضائل انبیاء کرام علیہم السلام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (۲۵۳) البقرہ

جواب ترجمہ: یہ رسول جو ہم نے (مخلوق کی اصلاح کے لیے) بھیجے ہیں، ان کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے، ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام فرمایا اور ان میں سے بعض کو اس نے بہت بلندی عطا کی ہے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے ان کی مدد فرمائی اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے لوگ اپنے پاس روشن دلائل آجانے کے بعد آپس میں نہ لڑتے، لیکن انہوں نے خود اختلاف کیا، چنانچہ ان میں سے کچھ وہ تھے جو ایمان لائے اور کچھ وہ جنہوں نے کفر اپنالیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے فضائل بیان کرنے سے پہلے وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوت کا ذکر فرمایا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ آپ رسولوں میں سے ہیں، تاج رسالت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر سجادیا گیا ہے، اس کے باوجود مخالفین

آپ ﷺ کی رسالت و نبوت کو تسلم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، آپ کو اس پر غم زدہ ہونے اور کبیدہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آپ ﷺ سے پہلے بھی کتنے رسول اور نبی مبعوث کیے گئے، انہیں ان کی صداقت و حقانیت پر معجزات و دلائل سے نوازا گیا، مگر منکرین و معاندین کی حرماں نصیبی تھی کہ ان پر بھی ایمان نہیں لائے، منکروں اور کور بختوں کا انکار، تمرد اور سرکشی کوئی نئی بات نہیں ہے، آپ سے پہلے جتنے بھی نبی گزرے ان کے ساتھ لوگوں نے بے رحمانہ رویہ رکھا، سب نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور ان پر ایمان نہیں لائے، اس لیے رنجیدہ ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے، اس میں رسالت یا نبوت کا قصور نہیں ہے، یہ تقدیر الٰہی کے فیصلے ہیں کہ کوئی سعادت پا گیا اور کوئی شقاوت میں اپنا نام لکھوا گیا، کسی نے انبیاء و رسل کے پیغامات پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے دارین کی سعادتیں سمیٹ لیں، کسی نے سرکشی اور تمرد سے ان معصوم ہستیوں کا انکار کیا اور دائمی نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا۔

یہ تقدیر خداوندی ہے اللہ کی مشیت بھی اسی طرح ہے کہ کوئی ایمان لائے اور کوئی کفر کرے، کارخانہ عشق میں کفر بھی لازمی ہے، اگر فرعون، ہامان، شداد، نمرود، ابولہب، ابوجہل جیسے کفار دنیا میں نہ ہوتے تو دوزخ کی آگ کو کیسے اور کیونکر دھکایا جاتا، اور قدرت والے کی اس میں کیا حکمت و مصلحت پنہاں ہے وہ قضاو قدر کا مالک ہی جانتا ہے جو سینوں کے بند دریچوں کے راز جانتا ہے، اس نے کبھی بھی اس راز سے نقاب نہیں سرکایا، لیکن ہر چشم بینا دیکھتی ہے کہ کائنات میں ایسے حرماں نصیبوں کی کسی دور میں کمی نہیں رہی جنہوں نے انبیاء و رسل کی دل کھول کر مخالفت نہ کی ہو۔

پھر قدرت والے نے قرآن کریم کی روشن آیات میں واضح فرمادیا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں اس کے بارے میں کوئی سوال، کوئی بحث مباحثہ، کوئی چوں وچرا ں نہیں کر سکتا، مجھ سے سوال نہیں کیا جاسکتا کہ فلاں کو ہدایت کی دولت سے کیوں نوازا گیا؟ فلاں کو روشنی و بینائی کیوں دی گئی؟ فلاں کو کفر و ضلال کے اندھے کنوؤں میں کیوں اتارا گیا؟ فلاں کو ہدایت کیوں نہیں دی گئی؟ کوئی زبان کھولنے اور

لب ہلانے کی جرأت نہیں کر سکتا، اس کے سامنے سر تسلیم واطاعت خم کرنے میں ہی عافیت ہے۔

تلک الرسل میں بالکل واشگاف اورواضح طور پر فرمایا گیا کہ جن لوگوں کو ہم نے انسانیت کی رشدوہدایت کے لیے مبعوث کیا، جن کے سر پر رسالت ونبوت کا تاج سجایا یہ ہمارے فرستادے اور ہمارے نمائندے ہیں، ان میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، ان میں کسی کو شرف تکلم بخشا، کسی کو عالی درجات سے نوازا، کسی کو دلائل قاہرہ اورواضح معجزات دیے، کسی کو روح القدس کے ذریعے تائید ایزدی مل گئی۔

تِلْكَ الرُّسُلُ: یہاں سے تیسرے پارے کا آغاز ہورہا ہے، اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بہت سے انبیاء کرام کا ذکر فرمایا ہے، ان میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت حزقیل علیہ السلام، حضرت شمویل علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے پیارے آقا ومولا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہوا ہے، کسی نبی کا تذکرہ اجمالاً ہے تو کسی کا تفصیلاً ہے، یہاں اللہ تعالیٰ ان کے فضائل کو سمو رہے ہیں، بعض انبیاء کی بعض پر فضیلت کا ذکر کیا جارہا ہے، تلک یہاں ذکر فرمایا أُولَئِكَ الرُّسُلُ نہیں فرمایا، اس لیے کہ جماعت رسل کا یہاں ذکر ہورہا ہے، جس کے مناسب تلک ہی تھا۔

تلک الرسل سے مراد کون سے انبیاء کرام علیہم السلام ہیں، اس بارے میں تین اقوال ہیں ان میں سے

① ایک یہ ہے کہ تلک الرسل سے مراد وہ انبیاء کرام علیہم السلام ہیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں اس سے پہلے ہوا ہے جیسے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور موسیٰ علیہم السلام۔

② دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ انبیاء علیہم السلام ہیں جن کا ذکر اس آیت سے پہلے ہوا ہے جیسے حضرت شمویل، حضرت داؤد علیہما السلام اور طالوت (ان لوگوں کے قول کے مطابق جنہوں نے طالوت کو نبی مانا ہے)

③ تیسرا قول حضرت اصم کا ہے وہ کہتے ہیں کہ تلک الرسل سے مراد وہ رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ

نے فساد دور کرنے کے لیے بھیجا ہے، جن کا ذکر وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ [البقرۃ: ۲۵۱] میں ہے۔ (تفسیر کبیر)

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ: یہ آیت مبارکہ بعض اہل تفسیر کے ہاں مشکل آیات میں شمار کی گئی ہے، ان کا یہ فرمانا مختلف احادیث مبارکہ کو سامنے رکھتے ہوئے ہے، ان روایات کو بھی دیکھا جائے اور اس آیت کو بھی دیکھا جائے تو ان کی بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا لَا تُخَيِّرُوا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ (مشکوٰۃ) تم انبیاء علیہم السلام کے درمیان کسی کو دوسرے پر ترجیح نہ دو اور مزید فرمایا لَا تُفَضِّلُوا بَيْنَ أَنْبِيَاءِ اللّٰهِ (بخاری) تم لوگ اللہ کے نبیوں کے درمیان کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔ یعنی تم یہ نہ کہو، فلاں فلاں سے بہتر ہے، فلاں فلاں سے افضل ہے۔ (قرطبی)

اس معنی کی تاویل میں علماء کا اختلاف نقل کیا گیا ہے ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ حکم آپ ﷺ کی طرف تفضیل کے بارے وحی نازل ہونے سے پہلے کا ہے اور آپ کے یہ جاننے سے پہلے کا ہے کہ آپ ﷺ اولادِ آدم کے سردار ہیں، اور بلاشبہ قرآن کریم فضیلت دینے سے روکنے والے حکم کے لئے ناسخ ہے۔ (قرطبی) اور ابن قتیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے ارشاد أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (ابن ماجہ) میں اولاد آدمی کا سردار ہوں، سے مراد قیامت کا دن ہے (یعنی قیامت کے دن آپ ﷺ اولاد آدم کے سردار ہوں گے) کیونکہ اس دن آپ ﷺ شفاعت فرمائیں گے اور لِوَاءُ الْحَمْدِ (حمد کا جھنڈا) اور حوض کوثر آپ ہی کے لئے ہوگا۔ (قرطبی)

اور آپ ﷺ نے تواضع اور انکساری کے طور پر یہ ارشاد فرمایا: لَا تُخَيِّرُونِي عَلٰى مُوسٰى (مشکوۃ، بخاری،) تم مجھے موسیٰ علیہ السلام سے بہتر اور برتر قرار نہ دو، جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول میں تواضع مراد ہے: وُلِّيتُكُمْ وَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ مجھے تمہارا والی بنایا گیا ہے حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں اور اسی طرح آپ ﷺ کے اس ارشاد کا معنی ہے لَا يَقُلْ أَحَدٌ أَنَا خَيْرٌ مِنْ يُونُسَ بْنِ

مَتّٰی (بخاری) کوئی یہ نہ کہے کہ میں حضرت یونس بن متی سے بہتر ہوں، یعنی یہ تواضع اورانکساری کی بناء پر ہے اوراللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ (قلم: ۴۸) اور تم مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ۔ اس پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان سے افضل ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے اور آپ ﷺ ان کی مثل نہ ہو جاؤ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ کا ارشاد لَا تُفَضِّلُونِي عَلَيْهِ (مشکوۃ) تم مجھے ان پر فضیلت نہ دو، یہ بطریق عاجزی ہے اور یہ معنیٰ مراد لینا بھی جائز ہے کہ تم مجھے ان پر عمل میں فضیلت نہ دو، شاید وہ عملاً مجھ سے افضل ہوں اور نہ ہی آزمائش اورامتحان میں مجھے فضیلت دو کیونکہ وہ آزمائش کے اعتبار سے مجھ سے بڑھے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کو قیامت کے دن تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر سرداری اور فضیلت عطا فرمائی ہے وہ آپ کے عمل کے سبب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے آپ کو فضیلت دینے کے سبب سے ہے اور اپنے لئے آپ کو خاص کرنے کی وجہ سے ہے۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس میں گہرے غور وخوض سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ گہرا غور وخوض اس میں جھگڑے تک پہنچانے کا ذریعہ ہے اور وہ یہاں تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں وہ کچھ کہے جو اسے نہیں کہنا چاہیے اور مقابلے کے وقت ان کا احترام کم ہو جاتا ہے۔ (قرطبی)

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ ساری کائنات میں اعلیٰ، افضل، برتر وبہتر مقام کے مالک ہیں، اللہ نے آپ ﷺ کو بہت ہی اونچی شان عطا کی ہے، مگر جس طرح آپ ﷺ نے منع فرمایا کہ مجھے دوسروں پر اس طرح، اس طرح فضیلت نہ دو کہ کہیں دوسروں میں نقص اور عیب تلاش کیا جائے ان کے مرتبہ اور مقام کو کم کیا جائے، ورنہ تو دوسرے نبیوں کی زبانوں پر آپ ﷺ تو آپ ﷺ ہیں آپ ﷺ کی امت کے بھی بڑے شاندار انداز میں تذکرے ہوتے تھے چونکہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی ہے

اس لیے ہمارے لیے احتیاط اسی میں ہے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی بات زبانوں سے ظاہر کرنے میں محتاط رہیں۔

نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی فضیلت

حضرت ابن عباس رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فرماتے ہیں کہ إِنَّ اللّٰهَ فَضَّلَ مُحَمَّدًا عَلَى الْأَنْبِيَاءِ وَعَلَى أَهْلِ السَّمَاءِ بیشک اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو انبیاء عَلَیْہِمُ السَّلَام پر اور اہل آسمان پر فضیلت دی ہے تو صحابہ نے پوچھا: اے ابن عباس! کیونکر اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان والوں پر فضیلت دی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَنْ يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلٰهٌ مِنْ دُونِهِ فَذٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِينَ اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اسے ہم سزا دیں گے جہنم کی، یونہی ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو۔

اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے لئے فرمایا ہے: إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (الفتح) یقیناً ہم نے آپ کو شاندار فتح عطا فرمائی ہے تاکہ دور فرمادے آپ کے لئے اللہ تعالیٰ جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو ہجرت کے بعد لگائے گئے۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ انبیاء عَلَیْہِمُ السَّلَام پر آپ کی فضیلت کیسی ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم: ۴) اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ وہ کھول کر بیان کرے ان کے لئے (احکام الٰہی کو) اور اللہ تعالیٰ نے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے لئے ارشاد فرمایا: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ (سورۃ سبا ۲۸) اور ہم نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو تمام انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جن وانس کی طرف مبعوث کیے گئے۔

حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فرماتے ہیں کہ خَيْرُ بَنِي آدَمَ نُوحٌ وَإِبْرَاهِيمُ وَمُوسَى وَمُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَهُمْ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (المحرر الوجیز) کہ بنی آدم میں افضل اور بہتر حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت محمد عَلَیْہِمُ السَّلَام ہیں اور یہی رسولوں میں سے اولو العزم ہیں،

یہ تعیین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے نص ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ جنہیں رسالت عطا فرمائی گئی ہے وہ ان سے افضل ہیں جنہیں رسالت نہیں دی گئی تو بلاشبہ جنہیں رسالت دی گئی ہے انہیں رسالت کے اعتبار سے دوسروں پر فضیلت دی گئی ہے اور وہ نبوت میں برابر ہیں، یہاں تک کہ رسولوں کو بھی اپنی امتوں کی جانب سے تکذیب اور انہیں قتل کرنے جیسی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچتی رہی ہیں اور یہ ایسی شے ہے جس میں کوئی خفا نہیں ہے۔ (قرطبی)

امت مسلمہ کا اس بات پر تو اجماع ہے کہ بعض انبیاء کرام علیہم السلام کو بعض پر فضیلت حاصل ہے اور ہمارے پیارے آقا و مولا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سب سے افضل و اعلیٰ، برتر و بالا ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ نے رحمت للعالمین بنایا جس طرح قرآن کریم میں اس کی وضاحت و صراحت موجود ہے (سورۃ الانبیاء ۱۰۷)

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو یہ بات لازمی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کل جہاں و اہل جہاں سے افضل ہوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذِکر اپنے ذِکر کے ساتھ کیا ہے، کلمہ شہادت میں اللہ کا نام پہلے ہے اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے، اذان میں اللہ کا نام پہلے ہے بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، تشہد میں اللہ کا ذکر پہلے ہے بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، جب کہ باقی انبیاء کرام علیہم السلام کا تذکرہ اس طرح نہیں ہے اور بالکل نہیں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و فضیلت کو مزید چار چاند اس وقت لگ جاتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ (النساء ۸۰)

سورۃ الفتح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کو اللہ نے اپنی بیعت قرار دیا ہے، فرمایا کہ جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر بیعت کی ہے انہوں نے اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے، اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے (الفتح ۱۰) پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی عزت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے ساتھ جوڑا ہے (سورۃ المنافقون ۸) پھر اللہ نے اپنی رضا کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کو جوڑا

ہے (سورۃ التوبہ ۶۲) پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی اجابت کو رسول اللہ کی اجابت کے ساتھ ملاتے ہوئے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی آواز پر لبیک کہیں۔ (سورۃ الانفال ۲۴)

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب نبی کریم ﷺ کو قرآن کریم جیسی عظیم الشان کتاب عطا فرمائی، جو آپ ﷺ کے معجزات میں سے سب سے بڑا معجزہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ سے فرمایا کہ وہ قرآن کریم کی ہر سورت کے ساتھ تحدی اور چیلنج کریں، تو آپ ﷺ نے مخالفین، معاندین اور دشمنان قرآن سے فرمایا کہ تم لوگ اس قرآن کریم کی مثل کوئی چھوٹی سی سورت ہی لے آؤ، (البقرہ ۲۳)

اور قرآن کریم کی سورتوں میں سب سے چھوٹی سورت سورۃ الکوثر ہے، جو صرف تین چھوٹی چھوٹی آیات پر مشتمل ہے، تو اللہ نے انہی چھوٹی سی تین آیات کے ساتھ انہیں چیلنج دیا، جب کہ قرآن کریم کی چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیات ہیں، تو قرآن کریم کی ہر آیت معجزہ ہوئی، یوں بات نکھر کر سامنے آگئی کہ قرآن کریم کی ہزاروں آیات نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

اندازہ فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی شان کو عظمت دی صرف نو معجزات کے ساتھ، جب موسیٰ علیہ السلام کو ان نو معجزات کے ساتھ اتنی بلند شان مل گئی تو نبی کریم ﷺ کو تو اللہ نے ہزاروں معجزات سے سرفراز فرمایا، تو آپ ﷺ کی شان و عظمت ان سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے معجزات سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات سے برتر و بالا، افضل و اعلیٰ ہیں تو یہ بات لازم ہے کہ ہمارے آقا و مولا نبی کریم ﷺ سارے انبیاء کرام علیہم السلام سے افضل و اعلیٰ، برتر و بالا ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے قرآن کریم کی عظمت شان بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اَلْقُرْآنُ فِي الْكَلَامِ كَآدَمَ فِي الْمَوْجُوْدَاتِ قرآن کلاموں میں اس طرح ہے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام موجودات میں ہیں۔ (مفاتیح الغیب للرازی)

قرآن کریم جیسا عظیم الشان معجزہ نبی کریم ﷺ کو دیا گیا، جب کہ قرآن کریم حروف وآواز کا نام ہے، یہ دو ایسے اعراض ہیں جو باقی رہنے والی چیزیں نہیں ہیں، جب کہ باقی تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو جو جو معجزات دیے گئے وہ ان امور کی جنس میں سے ہیں جو باقی رہنے والے ہیں پھر کیا شان ہے اس عظیم الشان معجزہ کی جو ہمیشہ باقی رہے گا، جب کہ باقی انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات فانی ہیں اور ختم ہونے والے ہیں۔

جس طرح قرآن کریم کی بے شمار آیات نبی کریم ﷺ کی فضیلت کو ظاہر کرتی ہیں، اسی طرح خود نبی کریم ﷺ کے اپنے ارشادات بھی ہمیں اس طرف توجہ دلاتے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا أَنَا أَكْرَمُ وَلَدِ آدَمَ عَلَى رَبِّي (مشکوٰۃ، ترمذی) میں اپنے رب کے نزدیک تمام اولاد آدم سے زیادہ عزت والا ہوں اور فرمایا أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ میں اولاد آدم کا سردار ہوں، اس میں آپ ﷺ نے کوئی تعیین نہیں فرمائی، لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ أَنْ يَقُولَ أَنَا خَيْرٌ مِنْ يُونُسَ بْنِ مَتَّى کسی کے لیے یہ کہنا مناسب نہیں کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں۔ (بخاری) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا لَا تُفَضِّلُونِي عَلَى مُوسَى تم مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو۔ (بخاری)

اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کرام علیہم السلام کو بعض پر فضیلت کا ذکر فرمایا ہے، پھر ان میں سے کچھ کا الگ سے یوں ذکر کیا مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ تعالیٰ نے اور بلند کیے ان میں سے بعض درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں۔ قرآن کریم کی سورۃ بنی اسرائیل میں حضرت داؤد کی فضیلت یوں بیان فرمائی وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُوراً اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی۔ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی فضیلت ایک اور مقام پر یوں بیان فرمائی وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ اور ہم نے انہیں انجیل عطا فرمائی۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو یوں امتیازی شان سے نوازتے ہوئے ارشاد فرمایا وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْراً لِلْمُتَّقِينَ (الانبیاء) اور یقیناً ہم نے عطا

فرمایا موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرقان اور روشنی اور ذکر پرہیز گاروں کے لئے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے مرتبہ اور مقام کو ایک مقام پر یوں بیان فرمایا وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا (النمل:۱۵) اور البتہ تحقیق ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو علم عطا فرمایا۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی عظمت و رفعت شان ایک مقام پر یوں بیان فرمائی وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ (احزاب: ۷) اور اے حبیب! یاد کریں جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی نوح سے بھی۔ (قرطبی)

مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ: جس سے کلام کیا گیا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت آدم کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا وہ نبی مرسل تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں وہ نبی مکلم تھے (یعنی جن سے کلام کی گئی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: بعض لوگوں نے تاویل یہ کی ہے کہ آدم علیہ السلام کو شرف ہمکلامی جنت میں عطا ہوا، تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت باقی رہے۔ (المحرر الوجیز، قرطبی)

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق یہاں بَعْضَهُمْ سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ وَأُحِلَّتْ لِيَ الغَنَائِمُ وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ میں سرخ و سیاہ کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میری لئے ساری زمین سجدہ گاہ اور پاکیزہ بنادی گئی اور ایک مہینے کی مسافت سے رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی اور میرے لئے غنائم حلال کر دی گئیں۔ (مسلم) اور مجھے شفاعت عطا کی گئی۔

اور اسی سے قرآن کریم، چاند کا شق ہونا، درخت کا آپ سے کلام کرنا، چند کھجوروں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑی مخلوق کو کھلانا اور ام معبد کی بکری کے خشک ہونے کے بعد اسے دوہنا وغیرہ تمام معجزات آپ کے متعلق ہیں۔ (قرطبی) ابن عطیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے اعتبار سے تمام لوگوں سے عظیم تر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ انبیاء علیہم السلام کو ختم کیا گیا، علاوہ ازیں وہ

خلق عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمایا۔ اور لفظ یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ اور آپ کے سوا وہ ہوں جن کی آیات و معجزات بڑے بڑے ہیں، اور کلام کا ذکر تاکیداً ہو سکتا ہے اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد حضرت ادریس علیہ السلام کو بلند مکان (آسمان) کی طرف اٹھانا ہو اور مراد آسمان میں انبیاء علیہم السلام کے مراتب ہوں۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ: اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات یہ ہیں، مردوں کو زندہ کرنا، مادر زاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو شفایاب کرنا اور مٹی سے پرندے بنانا وغیرہ جیسا کہ اس پر قرآن کریم میں نص موجود ہے کہ وہ باذن اللہ یہ معجزات دکھاتے تھے۔

وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ: اور ہم نے اسے قوت عطا فرمائی بِرُوْحِ الْقُدُسِ یعنی حضرت جبریل علیہ السلام سے۔ بعض کہتے ہیں جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں بعض کہتے ہیں وہ روح کہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حواریوں پر نازل ہوئی تھی جس کی وجہ سے معجزات و کرامات دکھاتے تھے اور یہی ان کی مؤید تھی۔ (حقانی)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ القدس سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں اور روح سے مراد جبریل ہیں، روح کی اضافت قدس کی طرف فضیلت و شرف کی وجہ سے ہے، مطلب یہ ہے کہ جبریل ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی ابتدا میں، درمیان میں اور اخیر میں مدد فرمائی، ابتدا میں مدد یہ اشارہ ہے فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا [التحریم: ۱۲] ہم نے ان میں اپنی روح پھونکی، کی طرف، اور درمیان میں جبریل علیہ السلام کے ذریعے مدد یوں کی کہ انہیں علوم سکھائے اور ان کے دشمنوں سے ان کی حفاظت کی اور اخیر میں جبریل علیہ السلام کے ذریعے مدد کا مطلب یہ ہے کہ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ نے جبریل علیہ السلام کے ذریعے ان کی مدد فرمائی اور انہیں آسمان پر اٹھوالیا۔

سورۃ النحل میں آیت ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ روح القدس سے مراد جبریل امین ہیں، اللہ فرماتے ہیں قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ [النحل: ۱۰۲] فرما دیجیے اتارا ہے اسے (قرآن کو) روح

القدس نے۔ ایک قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ روح القدس اس چیز کا نام ہے جس کے ذریعے عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ تیسرا قول حضرت ابو مسلم رحمہ اللہ کا ہے کہ روح القدس وہ ہے جس کے ذریعے ان کی مدد کی گئی، تو اس معنیٰ میں یہ بات جائز ہے کہ روح ظاہری مراد ہو جسے اللہ نے ان میں پھونکا ہو اور انہیں اس کے ذریعے دوسروں سے ممتاز کیا ہو جو مرد اور عورت کے نطفے کے ذریعے پیدا کیے جاتے ہیں۔ (تفسیر کبیر)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا: اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ آپس میں جنگ اور قتل و قتال نہ کرتے۔ جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے تشریف لے جانے کے بعد آپس میں مختلف ہو گئے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی امتیں آپس میں اختلاف کرتی رہیں اور ان میں لڑائیاں ہوتی رہیں حالانکہ ان کے پاس کھلے ہوئے دلائل موجود تھے، اگر ان کو سامنے رکھتے تو نہ مختلف ہوتے نہ جنگ کرتے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ: ان میں بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے ایمان قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام کے متبع بنے اور بہت سے لوگوں نے کفر اختیار کیا اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی تو ان کا آپس میں قتل و قتال نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ قادر مطلق اور فاعل ہے وہ جو چاہے کرلے اس پر کسی کا اعتراض ہو نہیں سکتا۔ (انوار البیان)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا: مطلب یہ ہے کہ رسولوں کے ذریعے سے علم حاصل ہو جانے کے بعد جو اختلاف لوگوں کے درمیان رونما ہوئے اور اختلافات سے بڑھ کر لڑائیوں تک جو نوبتیں پہنچیں، تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ معاذ اللہ خدا بے بس تھا اور اس کے پاس ان اختلافات اور لڑائیوں کو روکنے کا زور نہ تھا، نہیں، اگر وہ چاہتا، تو کسی کی مجال نہ تھی کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت سے سرتابی کر سکتا اور کفر و بغاوت کی راہ چل سکتا اور اس کی زمین میں فساد برپا کر سکتا، مگر اس کی مشیت یہ تھی ہی نہیں کہ انسانوں سے ارادہ و اختیار کی آزادی چھین لے اور انہیں ایک خاص روش پر چلنے کے لیے مجبور کر

دے، اس نے امتحان کی غرض سے انہیں زمین پر پیدا کیا تھا، اس لیے اس نے ان کو اعتقاد و عمل کی راہوں میں انتخاب کی آزادی عطا کی اور انبیاء علیہم السلام کو لوگوں پر کوتوال بنا کر نہیں بھیجا کہ زبردستی انہیں ایمان و اطاعت کی طرف کھینچ لائیں، بلکہ اس لیے بھیجا کہ دلائل اور بینات سے لوگوں کو راستی کی طرف بلانے کی کوشش کریں۔ پس جس قدر اختلافات اور لڑائیوں کے ہنگامے ہوئے، وہ سب اس وجہ سے ہوئے کہ اللہ نے لوگوں کو ارادے کی جو آزادی عطا کی تھی، اس سے کام لے کر لوگوں نے یہ مختلف راہیں اختیار کر لیں، نہ اس وجہ سے کہ اللہ ان کو راستی پر چلانا چاہتا تھا، مگر معاذ اللہ اسے کامیابی نہ ہوئی۔ (تفہیم القرآن)

قاضی ثناء اللہ لکھتے ہیں لیکن اللہ نے اپنی جلالی و جمالی صفات اور اپنے مختلف اسماء (مثلاً) ہادی، مضل، غفار، قہار، منتقم اور عفو کا ظہور چاہا اس لیے (کفر و اسلام اور ہدایت و گمراہی میں) لوگ مختلف ہو گئے۔ (مظہری)

شروع آیت وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ الخ اور پھر اخیر آیت میں وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا فرمایا مفسرین کی ایک جماعت کے نزدیک یہ آیت تاکید کے لیے مکرر لائی گئی ہے اور شیخ الاسلام ابو السعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تکرار تاکید کے لیے نہیں بلکہ اس تنبیہ کے لیے ہے اس آیت کو مکرر لایا گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ لوگوں کا اختلاف اور باہمی قتل و قتال سب اللہ کے ارادہ اور مشیت سے ہے کوئی شے بغیر اللہ کی مشیت کے نہیں ہو سکتی۔ (تفسیر ابی سعود)

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ لیکن اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے وہ اپنی مشیت اور ارادے سے کرتا ہے، اس پر کسی کو کسی قسم کے اعتراض اور تنقید کرنے کا حق نہیں ہے، اللہ کی حکمت اور کاموں کی مصلحت کے بارے میں اس کی مخلوق میں سے کوئی اس کی گہرائی کو نہیں پہنچ سکتا۔

ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ أَخْبِرْنِي عَنِ الْقَدَرِ، فَقَالَ: هُوَ طَرِيقٌ مُظْلِمٌ فَلَا تَسْلُكْهُ، فَأَعَادَ السُّؤَالَ، فَقَالَ: بَحْرٌ عَمِيقٌ فَلَا تَلُجْهُ، فَأَعَادَ السُّؤَالَ،

فَقَالَ: سِرُّ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ قَدْ خَفِيَ عَلَيْكَ فَلَا تُفَتِّشْهُ، اے امیر المؤمنین! مجھے تقدیر کے بارے میں بتایئے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ تاریک راہ ہے اس پر نہ چل۔ اس نے پھر سوال کیا آپ نے فرمایا یہ گہرا سمندر ہے اس میں گھسنے کی کوشش نہ کر۔ اس نے سوال کو پھر دہرایا تو آپ نے فرمایا یہ پوشیدہ راز ہے اس کی چھان بین نہ کر۔ (تفسیر بغوی)

جس طرح اندھیری رات میں راہ پانا مشکل ہے، جس طرح گہرے پانیوں میں گھسنا مشکل ہے اسی طرح تقدیر کی حقیقت پانا بھی فہم سے بالا ہے، انسانی فکر و سوچ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے مَن تَكَلَّمَ فِي شَيءٍ مِّنَ القَدرِ سُئِلَ عَنهُ يَومَ القِيَامَةِ وَمَن لَّم يَتَكَلَّم فِيهِ لَم يُسئَل عَنهُ جس نے تقدیر کے بارے میں کچھ بھی گفتگو کی اس سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا اور جس نے اس بارے میں بات نہ کی اس سے نہیں پوچھا جائے گا۔ (ابن ماجہ)

حضرت ابن دیلمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے جی میں تقدیر کے بارے میں کچھ شبہات پیدا ہوئے مجھے ڈر ہوا کہ کہیں مجھ پر دین اور معاملہ یہ خیالات بگاڑ نہ دیں، میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور عرض کی، اے ابو المنذر! میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ شبہات پیدا ہوئے ہیں مجھے اپنے دین اور معاملہ کے خراب ہونے کا ڈر ہوا ہے مجھے تقدیر کے متعلق کوئی حدیث بیان کریں ممکن ہے اللہ مجھے اس سے کوئی نفع دے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا لَوْ أَنَّ اللّٰهَ عذَّبَ أَهْلَ سَمَاوَاتِهِ وَأَهْلَ أَرْضِهِ، لَعَذَّبَهُمْ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَهُمْ، وَلَوْ رَحِمَهُمْ لَكَانَتْ رَحْمَتُهُ خَيْرًا لَهُمْ مِنْ أَعْمَالِهِمْ، وَلَوْ كَانَ لَكَ مِثْلُ أُحُدٍ ذَهَبًا، أَوْ مِثْلُ جَبَلِ أُحُدٍ ذَهَبًا تُنْفِقُهُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، مَا قَبِلَهُ مِنْكَ حَتَّى تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ كُلِّهِ، فَتَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ، وَمَا أَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ، وَأَنَّكَ إِنْ مُتَّ عَلَى غَيْرِ هَذَا دَخَلْتَ النَّارَ (سنن ابن ماجہ، ابی داؤد، مسند احمد) اگر اللہ تمام آسمان و زمین کے رہنے والوں

کو عذاب دے تو اس کا عذاب ظلم نہ ہو گا اور اگر سب پر رحم فرمائے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہو گی (یعنی اعمال موجب سزا ہیں اور مجرم کو سزا دینا ظلم نہیں اور رحم کرنا اس کی مہربانی ہے اور مہربانی اعمال کے زیر اثر نہیں بلکہ اعمال سے بہتر ہو گی) اگر تم کوہِ احد کے برابر سونا راہ خدا میں خرچ کرو تو اللہ قبول نہیں فرمائے گا، تاوقتیکہ تمہارا ایمان تقدیر پر نہ ہو اور جب تک تم کو اس کا یقین نہ ہو کہ جو کچھ تم کو پہنچنے والا ہے وہ پہنچ کر رہے گا اور نہیں پہنچنے والا ہے تو نہیں پہنچے گا اگر اس عقیدہ کے خلاف دوسرے عقیدہ پر مرو گے تو دوزخ میں جاؤ گے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے یہ تسلی بخش جواب دینے کے بعد سائل کو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے تسلی اور تشفی بخش جواب سننے کے لیے ان کی خدمت میں بھیجا، انہوں نے بھی سائل کا سوال سن کر یہی جواب دیا، پھر انہوں نے سائل کو حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا، انہوں نے سائل کا سوال سن کر یہی جواب دیا اور سائل سے کہا کہ آپ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر تقدیر کے بارے میں پوچھیں، چنانچہ سائل کا سوال سن کر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس کی تسلی کروائی کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، پھر وہی الفاظ جو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں آئے ہیں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں سنائے۔

قیامت سے پہلے پہلے کچھ کر لو

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۵۴) البقرہ

جواب ترجمہ: اے ایمان والو۔ جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے وہ دن آنے سے پہلے پہلے (اللہ کے راستے میں) خرچ کر لو جس دن نہ کوئی سودا ہو گا نہ کوئی دوستی (کام آئے گی) اور نہ کوئی سفارش ہو سکے گی اور ظالم وہ لوگ ہیں جو کفر اختیار کیے ہوئے ہیں۔

قرآنی آیات کا متن اور اس متن کے بین السطور میں پوشیدہ گوہر ہائے آبدار کو دیکھ اور محسوس کر کے اہل دانش عشش کر اٹھتے ہیں، اس سے پہلے کتنی آیات میں اہل ایمان کو توجہ دلائی جارہی ہے اور احکامات دیے جارہے ہیں کہ وہ اپنے اللہ کے راستے میں جہاد کریں، اس کی راہ میں مال لٹائیں اور اس سے اس کا اجر پائیں، کیونکہ انسان کے لیے تمام اشیاء میں سے اگر کسی چیز کو کسی پر وار دینا، کسی پر قربان کر دینا، کسی کے لیے کھپا دینا، کسی لیے لٹا دینا مشکل ترین چیز ہے تو وہ انسانی جان ہے، جو میدان کارزار میں لٹا دی جاتی ہے اور پیش کر دی جاتی ہے اور اس کے بعد انفاق میں مال کا نمبر آتا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے قتال وجہاد کا حکم دیا تو اس کے ساتھ ہی مال خرچ کرنے کا حکم دیا، اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ [الْبَقَرَةِ: ۲۴۴] اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو، پھر اس کے بعد فرمایا مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضاً حَسَناً [الْبَقَرَةِ: ۲۴۵) کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن عطا کرے، تو اس بیان سے مقصود جہاد میں مال خرچ کرنا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے جہاد وقتال کا تاکیدی حکم فرماتے ہوئے طالوت کا قصہ کس خوبصورت انداز میں بیان فرما کر ترغیب جہاد دی، پھر اس کے بعد جہاد میں مال خرچ کرنے کا حکم دیتے ہوئے اہل ایمان کو یہاں حکم دیا کہ اے اہل ایمان! تم لوگ اس مال میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہیں دیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ: اللہ تعالیٰ اپنے ایمان والے بندوں کو حکم دے رہے ہیں کہ خیر کی راہ میں اس کے دیے میں سے خرچ کریں تاکہ آخرت کے لیے اپنے رب کے ہاں ذخیرہ کر سکیں اور یہ کام اسی دنیا میں ہو سکتا ہے جو دارالعمل ہے۔ لفظ رَزَقْنَاكُمْ میں یہ بتا دیا کہ یہ مال ہمارا ہی دیا ہوا ہے جس نے مال دیا اس کو پورا پورا حق ہے کہ مال خرچ کرنے کا حکم فرمائے۔ (انوار البیان)

اس میں اختلاف ہے کہ یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کون سا خرچ مراد ہے، بعض علماء نے کہا: اس سے قتال اور جہاد میں خرچ کرنا مراد ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس سے زکوٰۃ اور صدقات فرضیہ مراد ہیں اور صدقات نفلیہ مراد نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خرچ نہ کرنے پر وعید فرمائی ہے

اور نفل کے ترک کرنے پر وعید نہیں ہوتی لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں وعید نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہ فرمایا ہے کہ قیامت کا دن آنے سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور جب تک تم دنیا میں ہو آخرت کے لیے منافع حاصل کرو، کیونکہ ان منافع کا آخرت میں حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔(تفسیر تبیان القرآن)

جوں اور جیسا بھی موقع میسر آئے اللہ کی راہ میں مال لگانے سے ذرا گریز اور دریغ نہیں کرنا چاہیے، جہاد فی سبیل اللہ میں ضرورت ہے تو بڑھ چڑھ کر حصہ لے، دینی مدارس اور مساجد جہاں قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی ہیں وہاں بھی جی بھر کر خرچ کرے، دینی کتابوں کی اشاعت میں دل کھول کر مال خرچ کرے، دعوت و تبلیغ کے کام میں بھی قابل رشک حد تک مال خرچ کرے، کیونکہ یہ موقع صرف اسی جہاں میں ملے گا، اگر یہاں کچھ نہ کیا تو دوسرے جہان میں ہاتھ ملتا رہ جائے گا، مگر وہاں کے ہاتھ ملنے سے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا، وہاں بندہ حسرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے پکارے گا کہ اے میرے رب! تو نے مجھے اس قدر مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ و خیرات کر لیتا۔ پھر اس بات پر بھی اجماع ہے کہ رزق حلال سے خرچ کرنا ہے، مال حرام سے خرچ کرنا بالاجماع ناجائز ہے، رزق حلال سے انفاق کرنے پر اجر و ثواب ملتا ہے، مال حرام جتنا مرضی خرچ کیا جائے اس کا اجر و ثواب نہیں ہے۔

مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ: یعنی قیامت کے دن سے پہلے پہلے راہِ خدا میں مال لٹایا جائے، دار العمل دنیا میں عمل کیا جائے، آخرت میں تو بدلہ ملے گا، نیکی کا ثواب ملے گا اور بدی کی سزا ملے گی، آخرت میں تو ذرہ برابر نیکی کرنے والوں کو اس کا صلہ ملے گا، ذرہ برابر برائی کرنے والوں کو اس کا صلہ ملے گا، کسی سے کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ: اس دن کوئی خرید و فروخت نہیں کر سکے گا، مال کا فدیہ دے کر جان نہیں چھڑا سکے گا، اگرچہ زمین سے آسمان تک کے خلاء کو سونے سے بھر دے، اس دن

کسی کو کسی کی دوستی، یاری اور نسبی برتری کام نہیں آئے گی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ [الْمُؤْمِنُونَ:۱۰۱] جب صور پھونک دیا جائے گا تو ان کے درمیان اس دن رشتہ داریاں کام نہیں آئیں گی اور نہ وہ ایک دوسرے سے سوال کر سکیں گے، اس دن کسی سفارشی کی سفارش بھی انہیں کام نہیں آئے گی۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں بیع (خرید و فروخت کرنا) فدیہ کے معنیٰ میں ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ [الْحَدِيدِ: ۱۵] آج کے دن تم سے فدیہ نہیں لیا جائے گا۔ اور فرمایا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ [الْبَقَرَةِ: ۱۲۳] نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا۔ اور فرمایا وَإِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذْ مِنْهَا [الْأَنْعَامِ: ۷۰] اگر دنیا بھر کا معاوضہ دے تو پھر بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ گویا اللہ تعالیٰ یوں فرما رہے ہیں کہ اس دن سے پہلے پہلے یہ کچھ کر لو جس دن تجارت نہیں ہو گی کہ تم کمائی کر کے عذاب کے بدلے میں فدیہ دے کر جان چھڑا لو گے دوسرا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ملکیت میں جو مال ہے اسے اپنے لیے آگے بھیج دو، اس دن سے پہلے پہلے کہ اس میں تجارت نہیں ہو گی، خرید و فروخت نہیں ہو گی کہ اس میں مال میں سے کچھ کمایا جا سکے۔ (مفاتیح الغیب)

بروز محشر انسانی بے بسی کیسی عجیب ہو گی، دنیا میں دوستیاں تعلق داریاں ہوتی ہیں، انسانی ہجوم ارد گرد ہوتے ہیں جن سے انسان کو بڑا فخر ہوتا ہے مگر قیامت کے دن یہ سارے تعلق ہوا ہو جائیں گے، سارے رشتے کٹ جائیں گے، سورۃ الزخرف کی ایک آیت بتاتی ہے کہ اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، سوائے متقی لوگوں کے۔ (الزخرف ۶۷) سورۃ البقرہ بتاتی ہے کہ اس دن اسباب سب کٹ جائیں گے۔ (البقرہ ۱۶۶) قیامت کے دن لوگ ایک دوسرے کا انکار کر رہے ہوں گے، ایک دوسرے پر لعنت کر رہے ہوں گے۔ (العنکبوت ۲۵) قیامت کے دن کفار کی دہائی ہو گی کہ آج ہمارا کوئی سفارشی نہیں ہے، کوئی جگری دوست نہیں ہے۔ (الشعراء ۱۰۰) سورۃ البقرہ

کہتی ہے کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ (آیت ۲۷۰)

یہاں جو شفاعت کی نفی کی گئی ہے یہ تمام سفارشات کی نفی نہیں ہے جیسے اللہ فرماتے ہیں کہ اس دن دوستی نہیں ہوگی اور سفارش نہیں ہوگی، دوسرے دلائل وبراہین سے پتہ چلتا ہے کہ اہل ایمان کے درمیان محبت ہوگی، اہل ایمان کی شفاعت کا بھی ذکر دوسرے دلائل میں موجود ہے۔

بروز محشر دوستی اور شفاعت نہ ہونے کا سبب کیا ہوگا؟ اس میں ایک بات تو یہ ہے کہ ہر شخص مصروف ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ عبس میں فرمایا کہ اس دن ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی، (آیت ۳۷) دوسری بات یہ ہے کہ اس دن خوف اور ڈر ہر کسی پر غالب ہوگا، یہاں تک کہ اس دن دودھ پلانے والیاں اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائیں گی، اس دن تمام حمل والیاں اپنا حمل دن پورے ہونے سے پہلے ہی گرادیں گی، اس دن لوگ نشہ کی حالت میں دکھائی دیں گے حالانکہ وہ نشہ میں نہیں ہوں گے۔ (سورۃ الحج ۲) تیسری بات یہ ہے کہ جب کافروں اور فاسقوں پر عذاب پڑے گا تو اس دن دوستی اور تعلق داری سے انہیں چڑ ہو جائے گی۔

وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ: حضرت عطاء بن یسار اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں **وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ** فرمایا ہے اور **وَالظَّالِمُونَ هُمُ الْكَافِرُونَ** نہیں فرمایا ہے، اہل علم اس آیت کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قیامت کے دن کوئی دوستی اور کوئی سفارش نہیں ہوگی تو اس سے مطلقاً دوستی اور شفاعت کی نفی کا وہم ہوتا تھا تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ **وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ** کافر ہی ظالم ہیں، جو اس بات پر دلالت ہے کہ دوستی اور سفارش کی نفی کافروں کے ساتھ خاص ہے، اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ گناہ گاروں کے حق میں سفارش ہوگی۔

دوسری توجیہ اس آیت کی یہ کی گئی ہے کہ کافر لوگ جب دوزخ میں داخل ہوں گے تو اس کے عذاب سے جان چھڑانے سے عاجز ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ کافروں کو یہ عذاب دینے میں ان پر ظلم

نہیں کر رہے ہوں گے، بلکہ کافر لوگوں نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا، کیونکہ انہوں نے کفر اور اللہ کی نافرمانی کا انتخاب کیا تھا یہاں تک کہ وہ اس عذاب کے مستحق ٹھہرے، اسی طرف سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ اشارہ کر رہے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے کیا تھا اسے وہ اپنے سامنے پائیں گے جب کہ آپ کا پروردگار تو کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا۔ (آیت ۴۹)

تیسری توجیہ یہ کی گئی ہے کافر ہی ظالم ہیں کیونکہ ان لوگوں نے ایسے دن کے لیے نیکیاں آگے نہیں بھیجی تھیں جہاں انہیں ان نیکیوں کی ضرورت پیش آنا تھی، اس لیے جو لوگ اس آیت کے نزول کے وقت وہاں موجود تھے انہیں آگاہ کیا گیا کہ اے حاضرین! آپ لوگ ان ردی چیزوں کا انتخاب کر کے ان کافروں کی پیروی نہ کرو، تم لوگ ایسے اعمال اپنے لیے آگے بھیجو جنہیں تم قیامت کے دن اپنی جانوں کو اللہ کے عذاب سے بچانے کے لیے بطور فدیہ پیش کر سکو۔

چوتھی توجیہ یہ پیش کی گئی ہے کافر ہی وہ لوگ ہیں جو معاملات کو بے محل رکھ کر اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوئے، یہ ان لوگوں سے سفارش کی امیدیں لگائے ہوئے تھے جو اللہ کے ہاں ان کی سفارش نہیں کر سکتے تھے، یہ لوگ بتوں سے کہا کرتے تھے هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ [یونس: ۱۸] یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہوں گے، اسی طرح یہ کافر اور مشرک لوگ بتوں کی پوجا و پرستش کرنے کی وجہ یوں بیان کرتے تھے کہ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفَى [الزمر: ۳] ہم ان کی بندگی اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے۔ تو جس نے جمادات کی پوجا و پرستش کی اور یہ امید رکھی کہ یہ اللہ کے ہاں میری سفارش کریں گے تو یہی چیز اپنی جانوں پر ظلم کرنا ہے، کہ ایسی جگہ سے خیر کی امید رکھنا جہاں یہ امید رکھنا جائز ہی نہیں تھا۔

پانچویں توجیہ یہ کی گئی یہاں ظلم سے مراد راہ خدا میں خرچ نہ کرنا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکہف میں فرمایا کہ آتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئاً [الْكَهْفِ: ۳۳] دونوں باغ پورا پورا پھل دیتے تھے اور کوئی باغ پھل دینے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتا تھا، تو اس آیت کا معنیٰ یہ ہو گا کہ کافر وہ

لوگ ہیں جو انفاق فی سبیل اللہ کو چھوڑ دیتے ہیں، جب کہ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ تھوڑا بہت خرچ کرتا رہے۔

چھٹی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ کافر ہی ظالم ہیں، یعنی بہت زیادہ ظلم کرنے والے ہیں، ظلم کی انتہاؤں تک پہنچے ہوئے ہیں، جیسے علماء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اَلْعُلَمَاءُ هُمُ الْمُتَكَلِّمُونَ وہ علم میں کامل ہیں، اسی طرح یہاں ہے، ان توجیہات میں سے اکثر علامہ قفال رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہیں، جنہیں امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کبیر میں نقل فرمایا ہے۔

فضائل و تفسیر آیۃ الکرسی

سوال آیۃ الکرسی کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَؤُدُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (۲۵۵) البقرہ

جواب ترجمہ: اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو ہمیشہ زندہ ہے جو پوری کائنات سنبھالے ہوئے ہے جس کو نہ کبھی اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ آسمانوں میں جو کچھ ہے (وہ بھی) اور زمین میں جو کچھ ہے (وہ بھی) سب اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ سارے بندوں کے تمام آگے پیچھے کے حالات کو خوب جانتا ہے، اور وہ لوگ اس کے علم کی کوئی بات اپنے علم کے دائرے میں نہیں لاسکتے، سوائے اس بات کے جسے وہ خود چاہے، اس کی کرسی نے سارے آسمانوں اور زمین کو گھیرا ہوا ہے، اور ان دونوں کی نگہبانی سے اسے ذرا بھی بوجھ نہیں ہوتا، اور وہ بڑا عالی مقام، صاحب عظمت ہے۔

حضرت محمد بن حنیفہ رحمہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا: لَمَّا نَزَلَتْ آيَةُ الْكُرْسِيِّ خَرَّ كُلُّ صَنَمٍ فِي الدُّنْيَا، وَكَذَلِكَ خَرَّ كُلُّ مَلِكٍ فِي الدُّنيَا وَسَقَطَتِ التِّيجَانُ عَن رُؤُسِهِم، وَهَرَبَتِ الشَّيَاطِينُ يَضْرِبُ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ جب آیۃ الکرسی نازل ہوئی دنیا میں تمام بت گر گئے اور اسی طرح دنیا میں تمام بادشاہ گر پڑے اور ان کے سروں سے تاج گر گئے اور شیاطین بھاگ پڑے، وہ آپس میں ایک دوسرے کو مارنے لگے۔ اس کے بعد وہ ابلیس کے پاس تمام جمع ہو گئے اور اسے اس کے بارے مطلع کیا، تو اس نے انہیں کہا کہ وہ اس کے بارے تفتیش کریں، چنانچہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف آئے تو انہیں یہ خبر موصول ہوئی کہ آیت الکرسی نازل ہوئی ہے۔ (قرطبی)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: يَا أَبَا الْمُنْذِرِ أَتَدْرِي أَيُّ آيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللَّهِ مَعَكَ أَعْظَمُ اے ابو المنذر! کتاب اللہ کی کون سی آیت تمہارے نزدیک سب سے بڑی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ وہ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ: تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: لِيَهْنِكَ الْعِلْمُ يَا أَبَا الْمُنْذِرِ اے ابا المنذر! تجھے علم مبارک ہو۔ (مسلم، ابو داؤد)

حکیم ترمذی ابو عبد اللہ رحمہ اللہ نے یہ اضافہ ذکر کیا ہے، فَوَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنَّ لِهَذِهِ الْآيَةِ لَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ تُقَدِّسُ الْمَلِكَ عِنْدَ سَاقِ الْعَرْشِ اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس آیت کی ایک زبان ہے اور دو ہونٹ ہیں، ساق عرش کے پاس شہنشاہ مطلق کی پاکی بیان کرتی ہے۔ (نوادر الاصول، قرطبی)

ابو عبد اللہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ جل ذکرہ نے آیت الکرسی نازل فرمائی اور وَجَعَلَ ثَوَابَهَا لِقَارِئِهَا عَاجِلًا وَآجِلًا، فَأَمَّا فِي الْعَاجِلِ فَهِيَ حَارِسَةٌ لِمَنْ قَرَأَهَا مِنَ الْآفَاتِ اور اس کا ثواب اس کے پڑھنے والے کے لئے دنیا اور آخرت میں رکھا ہے، دنیا میں تو یہ ہے کہ یہ اپنے پڑھنے والے کی آفات و مصائب سے حفاظت کرتی ہے۔

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ فِي زَوَايَا بَيْتِهِ الْأَرْبَعِ وہ اپنے گھر کے چاروں کونوں میں آیۃ الکرسی پڑھتے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کے ذریعے چاروں اطراف سے اپنی حفاظت کا انتظام کرتے تھے اور یہ کہ شیطان آپ کے گھر کے کونوں سے آپ سے دور ہو جائے۔ (نوادر الاصول، قرطبی)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک جن سے کشتی کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پچھاڑ دیا تو جن نے آپ کو کہا: مجھ سے ذرا ہٹو یہاں تک کہ میں آپ کو وہ بتاتا ہوں جس کے ساتھ تم ہم سے محفوظ رہ سکتے ہو، تو آپ نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے پوچھا تو اس نے کہا إِنَّكُمْ تَمْتَنِعُونَ مِنَّا بِآيَةِ الْكُرْسِيِّ بلاشبہ تم ہم سے آیۃ الکرسی کے ساتھ محفوظ رہ سکتے ہو۔ (نوادر الاصول، قرطبی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: جس نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو اس کے لئے موت کے سوا کوئی شے جنت میں داخل ہونے سے رکاوٹ نہیں ہے اور اس پر صدیق اور عابد ہی مواظبت اختیار کرتا ہے اور جس نے اسے اس وقت پڑھا جب وہ اپنے بستر پر گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے پڑوسیوں کو اور اس کے پڑوسیوں کے پڑوسیوں کو اور اس کے ارد گرد کے گھروں کو محفوظ فرمایا دیا (مشکوۃ المصابیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کی زکوٰۃ (صدقہ فطر) کی حفاظت میرے سپرد کی، آگے پورا قصہ ذکر کیا اور اس میں ہے: تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیال یہ ہے کہ وہ مجھے ایسے کلمات سکھا دے گا جس کے سبب اللہ تعالیٰ مجھے نفع پہنچائے گا، سو میں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ کیا ہیں؟ میں نے عرض کی: اس نے مجھے کہا ہے: جب تو اپنے بستر میں جائے تو اول سے آخر تک آیۃ الکرسی پڑھا کر اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم اور اس نے مجھے کہا ہے: تجھ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلسل محافظ رہے گا اور صبح ہونے تک کوئی شیطان تیرے قریب نہیں آئے گا (اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خیر کی چیز لینے کے

بہت زیادہ حریص تھے) تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ اس نے تجھ سے سچ کہا ہے حالانکہ وہ بہت جھوٹا ہے، اے ابوہریرہ! کیا تو اسے جانتا ہے جس سے تو تینوں راتیں باتیں کرتا رہا ہے؟ عرض کی نہیں: آپ ﷺ نے فرمایا: وہ شیطان ہے۔ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: أَوْحَى اللّٰهُ إِلَى مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ مَنْ دَاوَمَ عَلَى قِرَاءَةِ آيَةِ الْكُرْسِيِّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ أَعْطَيْتُهُ فَوْقَ مَا أُعْطِي الشَّاكِرِينَ وَأَجْرَ النَّبِيِّينَ وَأَعْمَالَ الصِّدِّيقِينَ وَبَسَطْتُ عَلَيْهِ يَمِينِي بِالرَّحْمَةِ وَلَمْ يَمْنَعْهُ أَنْ أُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُ مَلَكُ الْمَوْتِ

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی جس نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھنے پر ہمیشگی اختیار کی میں اسے اس سے زیادہ عطا کروں گا جو میں شکر کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں اور انبیاء علیہم السلام کا اجر اور صدیقین کے اعمال کا اجر اور میں اس پر اپنا دست رحمت پھیلا دیتا ہوں اور اس کے لئے کوئی شے رکاوٹ نہیں ہے کہ میں اسے جنت میں داخل کروں مگر یہ کہ ملک الموت اسے لے آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار! جس نے اس کے بارے سنا وہ اس پر ہمیشگی اختیار نہیں کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنِّي لَا أُعْطِيهِ مِنْ عِبَادِي إِلَّا لِنَبِيٍّ أَوْ صِدِّيقٍ أَوْ رَجُلٍ أُحِبُّهُ أَوْ رَجُلٍ أُرِيدَ قَتْلَهُ فِي سَبِيلِي میں یہ اپنے بندوں میں سے کسی کو عطا نہیں کروں گا سوائے نبی کے یا صدیق کے یا ایسے آدمی کے جس سے میں محبت کرتا ہوں یا ایسے آدمی کے جس کے بارے میں ارادہ کروں کہ وہ میرے راستے میں قتل ہو جائے۔ (قرطبی)

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اس پر مذاکرہ ہوا کہ قرآن کریم میں کون سی چیز فضیلت والی ہے، اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ آیت الکرسی کے بارے میں کیا خیال کرتے ہو؟ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کا ایک فرمان انہیں سنایا، جس میں آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا اے علی! سَيِّدُ الْبَشَرِ آدَمُ، وَسَيِّدُ الْعَرَبِ مُحَمَّدٌ وَلَا فَخْرَ،

وَسَيِّدُ الْكَلَامِ الْقُرْآنُ، وَسَيِّدُ الْقُرْآنِ الْبَقَرَةُ، وَسَيِّدُ الْبَقَرَةِ آيَةُ الْكُرْسِيِّ» (مفاتیح الغیب) انسانوں کے سردار حضرت آدم علیہ السلام ہیں، عرب والوں کے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس پر فخر نہیں اور کلاموں کا سردار قرآن کریم ہے اور قرآن کریم میں سردار سورۃ البقرہ ہے اور سورۃ البقرہ میں سردار آیتہ الکرسی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا مَا قُرِئَتْ هَذِهِ الْآيَةُ فِي دَارٍ إِلَّا اهْتَجَرَتْهَا الشَّيَاطِينُ ثَلَاثِينَ يَوْمًا وَلَا يَدْخُلُهَا سَاحِرٌ وَلَا سَاحِرَةٌ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً (مفاتیح الغیب) کسی گھر میں آیۃ الکرسی پڑھی جاتی ہے تو شیاطین اس گھر کو تیس دن کے لیے چھوڑ جاتے ہیں، اس گھر میں کوئی جادوگر، کوئی جادوگرنی چالیس دن تک نہیں داخل ہو سکتی۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کا دن تھا، میں جہاد میں مصروف تھا، پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ دیکھوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کر رہے ہیں؟ فرمایا کہ پھر میں نے آکر دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے کی حالت میں یاحی یاقیوم پڑھ رہے تھے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں پڑھ رہے تھے، پھر میں جہاد کی طرف چلا گیا، پھر واپس آیا، پھر گیا، پھر واپس آیا، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ رہا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یاحی یاقیوم سے زیادہ کچھ نہیں پڑھ رہے تھے، چنانچہ اسی پر اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی۔ (مفاتیح الغیب)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے پاس کھجوروں کے کھلیان تھے میں اس کی دیکھ بھال کرتا تھا (لیکن) میں نے اس کو دن بدن کم پایا، ایک رات میں نے اس کی دیکھ بھال کی، اچانک میں نے ایک بالغ لڑکے کی طرح ایک جانور کو پایا میں نے اس کو سلام کیا، اس نے بھی سلام کا جواب دیا میں نے کہا تو کون ہے؟ جن ہے یا انسان؟ اس نے کہا میں جن ہوں میں نے کہا اپنا ہاتھ مجھے پکڑا (جب) میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس کا ہاتھ کتے جیسا تھا اور اس کے بال بھی کتے کے بالوں جیسے تھے۔ میں کہا کیا اسی طرح جنات کو پیدا کیا گیا ہے؟ اس نے کہا کچھ جن ایسے بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ سخت ہیں۔ میں

نے (اس سے) کہا تجھے ایسا کرنے پر کس نے آمادہ کیا؟ اس نے کہا مجھے یہ بات پہنچی کہ تو صدقہ کو پسند کرنے والا آدمی ہے تو ہم نے اس بات کو پسند کیا کہ تیرے کھانے میں سے ہم بھی حصہ لے لیں۔ ابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کون سی چیز ہے جو ہمیں تمہارے شر سے بچا سکتی ہے؟ اس جن نے کہا آیۃ الکرسی جو سورۃ بقرہ میں ہے، من قَالَهَا حَتَّى يُمْسِيَ أُجِيرَ مِنَّا حَتَّى يُصبِحَ وَمَن قَالَهَا حِينَ يُصبِحَ أُجِير مِنَّا حَتَّى يُمْسِيَ جو شخص اس کو شام کو پڑھے گا تو صبح تک ہم سے پناہ میں رہے گا اور جو شخص اس کو صبح میں پڑھے گا تو شام تک ہم سے پناہ میں رہے گا۔ جب صبح ہوئی تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور ان کو یہ بات بتائی تو آپ نے فرمایا خبیث نے سچ کہا۔ (نسائی، ابو یعلی، ابن حبان، العظمۃ لابی الشیخ، ں طبرانی، حاکم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام میں سے ایک آدمی سے پوچھا کیا تو نے شادی کرلی؟ اس نے کہا نہیں؟ اور میرے پاس کچھ نہیں ہے کہ جس کے بدلہ میں شادی کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تجھے سورۃ الاخلاص قُل هُوَ اللهُ أَحَد یاد نہیں ہے؟ اس نے کہا کیوں نہیں، فرمایا یہ چوتھائی قرآن ہے پھر پوچھا کیا تجھے سورۃ الکافرون قل يَا أَيهَا الْكَافِرُونَ یاد نہیں ہے اس نے کہا ہاں کیوں نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ چوتھائی قرآن ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا تجھے سورۃ الزلزال إِذَا زُلزِلَت یاد نہیں ہے؟ اس نے کہا ہاں کیوں نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بھی چوتھائی قرآن ہے، پھر آپ نے پوچھا کیا تجھے سورۃ النصر إِذا جَاءَ نَصرُ الله یاد نہیں ہے؟ اس نے کہا کیوں نہیں، آپ نے فرمایا یہ بھی چوتھائی قرآن ہے پھر پوچھا کیا تجھے آیۃ الکرسی یاد نہیں ہے؟ عرض کیا کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا پھر تو شادی کرلے۔ (احمد، در منثور)

حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا من قَرَأَ آيَة الْكُرْسِيّ فِي دُبُرِ الصَّلَاةِ الْمَكْتُوبَةِ كَانَ فِي ذِمَّةِ الله إِلَى الصَّلَاةِ الْأُخْرَى جس شخص نے فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو اگلی نماز تک وہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ (طبرانی، در منثور)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کی کہ مجھ سے برکت اٹھالی گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَيْنَ أَنْتَ مِن آيَةِ الْكُرْسِيِّ مَا تَلِيتَ عَلَى طَعَامٍ وَلَا عَلَى إِدَامٍ إِلَّا أَمْمَى اللهُ بَرَكَةَ ذَلِكَ الطَّعَامَ وَالإِدَامَ آیۃ الکرسی کو تو کیوں نہیں پڑھتا؟ جس کھانے اور سالن پر یہ پڑھی جائے اللہ تعالیٰ اس کھانے اور سالن میں برکت کو بڑھا دیتے ہیں۔ (امالی لشعون)

ابفع بن عبد اللہ کلاعی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یارسول اللہ! اللہ کی کتاب میں کون سی آیت سب سے زیادہ عظمت والی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آیۃ الکرسی، پھر اس نے عرض کیا اللہ کی کتاب میں کون سی آیت ایسی ہے جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پسند فرماتے ہیں کہ وہ آپ کو بھی مل جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بھی مل جائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آخِرُ سُورَةِ الْبَقَرَةِ فَإِنَّهَا مِن كَنزِ الرَّحْمَةِ مِن تَحتِ عَرشِ اللهِ وَلَم تَتْرُك خَيراً فِي الدُّنيَا وَالْآخِرَةِ إِلَّا اشْتَمَلت عَلَيْهِ سورۃ البقرہ کی آخری آیت کیونکہ وہ اللہ کے عرش کے نیچے رحمت کے خزانہ میں سے ہے اور وہ دنیا وآخرت میں کسی خیر کو نہیں چھوڑتی ہے مگر یہ کہ وہ اس کو شامل ہوتی ہے۔ (دارمی، درمنثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان زمین اور جنت اور دوزخ میں آیت الکرسی سے زیادہ عظمت والی کوئی چیز نہیں بنائی جو سورۃ بقرہ میں ہے۔ (تفسیر درمنثور)

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے عرض کی کہ مجھے ایسی چیز سکھایئے جو مجھے نفع دے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اقْرَأ آيَةَ الْكُرْسِيِّ فَإِنَّهُ يَحفَظُكَ وَذُرِّيَتُكَ وَيَحفَظُ دَارَكَ حَتَّى الدُّوَيرَاتِ حَولَ دَارِكَ آیۃ الکرسی پڑھ، کیونکہ وہ تیری (اور) تیری اولاد کی حفاظت کرے گی اور تیرے گھر کی بھی حفاظت کرے گی یہاں تک کہ تیرے گھر کے ارد گرد پڑوسی گھروں کی بھی حفاظت کرے گی۔ (فوائد للمحاملی)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک دن لوگوں کے پاس تشریف لائے اور فرمایا تم میں سے کون مجھ کو قرآن میں سب سے عظمت والی آیت کے بارے میں

بتائے گا۔ کون سب سے زیادہ عدل والی آیت کے بارے بتائے گا؟ اور کون سب سے زیادہ خوف دلانے والی آیت کے بارے میں بتائے گا اور کون سب سے زیادہ امید دلانے والی آیت کے بارے میں بتائے گا؟ یہ سننے والے لوگ سب خاموش ہوگئے۔ پھر ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قرآن میں سب سے عظمت والی آیت اللہ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ القیوم ہے اور سب سے عدل کا پیام دینے والی آیت قرآن میں إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحسَانِ ہے (النحل آیت ۹۰) اور سب سے زیادہ خوف دلانے والی آیت فَمن يَّعْمَل مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيراً يَّرَهُ وَمَن يَّعْمَل مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَّرَهُ ہے اور سب سے زیادہ امید دلانے والی آیت قُل يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسرَفُوا عَلَى أَنفُسِهِم لَا تَقنَطُوا مِن رَّحمَةِ اللهِ ہے۔ (الالقاب للشیرازی، فضائل للہروی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سورۃ البقرہ کی آخری آیت یا آیۃ الکرسی پڑھتے تھے تو ہنستے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ إِنَّهُمَا مِن كَنزِ الرَّحمٰنِ تَحتَ الْعَرْشِ یہ دونوں چیزیں (یعنی سورۃ البقرہ کا آخر اور آیۃ الکرسی) عرش کے نیچے رحمن کے خزانہ میں سے ہیں۔ اور جب یہ آیت مَن يَّعْمَل سُوءاً يُّجْزَ بِهِ (النساء) پڑھتے تھے تو انا للہ وانا الیہ رجعون پڑھتے تھے اور (اللہ تعالیٰ کے سامنے) جھک جاتے تھے۔ (ابن مردویہ، در منثور)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ مَا أَرَى رَجُلاً وُلِدَ فِي الإِسْلَامِ أَوْ أَدْرَكَ عَقْلُه الإِسْلَامَ يَبِيتُ أَبَداً حَتَّى يقْرَأَ هَذِهِ الْآيَةِ {اللهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ القیوم} وَلَوْ تَعْلَمُونَ مَا هِيَ إِنَّمَا أُعْطِيهَا نَبِيَّكُم مِّنْ كَنْزٍ تَحتَ الْعَرْشِ وَلَمْ يُعْطَهَا أَحَدٌ قَبْلَ نَبِيِّكُمْ وَمَا بِتُّ لَيْلَةً قَطُّ حَتَّى اَقْرَأَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ أَقْرَؤُهَا فِي الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاء الْآخِرَةِ وَفِي وِتْرِي وَحِينَ آخُذُ مَضْجَعِي مِنْ فِرَاشِي

میں نے کسی آدمی کو نہیں دیکھا جو اسلام میں پیدا ہوا یا اسلام میں بالغ ہوا وہ اس حال میں ہمیشہ رات

گذارتا ہے کہ وہ آیت الکرسی کو پڑھ لیتا ہے اگر تم جانتے یہ کتنی برکت والی آیت ہے تمہارے نبی کو یہ عرش کے نیچے والے خزانے سے دی گئی تمہارے نبی سے پہلے کسی کو یہ چیز نہیں دی گئی میں نے کوئی بھی رات نہیں گذاری یہاں تک کہ اس کو تین مرتبہ پڑھ لیتا ہوں اور عشاء کے بعد دو رکعتوں میں اس کو پڑھ لیتا ہوں اور اپنے وتر میں بھی اور جب اپنے بستر پر لیٹنے لگتا ہوں تب بھی پڑھ لیتا ہوں۔ (ابو عبید، ابن ابی شیبہ، دارمی، در منثور)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کی کھجوریں میرے سپرد کیں میں نے ان کو ایک کمرہ میں رکھ لیا، پھر میں ان میں ہر دن کمی دیکھتا تھا، میں نے اس بات کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شکایت کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا یہ شیطان کا کام ہے تو اس کی گھات لگا (یعنی اس کی نگرانی کر) میں نے رات کو گھات لگائی، جب رات کا ایک حصہ گزر گیا، (وہ شیطان) ہاتھی کی صورت میں مجھ پر ظاہر ہوا، جب دروازہ کی طرف پہنچا تو دروازہ کی دراڑ سے دوسری طرف داخل ہو گیا، پھر کھجور کے قریب ہوا اور ایک ایک لقمہ کر کے کھانے لگا میں نے اپنے کپڑوں کو کس لیا اور میں نے یہ کلمات پڑھے اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اے اللہ کے دشمن! صدقہ کے کھجوروں کی طرف تو بڑھا ہے میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا دوسرے لوگ تجھ سے زیادہ حق دار ہیں، میں تجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ضرور لے جاؤں گا اور وہ تجھ کو رسوا کریں گے، اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ پھر نہیں آؤں گا، (میں نے اس کو چھوڑ دیا)

میں صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تیرے قیدی نے کیا کیا؟ میں نے کہا اس نے مجھ سے وعدہ کیا پھر نہیں آؤں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ دوبارہ آئے گا اس کی نگرانی کرنا، میں نے دوسری رات پھر نگرانی کی، اس نے اسی طرح کیا اور میں نے اسی طرح کیا، اس نے پھر وعدہ کیا کہ اب نہیں آؤں گا، میں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔

پھر صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو سارا واقعہ سنایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

وہ پھر آئے گا اس کی نگرانی کرنا، میں نے تیسری رات پھر نگرانی کی، اس نے اسی طرح کیا میں نے بھی اسی طرح کیا، میں نے کہا اے اللہ کے دشمن! تو نے مجھ سے دو مرتبہ وعدہ کیا اور یہ تیسری مرتبہ ہے، کہنے لگا میں عیال دار ہوں میں نصیبین (ایک جگہ کا نام) سے تیرے پاس آتا ہوں، اگر مجھے کوئی چیز مل جاتی تو تیرے پاس نہ آتا اور ہم تمہارے اس شہر میں رہتے تھے، یہاں تک کہ تمہارے رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے جب ان پر یہ دو آیتیں نازل ہوئیں تو ہم کو اس (شہر) سے بھگا کر نصیبین میں ڈال دیا اور یہ کہ دونوں آیتیں کسی گھر میں نہیں پڑھی جاتیں مگر یہ کہ اس میں شیطان نہیں داخل ہوتا۔

تین مرتبہ اس نے کہا اگر تو میرا راستہ چھوڑ دے، تو میں وہ دونوں آیتیں تجھ کو سکھا دوں گا، میں نے کہا ہاں (مجھے سکھاؤ) اس نے کہا وہ آیۃ الکرسی ہے۔ اور سورۃ بقرہ کا آخر ہے، اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے آخر تک۔ میں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا، پھر میں صبح کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو بتایا جو کچھ اس نے کہا تھا آپ ﷺ نے فرمایا صَدَقَ الْخَبِیْثُ وَھُوَ کَذُوْبٌ خبیث نے سچ کہا اگرچہ وہ بہت جھوٹ بولنے والا ہے معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس کے بعد میں ان دونوں کو پڑھتا تھا تو کوئی نقصان نہیں دیکھتا تھا۔ (مکائد الشیطان لابن ابی الدنیا، طبرانی، حاکم، ابو نعیم، بیہقی، در منثور)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم جب اس کے ذریعے دعا کی جائے تو قبول ہوتی ہے وہ تین سورتوں میں ہے۔ سورۃ بقرہ، آل عمران، اور طٰہٰ، پھر ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اس کو ڈھونڈھا تو سورۃ بقرہ کی آیۃ الکرسی میں آیت اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کو پایا۔ اور آل عمران میں اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کو پایا اور سورۃ طٰہٰ میں وَعَنَتِ الْوُجُوْہُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ کو پایا۔ (الدعا لابن ابی الدنیا، طبرانی، ابن مردویہ، فضائل للہروی، الاسماء والصفات للبیہقی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک کمرہ میں تشریف لائے اور ان کا کھانا ایک الماری میں ایک ٹوکری میں رکھا ہوا تھا، روشندان میں سے بلی کی طرح کا ایک جانور آتا تھا اور ٹوکری میں سے کھانا لے کر چلا جاتا تھا، ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ

ﷺ سے اس بات کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ شیطان ہے جب وہ آئے تو اس سے کہہ دو کہ میں تجھ کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤں گا اور چھوڑوں گا نہیں، شیطان نے کہا اے ابو ایوب ! مجھ کو اس مرتبہ چھوڑ دے، اللہ کی قسم پھر نہیں آؤں گا، ایوب رضی اللہ عنہ نے اس کو چھوڑ دیا، پھر شیطان نے کہا میں تجھ کو ایسے کلمات نہ سکھاؤں کہ جب تو ان کو کہے گا تو تیرے گھر کے قریب اس رات اور اس دن اور اس سے اگلے دن تک شیطان نہیں آئے گا؟ انہوں نے فرمایا، ہاں! ضرور بتاؤ، کہنے لگا آیۃ الکرسی پڑھا کر، ابو ایوب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور ان کو بتایا، آپ ﷺ نے فرمایا صَدَقَتْ وَهِيَ كَذُوْبٌ اس نے سچ کہا اگرچہ وہ بہت جھوٹا ہے۔ (حاکم، در منثور)

ایک روایت میں ہے کہ یہ بلی جب اگلے روز حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے دیکھی تو ایک بڑھیا کی شکل میں تبدیل ہو گئی تھی، اسے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے پکڑ لیا تھا، پھر اس نے اللہ کا واسطہ دے کر ان سے جان چھڑائی، ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے اگلے دن جا کر نبی کریم ﷺ کو سارا واقعہ سنایا تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ وہ جھوٹی ہے وہ دوبارہ آئے گی، تین مرتبہ ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس طرح ہوا، تین بار اس نے آپ رضی اللہ عنہ سے وعدہ خلافی کی اور تیسری بار اس نے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو آیۃ الکرسی پڑھنے کا کہا کہ آیَةَ الْكُرْسِيِّ لَا يَسْمَعُهَا شَيْطَانٌ إِلَّا ذَهَبَ جو شیطان اس کو سنتا ہے وہ بھاگ جاتا ہے، یہ بات ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو جا کر بتائی تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ بات اس نے سچ کہی ہے اگر وہ بہت بڑی جھوٹی ہے۔ (طبرانی، در منثور)

طبرانی ہی کی ایک روایت میں حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک جنی کو پکڑا تو اس نے مجھے کہا کہ مجھے چھوڑ دیجیے، میں آپ کو ایسی چیز سکھاتی ہوں جب آپ اسے پڑھیں گے تو ہم میں سے کوئی بھی آپ کو تکلیف نہیں پہنچا سکے گا، چنانچہ اس نے آیۃ الکرسی پڑھنے کا کہا۔ (طبرانی)

حضرت ابو قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے آیۃ الکرسی اور سورۃ بقرہ کا آخر (یعنی آخری آیتیں) سخت مصیبت کے وقت پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائیں

گے۔(ابن السنی، در منثور)

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب ان کے ہاں بچے کی پیدائش کا وقت قریب آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج میں سے حضرت زینب بن جحش رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا دونوں کو ان کے پاس بھیجا کہ ان کے پاس جاؤ اور ان کے پاس آیۃ الکرسی اور سورۃ الاعراف کی آیت مبارکہ

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (سورۃ الاعراف ۵۴)

اور قرآن کریم کی آخری دو سورتیں معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھ کر ان پر دم کرو۔ (العمل الیوم واللیلہ لابن السنی، تفسیر در منثور)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میرے پاس خوراک تھی، اس میں نقصان ہو رہا تھا، میں رات میں چھپ کر بیٹھ گیا، اچانک ایک جنی عورت دیکھی میں اس پر لپکا اور میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا کہ تجھ کو نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ تجھ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جاؤں گا کہنے لگی میں ایک عورت ہوں اور کثیر العیال ہوں (یعنی اولاد بہت ہے) پھر نہیں آؤں گی (مجھے چھوڑ دے) پھر وہ دوسری اور تیسری مرتبہ آئی میں نے اس کو پکڑ لیا تو کہنے لگی مجھے چھوڑ دے، میں تجھ کو ایک ایسی چیز سکھاؤں گی جب تو اس کو پڑھے گا تو ہم میں سے کوئی تیرے سامان کے پاس نہیں آئے گا جب تو اپنے بستر پر آئے تو اپنے اوپر اور اپنے مال پر آیۃ الکرسی پڑھ لے میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بتائی تو آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا اگرچہ وہ بہت جھوٹی ہے۔(الدلائل للبیہقی، در منثور)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سُورَةُ الْبَقَرَةِ فِيهَا آيَةٌ سَيِّدَةُ آيِ الْقُرْآنِ لَا تُقْرَأُ فِي بَيْتٍ فِيهِ شَيْطَانٌ إِلَّا خَرَجَ مِنْهُ آيَةُ الْكُرْسِيِّ سورۃ البقرہ میں ایک آیت ہے جو قرآن کریم کی ساری آیات کی سردار ہے، وہ آیۃ الکرسی ہے جس گھر میں پڑھی جاتی ہے

شیطان اس سے نکل جاتا ہے۔(حاکم) حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے پاس جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ ایک جن آپ کے ساتھ مکر و فریب کرے گا جب آپ اپنے بستر پر آئیں تو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کریں۔(مکائد الشیطان)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ایک رات کو اپنے باغ میں تشریف لے گئے، اس میں اچانک ایک آواز سنی اور پوچھا یہ کون ہے؟ اس نے کہا میں جنات میں سے ایک ہوں، ہم کو قحط سالی پہنچ گئی، تو میں نے ارادہ کیا کہ انسانوں کے پھلوں میں سے کچھ لے لوں ہمارے لیے اس کو حلال کر دیجئے، انہوں نے فرمایا ہاں ٹھیک ہے، پھر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا تو ہم کو بتا سکتا ہے کہ کون سی چیز ہمیں تم سے بچا سکتی ہے؟ اس نے کہا آیۃ الکرسی۔(مکائد الشیطان)

حضرت سلمہ بن قیس ایلیا کے پہلے امیر تھے، ان سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیۃ الکرسی سے زیادہ عظمت والی کوئی آیت تورات میں، انجیل میں اور زبور میں نازل نہیں کی۔(در منثور)

مطلب یہ ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز ہے کہ ان ہی پر یہ آیت اتری، قرآن کریم ہی کا اعزاز ہے کہ اس میں یہ آیت اتری، سورۃ البقرہ کا اعزاز ہے کہ آیۃ الکرسی اس کا ایک حصہ اور اس کی ایک آیت ہے، امت محمدیہ کا اعزاز ہے کہ ان کی کتاب میں یہ آیت ہے، باقی تمام امتیں اس اعزاز سے محروم ہیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی کا بھائی فوت ہو گیا، تو اس نے اسے حالت خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ کون سا عمل بہتر ہے؟ اس نے کہا کہ قرآن کریم کی تلاوت یہ بہترین عمل ہے، پھر اس نے پوچھا کہ قرآن کریم میں سے بھی کون سا عمل بہتر ہے؟ اس نے کہا کہ قرآن کریم میں آیۃ الکرسی کی تلاوت بڑا اہم عمل ہے، پھر پوچھا کہ ہمارے لیے کس چیز کی امید رکھتے ہو؟ اس نے کہا إِنَّكُم تَعمَلُونَ وَلَا تَعلَمُونَ وَإِنَّا نَعلَمُ وَلَا نَعمَلُ ہاں تم عمل کرتے ہو اور تم جانتے نہیں ہو اور ہم جانتے ہیں۔ اور ہم عمل نہیں کرتے۔(تفسیر در منثور)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جو شخص بستر پر سوتے وقت آیۃ الکرسی پڑھتا ہے صبح تک دو فرشتے اس کی حفاظت پر مامور ہوتے ہیں، جو صبح تک اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ (ابن ضریس، در منثور) علامہ قرطبی ارشاد فرماتے ہیں کہ آیت الکرسی توحید اور اعلیٰ صفات کو لیے ہوئے ہے، اس میں پچاس کلمے ہیں اور ہر کلمے میں پچاس برکتیں ہیں اور یہ تہائی قرآن کریم کے برابر ہے۔

اللہ: اللہ معبود حقیقی کا ذاتی نام ہے، جو واجب الوجود ہے، جو تمام کامل صفات کی جامع ہستی ہے، جو نقص اور زوال سے بالکل پاک و منزہ ہے، وہ الہ العالمین ذات ہے، جس نے آسمانوں کو بدون ستون محض اپنی قدرت کاملہ سے کھڑا کر دیا، انسانی نگاہیں ہزار ہا بار بھی اس کی طرف اٹھیں تو انہیں اس میں کوئی عیب اور نقص نہیں دکھائی دے گا، اس کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں دکھائی دے گا، کوئی پھٹن اور لکیر نہیں دکھائی دے گی، جس نے محض اپنی قدرت کاملہ سے اتنی وسیع و عریض زمین کو پانی کی سطح پر رکھ دیا، جس نے پہاڑوں کو زمین میں گاڑ دیا تاکہ زمین حرکت نہ کر سکے، اسی کاریگری کی مالک ہستی کو اللہ کہتے ہیں، جس نے انسان کو ایک نطفہ بے جان سے بنایا، اور اسے احسن تقویم کا لقب عطا فرمایا۔

لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ: اس کی ذات کے سوا کوئی بندگی اور پوجا کے لائق نہیں ہے، کوئی سجدے اور رکوع کے لائق نہیں ہے، کوئی جھکنے اور بچھنے کے مستحق نہیں ہے، کوئی مشکل کشا اور حاجت روا نہیں ہے، کوئی نذر و نیاز کا مستحق نہیں ہے، وہ اکیلی ہستی ہے جس کی پوجا کی جائے، جسے حاجات و مشکلات میں پکارا جائے۔

الْحَيُّ: یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم ہے، جس کے ساتھ اسے پکارا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب مردے کو زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو وہ انہی اسماء کے ساتھ مانگتے تھے۔ یا حی یا قیوم۔ (قرطبی) آصف بن برخیا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس تخت بلقیس لانے کا ارادہ فرمایا تو اسی قول

کے ساتھ دعا مانگی:۔ یا حی یا قیوم (قرطبی) بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم بارے پوچھا تو آپ علیہ السلام نے انہیں فرمایا: أیا ھیا شرا ھیا یعنی، یا حی یا قیوم۔ اور کہا جاتا ہے: یہی سمندر میں سفر کرنے والوں کی دعا ہے کہ جب انہیں غرق ہونے کا خوف لگتا ہے تو انہی اسماء کے ساتھ دعا مانگتے ہیں (پکارتے ہیں) (قرطبی) اور یہ قول بھی ہے: اللہ تعالیٰ نے امور کے محل میں تصرف کرنے اور اشیاء کی مقادیر مقرر کرنے کی وجہ سے اپنا نام حی رکھا ہے اور حضرت قتادہؒ نے کہا ہے: حی وہ ہوتا ہے جسے موت نہیں آتی۔ اور سدی نے کہا ہے: الْحَیُّ سے مراد باقی رہنے والا ہے لبید کا قول ہے

فَإِمَّا تَرِينِي الْيَوْمَ أَصْبَحْتُ سَالِمًا ... وَلَستُ بِأَحْيَا مِنْ كِلَابٍ وَجَعْفَرِ

پس اگر تو آج مجھے دیکھ رہا ہے کہ میں نے صحیح سالم صبح کی ہے تو میں کلاب و جعفر میں سے باقی رہنے والا نہیں ہوں۔

الْقَيُّوْمُ: حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ القیوم یہ قام سے ہے، یعنی مخلوق کو تدبیر کے ساتھ قائم رکھنے والا اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے: ہر نفس کو اس کے ساتھ قائم رکھنے والا جو اس نے کمایا ہے تاکہ وہ اسے اس کے عمل کے مطابق جزا دے، اس حیثیت سے کہ وہ اس کے بارے میں جاننے والا ہے اور ان میں سے کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، اس کا معنی ہے وہ ذات جو نہ بدلتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔ (یعنی نہ اس کی حالت میں کوئی تغیر و تبدل ہوتا ہے اور نہ وہ زوال پذیر ہے)

امیہ بن ابی الصلت نے کہا ہے:

لَمْ تُخْلَقِ السَّمَاءُ وَالنُّجُومُ ... وَالشَّمْسُ مَعَهَا قَمَرٌ يَقُومُ

قَدَّرَهُ مُهَيْمِنٌ قَيُّومُ ... وَالْحَشْرُ وَالْجَنَّةُ وَالنَّعِيمُ

آسمان اور ستارے، سورج اور اس کے ساتھ قائم ہونے والا چاند نہیں پیدا کئے گئے، جسے نگہبان قیوم نے مقرر کیا ہے اور حشر اور جنت اور تمام نعمتیں (نہیں پیدا کی گئیں) مگر ایسے امر کے لئے جس کی

شان انتہائی عظیم ہے۔ کلبی کہتے ہیں کہ القیوم وہ ہے جس کی بتداءنہ ہو۔ ایک شاعر نے کہا ہے:

إِنَّ ذَا الْعَرْشِ لَلَّذِي يَرْزُقُ النَّاسَ «وَحَيٌّ عَلَيْهِمْ قَيُّومُ

بلاشبہ صاحب عرش وہ ہے جو لوگوں کو رزق عطا فرماتا ہے اور وہ ان پر حی و قیوم ہے۔ (قرطبی)

لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ: اللہ تعالیٰ اس بے عیب ذات کا نام ہے جسے اونگھ آتی ہے اور نہ ہی نیند آتی ہے، اونگھ نیند کا ابتدائی حصہ ہوتا ہے، یہ آنکھ میں ہوتی ہے، جب آنکھ سے دل تک چلی جائے تو اسے نیند کہا جاتا ہے۔ مفضل نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ السِّنَةُ مِنَ الرَّأْسِ، وَالنُّعَاسُ فِي الْعَيْنِ، وَالنَّوْمُ فِي الْقَلْبِ السنۃ یہ سر کی جانب سے ہوتی ہے اور نعاس آنکھ میں ہوتی ہے اور نوم (نیند) دل میں ہوتی ہے۔ (قرطبی) اور سدی کہتے ہیں کہ السِّنَةُ: رِيحُ النَّوْمِ الَّذِي يَأْخُذُ فِي الْوَجْهِ فَيَنْعَسُ الْإِنْسَانُ السنۃ سے مراد اس نیند کی ہوا ہے جو چہرے پر لگتی ہے اور انسان اونگھنے لگتا ہے۔ (قرطبی)

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَبِالْجُمْلَةِ فَهُوَ فُتُورٌ يَعْتَرِي الْإِنْسَانَ وَلَا يَفْقِدُ مَعَهُ عَقْلَهُ بالجملہ اس سے مراد وہ فتور اور ڈھیلا پن ہے جو انسان کو لاحق ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی عقل مفقود نہیں ہوتی اور اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی بھی خلل واقع نہیں ہوتا اور کسی حال میں بھی اسے کوئی اکتاہٹ اور سستی لاحق نہیں ہوتی۔ (قرطبی)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے پوچھا، اے موسیٰ! کیا آپ کا رب سوتا ہے؟ حضرت موسیٰ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، پھر ان کے رب نے ان کو آواز دی، يَا مُوسَى سَأَلُوكَ هَل يَنَامُ رَبُّكَ فَخُذ زُجَاجَتَينِ فِي يَدَيكَ فَقُمِ اللَّيلَ اے موسیٰ! آپ سے انہوں نے سوال کیا کیا تیرا رب سوتا ہے؟ دو شیشے کی بوتلیں اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر رات میں کھڑے ہو جایئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا جب ایک تہائی رات گزر گئی تو اونگھ آنے لگی اور اپنے گھٹنوں کے بل گرنے لگے پھر آپ اٹھے اور ان بوتلوں کو مضبوطی سے پکڑا، یہاں تک کہ جب

اخیر رات ہوئی تو ایسی اونگھ آئی کہ دونوں بوتلیں گر پڑیں اور ٹوٹ گئیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا یَا مُوسیٰ لَو کُنتُ أَنَامُ لَسَقَطَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ فَهَلَكْنَ كَمَا هَلَكَتِ الزُّجَاجَتَانِ فِي يَدَيكَ اے موسیٰ! اگر میں نیند کرتا تو آسمان اور زمین گر جاتے اور ہلاک ہو جاتے جیسے تیرے ہاتھ میں بوتلیں گر کر ٹوٹ گئیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر آیۃ الکرسی کو نازل فرمایا۔ (ابن ابی حاتم، العظمت لابی الشیخ، تفسیر در منثور)

علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی ہے، جس میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں بوتلیں ٹوٹنے کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس روایت میں یہ ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے منبر رسول ﷺ پر نبی کریم ﷺ سے یہ حکایت سنی کہ موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ بھی سوتا ہو گا؟ تو اللہ نے ان کی طرف ایک فرشتہ روانہ کیا، اس نے موسیٰ علیہ السلام کو سوتے میں تین بار بیدار کیا، پھر ان کے ہاتھ میں شیشے کی دو بوتلیں تھمائیں، ہر ہاتھ میں ایک بوتل تھی، پھر آپ کو حکم دیا گیا کہ ان دونوں کی حفاظت کرنا ہے، موسیٰ علیہ السلام کو گہری نیند نے آلیا، اسی دوران آپ کے دونوں ہاتھ آپس میں ٹکرا گئے تو دونوں بوتلیں ٹوٹ گئیں۔

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ: زمین و آسمان کی ہر شے اس کی ملکیت ہے اور وہ تمام کا مالک اور رب ہے۔ علامہ طبری فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کفار نے کہا، مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفَى (زمر : ۳) ہم بتوں کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے تاکہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ نزدیک کر دیں۔

مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ: اللہ کی بارگاہ میں سفارش اور شفاعت کی کسی میں ہمت نہیں ہو گی، جو مجرموں کو اس کی طرف سے ملنے والی سزا سے بچالے یا چھڑالے، مگر اللہ کی شان کریمی ہے کہ وہ جسے چاہے گا شفاعت اور سفارش کی اجازت مرحمت فرمائے گا، جس کے حق میں وہ سفارش کی اجازت دے گا اس کے حق میں سفارش قبول بھی فرمائے گا، علامہ قرطبی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ جسے

چاہے گا اذن عطا فرمائے گا اور وہ انبیاء علیہم السلام، علماء مجاہدین، ملائکہ اور ان کے علاوہ وہ لوگ ہیں جنہیں رب العالمین یہ اعزاز واکرام اور شرف عطا فرمائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: جو ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ علماء اور صالحین ان کے بارے میں شفاعت کریں گے جو ابھی جہنم تک نہیں پہنچے اور وہ دونوں منزلوں کے درمیان ہوں گے یا وہاں پہنچ چکے ہوں گے لیکن ان کے اعمال صالحہ بھی ہوں گے۔ (قرطبی)

مفسر قرآن حضرت صوفی عبد الحمید سواتی فرماتے ہیں فرمایا جب قادر مطلق وہ ذات ہے۔ تو من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ کون ہے جو اس کے سامنے سفارش کرنے کا دم مار سکے بغیر اس کی اجازت کے، مشرکوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے معبود ان کی سفارش کریں گے، اللہ تعالیٰ خواہ راضی ہو یا ناراض یہ ہماری سفارش کر کے خدا کو ضرور ہی منالیں گے، یہودیوں اور نصرانیوں کا بھی اسی قسم کا عقیدہ ہے، حالانکہ جبری اور قہری سفارش کا تو وجود ہی نہیں ہے، ہاں اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ سفارش کرنے کی اجازت ہو گی۔

اشرف المخلوقات میں سب سے افضل انسان حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن رب العالمین کے سامنے آؤں گا اور اللہ تعالیٰ کے حضور لمبا سجدہ کروں گا پھر حکم ہو گا یَا مُحَمَّدُ اِرفَع رَاسَكَ، اے محمد! آپ اپنا سر اٹھائیں۔ آپ بات کریں آپ کی بات سنی جائیگی، آپ سفارش کریں، آپ کی سفارش قبول کی جائے گی۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سجدہ دس برس کے وقفہ کے برابر لمبا ہو گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ شفاعت کی اجازت دیں گے، بغیر اجازت کے کوئی سفارش نہیں ہو گی اور اجازت بھی اس شخص کے لیے دی جائے گی جس کا عقیدہ توحید پر ہو گا اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہوا۔ وَلَا يَرضَى لِعِبَادِهِ الكُفر اللہ تعالیٰ کفر والے عقیدہ، شرک والے عقیدہ کو پسند نہیں کرتا، وہ کفر کرنے کی توفیق تو دے دیتا ہے۔ کافر کی رسی تو دراز کر دیتا ہے مگر ان سے ناراض ہوتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک وَالكٰفِرُونَ

هُمُ الظّٰلِمُونَ۔ کافر لوگ ہی اصل ظالم ہیں، نیز یہ کہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ شرک بہت بڑا ظلم ہے، لہٰذا قیامت کے دن سفارش دو شرطوں سے مشروط ہو گی اور مستحق سفارش کون شخص ہو گا، مَن لَّا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئاً جو اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا نہ ہو اور پھر یہ کہ بغیر اجازت کے سفارش نہ ہو گی۔ جب اجازت ہو گی تو انبیاء ملائکہ، اولیاء، شہدا اور مومن سفارش کریں گے صحیحین کی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ بار بار سجدہ ریز ہوں گے اور اللہ تعالیٰ بار بار سفارش کی اجازت دیں گے، یہ سفارش مختلف قسم کے لوگوں کے لیے ہو گی، ایک دفعہ اجازت ہو گی کہ اس قسم کے لوگوں کے متعلق سفارش کریں، آپ سفارش کر کے ان لوگوں کو دوزخ سے نکال لیں گے، پھر سجدہ کریں گے پھر اجازت ہو گی، اب ایسے لوگوں کی سفارش کریں، آپ ان لوگوں کو بھی دوزخ سے نجات دلوائیں گے اور اس طرح آپ بار بار سجدہ کریں گے اور اللہ بار بار سفارش کی اجازت دیں گے، دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حضور ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے۔ (معالم العرفان)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن لوگوں کی کئی صفیں بنائی جائیں گی، پس اہل نار میں سے ایک آدمی ایک آدمی کے پاس سے گزرے گا تو وہ کہے گا: يَا فُلَانُ أَمَا تَذْكُرُ يَوْمَ اسْتَسْقَيْتَ فَسَقَيْتُكَ شَرْبَةً اے فلاں! کیا تجھے وہ دن یاد نہیں ہے جب تو نے پانی طلب کیا تو میں نے تجھے خوب جی بھر کر پانی پلایا تھا؟ فرمایا تو وہ اس کی شفاعت کر دے گا اور ایک اور آدمی کے پاس سے گزرے گا اور کہے گا أَمَا تَذْكُرُ يَوْمَ نَاوَلْتُكَ طَهُورًا کیا تجھے وہ دن یاد نہیں ہے جب میں نے تجھے طہور (جس سے پاکی حاصل کی جائے) دیا تھا؟ چنانچہ وہ اس کی شفاعت کر دے گا۔ (سنن ابن ماجہ، قرطبی)

جب فرشتے، انبیاء کرام اور اہل ایمان سفارش کر چکیں گے تو ایک ارحم الراحمین کی ذات بچے گی، پھر اللہ مٹھی بھر کر اہل دوزخ کو دوزخ سے نکالیں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے کبھی بھی کوئی خیر کا کام نہیں کیا ہو گا حالانکہ یہ لوگ کوئلہ بن چکے ہوں گے۔ (قرطبی)

جو لوگ کلمہ گو ہوں گے ان کے بارے میں اللہ فرمائیں گے مجھے اپنی عزت کی قسم، مجھے اپنی کبریائی کی قسم، مجھے اپنی عظمت کی قسم، مجھے اپنے جبروت کی قسم میں اس شخص کو ضرور بہ ضرور دوزخ کی آگ سے باہر نکالوں گا جس نے لا الہ اللہ کہا ہو گا۔ (قرطبی)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلہ کر کے فارغ ہو جائیں گے تو اپنی رحمت کے تقاضا سے جسے چاہیں گے دوزخ سے نکالنا تو فرشتوں کو حکم دیں گے اسے دوزخ سے نکالو، یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے کسی کو اللہ کا شریک نہیں ٹھہرایا تھا، لا الہ الا اللہ کہنے والوں پر اللہ رحم کریں گے، فرشتے انہیں ان کے سجدوں کے نشان سے دوزخ میں پہچانیں گے، کیونکہ دوزخ ابن آدم کے مقام سجدہ کو نہیں جلائے گی، نشان سجدہ جلانا دوزخ پر اللہ نے حرام کیا ہے۔ (قرطبی)

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ: دونوں ضمیریں ہر اس ذی عقل کی طرف لوٹ رہی ہیں جن کو لہ مافی السموات ومافی الارض میں بیان کیا گیا ہے، مفسر قرآن حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ سے مراد دنیا اور وَمَا خَلْفَهُمْ سے مراد آخرت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سب فی نفسہ صحیح ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ مابین الید سے مراد ہر وہ شے ہے جو انسان کے سامنے ہے اور ماخلفہ سے مراد ہر وہ شے ہے جو اس کے بعد آئے گی۔ مفسر قرآن صاحب تفسیر مظہری فرماتے ہیں کہ ان سے پہلے کی اور بعد کو آنے والی چیزوں کو یا ان چیزوں کو جانتا ہے جن کو انسان جانتے ہیں اور ان چیزوں کو بھی جن کو انسان نہیں جانتے یا ان چیزوں کو جانتا ہے جن کو لوگ لیتے یا ترک کرتے ہیں یا کسی چیز کو نظر انداز کر دینا بتاتا ہے کہ نظر انداز کرنے والے نے اس چیز کو پس پشت پھینک دیا۔ (مظہری)

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ: یہاں علم بمعنی معلوم ہے یعنی وہ اس کی معلومات میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے اور یہ حضرت خضر علیہ السلام کے اس قول کی طرح ہے جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت کہا جب چڑیا نے سمندر میں چونچ ماری، میرا اور تمہارا علم اللہ تعالیٰ کے

علم سے کم نہیں ہے مگر اتنا ہی جتنی یہ چڑیا اس سمندر سے کم ہے، پس یہ اور جو اس کے مشابہ ہے وہ معلومات کی طرف راجع ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم تو وہ ہے جو اس کی ذاتی صفت ہے وہ منقسم نہیں ہوتا، اور آیت کا معنی ہے، کسی کے لئے کوئی معلوم نہیں مگر وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے کہ وہ اسے جان لے۔

مولانا ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں اور اہل علم اللہ کے علم کے کسی حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے یعنی اللہ کی معلومات کے کسی حصہ کو پورے طور پر نہیں جان سکتے، اللہ کو ہر چیز معلوم ہے پھر مِن عِلْمِہٖ کی قید لگانے سے اس بات پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ کوئی علمی احاطہ نہیں کر سکتا۔ احاطہ علمی کی نفی سے مراد ہے ایسے علم کامل کی نفی جو تمام اشیاء کی حقیقت کو محیط ہو۔ علم محیط صرف باری تعالیٰ کی خصوصیت ہے کسی مخصوص چیز کی حقیقت کا کامل علم بطور ندرت ممکن ہے کہ کسی کو ہو جائے لیکن تمام اشیاء کی حقیقت کوئی نہیں جانتا، یا علم سے مراد وہ علم غیب ہے جو اللہ کے لیے مخصوص ہے یعنی اللہ کے علم غیب کے کسی حصہ کو کوئی احاطہ کے ساتھ نہیں جانتا۔ (مظہری)

اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے اور لوگوں کو اتنا ہی علم ہے جتنا اس نے دیا، اللہ تعالیٰ کا علم تمام کائنات کے ماضی، حال اور مستقبل کو محیط ہے، وہ دنیا اور آخرت کے تمام امور کو تفصیلاً جانتا ہے، اس کو ایک ذرہ کا علم بھی غیر متناہی وجوہ سے ہوتا ہے، مثلاً ایک ذرہ کو کتنے انسانوں، کتنے جانوروں، کتنے جنات اور کتنے فرشتوں نے دیکھا، اس ایک ذرہ کی دیگر ذرات کے ساتھ کتنی نسبتیں ہیں، اس پر کتنے ہوا کے جھونکے اور کتنے بارش کے قطرے گزرے، اس میں کتنے فائدے، کتنے نقصانات، کتنی حکمتیں ہیں، اس ذرہ کی کتنی عمر ہے، وہ کہاں کہاں رہا اور ایسی بیشمار وجوہ ہیں، تمام کائنات کا علم تو الگ رہا ایک ذرہ کے متعلق اللہ کا علم کتنا وسیع ہے انسان کی عقل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی، مخلوق کو اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنا وہ عطا فرماتا ہے۔ (تبیان القرآن) یُحِیطُونَ یہ احاطہ سے ہے اور احاطہ کا لغوی معنیٰ ہوتا ہے کسی چیز کا ادراک کمال درجے میں کرنا۔ (بحر العلوم للسمرقندی)

إِلَّا بِمَا شَاءَ: اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معلومات میں سے کچھ نہیں جانتے سوائے اس کے جتنا وہ چاہے کہ انہیں سکھادے، جیسے فرشتوں کے بارے میں قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ لوگ غیب دان نہیں ہیں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کچھ مغیبات اپنے انبیاء کرام کو بتادیتے ہیں، کچھ غیب پر انہیں اطلاع دے دی ہے، جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَداً إِلَّا مَنِ ارْتَضَى مِنْ رَسُولٍ وہ اپنے غیب کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا سوائے اپنے رسولوں میں سے جسے بتانا پسند کرلے۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الْكُرْسِيُّ لُؤْلُؤَةٌ وَالْقَلَمُ لُؤْلُؤَةٌ وَطُولُ الْقَلَمِ سَبْعُمِائَةِ سَنَةٍ وَطُولُ الْكُرْسِيِّ حَيْثُ لَا يَعْلَمُهُ إِلَّا اللّٰهُ کرسی ایک موتی ہے اور قلم بھی ایک موتی ہے اور قلم کی لمبائی سات سو برس کی ہے اور کرسی کی طوالت اتنی ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (تاریخ ابن عساکر)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: بَيْنَ كُلِّ سَمَاءَيْنِ مَسِيرَةُ خَمْسِمِائَةِ عَامٍ وَبَيْنَ السَّمَاءِ السَّابِعَةِ وَبَيْنَ الْكُرْسِيِّ خَمْسُمِائَةِ عَامٍ، وَبَيْنَ الْكُرْسِيِّ وَبَيْنَ الْعَرْشِ مَسِيرَةُ خَمْسِمِائَةِ عَامٍ، وَالْعَرْشُ فَوْقَ الْمَاءِ وَاللّٰهُ فَوْقَ الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا أَنْتُمْ فِيهِ وَعَلَيْهِ ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ساتویں آسمان اور کرسی کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہے اور کرسی اور عرش کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور عرش پانی کے اوپر ہے اور اللہ تعالیٰ (اپنی شان قدرت کے مطابق) عرش کے اوپر ہے اور وہ اسے جانتا ہے جس میں تم ہو اور جس پر تم ہو۔

حضرت ابن عباس نے کرسی کا معنیٰ اللہ کا علم کیا ہے، علامہ طبری نے اسی معنیٰ کو ترجیح دی ہے اور فرمایا کہ اسی سے وہ كُرَّاسَةٌ (کاپی) بھی ہے جو علم کو جمع کرتی ہے۔ (اور محفوظ رکھتی ہے) اور

اسی وجہ سے علماء کو الکراسی کہا گیا ہے کیونکہ ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ (تفسیر قرطبی)

اہل علم کی طرف سے کرسی کا ایک معنٰی و مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ کرسی سے مراد اللہ کی وہ قدرت ہے جس کے ساتھ وہ آسمانوں اور زمین کو ٹھہرائے ہوئے ہے، جس طرح آپ کہتے ہیں: اِجْعَلْ لِهَذَا الْحَائِطِ كُرْسِيًّا اس دیوار کی کرسی بنا دو یعنی وہ جس پر اس کا اعتماد اور سہارا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس سے مراد وہی کرسی ہے جو عرش کے ساتھ مشہور ہے۔

ابو مالک سے مروی ہے إِنَّ الصَّخْرَةَ الَّتِي عَلَيْهَا الْأَرْضُ السَّابِعَةُ وَمُنْتَهَى الْخَلْقِ عَلَى أَرْجَائِهَا، عَلَيْهَا أَرْبَعَةٌ مِنَ الْمَلَائِكَةِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ أَرْبَعَةُ وُجُوهٍ: وَجْهُ إِنْسَانٍ وَوَجْهُ أَسَدٍ وَوَجْهُ ثَوْرٍ وَوَجْهُ نَسْرٍ، فَهُمْ قِيَامٌ عَلَيْهَا قد أحاطوا بالأرضين والسموات، وَرُءُوسُهُمْ تَحْتَ الْكُرْسِيِّ وَالْكُرْسِيُّ تَحْتَ الْعَرْشِ وَاللَّهُ وَاضِعٌ كُرْسِيَّهُ فَوْقَ الْعَرْشِ

بیشک وہ چٹان جس پر ساتویں زمین ہے اور اس کی اطراف پر مخلوق کی انتہا ہے، اس پر چار فرشتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے چار چہرے ہیں، ایک انسان کا چہرہ، ایک شیر کا چہرہ، ایک بیل کا چہرہ اور ایک گدھ کا چہرہ، پس وہ اس پر کھڑے ہیں حالانکہ وہ زمینوں اور آسمانوں کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان کے سر کرسی کے نیچے ہیں اور کرسی عرش کے نیچے ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی کرسی کو عرش کے اوپر رکھے ہوئے ہے۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے اس میں اشارہ دو کرسیوں کی طرف ہے ان میں سے ایک عرش کے نیچے ہے اور دوسری عرش پر رکھی ہوئی ہے۔ (قرطبی)

ایک روایت کے مطابق آسمان و زمین کرسی کے درمیان میں ہیں اور کرسی عرش کے سامنے ہے اور ملحدین اس کو بادشاہ کی عظمت اور جلالت سلطان پر محمول کرتے ہیں اور وہ عرش و کرسی کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور یہ کوئی شے نہیں ہے اور اہل حق ان دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں بڑی وسعت ہے اور اس کے ساتھ ایمان لانا واجب ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری

رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کرسی قدم رکھنے کی جگہ ہے اور اس کی کجاوے کے چرچرانے کی طرح چرچراہٹ ہے۔(قرطبی)

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے ابوذر! سات آسمانوں کو کرسی کے ساتھ ایسی ہی نسبت ہے جیسے وسیع زمین پر پھینکی ہوئی آنگوٹھی کے حلقہ کو اس کے ساتھ ہوتی ہے اور عرش کو کرسی پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسے وسیع زمین کو انگوٹھی کے حلقہ پر ہوتی ہے۔(آجری، ابوحاتم بستی، قرطبی)

علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کرسی کا معنی ہے، جس پر کوئی شخص بیٹھے اور بیٹھنے کے بعد اس میں جگہ نہ بچے اور یہاں یہ کلام بہ طور تمثیل ہے، ورنہ کوئی کرسی ہے نہ کوئی بیٹھنے والا، اکثر متاخرین نے یہی کہا ہے تاکہ اللہ کے لیے جسم ہونا لازم نہ آئے اور احادیث میں بھی استعارہ ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے اور حق وہی ہے جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور توہم جسمیت کا کوئی اعتبار نہیں ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات کا انکار لازم آئے گا اور متقدمین نے یہ کہا کہ یہ متشابہات میں سے ہے اور حقیقت میں اس سے کیا مراد ہے اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔(روح المعانی)

شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ میں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کی حاکمیت اور مالکیت آسمانوں اور زمینوں سے بھی متجاوز ہے جہاں تک بندوں کا وہم و خیال بھی نہیں۔ احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ و تابعین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرسی ایک جسم ہے جو آسمانوں اور زمین سے بڑا ہے اور عرش سے چھوٹا ہے، حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ساتوں آسمان کرسی کے اندر ایسے ہیں جیسے کسی ڈھال میں سات درہم ڈال دیے جائیں کرسی کی اضافت اور نسبت اللہ کی طرف ایسی ہے جیسے عرش اللہ اور بیت اللہ کی نسبت ہے بظاہر یہ کوئی خاص قسم کی تجلی ہے اور جس طرح تجلیات کی انواع اور اقسام میں ہر شے کی تجلی علیحدہ ہے اسی طرح عجب نہیں کہ کرسی اور عرش کی تجلیات علیحدہ علیحدہ ہوں اور ایک دوسرے سے ممتاز ہوں جمہور سلف کے نزدیک آیت میں کرسی

سے ظاہری اور متبادر معنی مراد ہیں اور بعض علماء ادھر گئے ہیں کہ کرسی اس کی عظمت اور سلطنت کی تصویر اور محض ایک مثال ہے ورنہ در حقیقت نہ کوئی کرسی ہے اور نہ وہاں کوئی بیٹھنے والا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ لفظ سے حقیقی معنی ہی مراد لیے جائیں قرآن کریم میں صدہا جگہ مجازی اور کنائی معنی مراد لیے گئے ہیں۔(معارف القرآن)

وَلَا يَؤُدُهٗ حِفْظُهُمَا: ان چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ کو تھکا نہیں دیتی انسان تو مسلسل کچھ عرصہ کام کر کے تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر آرام چاہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ تمام کائنات کی مسلسل نگرانی کے باوجود تھکتا نہیں، وہ ازل سے لے کر ابد اور ہمیشہ کے لیے اپنے کام میں مصروف ہے، نہ وہ تھکتا ہے، نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے اور نہ کوئی چیز اس کے احاطہ قدرت سے باہر ہوتی ہے۔(معالم العرفان)

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ: اللہ کی ہستی بڑی ہی بلند اور بڑی ہی عظیم ہے اس کے علم، اس کی قدرت اور اس کی وسعت کو اپنے محدود پیمانوں سے نہ ناپو، یہیں سے اس کے بارے میں گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں اور شرک کی راہیں کھلتی ہیں، اپنی صفات کے باب میں جو کچھ وہ خود بتاتا ہے اس پر ایمان لاؤ اور ظن و قیاس اور تشبیہ و تمثیل کی خیال آرائیوں سے بچو۔(تدبر قرآن)

اَلْعَلِيُّ سے مراد قدر و منزلت کی بلندی ہے نہ کہ مکان کی بلندی، کیونکہ اللہ تعالیٰ جگہ اور مکان سے منزہ اور پاک ہے۔(قرطبی)

اور عبدالرحمن بن قرط سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج آسمانوں کی بلندیوں میں تسبیح سنی: سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَلِيِّ الْأَعْلَى سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى اور الْعَلِيُّ وَالْعَالِي ان کا معنی ہے اشیاء پر بہت سخت غلبہ رکھنے والا، عرب کہتے ہیں: عَلَا فُلَانٌ فُلَانًا، یعنی فلاں فلاں پر غالب آگیا۔ الْعَظِيمُ یہ صفت ہے اس کا معنی ہے قدر و منزلت اور شرف کے اعتبار سے عظیم، یہ اجسام کی عظمت کے معنی میں نہیں ہے۔

دین میں جبر واکراہ نہیں ہے

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۵۶) البقرہ

جواب ترجمہ: دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے، ہدایت کا راستہ گمراہی سے ممتاز ہو کر واضح ہو چکا، اس کے بعد جو شخص طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے گا، اس نے ایک مضبوط کڑے کو تھام لیا جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں، اور اللہ خوب سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ زمانہء اسلام سے پہلے جس عورت کا بچہ مر جاتا تھا وہ یہ نذر مان لیتی تھی کہ اگر میرا بچہ زندہ رہا تو اسے یہودی بنادوں گی (العیاذ اللہ) جب یہود کا قبیلہ بنو نضیر مدینہ منورہ سے جلا وطن کیا گیا تو ان میں انصار کے قبیلوں کے وہ لڑکے بھی تھے جو دین یہودیت پر تھے، یہودی مدینہ منورہ سے جانے لگے تو ان لڑکوں کے خاندان والوں نے کہا کہ ہم ان کو نہیں جانے دیں گے۔ اس پر اللہ نے آیت کریمہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ نازل فرمائی۔ (نسائی، ابو داؤد، ابن حبان، لباب النقول، در منثور، انوار البیان)

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ آیت کریمہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ایک انصاری کے بارے میں نازل ہوئی جو قبیلہ بنی سالم میں سے تھے اور جن کا نام حصین تھا۔ ان کے دو بیٹے نصرانی تھے اور وہ خود اسلام قبول کر چکے تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ دونوں نصرانیت چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں، کیا میں ان پر زبردستی نہ کروں (تاکہ وہ دونوں مسلمان ہو جائیں) اس پر اللہ جل شانہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (ابن جریر، لباب النقول، انوار البیان)

آیت شریفہ میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ دین میں زبردستی نہیں ہے، اگر کوئی شخص دین اسلام قبول نہیں کرتا تو اس پر زبردستی نہیں کی جائے گی کہ تو اسلام قبول کر لے ورنہ تجھے قتل کر دیں

گے، شاید حکم جہاد کی وجہ سے کسی کو اس کا وہم اور وسوسہ ہو کہ زبردستی نہیں ہے تو جہاد کیوں شروع کیا گیا جن لوگوں کو جہاد کی حقیقت معلوم ہے وہ جانتے ہیں کہ جہاد کا قانون یہ ہے کہ جب کافروں کی کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو اول ان کو اسلام کی دعوت دی جائے اور یہ دعوت ان کو آخرت کے عذاب سے بچانے کے لیے ہے اگر وہ اسلام قبول کرنے پر راضی ہوں تو ان سے کہا جائے گا کہ تم جزیہ دو، جب وہ جزیہ دینے لگیں گے تو ان کا دارالاسلام اور اہل اسلام سے ایک خاص تعلق پیدا ہو جائے گا جس سے آپس میں ملنا جلنا ہو گا، اہل کفر اسلام سے قریب ہوں گے اس کے سمجھنے کے مواقع فراہم ہوں گے، اللہ کی کتاب ان کے کانوں میں پڑے گی، اسلام کی سچائی کے دلائل واضحہ ان کے سامنے آئیں گے اور اہل ایمان کے اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ دیکھیں گے تو اقرب ہے کہ کفر سے باز آجائیں اور اسلام قبول کر لیں، اگر اسلام کے دلائل واضحہ سامنے آنے کے بعد بھی کوئی شخص اسلام کو قبول نہیں کرتا تو اس کی حماقت ہے کہ کفر پر جمنے ہی کو اختیار کیے ہوئے ہے۔ (تفسیر انوار البیان)

اسلام کے عہد اول سے لے کر آج تک مسلمان ممالک میں کروڑوں کافروں نے زندگی گزاری ہے کسی امیر یا خلیفہ یا بادشاہ نے انہیں اسلام پر مجبور نہیں کیا اور جن قوموں نے اسلام قبول کیا وہ اہل اللہ کی محنتوں و کوششوں سے اسلام کی آغوش میں آئی ہیں، کسی نے سر پر تلوار رکھ کر یا سینہ پر بندوق رکھ کر کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا، فقہاء نے واضح طور پر لکھا ہے کہ میدان جہاد میں عورتوں، بوڑھوں، اپاہجوں اور گرجوں میں رہنے والوں کو قتل نہ کیا جائے، حالانکہ ان لوگوں کو تلوار کے ذریعہ بہ آسانی اسلام میں داخل کیا جا سکتا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا أَسْلِمِي أَيَّتُهَا الْعَجُوزُ تَسْلَمِي یعنی تو اسلام قبول کر لے، عذاب سے بچ جائے گی، اس نے انکار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ پاک کے حضور میں عرض کیا اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ کہ اے اللہ! آپ گواہ رہیں میں نے دعوت دے دی ہے، اس کے بعد انہوں نے یہی آیت لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ تلاوت کی۔ (تفسیر در منثور)

البتہ اتنی بات ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ کفر خالق ومالک کی سب سے بڑی بغاوت ہے، باغی کی سزا تو سب کو معلوم ہی ہے، ان باغیوں کی بہت بڑی اور سب سے بڑی دائمی سزا تو ان کو آخرت میں ہو گی لیکن دنیا میں بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کی سرکوبی ہوتی رہے اور کفر کا اثر جس قدر بھی کم ہو اچھا ہے اگر جہاد و قتال نہ ہو تو کافر اہل ایمان پر چڑھ جائیں گے اور اہل ایمان تھوڑے رہ جائیں اور ان کا جینا دوبھر ہو جائے گا، لہٰذا ضروری ہوا کہ اگر جزیہ بھی دینا منظور نہیں کرتے تو ان سے قتال کیا جائے، اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ کفر جو خداوند تعالیٰ کی بغاوت ہے اس کی سزا میں قتل کر دینا اور بات ہے (اور جو لوگ باغیوں کا قانون جانتے ہیں وہ اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کر سکتے) اور سر پر تلوار رکھ کر یہ کہنا کہ اسلام قبول کرو ورنہ قتل کر دیں گے یہ دوسری بات ہے اس دوسری بات کو اکراہ کہا جاتا ہے اور جہاد کے موقع پر اکراہ نہیں کیا جاتا اور یہ بات بھی ہے کہ ایمان قبول کرنے پر زبردستی کا کوئی فائدہ ہے بھی نہیں کیونکہ اگر کوئی شخص جبر واکراہ کی وجہ سے ظاہری طور پر اسلام قبول کر بھی لے اور دل سے مسلمان نہ ہو تو نہ تو اس کے حق میں مفید فی الآخرۃ ہو گا اور نہ جھوٹی زبان سے اسلام قبول کرنے والے سے مسلمانوں کو کوئی نفع پہنچے گا۔ جیسا کہ منافقین ظاہر میں مسلمان تھے اور اندر سے کافر تھے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہتے تھے، اسلام کی حقانیت اور اس کی سچائی کے دلائل روز روشن کی طرح واضح ہیں دنیا بھر کی زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ چھپ چکا ہے گھر گھر اسلام کا کلمہ پہنچ چکا ہے، آلات جدیدہ نے دنیا کے ہر گوشہ میں اسلام کی دعوت پہنچا دی ہے اس کو حق جانتے ہوئے بھی جو لوگ اس کو قبول نہیں کرتے، وہ اپنے کو عذاب میں دھکیلنے کے خود ذمہ دار ہیں۔ (انوار البیان)

بعض لوگوں نے یہاں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو مرتد ہے اس کو سزا نہیں دینی چاہیے، شرعی طور پر مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص مرتد ہو جائے اس کو تین دن کی مہلت دی جائے گی کہ اپنے شکوک وشبہات پیش کرے، اگر ایک عالم حل نہیں کر سکے گا دوسرا کرے گا، دوسرا نہیں کر سکے گا تیسرا کرے گا، یہ تو ہو نہیں سکتا کہ خدائی تعلیم ہو اور اس پر اعتراضات ہوں ان کے جوابات نہ

ہوں، تین دن کے بعد بھی اگر وہ اپنے کفر پر ڈٹا رہا تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔

تو بعض لوگوں نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے لہٰذا اس کو کیوں قتل کیا جاتا ہے اور اس کو کیوں اسلام پر مجبور کیا جا رہا ہے، لیکن ان نادانوں نے بات کو سمجھا نہیں۔ ابتداءً کسی کافر کو اسلام پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ تو مسلمان ہو جا ورنہ تجھے قتل کر دیا جائے گا، لیکن جو مسلمان ہو جائے اور اس کے بعد پھر مرتد ہو جائے وہ باغی ہے اور باغی کا مسئلہ الگ ہے، آج کوئی بھی حکومت اپنے باغی کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو جو شخص رب کا باغی ہو جائے اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا باغی ہو جائے اس کو کس طرح معاف کیا جا سکتا ہے اور اس کو کس طرح نجات مل سکتی ہے۔ (ذخیرۃ الجنان)

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ: یعنی حقیقت کھل گئی ہے، رسول اللہ ﷺ کے معجزات اور عقلی شواہد نے بتا دیا کہ ایمان ہی سیدھا راستہ ہے جو لازوال سعادت تک پہنچاتا ہے اور کفر کا راستہ ٹیڑھا ہے جو ابدی بدبختی تک پہنچاتا ہے، اب انسانوں کا ہر عذر ختم ہو گیا، حجت تمام ہو گئی، آزمائش صحیح ہو گئی اکراہ کی ضرورت نہیں رہی۔ (مظہری)

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ: جس نے طاغوت کا انکار کیا، تو طاغوت کیا ہے؟ طاغوت کا معنی شیطان بھی ہے طاغوت کا معنی جادو بھی ہے اور صنم یعنی بت بھی ہے اور طاغوت کا معنی ساحر جادوگر بھی ہے اور طاغوت کاہن، فال نکالنے والے کو بھی کہتے ہیں، تو شیطان، بت، جادو اور جادوگر اور فال نکالنے والے یہ سب طاغوت ہیں۔

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں: كُلُّ مَا يُعبَدُ مِن دُونِ اللهِ اللہ تعالیٰ سے ورے ورے جس کی عبادت کی جاتی ہے، مثلاً: لات ہے، منات ہے، عزیٰ ہے، کوئی ہو وہ سب طاغوت ہیں اور مومن کا فریضہ ہے طاغوت کا انکار کرنا، شیطان کی اطاعت کا بتوں کی عبادت کا انکار کرنا، جادوگروں کے جادوؤں کا انکار کرنا، اسی طرح فال نکالنے والوں کے پاس جانے سے انکار کرنا۔ (ذخیرۃ الجنان) جن

لوگوں نے حضرات انبیاء کرام اور ملائکہ کی پوجا کی یہ ان پجاریوں کا قصور ہے حضرات انبیاء کرام اور ملائکہ کی معصومیت، بزرگی، شرف اور فضیلت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ وہ طاغوت نہیں ہیں، امام مالک نے بھی یقیناً ادھر دھیان نہیں کیا ہوگا، ورنہ وہ طاغوت کی تعریف میں کل کا لفظ استعمال نہ کرتے۔

وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ: یعنی جس نے اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کیا اور اللہ کو اس طرح مانا جس طرح رسول اللہ ﷺ نے بتایا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو مانے بغیر اور آپ ﷺ کی ہدایت سے ہٹ کر اللہ کو بالکل صحیح طور پر ماننا ممکن ہی نہیں (ذات وصفات کا مسئلہ عقل کی رسائی سے خارج ہے رسول برحق ﷺ کی مشعل راہ کی ضرورت ہے) (مظہری) بتوں کے پجاری، صنم پرست، کافر و مشرک کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنے کفر سے توبہ کرے، بتوں کی پرستش کا انکار کرے پھر اللہ کی ذات پر ایمان لائے۔

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى: حق اور ہدایت کے روز روشن کی طرح واضح ہو جانے کے بعد جو شخص طغیان اور ضلال کی طرف بلانے والی چیزوں سے تعلق قطع کرے اور ایمان لا کر اللہ سے اپنا تعلق قائم کرے تو اس نے نہایت مضبوط حلقہ کو پکڑ لیا اور اپنے آپ کو گمراہی اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا اور وہ ایمان باللہ کا حلقہ ایسا مضبوط ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا البتہ غفلت کی وجہ سے ہاتھ سے چھوٹ سکتا ہے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

اسْتَمْسَكَ باب استفعال اسْتِمْسَاك سے ماضی ہے، اس کا معنیٰ کسی چیز کے ساتھ چمٹنا، مضبوط پکڑنا، الْعُرْوَةُ کڑا، جس طرح ڈول کے اوپر ہوتا ہے یا لوٹے کے اوپر ہوتا ہے، اَلْوُثْقٰى اوثق کی تانیث ہے، اس کا معنیٰ ہے مضبوط۔

حضرت قیس بن عبادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں مسجد نبوی میں تھا، ایک شخص آیا جس کا چہرہ اللہ سے خائف تھا، نماز کی دو ہلکی رکعتیں اس نے ادا کیں، لوگ اسے دیکھ کر کہنے لگے یہ جنتی ہے، جب وہ باہر

نکلے تو میں بھی اس کے پیچھے گیا، باتیں کرنے لگا جب وہ متوجہ ہوا تو میں نے کہا جب آپ تشریف لائے تھے تب لوگوں نے آپ کی نسبت یوں کہا تھا، کہ سبحان اللہ کسی کو وہ نہ کہنا چاہیے جس کا علم اسے نہ ہو، ہاں البتہ اتنی بات تو ہے کہ میں نے حضور ﷺ کی موجودگی میں ایک خواب دیکھا تھا کہ گویا میں ایک لہلہاتے ہوئے سرسبز گلشن میں ہوں اس کے درمیان لوہے کا ایک ستون ہے جو زمین سے آسمان تک چلا گیا ہے اس کی چوٹی پر ایک کڑا ہے مجھ سے کہا گیا اس پر چڑھ جاؤ، میں نے کہا میں تو نہیں چڑھ سکتا، چنانچہ ایک شخص نے مجھے تھاما اور میں باآسانی چڑھ گیا اور اس کڑے کو تھام لیا، اس نے کہا دیکھو مضبوط پکڑے رکھنا، بس اسی حالت میں میری آنکھ کھل گئی کہ وہ کڑا میرے ہاتھ میں تھا، میں نے حضور ﷺ سے اپنا یہ خواب بیان کیا تو آپ نے فرمایا گلشن باغ اسلام ہے اور ستون دین ہے اور کڑا عروہ وثقیٰ ہے تو میرے دم تک اسلام پر قائم رہے گا، یہ شخص حضرت عبداللہ بن سلام ہیں۔ (مسلم)

لَا انْفِصَامَ لَهَا: رسی بھی ٹوٹ نہیں سکتی، حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے بعد ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرنا یہ اللہ کی تانی ہوئی رسی ہیں، جس نے انہیں پکڑ لیا اس نے اللہ کی مضبوط رسی کو پکڑ لیا جو ٹوٹ نہیں سکتی۔ (درمنثور، مظہری) لَا انْفِصَامَ لَهَا کا یہی مطلب ہے کہ وہ مضبوط کڑا ہے، جو ٹوٹ نہیں سکتا، یہ کڑا ہاتھ سے چھوٹ تو سکتا ہے، مثلاً آدمی گمراہ ہو جائے اور اسلام کا دامن چھوڑ دے، مگر یہ حلقہ ٹوٹ نہیں سکتا اور اس کو تھامنے والا آدمی محفوظ ہو جاتا ہے۔ (معالم العرفان) معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے لَا انْفِصَامَ لَهَا کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا جنت میں داخلہ کے علاوہ اس کا ٹوٹنا نہیں ہے۔ (درمنثور)

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے، وہ اس کی بھی سنتا ہے جو شہادتین کی گواہی دیتا ہے، جو زبان سے شہادتین کے کلمے پڑھتا ہے، وہ کافروں کے کافرانہ جملوں کو بھی سنتا ہے، وہ مومن کے دل کے اندر اعتقاد ظاہری کو بھی جانتا ہے اور کافر کے خبیث دل میں جو اعتقاد ہے اسے بھی جانتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ مدینہ کے ارد گرد رہنے والے

یہودیوں کے اسلام لانے کو پسند کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے خفیہ اور اعلانیہ اس بارے میں پوچھتے بھی رہتے تھے تو واللہ سمیع علیم سے مراد یہ ہے کہ اے محمد! ﷺ آپ ﷺ جو ان کے ایمان واسلام لانے پر حریص ہیں اور جو کوششیں کر رہے ہیں اللہ انہیں سنتا بھی ہے اور خوب جانتا بھی ہے۔

اندھیرے سے اُجالے تک

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲۵۷)البقرہ

جواب ترجمہ: اللہ ایمان والوں کا رکھوالا ہے، وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے، اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کے رکھوالے وہ شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں میں لے جاتے ہیں، وہ سب آگ کے باسی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا: اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا محافظ ہے، ان کا معین اور مددگار ہے، ایمان لانے والوں کا کارساز اللہ خود ہے۔ یہ آیت ان کی اپنے رب سے دوستی پر مشتمل ہے، بایں طور کہ وہ اپنے رب سے محبت رکھتے ہیں، پس اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ اس کے پیاروں سے محبت کرتے اور اس کے دشمنوں سے دشمنی رکھتے ہیں، اللہ نے بھی ان پر لطف و کرم اور احسان فرماتے ہوئے انہیں کفر، معاصی اور جہل کے اندھیروں سے نکالا اور ایمان، نیکی اور علم کی روشنی میں پہنچا دیا، اس کے نتیجے میں وہ قبر، حشر اور قیامت کے اندھیروں سے محفوظ رہ کر دائمی نعمت، راحت اور سرور والی جنت میں پہنچ گئے۔ (تفسیر السعدی)

يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کفر سے ایمان کی طرف نکالا ہے، اگرچہ یہاں صیغہ مضارع کا ہے جو حال اور استقبال کے لیے بولا جاتا ہے مگر یہاں مستقبل ماضی کے معنیٰ میں ہے، یعنی اللہ نے انہیں کفر سے اسلام وایمان کی جانب نکالا، انہیں

استقامت عطا کی، کفر اندھیرا ہے، ایمان روشنی ہے، اللہ نے انہیں اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لا کھڑا کیا ہے، دنیا کی ظلمت اور تاریکی سے انہیں آخرت اور جنت کی روشنی کی سمت لایا ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ: اس کا مطلب یہ ہے کہ یہودیوں کے دوست اور حامی کعب ابن اشرف جیسے شیطان لوگ ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مشرکین کے دوست اور حمایتی شیاطین ہیں۔

يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ: نور سے مراد اسلامی کی روشنی ہے، یہ کفار اور مشرکین اور شیطان کے پیروکار لوگوں کو اس روشنی سے نکالنے کے جتن کرتے ہیں، شبانہ روز اسی کام میں مصروف و مشغول رہتے ہیں کہ اسلام کی روشنی اور اجالے سے لوگوں کو کسی طرح نکال کر کفر و شرک میں مبتلا کر دیں، جو تاریکی ہی تاریکی ہے، اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ: جو لوگ کفر کی تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں، کفر یہ سرگرمیوں میں دن رات بسر کرتے ہیں، خود بھی راہ ضلال پر گامزن ہیں اور دوسروں کو بھی اس پر چلانے کی شیطانی کاوشیں بروئے کار لاتے ہیں یہ دوزخ کے مستحق لوگ ہیں، دوزخ میں ڈالے جانے کے بعد ان کا دائمی ٹھکانہ یہی ہوگا، یہ اٹل اور حتمی فیصلہ ہے وہاں سے انہیں نہ نکلنا ہے اور نہ ہی نکلنے کی آس وامید رہے گی۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ بعض نصرانی پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت مشہور ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے ان کی شان میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے۔ (ابن جریر، در منثور)

نمرود بادشاہ کا قصہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے نیز بتائیے کہ قرآنِ حکیم میں نمرود کا کیا قصہ ہے؟

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ {۲۵۸} البقرہ

جواب ترجمہ: کیا آپ نے اس شخص (کے معاملہ) پر غور نہیں کیا جس نے حضرت ابراہیم سے اپنے پروردگار کے بارے میں جھگڑا کیا اور اس جھگڑے کی وجہ یہ بنی کہ اللہ نے اسے حکومت دے رکھی تھی جب ابراہیم نے اس شخص (نمرود) سے کہا کہ میرا پروردگار وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو وہ کہنے لگا کہ میں بھی زندہ کر سکتا ہوں اور مار بھی سکتا ہوں۔ پھر ابراہیم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم ذرا مغرب سے نکال کے دکھاؤ۔ اب وہ کافر حیران رہ گیا۔ اور اللہ ظالموں کو راہ نہیں سجھاتا۔

دو مسلمان اور دو کافر بادشاہ: اس بادشاہ کا نام نمرود بن کنعان بن سام بن نوح تھا اس کا پایہ تخت بابل تھا، حضرت مجاہد فرماتے ہیں دنیا کی مشرق مغرب کی سلطنت رکھنے والے چار ہوئے جن میں سے دو مومن اور دو کافر، حضرت سلیمان بن داؤد اور حضرت ذوالقرنین، اور کافروں میں نمرود اور بخت نصر۔

فرمان ہوتا ہے کہ اے نبی ﷺ آپ نے اسے نہیں دیکھا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وجود باری تعالیٰ میں مباحثہ کرنے لگا، یہ شخص خود اللہ ہونے کا مدعی تھا، جیسا اس کے بعد فرعون نے بھی اپنے لوگوں میں دعویٰ کیا تھا کہ میں اپنے سوا کسی کو تمہارا رب نہیں جانتا، چونکہ ایک لمبی مدت اور لمبے عرصے سے یہ بادشاہ چلا آرہا تھا اس لئے دماغ میں رعونت اور انانیت آگئی تھی، سرکشی اور تکبر، نخوت اور غرور طبیعت میں سما گیا تھا۔

بعض لوگ کہتے ہیں چار سو سال تک حکومت کرتا رہا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جب اس نے وجود باری تعالیٰ پر دلیل مانگی تو آپ نے فرمایا میرا پروردگار وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، یہ ایک بدیہی اور مثل آفتاب روشن دلیل تھی کہ موجودات کا پہلے کچھ نہ ہونا پھر ہونا پھر مٹ جانا کھلی دلیل ہے۔ موجد اور پیدا کرنے والے کے موجود ہونے کی اور وہی اللہ ہے۔

نمرود نے جواباً کہا کہ یہ تو میں بھی کرتا ہوں، یہ کہہ کر دو شخصوں کو اس نے بلوایا جو واجب القتل تھے، ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو رہا کر دیا، دراصل یہ جواب اور دعویٰ کس قدر لچر اور بے معنی

ہے اس کے بیان کی بھی ضرورت نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو صفات باری میں سے ایک صفت پیدا کرنا اور پھر نیست کر دینا بیان کی تھی اور اس نے نہ تو انہیں پیدا کیا اور نہ ان کی یا اپنی موت حیات پر اسے قدرت، لیکن جہلاء کو بھڑکانے کیلئے اور اپنی علمیت جتانے کیلئے باوجود اپنی غلطی اور مباحثہ کے اصول سے طریقہ فرار کو جانتے ہوئے صرف ایک بات بنالی۔

ابراہیم علیہ السلام بھی اس کو سمجھ گئے اور آپ نے کند ذہن کے سامنے ایسی دلیل پیش کر دی کہ صورتاً بھی اس کی مشابہت نہ کر سکے، چنانچہ فرمایا کہ جب تو پیدائش اور موت تک کا اختیار رکھتا ہے تو مخلوق پر تصرف تیرا پورا ہونا چاہئے، میرے اللہ نے تو یہ تصرف کیا کہ سورج کو حکم دے دیا ہے کہ وہ مشرق کی طرف سے نکلا کرے چنانچہ وہ نکل رہا ہے، اب تو اسے حکم دے کہ وہ مغرب کی طرف سے نکلے اس کا کوئی ظاہری ٹوٹا پھوٹا جواب بھی نہ اس سے بن پڑا اور بے زبان ہو کر اپنی عاجزی کا اعتراف کرنے لگا اور اللہ کی حجت اس پر پوری ہو گئی لیکن چونکہ ہدایت نصیب نہ تھی، ہدایت نہ پاسکا، ایسے بدوضع لوگوں کو اللہ کوئی دلیل نہیں سجھاتا، ان پر اللہ کا غضب و غصہ اور ناراضگی ہوتی ہے اور اس کیلئے اس جہاں میں بھی سخت عذاب ہوتے ہیں۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ مناظرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ سے نکل آنے کے بعد ہوا تھا اس سے پہلے آپ کی اس ظالم بادشاہ سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی، زید بن اسلم کا قول ہے کہ قحط سالی تھی، لوگ نمرود کے پاس جاتے تھے اور غلہ لے آتے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی گئے، وہاں یہ مناظرہ ہو گیا بدبخت نے آپ کو غلہ نہ دیا، آپ خالی ہاتھ واپس آئے، گھر کے قریب پہنچ کر آپ نے دونوں بوریوں میں ریت بھر لی کہ گھر والے سمجھیں کچھ لے آئے، گھر آتے ہی بوریاں رکھ کر سو گئے، آپ علیہ السلام کی بیوی صاحبہ حضرت سارہ اٹھیں بوریوں کو کھولا تو دیکھا کہ عمدہ اناج سے دونوں پر ہیں، کھانا پکا کر تیار کیا، آپ کی بھی آنکھ کھلی، دیکھا کہ کھانا تیار ہے، پوچھا اناج کہاں سے آیا؟ کہا دو بوریاں جو آپ بھر کر لائے ہیں، انہیں میں سے یہ اناج نکالا تھا، آپ سمجھ گئے کہ یہ اللہ جل شانہ کی

طرف سے برکت اور اس کی رحمت ہے۔

اس بادشاہ کے پاس اللہ نے ایک فرشتہ بھیجا اس نے آکر اسے توحید کی دعوت دی لیکن اس نے قبول نہ کی، دوبارہ دعوت دی لیکن انکار کیا، تیسری مرتبہ اللہ کی طرف بلایا لیکن پھر بھی یہ منکر ہی رہا۔ اس بار بار کے انکار کے بعد فرشتے نے اس سے کہا اچھا تو اپنا لشکر تیار کر میں بھی اپنا لشکر لے آتا ہوں، نمرود نے بڑا بھاری لشکر تیار کیا اور زبردست فوج کو لے کر سورج نکلنے کے وقت میدان میں آ کھڑا ہوا، ادھر اللہ تعالیٰ نے مچھروں کا ایک دروازہ کھول دیا، بڑے بڑے مچھر اس کثرت سے آئے کہ لوگوں کو سورج بھی نظر نہ آتا تھا۔

اللہ کی یہ فوج نمرودیوں پر حملہ آور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ان کی رگوں سے خون چوس لیا، ان کے جسم سے گوشت نوچ ڈالا، ہڈیاں میدان میں چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ انہی مچھروں میں سے ایک نمرود کے نتھنے میں داخل ہو گیا اور چار سو سال تک اس کا دماغ چاٹتا رہا ایسے عذاب میں وہ رہا کہ اس سے موت ہزاروں درجے بہتر تھی اپنا سر دیواروں اور پتھروں پر مارتا پھرتا تھا، ہتھوڑوں سے کچلواتا تھا، یونہی رینگ رینگ کر بدنصیب نے ہلاکت پائی۔ تفسیر ابن کثیرؒ

حضرت عزیر علیہ السلام کا قصہ

سوال آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے نیز بتائیے کہ قرآنِ حکیم میں حضرت عزیر علیہ السلام کا کیا قصہ ہے؟

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ {۲۵۹} البقرہ

جواب ترجمہ: کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو ایک شہر پر گزرا اور وہ اپنی چھتوں پر گرا ہوا تھا کہا اسے اللہ مرنے کے بعد کیوں کر زندہ کرے گا پھر اللہ نے اسے سو برس تک مار ڈالا پھر اسے اٹھایا کہا تو یہاں کتنی دیر رہا کہا ایک دن یا اس سے کچھ کم رہا فرمایا بلکہ تو سو برس رہا ہے اب تو اپنا کھانا اور پینا دیکھ وہ تو سڑا نہیں اور اپنے گدھے کو دیکھ اور ہم نے تجھے لوگوں کے واسطے نشانی بنایا ہے اور ہڈیوں کی طرف دیکھ کہ ہم انہیں کس طرح اٹھا کر جوڑ دیتے ہیں پھر ان پر گوشت پہناتے ہیں پھر اس پر یہ حال ظاہر ہوا تو کہا میں یقین کرتا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تباہ حال بستی کون سی تھی؟ یہ بستی کون سی تھی جس پر تباہی و بربادی پھری ہوئی تھی؟ اس بارے میں دو قول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ یہ بستی بیت المقدس تھی، ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ بستی تھی جس سے ہزاروں لوگ موت سے ڈر کر اپنے گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے تھے، جس کا ذکر دوسرے پارے میں ہو چکا ہے، لیکن حضرت وہب رحمہ اللہ، حضرت قتادہ رحمہ اللہ، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ربیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بستی ایلیاء یعنی بیت المقدس تھی، جب کہ حضرت زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ بستی تھی جس سے ہزاروں لوگ موت کے خوف سے نکل گئے تھے۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ: علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں ایک واقعہ تحریر فرمایا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس ویران اور کھنڈرات بنی بستی سے گزرنے والے شخص عزیر علیہ السلام تھے، یہ ان لوگوں میں سے ایک تھے جنہیں بخت نصر نے قیدی بنالیا تھا، جب کہ یہ کم عمر تھے، جب آپ کی عمر چالیس سال ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکمت سے نوازا تھا، آپ وہ واحد آدمی تھے جنہیں تورات سب سے زیادہ یاد تھی اور تورات کا سب سے زیادہ علم رکھتے تھے، اسرائیلی روایات میں آتا ہے کہ آپ کا شمار نبیوں میں ہوتا تھا لیکن جب آپ نے اللہ تعالیٰ سے تقدیر کے بارے میں پوچھا تو اللہ نے انہیں نبوت کی فہرست سے خارج کر دیا تھا، لیکن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس بات کو کمزور، منقطع اور منکر قرار دیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام وہی شخص ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے سو سال تک موت دی پھر انہیں دوبارہ اٹھایا تھا۔ علامہ ابن اثیر نے تاریخ الکامل میں ارمیاء علیہ السلام کے بارے میں یہ واقعہ لکھا ہے۔

حضرت عزیز علیہ السلام اللہ کے نیک اور صاحب حکمت بندے تھے، ایک روز اپنی زمین کی دیکھ بحال کے لیے گئے، جب واپس پلٹے تو ایک ویرانے میں پہنچ گئے، دوپہر کا وقت تھا، آپ کو سخت گرمی لگ رہی تھی، جب آپ اس ویرانے میں داخل ہوئے تو اپنے گدھے پر سوار تھے، پھر آپ گدھے سے نیچے اترے، آپ کے پاس دو ٹوکرے تھے، ایک ٹوکرے میں انجیر اور دوسرے ٹوکرے میں انگور تھے، آپ اس ویرانے میں سایہ دار جگہ پر اترے اور اپنے سامان سے پیالہ نکال کر اس میں انگور نچوڑے، پھر توشہ دان سے خشک روٹی نکالی اور نچوڑے ہوئے انگوروں والے پیالے میں ڈال دی، تاکہ یہ گیلی ہونے کے بعد کھائیں، کھانا کھانے کے بعد آپ گدی کے بل ستانے لگے اور اپنی ٹانگیں دیوار کے ساتھ لگا دیں، پھر ان گھروں کی چھتوں کو دیکھنے لگ گئے، آپ اپنے عرشوں پر کھڑی ان عمارات کو دیکھ رہے ہیں جن کے مکین مر کھپ چکے ہیں، آپ ان مرنے والوں کی بوسیدہ ہڈیاں دیکھ رہے ہیں اور زبان سے یوں کہہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں مرنے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ کریں گے؟ حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کی قدرت تخلیق میں شک وشبہ نہیں تھا، آپ صرف تعجب وحیرانی کے طور پر ایسا کہہ رہے تھے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱)

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام بابل میں پہنچے، جہاں انہوں نے اپنا گدھا باندھنے کے بعد بستی میں چکر لگایا، جہاں انہیں کوئی بھی دکھائی نہیں دیا، جس پر اظہار تعجب کرتے ہوئے انہوں نے یہ فرمایا کہ اللہ اس بستی کو اس کی ویرانی کے بعد کیونکر آباد کرے گا۔ (کبیر)

وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا: چھتوں پر اس کی دیواریں گری پڑی تھی، امام اصمعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ خَوَى الْبَيْتُ اس وقت کہتے ہیں جب گھر خالی ہو اور اس کے اندر کوئی نہ ہو، پیٹ کھانے سے خالی ہو تو

اس وقت خَوَا بولتے ہیں، حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کے سجدہ مبارکہ کے بارے میں آتا ہے کہ إِذَا سَجَدَ خَوَّی جب آپ سجدہ کرتے تو آپ ﷺ کے بازوؤں اور آپ ﷺ کے پہلو کے درمیان کی جگہ خالی ہوتی تھی، آپ ﷺ کے پیٹ اور آپ ﷺ کی رانوں کے بیچ کی جگہ خالی ہوتی تھی، عربی زبان میں خَوَّی الْفَرَسُ بولتے ہیں جس کا معنیٰ گھوڑے کی ٹانگوں کے درمیان خالی جگہ، فاصلہ، پھر یہ لفظ اس مکان کے لیے بولا جانے لگا جو منہدم ہو چکا ہو، کہ خَوَی وہ اپنے انہدام کی وجہ سے اپنے رہنے والوں سے خالی ہو چکا ہے۔ عرش گھر کی چھت کو کہتے ہیں، عروش بنیادوں کو کہا جاتا ہے، جب چھتیں لکڑی کی ہوں تو انہیں عربی میں عرش کہا جاتا ہے۔ اس بستی کی چھتیں گر چکی تھیں جب کہ دیواریں اس طرح کھڑی تھیں کہ وہ ان چھتوں پر آ لگی تھیں، ویران گھروں کی تعبیر کے لیے خوبصورت ترین الفاظ و مفہوم ادا کیا گیا ہے۔

قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا: یہ شخص کہنے لگا کہ اللہ کیونکر زندہ فرمائے گا اس بستی کو اس کی موت کے بعد، اس جملہ سے ان لوگوں کی رائے کی جڑ کٹ جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ اس بستی سے گزرنے والا شخص مسلمان نہیں تھا جس نے اللہ کی قدرت پر شک کیا ہے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس بستی کے اوپر سے گزرنے والے نبی تھے تو اس صورت میں نبی نے جو اس ویرانے اور خانہ خرابی کو دیکھا تو عرف اور عادت کے لحاظ سے کہا کہ اللہ اسے کیونکر آباد کرے گا، یا پھر اس اظہار تعجب سے مقصود قدرت خداوندی کے مزید دلائل جمع کرنا تھا۔

فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ: پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد حضرت عزیر علیہ السلام کو نیند کی حالت میں ہی سلا دیا، اس وقت آپ جوانی کی عمر میں تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی موت سے انسانوں، درندوں اور پرندوں کو اندھا کر دیا۔ (تفسیر کبیر)

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر ملک الموت کو بھیجا، انہیں موت دے دی اور آپ سو سال تک موت کے منہ میں رہے۔ (البدایہ والنہایہ) پھر اللہ تعالیٰ نے اس لمبے عرصہ

کے بعد حضرت عزیر علیہ السلام کو دوبارہ زندہ فرمایا۔(کبیر) یہاں بَعَثَهٗ کا معنیٰ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا، قیامت کو یوم البعث اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ مردوں کو ان کی قبروں سے زندہ کر کے اٹھائیں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے بَعَثَهٗ فرمایا أَحْيَاهُ نہیں فرمایا کیونکہ یہ لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ اس طرح کیا جس طرح وہ پہلے زندہ تھے، عاقل تھے، دانا تھے، معارف الٰہیہ میں نظر کرتے اور استدلال کرتے تھے، جب کہ أَحْيَاهُ فرمانے سے یہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام کے فوت ہونے کے بعد بنی اسرائیل میں بہت سے واقعات رونما ہو چکے تھے، اللہ تعالیٰ نے جب عزیر علیہ السلام کو دوبارہ اٹھایا تو ایک فرشتہ ان کی طرف بھیجا، عزیر کا دل پیدا کیا گیا تا کہ وہ اس کے ذریعے سمجھیں ان کی آنکھیں پیدا کی گئیں تا کہ ان کے ذریعے دیکھیں، وہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا تو وہ اپنے آپ کو پیدا ہوتا دیکھ رہے تھے، پھر ان کی ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، بال اور کھال پیدا کی، پھر ان میں روح پھونکی، یہ سارا منظر وہ دیکھ رہے تھے اور سمجھ بھی رہے تھے، اس کے بعد آپ سیدھے بیٹھ گئے۔(البدایہ والنہایہ ج ۱)

قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ: آسمان سے آواز دی گئی کہ اے عزیر! موت کے بعد کتنا عرصہ ٹھہرے رہے؟ فرمانے لگے کہ ایک دن، پھر سورج کی طرف دیکھا تو اندازہ ہوا کہ ابھی تو سورج غروب نہیں ہوا، پھر فرمانے لگے کہ آدھا دن رہا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ موت کے بعد پورا سو سال ٹھہرے رہے۔(تفسیر کبیر) یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو سو سال تک موت دی تو آپ علیہ السلام نے کیوں فرمایا کہ میں ایک دن یا دن کا ایک حصہ موت کے منہ میں رہا، یہ تو جھوٹ لگتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے گمان کے مطابق یہ جواب دیا، اس لیے اسے جھوٹ نہیں کہا جا سکتا۔

فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ: اب ہماری قدرت دیکھو کہ تمہارا توشہ جو تمہارے ساتھ تھا، باوجود سو سال گزر جانے کے ویسا ہی ہے، نہ سڑا ہے اور نہ ہی خراب ہوا ہے، یہ توشہ انگور اور انجیر اور جوس تھا، نہ تو یہ شیرہ بگڑا تھا نہ انجیر خراب ہوئی تھی ، نہ انگور خراب ہوئے تھے، بلکہ ٹھیک اپنی اصلی حالت پر تھے۔

وَانْظُرْ إِلَى حِمَارِكَ: اب فرمایا اپنے گدھے کی طرف نگاہ کیجیے، آپ کیا دیکھتے ہیں کہ سفید ہڈیاں چمک رہی تھیں، جوڑ جوڑ جدا ہو چکا تھا، آپ نے ایک آواز سنی کہ أَيَّتُهَا الْعِظَامُ الْبَالِيَةُ إِنِّي جَاعِلٌ فِيكِ رُوحًا اے بوسیدہ ہڈیو! میں تمہارے اندر روح ڈالنے والا ہوں، چنانچہ ہڈیوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے، پھر ہر عضو جہاں جہاں اس کی جگہ تھی وہاں ملتا گیا، پسلیاں پسلیوں کے ساتھ اپنی جگہ پر پیوست ہو گئیں، بازو اپنی جگہ پر لگ گئے، پھر سر اپنی جگہ پر لگ گیا، پھر پٹھے، آنتیں ، پھر گوشت ان پر چڑھتا گیا، پھر کھال ان کے اوپر چڑھتی گئی، پھر کھال سے بال نکلنے شروع ہو گئے، پھر اس میں روح ڈالی گئی، پھر گدھا اپنا سر بلند کرتے ہوئے اس طرح اٹھا کہ اس کے دونوں کان آسمان کی طرف تھے، گدھا ہنہنا رہا تھا، حضرت عزیر علیہ السلام سمجھے کہ قیامت برپا ہو گئی ہے، یہ منظر دیکھ کر حضرت عزیر علیہ السلام سجدہ ریز ہو گئے۔ (البدایہ والنہایہ۔ تفسیر کبیر)

وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ: تاکہ ہم تجھے نشانی بنا دیں لوگوں کے لیے، حضرت عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے لیے نشانی بن گئے، جب اللہ تعالیٰ نے انہیں سو سال کے بعد زندہ فرمایا تو ان کے سر کے بال کالے تھے آپ جوان تھے، جب کہ آپ کے بیٹے اور پوتے بوڑھے ہو چکے تھے، ان کی داڑھیاں اور سر سفید ہو چکے تھے۔ امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے لیے نشانی بنانے کا مطلب آپ کی بزرگی، تعظیم اور دین و دنیا میں انہیں اونچے مقام پر پہنچانے کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گدھے کی طرف دیکھنا آپ کے لیے شرط قرار دیا اور آپ کو لوگوں کے لیے نشانی بنانے کو جزا قرار دیا۔

وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا: اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ہڈیاں اپنی اپنی جگہ پر جوڑدیں، پھران ہڈیوں پر گوشت کو پھیلا دیا۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ فرشتے نے ہڈیوں کو آوازدی توانہوں نے جواب دیا پھر ہر طرف سے جمع ہو گئیں۔ نُنْشِزُهَا کا معنیٰ ہے ہم کیسے انہیں زمین سے اٹھاتے ہیں اور مناسب جگہ پر جوڑتے اور ایک دوسرے پر رکھتے چلے جاتے ہیں۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ: جب حضرت عزیر علیہ السلام نے مارنے اور زندہ کرنے کا مشاہدہ کرلیا اور اپنے خالق کی یہ کاریگری اور صناعی دیکھی تو اب روز روشن کی طرح یہ بات کھل کر ان کے سامنے آگئی کہ قدرت والا ہر چیز پر قادر ہے، وہ چاہے تو قطرہ آب سے انسانوں کو عدم سے وجود میں لائے، جانوروں کو عدم سے وجود میں لائے، چاہے تو مردہ چیزوں کو اپنی قدرت کاملہ سے پہلے والی شکل وصورت پر کھڑا کردے، اس کے لیے کوئی عجیب وغریب کام کرنا مشکل نہیں ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

بیت المقدس میں حاضری: حضرت عزیر علیہ السلام سو سال موت کی آغوش میں رہنے کے بعد جب دوبارہ زندہ کیے گئے تو اس کے بعد اپنے گدھے پر سوار ہو کر بیت المقدس کی حاضری کے لیے تشریف لے گئے، لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ ہمیں تو اپنے آباؤاجداد نے بتایا تھا کہ عزیر علیہ السلام بابل میں فوت ہو گئے تھے، بخت نصر نے بیت المقدس میں ان چالیس ہزار لوگوں کو قتل کیا جو تورات پڑھتے تھے ان لوگوں میں عزیر علیہ السلام بھی تھے، لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ عزیر علیہ السلام تورات پڑھتے ہیں، جب سو سال کے بعد لوگوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے نئے سرے سے تورات لکھوائی، جس قدر تورات لوگوں کو زبانی یاد تھی سو یاد تھی، باقی تورات کسی کے پاس نہ تھی، بخت نصر نے جس زمانہ میں تباہی پھیری اور قتل عام کیا تھا اس زمانہ میں عزیر علیہ السلام کے والد نے تورات ایک جگہ پر دفن کردی تھی، اس بات کا علم حضرت عزیر علیہ السلام ہی کو تھا، حضرت عزیر علیہ السلام کچھ لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچے جہاں گڑھا کھودا پھر تورات وہاں سے نکالی گئی، مدفونہ تورات کو جب نکالا گیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بوسیدہ اور پرانی ہو چکی

ہے، اس کے بعد حضرت عزیر علیہ السلام ایک سایہ دار درخت کی چھاؤں تلے بیٹھ گئے، بنی اسرائیل بھی آپ کے ارد گرد بیٹھ گئے، یوں حضرت عزیر علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے نئے سرے سے تورات لکھوائی اور حضرت عزیر علیہ السلام نے جو تورات زبانی لکھوائی تھی اس کے ساتھ ملائی گئی تو ایک حرف کا بھی مدفونہ تورات اور حضرت عزیر علیہ السلام کی زبانی لکھوائی گئی تورات میں فرق نہیں تھا، یہی وہ لمحہ تھا جب لوگوں نے فرط عقیدت و محبت میں حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا تھا اور یہودیوں کے دل میں آپ کی بے پناہ محبت تھی، ان کے سوا کسی چیز سے اس قدر انہیں محبت نہیں تھی۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ میں حضرت عزیر علیہ السلام کی سو سالہ موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے بعد کا عجیب واقعہ لکھا ہے فرماتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام اپنے گدھے پر سوار ہو کر اپنے محلے کی طرف گئے تو لوگوں نے آپ کو اوپرا سمجھا اور آپ نے بھی ان لوگوں اور ان گھروں کو اوپرا سمجھا، آپ اپنے گمان کے مطابق اپنے گھر کی طرف بڑھے، کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک نابینا اور اپاہج بڑھیا بیٹھی ہوئی ہے، جس کی ایک سو بیس سال عمر تھی، یہ بڑھیا ان لوگوں کی باندی تھی، جب عزیر علیہ السلام موت کی آغوش میں گئے تو اس وقت یہ بیس سالہ نوجوان عورت تھی، وہ حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں جانتی تھی، اب وہ اتنے لمبے عرصہ کے بعد بوڑھی ہو چکی تھی، حضرت عزیر علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ ارے! کیا عزیر کا مکان یہی ہے؟ بڑھیا نے کہا ہاں، یہ عزیر علیہ السلام کا مکان ہے، پھر روتے ہوئے کہنے لگی کہ کئی سالوں سے میں نے کسی کی زبان سے عزیر علیہ السلام کا نام تک نہیں سنا، لوگ اسے بھول چکے ہیں۔

حضرت عزیر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں عزیر ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے سو سال موت دینے کے بعد دوبارہ اٹھایا ہے، وہ بڑھیا کہنے لگی کہ سبحان اللہ! ہم نے عزیر علیہ السلام کو سو سال سے نہیں دیکھا نہ ہی اس کا کوئی تذکرہ سنا ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں ہی عزیر ہوں، بڑھیا نے کہا کہ عزیر تو مستجاب الدعوت (جس کی دعا قبول ہوتی ہو) ہیں، وہ مریض اور مصیبت میں مبتلا کسی کے لیے دعا کرتے ہیں تو اسے شفاء اور عافیت نصیب ہوتی ہے، آپ اللہ سے دعا کیجیے کہ اللہ میری بینائی لوٹا دے تاکہ میں آپ کو دیکھ

سکوں، اگر آپ عزیر علیہ السلام ہی ہوئے تو میں آپ کو پہچان لوں گی۔

چنانچہ عزیر علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا کی اور اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں پر پھیرا تو اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئیں، وہ نابینا ہونے کے ساتھ اپاہج بھی تھی، اس کا ہاتھ تھام کر فرمایا کہ اللہ کے حکم سے اٹھو، بینائی لوٹنے کے بعد اس کا لولہ اور اپاہج پن بھی ختم ہو گیا، یوں لگ رہا تھا گویا وہ رسی میں بندھی ہوئی کھلی ہے وہ اٹھ کھڑی ہوئی، پھر اس نے عزیر کو دیکھا تو پکار اٹھی أَشْهَدُ أَنَّكَ عُزَيْرٌ میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ عزیر علیہ السلام ہی ہیں۔

پھر وہ بنی اسرائیل کے محلے کی طرف گئی جہاں وہ لوگ اپنی محافل و مجالس میں بیٹھے ہوئے تھے، عزیر کے ایک سو اٹھارہ سالہ بیٹے بھی وہاں موجود تھے، بڑی عمر کے ان کے پوتے بھی وہاں موجود تھے، انہیں اس بڑھیا نے آواز دی کہ لوگو! هَذَا عُزَيْرٌ قَدْ جَاءَكُمْ یہ عزیر تمہارے پاس آچکے ہیں، ان لوگوں نے اس بڑھیا کی یہ بات سن کر کہا کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے، اس پر اس بڑھیا نے اپنے بارے میں بتلایا کہ میں تمہاری فلاں باندی ہوں، میرے لیے عزیر علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا مانگی ہے، اللہ نے میری بینائی لوٹا دی ہے اور مجھے اپنے قدموں پر چلا دیا ہے، بڑھیا نے لوگوں کو بتلایا کہ عزیر علیہ السلام کہتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے سو سال تک موت دیے رکھی پھر انہیں دوبارہ اٹھایا، چنانچہ لوگ مجلس سے اٹھ کر عزیر علیہ السلام کی طرف آئے اور انہیں دیکھا، عزیر علیہ السلام کے بیٹے نے کہا کہ میرے والد کے کاندھوں کے درمیان کالے رنگ کا ایک مسہ تھا، چنانچہ جب انہوں نے دیکھا تو واقعی وہ عزیرؑ ہی تھے، بنی اسرائیل نے یقین حاصل کرنے کے لیے انہیں تورات لکھنے کی فرمائش کر دی، کیونکہ عزیر ہی حافظ تورات تھے، بخت نصر نے تورات نذر آتش کروادی تھی، لوگوں کے پاس اتنی ہی تورات تھی جتنی زبانی یاد تھی۔ (البدایہ والنہایہ)

آسمان کی طرف سے دو شہابیے اترے جو عزیر علیہ السلام کے پیٹ میں داخل ہو گئے، جس کے بعد انہیں تورات زبانی یاد ہو گئی، پھر انہوں نے بنی اسرائیل کے لیے دوبارہ تورات لکھوائی، شہابیوں کے

اترنے، تورات کو دوبارہ لکھوانے اور بنی اسرائیل کے امور کی نگرانی کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کی وجہ سے ہی یہودیوں نے آپ کو ابن اللہ کہا تھا۔ (البدایہ والنہایہ) ایک قول یہ کیا گیا کہ أَنَّ الْمَلَكَ أَتَى عُزَيْرَ بِإِنَاءٍ مَاءً وَسَقَاهُ مِنهُ فَتَمَثَّلَتِ التَّوْرَاةُ فِي صَدْرِهِ فرشتہ ان کے پاس پانی کا ایک برتن لایا جس سے انہوں نے پیا تو تورات ان کے سینے میں منتقل ہو گئی۔ (طبری)

یہ فرشتہ آپ کے پاس انسانی شکل میں آیا تھا، آپ تورات کے معدوم ہو جانے کی وجہ سے بیت المقدس کے پاس بیٹھ کر دن رات روتے رہے تھے، جس پر اس فرشتے نے آپ سے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ تو عزیر علیہ السلام نے فرمایا کہ تورات ہمارے سامنے ختم ہو گئی ہے اس لیے رو رہا ہوں، فرشتے نے پوچھا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تورات آپ کی طرف پھر لوٹا دے؟

آپ نے فرمایا کہ ہاں، فرشتے نے انہیں کہا کہ جایئے پاک ہو جایئے، روزہ رکھیے، کل تک ہم اسی جگہ ملاقات کرتے ہیں، اگلے دن عزیر علیہ السلام یہاں پہنچ کر انسانی شکل میں آنے والے اس فرشتے کا انتظار کرنے لگے، فرشتہ آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی کا ایک برتن تھا، یہ پانی آپ نے پیا تو تورات آپ کے سینے میں منتقل ہو گئی۔ (تاریخ الکامل)

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أَمَرَ اللّٰهُ مَلَكاً فَنَزَلَ بِمَعرِفَةٍ مِّن نُورٍ فَقَذَفَهَا فِي عُزَيْرٍ فَنَسَخَ التَّوْرَاةَ حَرْفًا بِحَرْفٍ حَتَّى فَرَغَ مِنْهَا اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو حکم دیا تو وہ معرفت کا نور لے کر نازل ہوا، وہ نور معرفت اس نے عزیرؑ میں پھینکا، اس کے بعد انہوں نے تورات مکمل حرف بحرف تحریر کی۔ (البدایہ والنہایہ)

آپ نے سواد دیر حزقیل کی سرزمین پر بنی اسرائیل کے لیے تورات لکھوائی تھی اور جس بستی میں آپ کو موت کی نیند سلایا گیا تھا اس کا نام سائر آباد تھا۔ (البدایہ) حضرت عزیر علیہ السلام کا زمانہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کا ہے۔ (البدایہ والنہایہ)

ابو حاتم سجستانی رحمہ اللہ نے حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں چند اشعار کہے

وَأَسْوَدُ رَأْسٍ شَابَ مِنْ قَبْلِهِ ابْنُهُ ... وَمِنْ قَبْلِهِ ابْنُ ابْنِهِ فَهُوَ أَكْبَرُ

يَرَى ابْنِهِ شَيْخًا يَدِبُّ عَلَى عَصَا ... وَلِحْيَتُهُ سَوْدَاءُ وَالرَّأْسُ أَشْقَرُ

وَمَا لِابْنِهِ حَيْلٌ وَلَا فَضْلُ قُوَّةٍ ... يَقُومُ كَمَا يَمْشِي الصَّبِيُّ فَيَعْثُرُ

يُعَدَّ ابْنُهُ فِي النَّاسِ تِسْعِينَ حِجَّةً ... وَعِشْرِينَ لَا يَجْرِي وَلَا يَتَبَخْتَرُ

وَعُمْرُ أَبِيهِ أَرْبَعُونَ أَمَرَّهَا ... ولان ابنه تِسعُونَ فِي النَّاسِ غُبَّرُ

فَمَا هُوَ فِي الْمَعْقُولِ إِنْ كُنْتَ دَارِيًا ... وَإِنْ كُنتَ لَا تَدرِي فَبالجَهل تُعَذَّر

جوانی کے عالم میں سر کے بال سیاہ تھے، ان کے پوتے بھی ان سے پہلے بوڑھے ہیں، وہ اپنے بوڑھے بیٹے کو عصا کے سہارے چلتا ہوا دیکھتے ہیں، خود ان کی پشت سیاہ ہے اور سر سرخ وسیاہ ہے، اوران کے فرزند کے لیے کوئی بڑھاپے سے چھٹکارے کا حیلہ نہیں اور نہ کوئی زیادہ طاقت، وہ کھڑا ہوتا ہے تو ایسے جیسے بچہ چلتے ہوئے پھسل جائے، لوگوں میں بیٹے کی عمر نوے اور بیس سال شمار ہوتی ہے، جو نہ چل سکتا ہے نہ اکڑ سکتا ہے، اوراس کے باپ کی عمر صرف چالیس سال ہے جب کہ اس کے پوتے پر نوے برس گزر چکے ہیں، اگر تو جانتا ہے تو یہ سمجھ آنے والی بات نہیں اور اگر تو نہیں جانتا تو پھر جہالت سے معذور ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دلی اطمینان کیسے ہوا؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَى وَلَكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءاً ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْياً وَاعْلَمْ أَنَّ اللهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ {۲۶۰} البقرۃ

جواب ترجمہ: اور یاد کر جب ابراہیم نے کہا: اے میرے پروردگار! مجھ کو دکھا کہ تو مردے کو کس طرح زندہ کرے گا؟ فرمایا: کہ کیا تم یقین نہیں لاتے؟ کہا کیوں نہیں لیکن اس واسطے چاہتا ہوں

کہ میرے دل کو تسکین ہو جائے، فرمایا: تو چار پرندے اڑنے والے پکڑ لے پھر انہیں اپنے ساتھ ہلا لے پھر ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دے پھر ان کو بلا تیرے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کی بہت سی وجوہات تھیں، ایک تو یہ کہ چونکہ یہی دلیل آپ نے نمرود مردود کے سامنے پیش کی تھی تو آپ نے چاہا کہ علم الیقین سے عین الیقین حاصل ہو جائے، جانتا تو ہوں ہی لیکن دیکھ بھی لیں، اب رب العالمین فرماتے ہیں کہ چار پرندے لے لو۔

قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ: مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کے اس بارے میں کئی اقوال ہیں کہ کون کون سے پرندے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لئے تھے؟ کوئی کہتا ہے وہ کلنگ اور مور اور مرغ اور کبوتر تھے، کوئی کہتا ہے وہ مرغابی اور سیمرغ کا بچہ اور مرغ اور مور تھے، کوئی کہتا ہے کبوتر، مرغ، مور اور کوا تھے، پھر انہیں کاٹ کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہی فرماتے ہیں **أَخَذَ طَاوُسًا وَنَسْرًا وَغُرَابًا وَدِيكًا** ابراہیم نے مور، گدھ، کوا اور مرغ پکڑا۔

فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءاً: اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا کہ پھر ان پرندوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیجیے، آپ نے چار پرندے لئے، ذبح کر کے ان کے ٹکڑے کئے پھر اکھیڑ دیئے اور مختلف ٹکڑے آپس میں ملا دیئے، پھر چاروں پہاڑوں پر وہ ٹکڑے رکھ دیئے اور سب پرندوں کے سر اپنے ہاتھ میں رکھے۔

ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْياً: پھر اللہ نے فرمایا کہ ان پرندوں کو بلایئے وہ آپ کے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہیں بلانے لگے جس پرندے کو آواز دیتے اس کے بکھرے ہوئے پر ادھر ادھر سے اڑتے اور آپس میں جڑتے اسی طرح خون خون کے ساتھ ملتا اور باقی اجزاء بھی جس جس پہاڑ پر ہوتے آپس میں مل جاتے اور پرندہ اڑتا ہوا آپ علیہ السلام کے پاس آتا، آپ علیہ السلام اسے دوسرے پرند کا سر دیتے تو وہ قبول نہ کرتا، خود اس کا سر دیتے تو وہ جڑ جاتا،

یہاں تک کہ ایک ایک کرکے یہ چاروں پرند زندہ ہو کر اُڑ گئے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اور مردوں کے زندہ ہونے کا یہ ایمان افروز نظارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔

وَاعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ: اور جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے، وہ تمام ممکنات پر غالب ہے، حکیم ہے یعنی وہ کاموں کے انجام اور چیزوں کی انتہاؤں کو خوب جانتا ہے۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اجر

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

مَّثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ {۲۶۱} البقرہ

جواب ترجمہ: ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ کہ اگائے سات بالیں ہر بال میں سو سو دانے اور اللہ جس کے واسطے چاہے بڑھاتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا، جاننے والا ہے۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یعنی حج میں یا جہاد میں یا فقراء و مساکین اور بیواؤں اور یتیموں پر یا بہ نیت امداد اپنے عزیزوں دوستوں پر اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک دانہ گیہوں کا عمدہ زمین میں بوئے اس دانہ سے گیہوں کا ایک پودا نکلے جس میں سات خوشے گیہوں کے پیدا ہوں اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے حاصل ہو گئے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا اجر و ثواب ایک سے لے کر سات سو تک پہنچتا ہے ایک پیسہ خرچ کرے تو سات سو پیسوں کا ثواب حاصل ہو سکتا ہے۔ صحیح و متعبر احادیث میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اس کا دس گنا ملتا ہے اور سات سو گنا تک پہنچ سکتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جہاد اور حج میں ایک درہم خرچ کرنے کا ثواب سات سو درہم کے برابر ہے۔ (معارف القرآن)

لیکن قرآن حکیم نے اس مضمون کو بجائے مختصر اور صاف لفظوں میں بیان کرنے کے دانہ گندم کی مثال کی صورت میں بیان فرمایا جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح کاشتکار ایک دانہ گندم سے سات سو دانے اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب کہ یہ دانہ عمدہ ہو خراب نہ ہو اور دانہ ڈالنے والا کاشتکار بھی کاشتکاری کے فن سے پورا واقف ہو اور جس زمین میں ڈالے وہ بھی عمدہ زمین ہو کیونکہ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہو گئی تو یا یہ دانہ ضائع ہو جائے گا ایک دانہ بھی نہ نکلے گا اور یا پھر ایسا بارآور نہ ہو گا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جائیں۔

اسی طرح اعمال صالحہ اور خصوصاً انفاق فی سبیل اللہ کی مقبولیت اور زیادتی اجر کے لئے بھی یہی تین شرطیں ہیں کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ پاک اور حلال ہو کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال مال کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے، دوسرے خرچ کرنے والا بھی نیک نیت اور صالح ہو بد نیتی یا نام و نمود کے لئے خرچ کرنے والا، اس ناواقف کاشتکار کی طرح ہے جو دانہ کو کسی ایسی جگہ ڈال دے کہ وہ ضائع ہو جائے۔ تیسرے جس پر خرچ کرے وہ بھی صدقہ کا مستحق ہو کسی نااہل پر خرچ کر کے ضائع نہ کرے اس طرح اس مثال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت بڑی فضیلت بھی معلوم ہو گئی۔ (معارف القرآن)

مخیر حضرات کی تعریف اور احتیاطی تدابیر

سوال ان آیات کا ترجمہ او تفسیر کیجیے

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲۶۲) قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ (۲۶۳) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ

تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (۲۶۴)البقرہ

جواب ترجمہ: جو لوگ اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ کوئی تکلیف پہنچاتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنا ثواب پائیں گے، نہ ان کو کوئی خوف لاحق ہو گا اور نہ کوئی غم پہنچے گا۔ بھلی بات کہہ دینا اور درگزر کرنا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد کوئی تکلیف پہنچائی جائے اور اللہ بڑا بے نیاز، بہت بردبار ہے، اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر اس شخص کی طرح ضائع مت کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چکنی چٹان پر مٹی جمی ہو، پھر اس پر زور کی بارش پڑے اور اس (مٹی کو بہا کر چٹان) کو (دوبارہ) چکنی بنا چھوڑے۔ ایسے لوگوں نے جو کمائی کی ہوتی ہے وہ ذرا بھی ان کے ہاتھ نہیں لگتی اور اللہ (ایسے) کافروں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ الخ: اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے ان بندوں کی مدح و تعریف کرتا ہے جو خیرات و صدقات کرتے ہیں اور پھر جسے دیتے ہیں اس پر احسان نہیں جتاتے اور نہ اپنی زبان سے یا اپنے کسی فعل سے اس شخص کو کوئی نقصان پہنچاتے ہیں، ان سے ایسے جزائے خیر کا وعدہ فرماتا ہے کہ ان کا اجر و ثواب رب دوعالم کے ذمہ ہے۔ ان پر قیامت کے دن کوئی ہول اور خوف و خطر نہ ہو گا اور نہ دنیا اور بال بچے چھوٹ جانے کا انہیں کوئی غم و رنج ہو گا، اس لئے کہ وہاں پہنچ کر اس سے بہتر چیزیں انہیں مل چکی ہیں۔

قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ: کلمہ خیر زبان سے نکالنا، کسی مسلمان بھائی کیلئے دعا کرنا، درگزر کرنا، خطاوار کو معاف کر دینا اس صدقے سے بہتر ہے جس کی تہہ میں ایذاء دہی ہو، حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَا مِنْ صَدَقَةٍ أَحَبُّ إِلَى اللَّهِ مِنْ قَوْلٍ مَعْرُوفٍ (ابن ابی حاتم) کوئی صدقہ نیک کام

سے افضل نہیں، کیا تم نے فرمان باری (قول معروف الخ) نہیں سنا؟

وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ: اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوق سے بے نیاز ہے اور ساری مخلوق اس کی محتاج ہے، وہ حلیم اور بردبار ہے، گناہوں کو دیکھتا ہے اور حلم و کرم کرتا ہے بلکہ معاف فرما دیتا ہے، تجاوز کرلیتا ہے اور بخش دیتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى: اہل ایمان سے خطاب ہے کہ اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف دے کر ضائع نہ کرو، یہ عمل اللہ کے ہاں پسندیدہ نہیں ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ، اَلْمَنَّانُ بِمَا أَعْطَى، وَالْمُسْبِلُ إِزَارَهُ، وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ (مسلم) تین قسم کے لوگوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات چیت نہ کرے گا، نہ ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا، نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کیلئے دردناک عذاب ہیں، ایک تو دے کر احسان جتانے والا، دوسرا ٹخنوں سے نیچے پاجامہ اور تہبند لٹکانے والا، تیسرا اپنے سودے کو جھوٹی قسم کھا کر بیچنے والا۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَاقٌّ، وَلَا مَنَّانٌ، وَلَا مُدْمِنُ خَمْرٍ، وَلَا مُكَذِّبٌ بِقَدَرٍ (ابن ماجہ، ابن کثیر) ماں باپ کا نافرمان، خیرات کرکے احسان جتانے والا، شراب کا عادی اور تقدیر کو جھٹلانے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ثَلَاثَةٌ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، الْعَاقُّ لِوَالِدَيْهِ، وَمُدْمِنُ الْخَمْرِ، وَالْمَنَّانُ بِمَا أَعْطَى (نسائی) تین لوگوں کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دیکھے گا بھی نہیں، ماں باپ کا نافرمان، شراب کا عادی اور دے کر احسان جتانے والا۔ نسائی کی روایت میں تو یہاں تک آتا ہے کہ یہ تینوں شخص جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ (نسائی) اس آیت میں بھی یہی بتلایا جارہا ہے کہ اپنے صدقہ وخیرات کو احسان جتلا کر ضائع نہ کرو، ایسا کرنے سے صدقہ وخیرات کا اجر وثواب باقی

نہیں رہتا۔

كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ: پھر مثال دی کہ احسان اور تکلیف دہی کے صدقے کے غارت ہو جانے کی مثال اس صدقہ جیسی ہے جو ریاکاری کے طور پر لوگوں کو دکھاوے کیلئے دیا جائے، اپنی سخاوت اور فیاضی اور نیکی کی شہرت مد نظر ہو، لوگوں میں تعریف وستائش کی چاہت ہو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی طلب نہ ہو نہ اس کے ثواب پر نظر ہو، اسی لئے اس جملے کے بعد فرمایا کہ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہ ہو تو اس ریاکارانہ صدقے کی اور اس احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے کے صدقہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی صاف چٹان ہو جس پر مٹی بھی پڑی ہوئی ہو، پھر سخت شدت کی بارش ہو تو جس طرح اس پتھر کی تمام مٹی دھل جاتی ہے اور کچھ بھی باقی نہیں رہتی، اسی طرح ان دونوں قسم کے لوگوں کے خرچ کی کیفیت ہے کہ لوگ سمجھتے ہوں کہ اس کے صدقہ کی نیکی اس کے پاس ہے جس طرح بظاہر پتھر پر مٹی نظر آتی ہے لیکن جیسے کہ بارش سے وہ مٹی جاتی رہی اسی طرح اس کے احسان جتانے یا تکلیف پہچانے یا ریاکاری کرنے سے وہ ثواب بھی جاتا رہا اور اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے گا تو کچھ بھی جزا نہ پائے گا، اپنے اعمال میں سے کسی چیز پر قدرت نہ رکھے گا، اللہ تعالیٰ کافر گروہ کی راہ راست کی طرف رہبری نہیں کرتا۔ (تفسیر ابن کثیر)

ریاکاری کا نقصان: اگر کوئی شخص مسلمان ہو اور ریاکاری سے کوئی ایسا کام کرے جو فی نفسہ نیک ہو، خواہ مالی عبادت ہو یا جانی عبادت، ریاکاری کی وجہ سے وہ بھی ثواب سے محروم رہے گا بلکہ ریاکاری اس کے لیے وبال ہو گی اور آخرت میں مستحق عذاب ہو گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے جن لوگوں کے بارے میں سزا کا فیصلہ ہو گا ان میں ایک شخص وہ ہو گا جو بظاہر شہید ہو گیا تھا لیکن اس کی نیت یہ تھی کہ بہادری میں اس کا نام ہو اور ایک وہ شخص ہو گا جس نے علم پڑھا اور پڑھایا اور قرآن شریف پڑھا، علم حاصل کرنے سے اس کی نیت یہ تھی کہ اس کو عالم کہا جائے اور قرآن پڑھنے سے اس کی نیت یہ تھی کہ اس کو قاری کہا جائے اور ایک

وہ شخص ہو گا جسے اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کا مال دیا تھا وہ اللہ پاک کے حضور میں کہے گا کہ جو بھی کوئی خرچ کرنے کی سبیل مجھے ملی جس میں خرچ کرنا آپ کے نزدیک محبوب تھا اس میں میں نے آپ کے لیے خرچ کیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو گا کہ تو جھوٹ کہتا ہے تو نے یہ اس لیے کیا کہ تجھے سخی کہا جائے، تینوں آدمیوں سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تمہاری جو خواہش تھی وہ پوری ہو چکی اور جو تم چاہتے تھے وہ کہا جا چکا لہٰذا ان تینوں کو منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جن کے ذریعہ سب سے پہلے دوزخ کو دھکایا جائے گا یہ تین آدمی ہوں گے۔ (الترغیب و الترہیب، انوار البیان)

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نے بیان کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس نے ریا کاری کرتے ہوئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، اور جس نے روزہ رکھ کر ریاکاری کی اس نے شرک کیا اور جس نے صدقہ دے کر ریاکاری کی اس نے شرک کیا۔ (مشکوٰۃ، انوار البیان)

متلاشیان رضائے خداوندی کی مثال

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۲۶۵) البقرہ

جواب ترجمہ: اور جو لوگ اپنے مال اللہ کی خوشنودی طلب کرنے کے لیے اور اپنے آپ میں پختگی پیدا کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باغ کسی ٹیلے پر واقع ہو، اس پر زور کی بارش برسے تو وہ دگنا پھل لے کر آئے۔ اور اگر اس پر زور کی بارش نہ بھی برسے تو ہلکی پھوار بھی اس کے لیے کافی ہے، اور تم جو عمل بھی کرتے ہو اللہ اسے خوب اچھی طرح دیکھتا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ :اس آیت شریفہ میں مؤمنین صالحین مخلصین کے مال خرچ کرنے کی ایک مثال بتائی ہے اور اس مثال میں ان کے ثواب کی کثرت اور عند اللہ مقبولیت ظاہر فرمائی ہے، ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اور اس خرچ کرنے میں ان کی یہ بھی نیت ہے کہ ان کے نفس اس نیکی کرنے میں پختہ ہو جائیں تاکہ نفس خرچ کرنے کے خوگر رہیں اور کنجوسی کو پاس نہ آنے دیں تو ایسے لوگوں کے خرچ کرنے کی ثواب کے اعتبار سے ایسی مثال ہے جیسے کسی ٹیلے پر ایک باغیچہ ہو (ٹیلوں کی آب وہوا باغوں کے لیے نہایت مناسب ہوتی ہے) پھر اوپر سے زور دار بارش بھی ہو جائے تو زمین کو اور زیادہ قوت وطاقت پہنچ جائے جس کی وجہ سے دوگنے پھل آجائیں چونکہ یہ باغیچہ اونچے ٹیلہ پر ہے اس لیے زور دار بارش نہ ہو تو تھوڑا بہت چھینٹا بھی اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے جس طرح اس باغیچہ میں پھل خوب کثیر مقدار میں آئیں گے اہل ایمان اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے جو مال خرچ کریں گے اسی طرح ان کے خرچ کرنے کا ثواب بھی بہت زیادہ ملے گا۔ (انوار البیان)

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ: یعنی جو بھی کوئی کسی طرح کا عمل کرتا ہے اچھا ہو یا برا، اللہ تعالیٰ سب کو دیکھتا ہے ہر عمل کا بدلہ اللہ کے یہاں سے ملے گا۔ ریاکار کو بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور مخلص کو بھی، اپنے عمل کی ہر ایک کو نگرانی کرنا لازم ہے کہ اخلاص ہے یا نہیں۔ (انوار البیان)

بڑھاپا، اولاد کمزور اور سرمایہ تباہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ (۲۶۶) البقرہ

جواب ترجمہ: کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں (اور) اس کو اس باغ میں اور بھی ہر طرح کے پھل حاصل ہوں، اور بڑھاپے نے اسے آپکڑا ہو، اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں، اتنے میں ایک آگ سے بھرا بگولا آکر اس کو اپنی زد میں لے لے اور پورا باغ جل کر رہ جائے؟ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔

اس آیت شریفہ میں ان لوگوں کے بارے میں ایک مثال بیان فرمائی ہے، جو نیک اعمال کرتے ہیں لیکن دکھلاوے، ریاکاری اور نمود کے ساتھ ساتھ احسان جتلا کر تکلیف دینے کی وجہ سے یا کسی ایسے عمل کی وجہ سے اعمال تباہ و برباد اور اکارت کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کسی شخص کا باغ ہو جس میں کھجوروں اور انگوروں کے درخت ہوں اور ان کے علاوہ بھی ہر قسم کے پھل ہوں اس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں وہ خود بوڑھا ہو گیا ہو اور اس کے اہل و اولاد ضعیف ہوں، خود بھی کچھ نہیں کر سکتا اور اولاد بھی کسی قابل نہیں، گزارہ کا راستہ صرف یہی باغ ہے اپنا خرچ بھی اسی سے ہے اور بال بچوں کا سہارا بھی یہی باغ ہے۔

ایسی حالت میں ایک تیز آندھی آئی اس آندھی میں آگ تھی اس آگ نے سارے باغ کو جلا کر خاکستر کر دیا، عین حاجت کے وقت جبکہ اس باغ کی بہت زیادہ ضرورت تھی کچھ بھی نہ بچا سارا ہی جل کر راکھ ہو گیا، اس مثال کو سامنے رکھ کر سمجھ لیں کہ جو اعمال صالحہ انجام دیئے جاتے ہیں ان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آخرت میں ان کا ثواب ملے، وہاں حاجتیں پوری ہوں اور عذاب سے حفاظت ہو لیکن اخلاص نہ ہونے کے باعث جب بہت بڑی اور سب سے بڑی حاجت کا وقت آیا تو جو اعمال کیے تھے انہوں نے کچھ بھی کام نہ دیا کیونکہ اللہ کی رضا کے لیے نہیں بلکہ بندوں کو دکھانے کے لیے اعمال کیے تھے جو بظاہر نیک تھے لیکن ریاکاری نے ان کی نیکی ختم کر دی تھی نماز پڑھی دکھاوے کے لیے، حج کیا نام و نمود کے لیے، صدقہ دیا شہرت کے لیے جہاد کیا بہادری ظاہر کرنے کے لیے،

صدقہ دیا شہرت کے لیے اور شہرت کے خیال سے نہ تھا تو جن کو دیا تھا ان پر احسان دھر کر اور تکلیف پہنچا کر اکارت کر دیا آخرت میں پیشی ہے اعمال صالحہ کی ضرورت ہے اور اعمال کا ثواب مل نہیں رہا ایسے وقت میں جو بد حالی ہو گی اس کا کچھ اندازہ مذکورہ بالا باغ والے آدمی کی حیرت اور پریشانی سے کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فکر مند بنانے کے لیے طرح طرح کی مثالیں بیان فرماتے ہیں۔ (انوار البیان)

كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ: اللہ تعالیٰ نے تمہارے سامنے یہ مثالیں بیان فرما دیں، تم بھی غور و فکر، تدبر اور تفکر کرو، سوچو، سمجھو اور عبرت و نصیحت حاصل کرو جیسے فرمایا وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ (العنکبوت ۴۳) ان مثالوں کو ہم نے لوگوں کیلئے بیان فرما دیا۔ انہیں علماء ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔

پاکیزہ اور حلال راہ حق میں خرچ کرنے کا حکم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (۲۶۷) البقرہ

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! جو کچھ تم نے کمایا ہو اور جو پیداوار ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہو اس کی اچھی چیزوں کا ایک حصہ (اللہ کے راستے میں) خرچ کیا کرو، اور یہ نیت نہ رکھو کہ بس ایسی خراب قسم کی چیزیں (اللہ کے نام پر) دیا کرو گے جو (اگر کوئی دوسرا تمہیں دے تو نفرت کے مارے) تم اسے آنکھیں میچے بغیر نہ لے سکو۔ اور یاد رکھو کہ اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ ہر قسم کی تعریف اسی کی طرف لوٹتی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ: اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو صدقہ کرنے کا حکم دیتا ہے کہ مال تجارت جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے سونا چاندی اور پھل اناج وغیرہ جو اس نے

تمہیں زمین سے نکال کر دیئے ہیں، اس میں سے بہترین مرغوب طبع اور دل پسند عمدہ عمدہ چیزیں اللہ کی راہ میں دو، ردی، بے کار، سڑی گلی، گری پڑی، فضول اور خراب چیزیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں نہ دو، اللہ خود طیب ہے وہ خبیث کو قبول نہیں کرتا، تم اس کے نام پر ایسی خراب چیز دینا چاہتے ہو جسے تم خود لینا پسند نہیں کرتے، اگر اس طرح کی کوئی چیز تمہیں لینا پڑے تو شرم کے مارے آنکھیں میٹ لیتے ہو، یہ بھی اس وقت جب اپنے حق کو جاتے دیکھ رہے ہو تو، لیکن اللہ ایسا مجبور بھی نہیں وہ کسی حالت میں ایسی چیز کو قبول نہیں فرماتا، یہ بھی مطلب ہے کہ حلال چیز کو چھوڑ کر حرام چیز یا حرام مال سے خیرات نہ کرو۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں أَمَرَهُمْ بِالْإِنْفَاقِ مِنْ أَطِيبِ الْمَالِ وَأَجْوَدِهِ وَأَنْفَسِهِ، وَنَهَاهُمْ عَنِ التَّصَدُّقِ بِرُذَالَةِ الْمَالِ ودَنيه اللہ تعالیٰ نے انہیں پاکیزہ ترین، عمدہ ترین، نفیس ترین مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، اور انہیں گھٹیا اور رذیل مال صدقہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ طیبات سے مراد وہ اموال ہیں جو وہ کماتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ طیبات سے مراد سونا اور چاندی ہے، پھل اور کھیتیاں ہیں جو ان کے لیے زمین سے نکالی ہیں۔ (ابن کثیر)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمہاری روزیاں تم میں تقسیم کی ہیں تمہارے اخلاق بھی تم میں بانٹ دیئے ہیں، دنیا تو اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو بھی دیتا ہے دشمنوں کو بھی، ہاں دین صرف ان لوگوں کو دیتا ہے جن سے وہ محبت رکھتا ہے اور جسے دین مل جائے اسے اللہ نے پنا محبوب بنالیا ہے، اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے کوئی بندہ مسلمان نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا دل اس کی زبان مسلمان نہ ہو جائے، کوئی بندہ مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے پڑوسی اس کی ایذاؤں سے بے خوف نہ ہو جائیں، لوگوں نے پوچھا، یا نبی اللہ! پڑوسی کو ایذا دینے کا کیا مطلب ہے؟ اس سوال پر آپ نے فرمایا ایذاء سے مراد

دھوکہ بازی اور ظلم و ستم ہے، جو شخص حرام وجہ سے مال حاصل کرے اس میں اللہ برکت نہیں دیتا ، نہ اس کے صدقہ خیرات کو قبول فرماتا ہے اور جو چھوڑ کر جاتا ہے وہ سب اس کیلئے آگ میں جانے کا توشہ اور سبب بنتا ہے، اللہ تعالیٰ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو اچھائی سے دفع کرتا ہے، خباثت خباثت سے نہیں مٹتی۔(مسند احمد)

شان نزول: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔(ابن کثیر) فرماتے ہیں کہ کھجوروں کے موسم میں انصار اپنی اپنی وسعت کے مطابق کھجوروں کے خوشے لاکر دوستوں کے درمیان ایک رسی کے ساتھ لٹکا دیتے، جسے اصحاب صفّہ اور مسکین مہاجر بھوک کے وقت کھالیتے، کسی نے جسے صدقہ کی رغبت کم تھی اس میں ردی کھجور کا ایک خوشہ لٹکا دیا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر تمہیں ایسی ہی چیزیں ہدیہ میں دی جائیں تو ہرگز نہ لوگے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گوہ کا گوشت لایا گیا، آپ نے نہ کھایا نہ کسی کو کھانے سے منع فرمایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کسی مسکین کو دے دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تُطْعِمُوهُمْ مِمَّا لَا تَأْكُلُونَ جو تمہیں پسند نہیں اور جسے تم کھانا پسند نہیں کرتیں اسے کسی اور کو کیا دو گی؟(مسند احمد)

وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب تمہارا حق کسی پر ہو اور وہ تمہیں وہ چیز دے جو بے قدر و قیمت ہو تو تم اسے نہ لوگے مگر اس وقت جب تمہیں اپنے حق کی بربادی دکھائی دیتی ہو تو تم چشم پوشی کرکے اسی کو لوگے۔(ابن جریر، ابن کثیر) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ تم نے کسی کو اچھا مال دیا اور ادائیگی کے وقت وہ ناقص مال لے کر آیا تو تم ہرگز نہ لوگے اور اگر لوگے بھی تو اس کی قیمت گھٹا کر، تو تم جس چیز کو اپنے حق میں لینا پسند نہیں کرتے اسے اللہ کے حق کے عوض کیوں دیتے ہو؟

ردی اور گھٹیا مال، حرام کمایا ہوا اور دوسروں کے مال پر جھپٹا مار کر ہتھیایا ہوا مال اللہ تعالیٰ قبول کرتے ہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ ایسا مال اپنی راہ میں دینے کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، قرآن کریم میں

جہاں کہیں بھی اس طرح کا مضمون آیا اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں محبوب ترین چیز دینے ہی کی ترغیب دی ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران:۹۲) ہرگز تم کامل نیکی کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم وہ چیز خرچ نہ کرو جسے تم پسند کرتے ہو، ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج:۳۷) ہرگز نہیں پہنچتا اللہ کو ان کا گوشت، نہ ان کا خون لیکن اللہ کو پہنچتا ہے تمہاری طرف سے تقویٰ۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ: اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا اور عمدہ چیز دینے کا کہا ہے، کہیں اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ محتاج ہے، نہیں نہیں وہ تو بے نیاز ہے اور تم سب اس کے محتاج ہو، یہ حکم صرف اس لئے ہے کہ غرباء بھی دنیا کی نعمتوں سے محروم نہ رہیں گے، اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں، صدقہ اپنے چہیتے حلال مال سے نکال کر اللہ کے فضل اور اس کے کرم اور اس کی سخاوت پر نظریں رکھو، وہ اس کا بدلہ اس سے بہت بڑھ چڑھ کر تمہیں عطا فرمائے گا وہ مفلس نہیں وہ ظالم نہیں، وہ حمید ہے تمام اقوال افعال تقدیر شریعت سب میں اس کی تعریفیں ہی کی جاتی ہیں۔

شیطانی اور رحمانی عہد و پیمان

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۶۸)البقرہ

جواب ترجمہ: شیطان تمہیں ڈراتا ہے تنگ دستی سے اور حکم دیتا ہے تمہیں فحش کاموں کا اور اللہ وعدہ فرماتا ہے تم سے اپنی طرف سے مغفرت کا اور فضل کا اور اللہ وسعت والا ہے۔

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ: اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے شیطان روکتا ہے اور دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ اس طرح تم فقیر ہو جاؤ گے، وہ تمہیں ڈراتا ہے کہ راہ حق میں خرچ کرو گے تو تمہارا مال کم ہو

جائے گا، اس لیے جو کچھ تمہارے پاس ہے اسے سنبھال سنبھال کر رکھو، اسے اللہ کی رضاجوئی کے لیے خیر کے کاموں میں نہ لگاؤ۔

وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ: شیطان چونکہ آدم اور اولاد آدم کا ازلی دشمن ہے، اس نے اللہ کی بارگاہ میں عہد وپیمان کیا تھا کہ میں انسان کو ہر طرف سے آکر گمراہ کروں گا، اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرنے سے مال میں برکت آتی ہے اور رحمت برستی ہے، جب کہ شیطان اس کام سے ڈرا کر روک دیتا ہے، پھر انسان اپنے مال کو سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے، اسے ہوا تک نہیں لگنے دیتا، پھر اس کے ساتھ شیطان یہ دشمنی کرتا ہے کہ انسان کو بے حیائی اور برائی کے کاموں کی ترغیب دیتا ہے، برائی کے کاموں میں لذت دکھاتا اور سجھاتا ہے، بے حیائیوں اور بدکاریوں کی رغبت دلاتا ہے، گناہوں پر نافرمانیوں پر حرام کاریوں پر اور مخالفت پر اکساتا ہے۔

شیطان انسان کو فحشاء کا حکم دیتا ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت میں عمدہ اور بہترین چیزیں خرچ نہ کرے ورنہ فقیر ہو جائے گا، پھر جب انسان شیطان کی پیروی کر لیتا ہے تو شیطان کا حوصلہ بلند ہو جاتا ہے وہ اس پر مزید محنت کرتا ہے اور اسے مکمل طور پر مال خرچ کرنے سے روک دیتا ہے کہ وہ عمدہ مال خرچ کرتا ہے اور نہ ہی ردی اور بے کار مال خرچ کرتا ہے۔

یہاں تک کہ انسان پر جو حقوق واجب ہوتے ہیں ان میں بھی خرچ کرنے سے ہاتھ پیچھے کھینچ لیتا ہے نہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے جو صاحب نصاب پر سال کے بعد واجب ہوتی ہے، نہ ہی اپنے قریبی رشتہ داروں کی صلہ رحمی کے طور پر مال خرچ کرتا ہے، نہ ہی کسی کی طرف سے ودیعت کیے ہوئے مال کو واپس لوٹانے کی کوشش کرتا ہے، جب انسان اس حد تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کے دل ودماغ میں گناہ کوئی بری چیز نہیں رہ جاتی، وہ بے دھڑک گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، اسے گناہوں کی دلدل میں اترنے میں کوئی ہچکچاہٹ اور شرمندگی نہیں ہوتی، یہ سلسلہ ایسی وسعت اختیار کرتا ہے کہ انسان ہر طرح کے گناہوں میں پڑ جاتا ہے، اسی کو قرآن کریم نے یہاں فحشاء کے ساتھ تعبیر کیا ہے، جب

انسان شیطان کی اتباع اور پیروی نہیں کرتا تو پھر شیطان مایوس ہو جاتا ہے، اس نے انسان سے جو امیدیں وابستہ کی ہوتی ہیں وہ کٹ جاتی ہیں، جب شیطان انسان کے ساتھ اپنی امیدیں وابستہ رکھتا ہے تو پھر ہر طرح کا داؤ پیچ کھیلتا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ إِنَّ لِلشَّيْطَانِ لَمَّةً وَهِيَ الْإِيعَادُ بِالشَّرِّ، وَلِلْمَلَكِ لَمَّةً وَهِيَ الْوَعْدُ بِالْخَيْرِ، فَمَنْ وَجَدَ ذَلِكَ فَلْيَعْلَمْ أَنَّهُ مِنَ اللَّهِ وَمِنْ وَجَدَ الْأَوَّلَ فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ (ترمذی، نسائی، ابن حبان، تفسیر الکبیر) بنی آدم کے دل میں شیطان کی طرف سے خیال آتا ہے اور ایک فرشتے کی طرف سے بھی خیال آتا ہے شیطانی خیال یہ ہے کہ انسان برائی کرے اور حق کو جھٹلائے اور فرشتے کا یہ خیال ہے کہ اسے نیکی کرنے اور حق کی تصدیق کا خیال آتا ہے سو تم میں سے جو شخص ایسی کیفیت پائے تو وہ جان لے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے لہٰذا اللہ کی حمد کرے اور جو شخص دوسری کیفیت پائے تو شیطان سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ کی پناہ مانگے، یہ بات بیان فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ تلاوت فرمائی۔

فحشاء سے مراد بخل ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان تمہیں بخل کرنے پر آمادہ کرتا ہے، عرب فاحش بخیل آدمی کو کہتے ہیں۔ (تفسیر کبیر) طرفہ شاعر کا شعر بھی ہے

أَرَى الْمَوْتَ يَعْتَامُ الْكِرَامَ وَيَصْطَفِي ... عَقِيلَةَ مَالِ الْفَاحِشِ الْمُتَشَدِّدِ

میں موت کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ عمدہ صفات کے حامل افراد کو چن لیتی ہے، یعنی انہیں جلد موت آجاتی ہے جس طرح کہ سخت قسم کے بخیل انسان کے مال مویشی میں سے عمدہ جانور چن لئے جائیں، یہاں شاعر نے الفاحش کو بخیل کے معنی میں استعمال کیا ہے، اس آیت میں بخیل اور بخل دونوں کی مذمت کی گئی ہے۔

شیطان سے کیا مراد ہے؟ یہاں شیطان سے کیا مراد ہے؟ اور کون سا شیطان مراد ہے؟ بعض

حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ابلیس ہی ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے تمام شیاطین مراد ہیں، بعض کہتے ہیں کہ شیاطین الجن اور شیاطین الانس مراد ہیں، بعض کہتے ہیں کہ یہاں شیطان سے مراد انسان کا نفس امارہ ہے، جو انسان کو بار بار برائی کی طرف دعوت دیتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا: اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم ذات ہے، مہربان ہے، اپنے بندوں کے ساتھ پیار کرتا ہے، اس لیے وہ کبھی بھی انسان کو ایسا حکم نہیں دیتا جس سے اس کی دنیا خراب اور آخرت تباہ ہو، شیطان جن غلط راہوں پر انسان کو ڈالتا ہے اللہ ان راہوں سے بچنے کا حکم دیتا ہے، شیطان راہ خدا میں خرچ کرنے سے روکتا ہے جب کہ اللہ اپنا مال لگانے کا حکم دیتا ہے، اور بتاتا ہے کہ تمہاری تجوریوں میں جو کچھ موجود ہے یہ ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گا مگر اللہ کے خزانوں میں جو کچھ ہے وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے، شیطان تمہیں رب کی بخشش اور مغفرت سے دور لے جانا چاہتا ہے جب کہ مہربان ذات تمہاری خطاؤں کو معاف کرنے اور تمہیں بخشش کی آس اور امید دلاتی ہے، شیطان تمہیں فقیری اور مسکنت سے ڈراتا ہے جب کہ اللہ اپنے فضل وکرم کا یقین دلاتا ہے، یہاں مغفرت سے آخرت کی منفعتوں کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے، جب کہ فضل سے اس طرف اشارہ کیا جارہا ہے جو اسے دنیا میں مخلوق کی طرف سے حاصل ہو گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ دو چیزیں اللہ کی طرف سے ہیں اور دو چیزیں شیطان کی طرف سے ہیں، جیسے فرمایا الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ یعنی شیطان کہتا ہے اپنے مال کو خرچ نہ کرو اور اس کو روکے رکھو کیونکہ تو اس کی طرف (کسی وقت) محتاج ہو گا اور فرمایا وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا یعنی اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرماتے ہیں گناہوں پر مغفرت کرنے کا اور رزق میں زیادتی کرنے کا۔ (در منثور)

اہل دانش اور بینش کو معلوم ہونا چاہیے کہ شیطان انسان کو آنے والے کل میں فقیر ہو جانے سے خوف دلاتا ہے، جب کہ رحمان انسان کو اس کی آخرت کے کل کے بارے میں مغفرت کا وعدہ کرتا

ہے، تو رحمان نے آخرت کے بارے میں جو وعدہ کیا ہے اسے کئی وجوہ کی بناء پر قبول کرنا زیادہ بہتر ہے، ایک وجہ یہ ہے کہ کل کی دنیا کا ملنا مشکوک ہے، جب کہ آخرت کا پایا جانا یقینی اور قطعی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کل کی دنیا میں کبھی مال ہاتھ آتا ہے اور کبھی جس مال کا بخل کیا گیا تھا وہ ہاتھ نہیں آتا، جب کہ اللہ کی طرف سے کیے گئے وعدہ مغفرت کا آخرت میں ملنا یقینی ہے، کیونکہ یہ وعدہ اس سچی ہستی کی طرف سے کیا گیا ہے جو جھوٹ بول ہی نہیں سکتی۔

تیسری وجہ یہ ہے جس مال پر انسان بخل کرتا ہے دنیا میں کل اس پر کبھی قابو رکھ سکتا ہے، نفع اٹھا سکتا ہے اور کبھی اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا، یا تو اس کا سبب کوئی خوف ہوتا ہے یا بیماری یا کسی دوسرے اہم کام میں مشغولیت، جب کہ آخرت میں اللہ کی مغفرت، بخشش، اس کے فضل واحسان کا پایا جانا لازمی ہے کیونکہ اس کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ جس مال کے ساتھ بخل کیا گیا ہے وہ کل کلاں ختم ہو جائے گا اور اس کا نفع باقی نہیں رہے گا، جب کہ کل آخرت میں اللہ کی بخشش، اللہ کا فضل اور اللہ کا احسان ایسی چیز ہے جس کا نفع باقی رہے گا کبھی ختم نہیں ہو گا۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ دنیوی لذتوں سے نفع اٹھانے میں نقصانات کی آمیزش ہوتی ہے، ان لذات کے حصول کے لیے ہزارہا جتن کرنا پڑتے ہیں، جب کہ آخرت کے منافع تمام تر آمیزش سے پاک ہوں گے، جو شخص ان چیزوں کی حقیقت جان لے گا اسے معلوم ہو گا کہ اللہ رحمٰن ورحیم کے وعدہ مغفرت پر کان دھرنا شیطان کے عہد وپیمان سے کہیں زیادہ بہتر اور بڑھ کر ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ اللہ تمہیں مغفرت کا وعدہ دیتا ہے سے مراد گناہوں کا مٹنا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا [التَّوْبَة: ۱۰۳] ان سے صدقہ وصول کیجیے، انہیں پاک کیجیے اور اس کے ساتھ ان کا تزکیہ کیجیے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جس مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے وہ کمال درجے کی مغفرت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں

مغفرت کو معرفہ نہیں بلکہ نکرہ ذکر کیا ہے، پھر یہاں مغفرت کے بعد مِنہُ کا لفظ اس کے کمال کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس کے انتہائی کرم، اس کی کمال سخاوت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو تمام اہل عقل و دانش کو معلوم ہے، اللہ نے اس مغفرت کو اس لحاظ سے خاص کیا ہے کہ اس نے فرمایا کہ یہ مغفرت اس کی طرف سے ہو گی، یہ بات اس مغفرت کی عظمت کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ مغفرت دینے والی ذات جب عظمت والی ہے تو اس کی طرف سے دی گئی مغفرت بھی عظمت والی ہو گی۔

معطی کی عظمت عطیہ کی عظمت کا اشارہ دیتی ہے، اس کی کمال مغفرت اس بات کا بھی احتمال رکھتی ہے جس کا اس نے دوسرے مقام پر یوں ذکر فرمایا کہ فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ [الْفُرْقَانِ: ۷۰] یہ وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا، یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ایسی مغفرت ہو جسے اللہ تمام گناہ گاروں کے گناہوں کی بخشش کے لیے سفارشی بنا دے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ایسی باکمال مغفرت ہو جس کی طرف اس دنیا میں جب تک ہم رہیں ہماری ناقص عقول کی رسائی ہی نہ ہو، کیونکہ آخرت کی بہت سی تفصیلات ایسی ہیں جب تک ہم دنیا میں رہیں گے تب تک ہماری عقلوں سے بھی وہ اوجھل رہیں گی۔

آیت مبارکہ میں فَضْلاً کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے لیے خرچ کریں گے اللہ انہیں دنیا میں ہی اس کا نعم البدل عطا فرمائیں گے، ارباب تفسیر کہتے ہیں کہ اس فضل سے مراد وہ فضیلت بھی ہو سکتی ہے جو کسی انسان کو حاصل ہوتی ہے اور یہ فضیلت جود و سخاوت ہے، اس لیے کہ نیک بختی و سعادت کے تین مرتبے ہیں، نفسانی، بدنی اور خارجی، مال کا مالک ہونا یہ خارجی فضائل میں سے ہے، کسی کو جود و سخاوت کا حاصل ہونا یہ نفسانی فضائل میں سے ہے، اس پر اہل علم کا اتفاق ہے کہ ان تین مراتب میں اشرف و افضل مرتبہ سعادت نفسانی ہے جب کہ ان میں سب سے کم تر مرتبہ سعادت خارجی ہے، جب انسان کو مال خرچ کرنے کی سعادت میسر

آگئی تو سمجھ لیجیے کہ اسے کمال نفسانی حاصل ہو گیا، یہ کامل درجہ کی حالت ہے، تو مال خرچ کرنے سے انسان کو اللہ کا فضل حاصل ہو جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب انسان کو مال خرچ کرنے کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے تو روح سے لذات دنیویہ میں مشغول ہونے کی ھئیت ختم ہو جاتی ہے اور دنیا کی محبت ایسی چیز ہے جو روح تک نور جلال الٰہی کی تجلی پہنچنے میں رکاوٹ ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لَوْلَا أَنَّ الشَّيَاطِينَ يُوحُونَ إِلَى قُلُوبِ بَنِي آدَمَ لَنَظَرُوا إِلَى مَلَكُوتِ السَّمٰوَاتِ، اگر شیاطین اولاد آدم کے دلوں میں وسوسے نہ ڈالیں تو وہ ملکوت السماوات کو دیکھ لیں۔ جب دل کے چہرے سے دنیوی محبت کی غبار چھٹ جاتی ہے تو انوارات سے عالم قدس روشن ہو جاتا ہے اور چمکتے ستارے کی طرح ہو جاتا ہے اور فرشتوں کی ارواح کے ساتھ مل جاتا ہے، یہی وہ فضل ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے یہاں ذکر فرمایا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جب انسان سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ یہ خیرات اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے والا ہے تو انسانی قلوب اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، جو اس کے تقاضوں کے راستے میں حائل نہیں ہوتے، اس وقت اس پر دنیوی دروازے کھل جاتے ہیں، یہ اس لیے بھی کہ جن لوگوں پر یہ اپنے اموال خرچ کرتا ہے وہ دعاؤں کے ساتھ اس کی مدد و نصرت کرتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ اس پر ابواب خیر کے دروازے کھول دیتا ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

فضلاً کا ایک مفہوم یہ ہے کہ وہ خرچ کا بدلہ دے گا، ایک معنیٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم نے خرچ کیا ہے اس سے بہتر عطا کرے گا دنیا میں اور اجر و ثواب دے گا آخرت میں۔ فضل کا ایک معنیٰ رزق میں زیادتی اور دنیا و آخرت میں وسعت ہے، مروی ہے کہ تورات میں اللہ نے فرمایا، عَبْدِي، أَنْفِقْ مِنْ رِزْقِي أَبْسُطْ عَلَيْكَ فَضْلِي، فَإِنَّ يَدِي مَبْسُوطَةٌ عَلَى كُلِّ يَدٍ مَبْسُوطَةٍ، میرے بندے! میرے دیے میں سے خرچ کر میں تجھ پر اپنا فضل کشادہ کر دوں گا، میرا ہاتھ ہر کشادہ و کھلے ہاتھ سے بھی زیادہ

کھلا ہوا اور کشادہ ہے، اس طرح کی ایک آیت قرآن کریم میں بھی ہے ارشاد ہے وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ اور جو کچھ تم خرچ کروگے اللہ تمہیں اس کا بدل دے گا۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ: اللہ سے بڑھ کر رحم و کرم، فضل و لطف کس کا زیادہ وسیع ہوگا؟ اور انجام کار کا علم بھی اللہ سے زیادہ اچھا کسے حاصل ہو سکتا ہے؟ وہ ذات بہت وسیع پیمانے پر مغفرت اور بخشش کرنے والی ہے، وہ اس بات پر قادر ہے کہ تمہیں مالدار کر دے، اس لیے اس کی راہ میں خرچ کرنے سے کبھی نہیں کترانا چاہیے، جو کچھ تم خرچ کرتے ہو وہ اس کا تمہیں نعم البدل بھی عطا کرے گا اور اس کے علم میں بھی اچھی طرح یہ بات موجود ہے کہ تم اس کی خاطر اس کی راہ میں کس قدر خرچ کرتے ہو، تم جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے، تم جو اس کی راہ میں دو گے وہ تمہیں واپس لوٹا دے گا، علیم کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ خرچ کرنے والوں کی نیتوں کو خوب جانتا ہے، ایک مفہوم علیم کا یہ ہے کہ وہ خوب خوب جانتا ہے کہ اپنا فضل کہاں اور کس پر رکھے۔

حکمت عطیہ خداوندی ہے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (۲۶۹) البقرہ

جواب ترجمہ: وہ جس کو چاہتا ہے دانائی عطا کر دیتا ہے، اور جسے دانائی عطا ہو گئی اسے وافر مقدار میں بھلائی مل گئی۔ اور نصیحت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو سمجھ کے مالک ہیں۔

جب قرآن کریم میں یہ بتایا گیا کہ شیطان انسان کو فقر سے ڈراتا ہے، فحشاء کا حکم دیتا ہے اور رحمٰن انسان کو مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے تو اس بات پر انسان کو آگاہی دی جا رہی ہے کہ رحمٰن کے عہد و پیمان کو شیطانی وعدوں اور وسوسوں پر ترجیح دینا ضروری ہے اور رحمانی وعدوں کو ترجیح دینے والی دو چیزیں ہیں ایک حکمت اور دوسری عقل، جب کہ شیطانی وعدوں اور وسوسوں کو ترجیح دینے والی

دو چیزیں ہیں ایک شہوت اور دوسرا نفسانی خیالات، کیونکہ شہوت اور نفسانی خیالات ہی دو ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو لذت موجود کو حاصل کرنے پر اکساتے ہیں اور خیالات اور اوہام کی پیروی کا حکم دیتے ہیں، اور اس میں کوئی شک وشبہ کی بات نہیں ہے کہ عقل و حکمت ہی دو ایسی چیزیں ہیں جو درست اور صحیح فیصلہ کرنے والی ہیں، جن میں کوئی زیغ و ٹیڑھ نہیں ہے، جب کہ شہوت و نفسانی خیالات انسان کو آزمائش و امتحان سے دوچار کر دیتے ہیں، اس لیے حکمت اور عقل کا فیصلہ تسلیم کرنا زیادہ بہتر ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں اشارہ دیا ہے کہ جسے حکمت عطا کی گئی اسے بہت کچھ دے دیا گیا۔

حکمت کا معنیٰ: اَلْحِكْمَةَ مَصْدَرٌ مِنَ الْإِحْكَامِ وَهُوَ الْإِتْقَانُ فِي عَمَلٍ أَوْ قَوْلٍ لفظ حکمت اِحکام بالکسر کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں کسی عمل یا قول کو اس کے تمام اوصاف کے ساتھ مکمل کرنا۔ (بحر محیط) لفظ حکمت جب حق تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جائے تو معنی تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں اور جب غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے، موجودات کی صحیح معرفت اور اس کے مطابق عمل مراد ہوتا ہے۔ (مفردات القرآن للراغب اصفہانی) بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں اَلعِلمُ النَّافِعِ اَلْمُؤَدِّی اِلَی العَمَل یعنی حکمت ایسے علم کو کہا جاتا ہے۔ جو مفید ہو اور انسان کو عمل تک پہنچائے۔ (معالم العرفان)

حکمت کی تفسیر؟ حکمت سے مراد یا تو علم ہے یا فعل کا درست ہونا، مفسر قرآن حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں حکمت کی تفسیر چار طرح سے ہے، ① ایک مواعظ القرآن، سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے وَما أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ [الْبَقَرَةِ: ۲۳۱] اور تم پر جو کتاب اور حکمت کی باتیں تمہیں نصیحت کرنے کے لیے نازل کی ہیں، سے مراد مواعظ القرآن ہیں، سورۃ النساء میں فرمایا وَما أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتابِ وَالْحِكْمَةِ ،اس سے مراد بھی مواعظ ہیں، سورۃ آل عمران میں بھی اسی طرح فرمایا۔ ② حکمت کا معنیٰ فہم و علم ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَآتَيْناهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا [مَرْيَمَ: ۱۲] اور ہم نے بچپن ہی میں ان (یحیٰ) کو دانائی عطا

کر دی تھی۔ سورۃ لقمان میں ارشاد ہے وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ [لُقْمَانَ: ۱۲] اور ہم نے لقمان کو دانائی عطا کی تھی، مطلب یہ کہ ہم نے انہیں فہم وعلم عطا کیا، سورۃ الانعام میں ارشاد ہے أُولَئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ (الْأَنْعَامِ: ۸۹) وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکمت عطا کی تھی۔

③ حکمت سے مراد نبوت ہے جیسا کہ سورۃ النساء میں ارشاد ہے فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ [النِّسَاءِ: ۵۴] پس تحقیق ہم نے آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت عطا کی، یہاں حکمت سے مراد نبوت ہے، سورۃ ص میں ارشاد ہے وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (ص: ۲۰) اور ہم نے اسے حکمت اور فیصلہ کن خطاب عطا کیا، یہاں بھی حکمت سے نبوت مراد ہے، سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ (الْبَقَرَةِ: ۲۵۱) اور اللہ تعالیٰ نے اسے بادشاہی اور حکمت دی، یہاں بھی حکمت سے نبوت مراد ہے۔

④ حکمت سے مراد قرآن کریم ہے، جس میں اسرار ورموز کے عجائبات کا خزانہ پوشیدہ ہے، سورۃ النحل میں ارشاد ہے ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ (النَّحْلِ: ۱۲۵) اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت کے ساتھ بلایئے، تو یہاں حکمت سے مراد قرآن کریم ہے۔

حکمت سے مراد: علامہ اثیر الدین ابوحیان اندلسی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر بحر المحیط میں کچھ اقوال ذکر کیے ہیں، جن میں اہل علم ودانش نے اپنے اپنے علم کے مطابق حکمت کی مراد واضح کرنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ علامہ اندلسی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ انتیس اقوال ہیں مگر شمار کرنے سے انتیس مکمل نہیں ہوتے۔ ① حکمت سے مراد قرآن ہے۔

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا قرآن مجید کے ناسخ اور منسوخ، محکم اور متشابہ اور مقدم اور مؤخر کی معرفت حکمت ہے۔ ③ حکمت سے مراد نبوت ہے۔ ④ حکمت سے مراد فہم قرآن سے۔ ⑤ حکمت سے مراد علم اور فقہ ہے۔ ⑥ حکمت سے مراد قول اور فعل کا درست ہونا ہے۔ ⑦

حکمت سے اللہ کے دین میں تقوی مراد ہے۔

⑧ حکمت سے مراد خشیت (خوف خدا) ہے۔ ⑨ حکمت سے مراد اللہ کے حکم میں سمجھ بوجھ حاصل کرنا ہے۔ ⑩ حکمت سے مراد فہم ہے۔ ⑪ حکمت سے مراد علم اور عمل کا مجموعہ ہے، حکیم کو اس وقت تک حکیم نہیں کہا جائے گا جب تک یہ دونوں چیزیں اس میں نہ پائی جائیں۔

⑫ حکمت سے مراد کتابت ہے۔ ⑬ حکمت وہ چیز ہے جس کے درست ہونے کی عقل گواہی دے۔ ⑭ حکمت سے مراد اللہ کے احکام میں غور و فکر کرنا اور ان کا اتباع کرنا۔ ⑮ اللہ کی اطاعت، فقہ، دین اور اس پر عمل کرنا حکمت ہے۔ ⑯ حکمت سے مراد مغفرت ہے۔ ⑰ حکمت اس نور کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے وسوسہ اور الہام میں فرق واضح ہو۔

⑱ حکمت یہ ہے کہ اپنی خواہشات کی بجائے حق کے مطابق فیصلہ کرنا۔ ⑲ حکمت یہ ہے کہ سرعت کے ساتھ صحیح جواب دینا۔ ⑳ حکمت سے مراد کسی اختلافی معاملہ کو صحت کی طرف لوٹانا۔ ㉑ حکمت وہ چیز ہے جس سے روحوں کو سکون ملے۔ ㉒ حکمت کسی علت کے بغیر اشارہ کرنا ہے۔ ㉓ حکمت ہر حال میں حق کی گواہی دینا۔

㉔ حکمت دین کی بہتری اور دنیا کی اصلاح کرنا۔ ㉕ حکمت علم لدنی ہے۔ ㉖ حکمت اللہ تعالیٰ کی ذات میں تفکر کرنا اور الہام کا مورد بننے کے لیے صفاء باطن کرنا۔ یہ تمام اقوال قریب قریب ہیں، ایک جیسا مفہوم ہی واضح ہوتا ہے۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ: یہاں جو ارشاد فرمایا کہ جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی، اس طرح کی تمام توجیہات کو سامنے رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب کا مفہوم علم ہے، پھر یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت ہی قلیل علم سے نوازا ہے، جیسے خود اللہ فرماتے ہیں کہ **وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا** (الإسراء: ۸۵) تم تو تھوڑا سا علم دیے گئے ہو، دنیا کس قدر وسیع و عریض ہے، شرق تا غرب پھیلی ہوئی ہے مگر اللہ اس کو بھی قلیل فرما رہے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے **قُلْ**

مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ [النِّسَاءِ: ۷۷) فرمادیجیے کہ دنیا کا سازوسامان قلیل ہے، جب انسان اس قلیل کی مقدار معلوم کرلے تو اسے کثیر کی عظمت خود ہی معلوم ہو جائے گی، کہ اگر قلیل اس قدر زیادہ ہے تو کثیر کس قدر ہو گی، برھان عقلی بھی اس کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے کیونکہ دنیا جس قدر بھی ہو متناہی اور ختم ہونے والی ہے، اس کی مدت متناہی ہے یہ بھی ختم ہو جائے گی، جب کہ علوم کے مراتب، ان کی تعداد اوران کے باقی رہنے کی مدت لامتناہی ہے۔ علم کا مرتبہ تو اسی وقت ظاہر ہو گیا تھا جب اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کو صفت علم سے نوازا تھا، انہیں تمام اشیاء کے نام سکھائے تھے، اس وقت ملائکہ کی بے بسی ظاہر ہو گئی تھی۔

اگر حکمت سے مراد فعل کا درست ہونا لیا جائے تو اس کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ انسانی طاقت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے اخلاق کے رنگ میں رنگ جانا (تخلق باخلاق اللہ) حکمت ہے، جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ تَعَالَى تم اپنے کو اللہ کے اخلاق میں رنگ لو۔

حکمت کی دو قسمیں: حکمت کی دو قسمیں ہیں، حکمت نظری اور حکمت عملی، حکمت نظری کی تعریف یہ ہے کہ بشری طاقت کے مطابق حقائق اشیاء کا اس طرح علم ہو جس طرح وہ اشیاء واقع میں ہیں اور حکمت عملی یہ ہے کہ انسان برے اخلاق کو ترک کرے اور اچھے اخلاق کو اپنائے اور ایک تعریف یہ ہے کہ بشری طاقت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق ہونا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام پر عمل کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افعال کی اتباع کرنا۔ (تبیان القرآن)

حکمت عملی کی تین قسمیں: حکمت عملی کی تین قسمیں ہیں، اگر اس کا تعلق ایک فرد کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اس کو تہذیب اخلاق کہتے ہیں اور اگر اس کا تعلق ایک خاندان کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اسے تدبیر منزل کہتے ہیں اور اگر اس کا تعلق ایک شہر یا ملک کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اس کو سیاست مدنیہ کہتے ہیں۔ (تبیان القرآن)

فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا: اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، ہر آدمی حکمت حاصل نہیں کر سکتا

، البتہ جس شخص میں جس قدر حکمت کے حصول کی استعداد ہوتی ہے، اس کے مطابق وہ اپنا حصہ وصول کرلیتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا جسے حکمت عطا کر دی گئی، اسے خیر کثیر سے نوازا گیا گویا حکمت یعنی فہم قرآن یا فہم دین تمام خوبیوں کا منبع ہے اور فہم علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور علم کی روشنی دینی مدارس پھیلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکمت کو خیر کثیر فرمایا ہے، یہ جس جگہ بھی ملے اس کو اختیار کرلو۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ كَلِمَةُ الحِكمَةِ ضَالَّةُ المُؤمِنِ حکمت کی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ اسے جہاں پاتا ہے، حاصل کرلیتا ہے۔ حکمت ہی ایسی چیز ہے جو مومن کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ لہٰذا مومن ہمیشہ اس کا متلاشی رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے کسی اعلیٰ عہدہ منصب یا کسی دوسری قیمتی چیز کو خیر کثیر سے تعبیر نہیں کیا، مگر یہ لقب صرف حکمت کو عطا ہوا، کیونکہ حکمت تمام خوبیوں کا منبع ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حکمت کی انتہاء یہ ہے کہ انسان افضل الاشیاء کو افضل العلوم سے معلوم کرے۔ افضل الاشیاء خدا تعالیٰ کی ذات، وحدانیت اور اس کی صفات ہیں، لہٰذا جو شخص علم کے ذریعے اس راز کو پالے گا، وہی صاحب حکمت ہوگا اور پھر علم بھی محض زبانی کلامی نہ ہو، بلکہ اس میں دل کی حضوری اور عقل کا کمال شامل ہو، لہٰذا جسے حکمت عطا کی گئی اسے گویا بہت بہتری دے دی گئی اور یہی چیز منبع صفات اور ہر چیز کی جڑ اور بنیاد ہے۔ (معالم العرفان)

بعض حکماء فرماتے ہیں کہ جسے اللہ تعالیٰ نے علم اور قرآن کریم کی دولت عطا فرمائی اس کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے، وہ اہل دنیا کے لیے ان کی دنیوی دولت کی بناء پر متواضع اور منکسر المزاج نہ بنے، اس لیے اسے جو کچھ دیا گیا ہے وہ دنیا والوں سے بہتر دیا گیا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے متاع دنیا کو قلیل قرار دیا ہے، جب کہ علم کو خیر کثیر فرمایا ہے۔ (بحر العلوم)

وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ: امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کی مراد یہ ہے کہ جب

انسان اپنے دل میں حاصل ہونے والی حکمتیں اور معارف دیکھتا ہے تو اس کے بعد غور و تدبر کرتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے دینے اور اس کی طرف سے آسانی کے بغیر حاصل نہیں ہوا، یہ غور و تدبر اولی الالباب (عقل مند و دانش مند) لوگوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

خازن فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نصیحت فرمائی ہے اس نصیحت سے اہل عقل ہی سبق حاصل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے حکم اور نہی کو سمجھتے ہیں۔ (تفسیر خازن) علامہ زجاج فرماتے ہیں کہ قرآنی آیات میں جو قصے بیان کیے گئے ہیں ان میں اہل عقل ہی غور و فکر کرتے ہیں کہ ان میں کیا نصیحت کی گئی ہے۔ (زاد المسیر)

نذر کی شرعی حیثیت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ (۲۷۰) البقرہ

جواب ترجمہ: جو کچھ کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو سو بلاشبہ اللہ اس کو جانتا ہے اور ظلم کرنے والوں کے لیے کوئی بھی مددگار نہیں۔

نذر کا لغوی و شرعی معنیٰ: نذر کا معنی ہے تاوان، کسی چیز کو واجب کرنا، اللہ کے لیے منت ماننا۔ (قاموس للفیروزآبادی) نذر کا شرعی معنیٰ یہ ہے کہ تم کسی کام کے ہونے کی بناء پر اپنے اوپر ایسی عبادت کو واجب کر لو جس کو تم پر واجب نہیں کیا گیا ہے۔ (المفردات للراغب اصفہانی) نذر کے دو معنی آتے ہیں ایک معنی مشہور جس کا صلہ علی آتا ہے۔ دوسرا معنی عہد و پیمان کرنا جس کا صلہ الی ہوتا ہے یہاں معنی ثانی مراد ہے تاکہ حدیث کی مخالفت لازم نہ آئے کہ نذر سے بخیل کا مال خرچ کرانا ہوتا ہے لہذا معنی یوں ہوں گے کہ تم جو عہد و پیمان کرتے ہو کہ تم خدا کے واسطے دو گے لہذا عہد پورا کرو اور

مال دو۔ (جواہر القرآن)

نذر کی دو اقسام: نذر کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم حرام ہے اور یہ ہر وہ نذر ہے جو اللہ کی اطاعت میں نہ ہو اور زمانہ جاہلیت میں زیادہ تر نذریں ایسی ہوتی تھیں اور دوسری قسم ہے مباح، یہ کبھی کسی کام کے ساتھ مشروط ہوتی ہے اور کبھی مطلق ہوتی ہے مثلاً اگر میں فلاں مرض سے شفا پا جاؤں تو میں ایک دینار صدقہ کروں گا (یہ نذر مشروط ہے) یا میں اللہ کے لیے ایک غلام آزاد کروں گا (یہ غیر مشروط ہے) اور کبھی نذر مطلق ہوتی ہے، مثلاً اگر میں صحت مند ہو گیا تو میں صدقہ کروں گا۔ (البحر المحیط للاندلسی)

نذر صحیح اور نذر باطل کا بیان: علامہ علاء الدین حصکفی حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اکثر عوام جو فوت شدہ بزرگوں کی نذر مانتے ہیں اور اولیاء کرام کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ان کے مزارات پر جو روپے، موم بتی اور تیل کی نذر مانتے ہیں، وہ بالاجماع باطل اور حرام ہے، جب تک ان چیزوں کو فقراء پر خرچ کرنے کا ارادہ نہ کیا جائے لوگ اس آفت میں بہت مبتلا ہیں خصوصاً ہمارے زمانہ میں۔ (در مختار علی ھامش رد المختار ج ۲ ص ۱۲۸ بحوالہ تبیان القرآن)

علامہ ابن عابدین شامی حنفی رحمہ اللہ اس کی تشریح میں لکھتے ہیں: مثلاً کوئی شخص اولیاء اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اپنی نذر میں کہتا ہے: اے میرے سردار فلاں بزرگ! اگر میرا گم شدہ شخص واپس آ جائے یا میرا بیمار صحت مند ہو جائے یا میری حاجت پوری ہو جائے تو میں آپ کے لیے اتنا سونا یا چاندی، یا کھانا، یا موم بتی یا تیل دوں گا۔ (البحر الرائق) یہ نذر کئی وجوہ سے باطل اور حرام ہے

① یہ مخلوق کی نذر ہے اور مخلوق کی نذر باطل اور حرام ہے، کیونکہ نذر عبادت ہے اور مخلوق کی عبادت جائز نہیں ہے۔ ② جس کی نذر مانی گئی ہے، وہ فوت شدہ ہے اور فوت شدہ شخص کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ ③ اگر نذر ماننے والے کا یہ گمان ہے کہ وہ فوت شدہ شخص اللہ کے اذن کے بغیر تصرف کرتا ہے تو یہ اعتقاد کفر ہے، ہاں! اگر اس نے یہ کہا کہ اے اللہ! میں تیرے لیے نذر مانتا ہوں کہ اگر تو نے میرے مریض کو شفا دی یا میرے گم شدہ شخص کو لوٹا دیا، یا میری حاجت پوری کر دی تو میں سیدہ

نفیسہ کے مزار پر بیٹھے ہوئے فقراء کو کھانا کھلاؤں گا، یا امام شافعی رحمۃ اللہ یا امام لیث رحمۃ اللہ کے مزار پر بیٹھنے والے فقراء کو کھانا کھلاؤں گا، یا اس نے ان کی مساجد کے لیے چٹائی اور روشنی کے لیے تیل یا دیگر کاموں کے لیے روپیہ دیا جس میں فقراء کا نفع ہو یہ نذر خاص اللہ کے لیے ہو اور شیخ کا ذکر صرف نذر کو خرچ کرنے کے محل کے لیے ہو تا کہ اس مزار یا مسجد میں بیٹھنے والے فقراء اور مستحقین پر ان چیزوں کو خرچ کر دیا جائے تو اس اعتبار سے یہ نذر جائز ہے اور کسی غنی یا سید پر ان چیزوں کا خرچ کرنا جائز نہیں ہے اور جو نذر مخلوق کے لیے مانی گئی ہو اس کو پورا کرنا حرام ہے اور مزار کے متولی کے لیے اس کا لینا جائز نہیں ہے، جب تک نذر ماننے والا اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے نذر نہ مانے اور فقراء پر اس کو خرچ کرنے کی نیت نہ کرے۔ (رد المختار ج ۲ بحوالہ تبیان القرآن)

وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ: نفقہ کے ساتھ نذر کا ذکر بھی فرمایا ہے کوئی شخص اگر نذر مان لے بشرطیکہ گناہ کی نذر نہ ہو تو وہ لازم ہو جاتی ہے نذر مطلق بھی ہوتی ہے اور معلق بھی، مطلق یہ کہ یوں زبان سے کہے کہ اللہ کے لیے ایک روزہ رکھوں گا یا دو دو (۲) رکعت نماز پڑھوں گا یا نفلی صدقہ کروں گا اور نذر معلق یہ ہے کہ یوں کہے کہ میرا بیٹا اچھا ہو جائے تو اتنے نفل پڑھوں گا یا اتنے مسکینوں کو کھانا کھلاؤں گا یا سو (۱۰۰) روپے صدقہ کروں گا، دونوں طرح کی نذر کرنے سے نذر کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ (انوار البیان)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نذر ماننے سے منع فرمایا اور فرمایا کہ وہ کسی چیز کو دفع نہیں کر سکتی اور ہوتا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ بخیل سے کوئی چیز نکال لی جاتی ہے۔ (بخاری) نذر ماننا مناسب تو نہیں جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوا لیکن اگر کوئی شخص نذر مان لے تو اسے پورا کرے، البتہ اگر گناہ کی نذر مانی ہو تو اس کو پورا نہ کرے لیکن اس کا کفارہ ادا کرے جو قسم کا کفارہ ہے وہی نذر کی خلاف ورزی کا بھی کفارہ ہے۔ (انوار البیان) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کی اطاعت کی نذر مانے وہ اللہ کی اطاعت کرے اور جو

شخص معصیت کی نذر مان لے وہ اللہ کی نافرمانی نہ کرے (بخاری) یعنی گناہ کی نذر ماننے کی وجہ سے یہ نہ سمجھے کہ مجھے گناہ کرنا ہی ہے بلکہ اپنی نذر کی خلاف ورزی کرے اور کفارہ دے دے۔ (انوار البیان)

فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ: تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے کہ تم نے کس نیت کے ساتھ منت مانی ہے نذر جائز ہے یا ناجائز، تم لوگوں کو دھوکا دے سکتے ہو کہ فلاں کام فلاں نیت سے کیا ہے، مگر اللہ تعالیٰ تو تمہارے دلوں کے رازوں سے واقف ہے، وہ تمہاری ظاہر اور پوشیدہ سب باتوں کو جانتا ہے۔ (معالم العرفان)

وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ: اللہ تعالیٰ ظالموں کا مددگار نہیں ہے، اس میں ظالموں کے لیے سخت وعید آئی ہے، یہ ظالم دو قسم پر ہیں، ایک وہ جو اپنی جان پر ظلم کرتے ہیں، اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہر وہ شخص ہے جو تمام تر معاصی اور گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص ظالم ہے جو دوسروں پر ظلم کرتا ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ مستحقین پر مال خرچ نہیں کرتا، اسی طرح اپنی جان پر ظلم اس طرح کرتا ہے کہ اگر مال خرچ کرتا ہے تو دکھلاوے اور شہرت کی خاطر کرتا ہے، یا اس انفاق کو گناہوں کی وجہ سے برباد کر دیتا ہے۔ اہل تفسیر فرماتے ہیں کہ یہ بھی ظلم ہے کہ صدقہ جس جگہ پر کیا جانا چاہیے وہاں تو نہ کرے اور کسی اور جگہ پر کر دے، حرام مال کو صدقہ کرنا بھی ظلم ہے۔

صدقات سے کچھ گناہ مٹ جاتے ہیں

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

إِن تُبْدُواْ الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاء فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّئَاتِكُمْ وَاللّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ {۲۷۱} البقرۃ

جواب ترجمہ: اگر تم خیرات ظاہر کر کے دو تو بھی اچھی بات ہے اور اگر اسے چھپا کر دو اور فقیروں کو پہنچا دو تو تمہارے حق میں وہ بہتر ہے اور اللہ تمہارے کچھ گناہ دور کر دے گا اور اللہ تمہارے کاموں سے خوب خبر رکھنے والا ہے۔

شان نزول: حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ پوشیدہ طور پر صدقہ کرنا افضل ہے یا اعلانیہ صدقہ کرنا افضل ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (کبیر) حضرت شعبیؒ سے مروی ہے کہ یہ آیت إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آدھا مال لوگوں کے سامنے لے کر آئے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ سارا مال لے کر آئے قریب تھا کہ اس کو اپنے دل سے خفیہ رکھتے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھ لیا (اے ابو بکر) اپنے اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑا؟ تو انہوں نے عرض کیا عِدَّةُ اللهِ وَعِدَةُ رَسُولِهِ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ چھوڑا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا مَا سَبَقْنَاكَ إِلَى بَابِ خَيرٍ قَطُّ إِلَّا سَبَقْتَنَا إِلَيْهِ خیر کے کاموں میں ہم آپ سے کبھی بھی آگے نہیں بڑھ سکے۔ (ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، الترغیب للاصفہانی، ابن عساکر، در منثور)

جمہور مفسرین کا موقف یہ ہے کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں ہے کیونکہ اس میں اظہار کی نسبت اخفاء افضل ہے اور اسی طرح تمام نفلی عبادات میں اخفا افضل ہوتا ہے کیونکہ اس طرح ریا ان سے دور رہتا ہے اور واجبات میں اس طرح نہیں ہے، حسن نے کہا ہے، زکوٰۃ میں اظہار احسن ہے اور نفل میں اخفا افضل ہے کیونکہ یہ اس پر زیادہ دلالت کرتا ہے کہ اس سے ارادہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے نفل میں سری صدقہ کو اعلانیہ صدقہ پر فضیلت دی ہے کہا جاتا ہے کہ وہ ستر گنا ہے اور فرضی صدقہ میں اعلانیہ کو سری پر فضیلت دی گئی ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ پچیس گناہ ہے، فرمایا: تمام اشیاء میں جمیع فرائض اور نوافل اسی طرح ہیں۔ (تفسیر قرطبی)

اس آیت شریفہ میں صدقات دینے کے بارے میں ایک بہت اہم بات ذکر فرمائی ہے اور وہ صدقات ظاہر کرکے دینے اور چھپا کر دینے کے متعلق ہے اول تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ریاکاری جس کا نام ہے وہ خواہ مخواہ چپکتی نہیں پھرتی وہ تو نیت اور ارادہ کا نام ہے، جو کوئی شخص نماز پڑھے یا ذکر کرے یا

زکوٰۃ دے یا صدقہ نافلہ دے اور اس کی نیت یہ ہو کہ لوگ مجھے نیک سمجھیں، میرا نام ہو، میری شہرت ہو تو یہ ریاکاری ہو گی اور گناہ ہو گا جس سے اعمال اکارت ہو جائیں گے، لیکن اگر کوئی شخص صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جانی و مالی عبادت کرے چاہے لوگوں کے سامنے ہی ہو اور اس سے نام و نمود شہرت مقصود نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ اگر یہ نیت ہو کہ لوگوں کے سامنے عمل کرنے سے دوسروں کو بھی ترغیب ہو گی تو اس نیت کا مستقل ثواب ملے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ بیان فرمایا کہ میں اپنے گھر کے اندر اپنی نماز کی جگہ نماز پڑھ رہا تھا کہ آدمی داخل ہوا اس نے مجھے دیکھ لیا اس کے آنے سے مجھے یہ بھلا معلوم ہوا کہ اس نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ عرض کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوہریرہ! تجھ پر اللہ کی رحمت ہو اس میں تیرے لیے دو اجر ہیں، پوشیدہ عمل کرنے کا اجر بھی اور ظاہراً عمل کرنے کا اجر بھی۔ (ترمذی، انوار البیان)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو یہ بیان کیا کہ مجھے یہ بھلا معلوم ہوا کہ اس نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اس کے بیان کرنے میں یا تو ان کا یہ مطلب تھا کہ میرے نفس میں ریاکاری کا وسوسہ آگیا کہ مجھے ایک آدمی نے تنہائی میں نماز پڑھتے دیکھ لیا یا یہ مطلب تھا کہ نفس کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ یہ جو آدمی آیا ہے یہ میرا عمل دیکھ کر خود بھی عمل کرے گا، بہر حال جو بھی صورت ہو آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دوہرے اجر کی خوشخبری دی، اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ ریا لوگوں کے سامنے عمل کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تو اندر کے اس جذبہ کا نام ہے کہ لوگ میرے معتقد ہوں اور مجھے اچھا کہیں اور عبادت کی وجہ سے میری تعریف ہو۔ (انوار البیان)

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ: اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ اگر تم صدقات ظاہر کر کے دے دو تو یہ بھی اچھی بات ہے، جب نیت خالص ہے اور اللہ کی رضا مقصود ہے تو یہ ادائیگی ریاکاری نہ رہی اور اس میں اس فائدہ کی امید ہے کہ دوسروں کو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب ہو گی پھر فرمایا **وَإِنْ**

تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اور اگر تم صدقات کو چھپا کر دو تو یہ تمہارے لیے ظاہر کر کے دینے سے زیادہ بہتر ہے، ظاہر کر کے دینے کو اچھی بات بتایا اور چھپا کر دینے کو زیادہ بہتر بتایا، کیونکہ چھپا کر دینے میں احتمال ریا کا ختم ہو جاتا ہے اور نفس کے پھولنے کا احتمال باقی نہیں رہتا اور اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جس کو صدقہ دیا جائے وہ تنہائی میں لینے سے شرماتا نہیں اور اپنی خفت بھی محسوس نہیں کرتا۔

الفاظ آیت کے عموم سے معلوم ہو رہا ہے کہ چھپا کر دینا ہی زیادہ بہتر ہے, بعض حالات کے اعتبار سے لوگوں کے سامنے خرچ کرنا زیادہ باعث فضیلت ہو جائے وہ دوسری بات ہے مثلاً کسی جگہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا رواج نہیں ہے لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے ہیں فریضہ زکوٰۃ زندہ کرنے اور اس کا رواج ڈالنے کے لیے لوگوں کے سامنے دے یا کوئی ایسا شخص ہو جس کی اقتداء میں لوگوں کو خرچ کرنے کی طرف توجہ ہو گی تو ایسی صورت میں لوگوں کے سامنے دینے اور خرچ کرنے میں چھپا کر دینے سے زیادہ ثواب ہو سکتا ہے اصل چیز اخلاص نیت ہے اور نفس پر قابو پانا چونکہ ہر شخص کے بس کا نہیں ہے اس لیے چھپا کر خرچ کرنے کو زیادہ بہتر اور افضل بتایا ہے۔

بہت سے لوگ دیتے تو تنہائی میں ہیں لیکن اخبارات کے ذریعے شہرت حاصل کرتے ہیں اور مساجد و مدارس کی روئیدادوں میں اپنا نام لانے کی کوشش کرتے ہیں اور بڑے بڑے القاب و آداب کے ساتھ اپنا نام چھپنے کے انتظار میں رہتے ہیں۔ تنہائی میں دینے کا کیا فائدہ ہوا؟ جبکہ دل میں ریاکاری کی موجیں اٹھ رہی ہیں، عمل ظاہر میں کرے یا پوشیدہ کرے صرف اللہ کی رضا مقصود ہو اور عمل کی جو خوبی ظاہر میں ہو وہی پوشیدہ حالت میں ہو تو یہ دلیل اخلاص ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ جب لوگوں کے سامنے نماز پڑھتا ہے اور اچھی طرح نماز پڑھتا ہے اور پوشیدہ طور پر نماز پڑھتا ہے تب اچھی نماز پڑھتا ہے تو اللہ جل شانہ فرماتے ہیں کہ واقعی یہ میرا بندہ ہے۔ (مشکوٰۃ، انوار البیان)

وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ: تکفیر لغت میں ڈھانپنے اور چھپانے کو کہتے ہیں، عربی محاورے میں رَجُلٌ مُكَفَّرٌ فِي السِّلَاحِ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص اسلحہ میں چھپا ہوا ہو، اسی طرح عربی محاورے میں کہا جاتا ہے كَفَّرَ عَنْ يَمِينِهِ یعنی اس نے اپنی قسم توڑنے کے گناہ کو چھپالیا صدقہ دے کر، کفارہ اس پردے کو کہا جاتا ہے جو انسان کے گناہ کو چھپالیتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سارے گناہوں کو مٹادیں گے جب کہ بعض فرماتے ہیں کہ من سے پتہ چلتا ہے کہ سارے گناہ نہیں بلکہ بعض گناہ مٹادیے جائیں گے، تاکہ لوگ اپنے گناہوں سے ڈرتے رہیں اور اسی پر بھروسہ کرکے نہ بیٹھ جائیں، بعض فرماتے ہیں کہ سیئات سے یہاں مراد چھوٹے گناہ ہیں۔ (خازن)

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ: تم صدقات کو علی الاعلان دو یا پوشیدہ کرکے دو اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی تم کرو گے اللہ کو اس کی خبر ہے، اس میں علانیہ صدقہ کرنے کی بجائے چھپ چھپا کر صدقہ کرنے کی فضیلت کی طرف اشارہ دیا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پوشیدہ اور علانیہ ہر دو حالتوں کو جانتے ہیں، جب کہ تم لوگ صدقہ کرنے کے بدلے اللہ کی رضا چاہتے ہو تو تمہارا مقصود تو تمہیں پوشیدہ صدقہ کرنے سے حاصل ہوگا، گویا کہ انہیں ریاء اور دکھاوے سے دور رہتے ہوئے مخفی طور پر صدقہ کرنے کی ترغیب دی گئی۔

اللہ کی رضاجوئی کے لیے خرچ کرنا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (۲۷۲) البقرہ

جواب ترجمہ: آپ کے ذمہ نہیں ہے ان کی ہدایت، لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور

جو کچھ بھی اچھا مال تم خرچ کرتے ہو تو وہ تمہاری جانوں کے لیے ہے، اور تم نہیں خرچ کرتے ہو مگر اللہ کی رضا کے لیے، اور جو کچھ بھی خرچ کرو گے اچھا مال وہ پورا پورا تمہیں دے دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

شانِ نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ صحابہ مشرکین رشتہ داروں کو صدقہ دینا ناپسند کرتے تھے تو انہوں (اس کے بارے میں) سوال کیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ الخ تو ان کے لیے رخصت دے دی گئی۔ (نسائی، البزار، ابن جریر، طبرانی، حاکم، در منثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں صرف مسلمانوں پر صدقہ کرنے کا حکم فرماتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ الخ اس کے بعد ہم کو ہر دین والوں میں سے سوال کرنے والے کو صدقہ دینے کا حکم فرمایا۔ (ابن ابی حاتم، ابن مردوی، المختارہ للضیاء، در منثور) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکوں پر صدقہ نہیں کرتے تھے تو یہ آیت لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ الخ نازل ہوئی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر صدقہ فرمایا۔ (ابن جریر، ابن المنذر، در منثور) حضرت ابن الحنفیہ سے مروی ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مشرکین پر صدقہ کرنے کو ناپسند کرتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ الخ نازل فرمائی تو پھر لوگوں نے ان پر بھی صدقہ کیا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، در منثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انصار میں سے (بعض) لوگوں کی (یہودیوں کے قبائل) قریظہ اور نضیر سے رشتہ داریاں تھیں تو وہ لوگ ان پر صدقہ کرنے سے بچنے لگے اور وہ اس بات کا ارادہ کرتے تھے کہ یہ لوگ مسلمان ہو جائیں تو اس پر یہ آیت لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ الخ نازل ہوئی۔ ابن جریر، در منثور)

حضرت قتادہؒ سے مروی ہے کہ ہمیں یہ بات بتائی گئی کہ صحابہ کرامؓ میں کچھ لوگوں نے پوچھا کیا ہم ایسے شخص پر صدقہ کریں جو ہمارے دین میں سے نہیں ہے؟ تو اس پر یہ آیت لَيْسَ عَلَيْكَ

هُدَاهُمْ الخ نازل ہوئی۔ (عبد بن حمید، ابن جریر، در منثور)

ایک شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر صدیق کی والدہ قتیلہ اوران کی دادی دونوں حضرت اسماء کے پاس کچھ مانگنے کے لیے آئیں اور یہ دونوں مشرکہ تھیں، تو حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر صدیق نے ان دونوں سے کہا کہ میں تم دونوں کو اس وقت تک کچھ نہیں دوں گی جب تک میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھ نہ لوں کیونکہ تم دونوں ہمارے دین پر نہیں ہو، چنانچہ حضرت اسماءؓ نے نبی کریم ﷺ سے اس بارے میں پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم ان دونوں کو صدقہ دے دو۔ (تفسیر کبیر للرازی)

مختلف روایات میں بیان کیے گئے سبب نزول کو پیش نظر رکھنے کے لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ہدایت پر لانا، سیدھی راہ پر لانا آپ ﷺ کا کام نہیں ہے کہ صدقہ روک کر لوگوں کو اسلام پر لانے کی کوشش کی جائے یا کوئی صورت پیدا کی جائے، نفلی صدقات مسلمانوں کو جس طرح دیے جاسکتے ہیں اسی طرح غیر مسلم ضرورت مندوں کو بھی دیے جاسکتے ہیں اور اس میں بھی ثواب ہے اسلام قبول کرنا نہ کرنا ان کا کام ہے، اسلام قبول کرلیں گے تو ان کا فائدہ ہے، دنیا جہان کی عزت ملے گی، اگر نہیں قبول کرتے تو ان کی مرضی ہے۔

جس طرح یہاں مشرکین اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کو صدقہ دینے کی اجازت دی گئی، اسی طرح قرآن کریم کی سورۃ الممتحنہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنة ۸) اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ بہت محنت و کوشش فرماتے تھے اور اہل کفر کو حق کی دعوت دیتے تھے۔ وہ

لوگ جب قبول نہیں کرتے تھے تو آپ ﷺ کو طبعی طور پر رنج ہوتا تھا، آپ ﷺ کی تسلی کے لیے آیات نازل ہوتی تھیں، ایسی آیات قرآن کریم میں کئی جگہ موجود ہیں انہی میں سے ایک یہ آیت بھی ہے کہ آپ کا کام راہ دکھانا ہے۔ صحیح بات بتانا ہے، حق کا قبول کرانا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہادی ہے، وہ جس کو چاہے، ہدایت دے، آپ کو غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ (انوار البیان)

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ: یہاں پر خطاب خاص نبی کریم ﷺ کو ہے جب کہ اس سے مراد عام ہے، تمام اہل اسلام کو یہ خطاب ہے، آپ پر ان کی ہدایت کی ذمہ داری نہیں ہے (کہ جس طریق سے بھی ممکن ہو لوگوں کو مسلمان کرو پھر آپ یہ تدبیریں کیوں کرتے ہیں اور اگر آپ یہ تدبیریں کریں بھی تب بھی آپ ان کو ہدایت نہیں کر سکتے) (حل القرآن للتھانویؒ)

مسلمانوں کو بتایا گیا کہ آپ پر ان کے اسلام لانے کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور اگر آپ ان غریب کافروں پر بھی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے کچھ خرچ کریں گے تو اس کا بھی پورا پورا ثواب ملے گا۔ (ترجمان القرآن لمولانا آزادؒ) (اپنی مشیت تکوینی کے ماتحت و مطابق) رسول ﷺ کا کام صرف تبلیغ ہے، یعنی ہدایت کا پیام دنیا تک پہنچا دینا، باقی کس کو قبول حق کی توفیق ہوتی ہے اور کس کو نہیں، اس کا تعلق تمام تر مشیت الٰہی سے ہے۔ (تفسیر ماجدی)

پیغمبر یا رسول کا کام صرف اعلان حق ہے ماننا نہ ماننا لوگوں کا اختیار ہے اس آیت میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ جب یہ توفیق صحیح سے محروم ہیں تو تیرے احاطہ اختیار سے باہر ہے کہ تو انہیں ہدایت دے دے، راہنمائی تو فرائض نبوت میں ہے، مگر شرح صدر اور توفیق یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ اس کو عطا ہوتی ہے جو اس کے حصول کی کوشش کرے۔ (سراج البیان)

سو ہدایت پیغمبر ﷺ کے اختیار میں نہیں ہوتی، پیغمبر کا کام تو صرف انذار و تبشیر اور دعوت و تبلیغ ہے اور بس، لوگوں کو راہ حق پر ڈال دینا اور حق کو ان سے منوا لینا نہ ان کے ذمے ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے بس میں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کام اور اسی کی شان ہے کہ اس کا اصل تعلق انسان کے قلب و باطن

سے ہے اور قلب و باطن کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور وہی جان سکتا ہے کہ کون کس کے لائق ہے۔ (تفسیر مدنی)

وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ: دل اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اللہ کی مخلوق میں سے یہ بات کسی کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ کسی کو ہدایت دے یا گمراہ کر دے، ہدایت دینا یا گمراہ کرنا اللہ وحدہ کی ذات کا کام ہے، اس لئے کہ وہ دلوں کا خالق ہے، دلوں پر صرف اللہ کی حکمرانی ہے، صرف اللہ ہی دلوں کو موڑ سکتا ہے، وہی ہے جو دلوں کو حکم دے سکتا ہے، رسول ﷺ کا کام صرف یہ ہے کہ وہ پیغام اچھی طرح پہنچا دے، رہی ہدایت تو یہ صرف اللہ کا کام ہے، وہ جسے چاہے ہدایت دے کیونکہ وہی ہدایت دینے والا ہے۔

ہدایت دینا صرف اللہ کا کام ہے، انسان سے اس استحقاق کو لے لینا، محض اس لئے ہے کہ ایک مومن طلب ہدایت کے لئے صرف اللہ کی طرف رجوع کرے اور وہ صرف اللہ ہی سے دلائل اخذ کرے، اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس استحقاق کو صرف خاصہ خدا قرار دینے کے بعد اب ایک داعی کے لئے یہ جواز باقی نہیں رہتا کہ وہ گمراہ لوگوں کے ساتھ نفرت کرے یا ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے دلی تنگی محسوس کرے، اس لئے کہ وہ انہیں مسلسل دعوت دیتا رہے گا، ان کے ساتھ رحیمانہ برتاؤ کرے گا اور اس بات کا انتظار کرے گا کہ کب اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ راہ راست پر آجائیں کب انہیں توفیق بخشتا ہے کہ وہ اس سمت قدم اٹھائیں اور اپنے اللہ کو پہچانیں۔ (فی ظلال القرآن للقطب)

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ: جو مال بھی نیک کاموں میں خرچ کرو گے اس کا نفع تم ہی کو ہو گا، لہٰذا صدقہ و خیرات کر کے لوگوں پر احسان جتلا کر اور انہیں تکلیف پہنچا کر، دکھلاوا کر کے اسے ضائع نہ کرو یا یہ مطلب ہے کہ فقراء کو دے دیا کرو، خواہ وہ کافر ہی ہوں تمہیں ثواب ملنے سے مطلب ہے۔

وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ: کہ تم تو صرف اللہ کی رضا ہی کے لیے خرچ کرتے ہو، لہٰذا ان

آداب کی رعایت کرو جن سے اللہ کی رضا حاصل ہو اور ان اعمال سے بچو جن سے اللہ کی ناراضگی ہوتی ہو اور جن سے صدقات باطل ہو جاتے ہوں۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ نفی نہی کے معنی میں ہے یعنی تم نہ خرچ کرو مگر اللہ کی رضا کے لیے۔ (انوار البیان)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مومن جب خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے ہی خرچ کرتا ہے۔ (ابن کثیر) حضرت عطاء خراسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب آپ کسی کو کچھ دیں تو اللہ کی رضا کے لیے دیں قطع نظر اس کے کہ اس کا عمل کیا ہے اور کیسا ہے؟ صدقہ کرنے والا جب اللہ کی رضا جوئی کے لیے صدقہ کرتا ہے تو اس کو اللہ کی طرف سے اجر و ثواب ملتا ہے، کسی کے نیک یا بد ہونے، کسی کے مستحق یا غیر مستحق ہونے کی وجہ سے اجر نہیں ملتا بلکہ اسے اجر و ثواب تو اس کے ارادے اور نیت کے مطابق ملتا ہے، اس لیے ارادہ اور نیت درست رکھتے ہوئے اس کی مخلوق کو دینا چاہیے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ : یعنی جو مال بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا اور ذرا سی بھی کمی نہ ہو گی اس میں پچھلے جملہ کی تاکید ہے۔ اور بعض مفسرین نے اس کا یہ معنی بتایا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے خرچ کرنے کے بعد مزید مال عطا فرمائے گا، بحکم حدیث اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا یہ معنی لینا بھی بعید نہیں ہے۔ (روح المعانی، انوار البیان) اللہ تعالیٰ کے خزانے بھرے ہوئے ہیں وہ ساری کائنات کے لوگوں کو ان کی منشاء اور طلب پر بھر بھر کر عطا کرے پھر بھی اس کے خزانوں میں کمی واقع نہیں ہو گی۔

اللہ کا کام کرنے والوں پر خرچ کا حکم

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ

اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ (۲۷۳) البقرہ

جواب ترجمہ: صدقات فقراء کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں روکے ہوئے ہیں وہ زمین میں سفر نہیں کرسکتے۔ سوال سے بچنے کے سبب انجان آدمی انہیں مالدار سمجھتا ہے، تو انہیں پہچان لے گا ان کی نشانی سے، وہ لوگ لپٹ کر لوگوں سے سوال نہیں کرتے، اور جو بھی کچھ تم خرچ کروگے، اچھا مال سو اللہ اس کو جاننے والا ہے۔

لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ راہ خدا میں روکے جانے فقرا سے مراد اصحاب صفہ ہیں۔ (ابن المنذر، در منثور) حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اصحاب صفہ فقراء تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو اس کو چاہیے کہ وہ تیسرے کو ساتھ لے جائے۔ (بخاری، مسلم) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اہل صفہ کے ساتھ مل جاؤ، ان کو بلاؤ، پھر فرمایا، صفہ والے اسلام کے مہمان ہیں، یہ اہل وعیال کی آرزو رکھتے ہیں اور نہ ہی مال کی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی صدقہ آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بھیج دیتے اور اس میں سے خود نہ کھاتے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ہدیہ آتا تو بھی ان کے پاس بھیج دیتے اور اس میں خود بھی کھالیتے۔ (بخاری)

ابن عبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز پڑھاتے تو کچھ لوگ بھوک کی وجہ سے نماز میں کھڑے کھڑے گر جاتے اور وہ اہل صفہ تھے یہاں تک کہ بدو لوگ ان کو دیوانہ کہتے۔ (حلیۃ الاولیاء) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اہل صفہ ستر آدمی تھے اور ان میں سے کسی ایک کے پاس (اوڑھنے کے لیے) ایک چادر بھی نہیں تھی۔ (حلیۃ الاولیاء، زوائد الزھد)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صفہ (چبوترہ) غریب مسلمانوں کے لیے بنایا گیا تھا تو مسلمان ان کی طرف اپنی طاقت کے مطابق صدقات بھیجتے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (جب) ان کے پاس تشریف لاتے تو فرماتے السلام علیکم! اے صفہ والو! وہ لوگ کہتے وعلیکم السلام یا رسول اللہ! پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم

فرماتے تم لوگوں نے کس حال میں صبح کی، وہ عرض کرتے یارسول اللہ! خیر کے ساتھ صبح کی پھر آپ ﷺ فرماتے تم لوگ آج کے دن بہتر ہو یا اس دن صبح کو تمہارے پاس (کھانے کا) پیالہ ہو گا اور شام کو دوسرا پیالہ ہو گا، صبح کو تم ایک جوڑے میں ہوں گے اور شام کو دوسرے جوڑے میں ؟ تو اصحاب صفہ نے عرض کیا ہم اس دن بھی خیر میں ہوں گے ہم کو اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے اور ہم اس کا شکر ادا کریں گے (پھر) رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ آج کے دن تم خیر میں ہو۔ (حلیۃ الاولیاء)

شان نزول: علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت فقراء مہاجرین کے بارے میں نازل ہوئی، وہ لوگ چار سو کے قریب تھے، یہ اصحاب صفہ تھے، ان کے پاس مدینہ شریف میں نہ کوئی جائے سکونت تھی اور نہ رہائش گاہیں، وَكَانُوا مُلَازِمِينَ الْمَسْجِدَ، وَيَتَعَلَّمُونَ الْقُرْآنَ، وَيَصُومُونَ وَيَخْرُجُونَ فِي كُلِّ غَزْوَةٍ، یہ لوگ مسجد کو ہی اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے، قرآن کریم سیکھتے تھے، روزے رکھتے تھے، یہ وہ لوگ ہیں جو ہر غزوہ میں جاتے تھے

ایک دن نبی کریم ﷺ اصحاب صفہ کے پاس کھڑے ہو گئے، ان کی حالت زار دیکھی تو انہیں خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا کہ أَبْشِرُوا يَا أَصْحَابَ الصُّفَّةِ فَمَنْ لَقِيَنِي مِنْ أُمَّتِي عَلَى النَّعْتِ الَّذِي أَنْتُمْ عَلَيْهِ رَاضِيًا بِمَا فِيهِ فَإِنَّهُ مِنْ رِفَاقِي اے اصحاب صفہ! خوش ہو جاؤ، جو شخص میری امت میں سے اس صفت پر میرے ساتھ ملاقات کرے جس پر تم ہو، جو کچھ اس میں ہو اس پر راضی ہو تو وہ میرے رفقاء میں سے ہو گا۔ (تفسیر کبیر)

فقراء کی پانچ صفات: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان عظیم صفات والے فقراء کی پانچ صفات بیان فرمائی ہیں۔ پہلی صفت: الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ، اِحصار لغت میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جو آدمی اور اس کے سفر کے درمیان حائل ہو، کوئی بیماری، بڑھاپا، کوئی دشمن، خرچ کا ختم ہو جانا یا اس طرح کی کوئی اور چیز، محصر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو حالت احرام میں روک دیا گیا ہو، یہاں جن لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ ان لوگوں کو اللہ کی راہ میں روکا گیا ہے، کس طرح

روکا گیا ہے؟

ان لوگوں نے اپنے آپ کو روکا ہے اور جہاد پر کھڑے ہو گئے، لفظ فی سبیل اللہ قرآنی عرف میں جہاد کے ساتھ مختص ہے، اس لیے کہ جہاد اس زمانے میں واجب تھا، اور سخت ترین ضرورت اس وقت یہ تھی کہ وہ لوگ جہاد کے لیے رسول کریم ﷺ کے ساتھ اپنے کو روک کر رکھتے، تو یہ لوگ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تیار رہتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان فقراء کی اس صفت کو یہاں بیان فرمایا ہے، اس لیے یہ لوگ صدقہ کے مستحق قرار پائے۔

انہیں صدقہ پیش کرنا خیر کے کاموں میں سے ایک کام ہے، انہیں صدقہ دینے سے ان کے فقر کا ازالہ ہو گا، انہیں صدقہ دینے سے ان کے دلوں کو تقویت ملے گی، انہیں صدقہ دینے سے اسلام کو استحکام ملے گا، انہیں صدقہ دینے کی ترغیب دی جارہی ہے کہ انہیں اس کی بہت شدید ضرورت ہے حالانکہ وہ اپنی حاجت ومحتاجی کو ظاہر نہیں کرتے، یہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے، اس لیے ان کے احوال سے ناواقف لوگ انہیں مالدار خیال کرتے ہیں۔

پھر ان لوگوں نے اپنے کو اس طرح روک رکھا ہے کہ معاش کی خاطر تجارت میں مصروف نہیں ہوتے، اس لیے کہ انہیں دشمن کا خوف دامن گیر ہوتا ہے، کیونکہ کفار مدینہ شریف کے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے جہاں یہ لوگ ملتے پھر وہ ان سے لڑائی کرتے تھے، پھر ان لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ بھی تھا کہ یہ لوگ زخموں سے چور چور تھے، نبی کریم ﷺ کی معیت میں میدان کارزار میں انہوں نے زخم اٹھائے تھے، اس بناء پر یہ زمین میں چل پھر نہیں سکتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ یہ وہ لوگ تھے جو اللہ کے ذکر، اس کی اطاعت اور بندگی میں مشغول تھے، شدت کے ساتھ اطاعت میں مستغرق ہونے نے انہیں تمام مہم کاموں میں مشغول ہونے سے روک دیا تھا۔ (ملخص از تفسیر کبیر)

دوسری صفت: ان لوگوں کی دوسری صفت بیان کی گئی، لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ ضرب کا معنیٰ ہوتا ہے زمین میں چلنا، یہ لوگ زمین میں چلنے پھرنے کی استطاعت نہیں رکھتے، جہادی کاموں

میں مشغولیت اور مصروفیت کی بناء پر یہ لوگ کاروبار، تجارت اور کسب معاش میں مشغول نہیں ہو سکتے، جہاد فی سبیل اللہ کاروباری مشغولیات سے انہیں روکتا ہے، دشمنوں کی ریشہ دوانیاں اور منصوبہ بندیاں بھی ان کے سفر میں رکاوٹ ہیں، ان کی بیماری اور ان کی معذوری انہیں سفر سے روکتی ہے، ان حالات میں انہیں شدت سے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ان کی ضرورتوں کو پورا کریں۔

تیسری صفت: ان لوگوں کی تیسری صفت بیان کی گئی کہ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ سوال سے بچنے کے سبب انجان آدمی انہیں مالدار سمجھتا ہے، تعفف یہ عفت سے ہے، عفت کا معنٰی ہے کسی چیز کو چھوڑنا، کسی چیز سے باز رہنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سوال کرنے سے بچتے ہیں، سوال نہیں کرتے، دست سوال دراز نہیں کرتے، جہلاء انہیں مالدار اس لیے سمجھتے ہیں کہ وہ مانگتے نہیں ہیں، وہ لوگوں کے سامنے اپنی حاجات پیش نہیں کرتے ہیں۔

صاحب انوار البیان فرماتے ہیں یہ لوگ مخلوق کے سامنے سوال کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اس وجہ سے انجان آدمی جسے ان کا اندرونی حال معلوم نہیں ہے انہیں مالدار سمجھتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ دینی کاموں میں لگے ہوئے ہیں جنہیں کمانے کی فرصت نہیں وہ مخلوق سے بالکل بے نیاز ہو کر کام کریں کسی کے سامنے کوئی حاجت نہ رکھیں ایسے بے نیاز ہو کر رہیں کہ جنہیں ان کا حال معلوم نہ ہو وہ ان کی بے نیازی کو دیکھ کر انہیں مالدار سمجھیں۔

ہاں دوسرے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ خرچ کرنے کی صحیح جگہ پہنچیں اور ایسے حاجت مندوں کا پتہ چلائیں، اور در حقیقت اصل مسکین وہی ہے جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ وہ مسکین نہیں ہے جو لوگوں کے پاس گھومتا پھرتا ہے اسے ایک لقمہ اور دو لقمے اور ایک کھجور اور دو کھجوریں در بدر پھراتی ہیں لیکن واقعی مسکین وہ ہے جسے اتنا مقدور نہیں جو اسے بے نیاز کر دے اور اس کا پتہ بھی نہیں چلتا تاکہ اس پر خرچ کر دیا جائے اور وہ لوگوں سے سوال کرنے کے لیے بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ (بخاری، انوار البیان)

چوتھی صفت: ان لوگوں کی چوتھی صفت بیان کی گئی کہ تَعۡرِفُهُمۡ بِسِيمَاهُمۡ آپ ایسے لوگوں کو تو ان کی نشانی سے پہچان لیں گے، عربی میں سیما اور سیمیا اس نشانی کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے کوئی چیز پہچانی جائے، یہ لفظ اَلسِّمَۃُ سے ہے جس کا معنیٰ علامت اور نشانی ہے، مفسر قرآن حضرت مجاہد فرماتے ہیں ان لوگوں کی علامت اور نشانی خشوع اور تواضع ہے۔

حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ بھوک کی وجہ سے ان کی رنگت کا پیلا پن مراد ہے، ابن زید کہتے ہیں کہ ان کے لباس کی پراگندگی اور بھوک کی نشانی مراد ہے، علامہ رازی رحمہ اللہ کے نزدیک اس سے ایک اور چیز مراد ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کے لیے اللہ کی مخلوق کے دلوں میں ایک ہیبت اور وقعت ہوتی ہے، جو شخص انہیں دیکھتا ہے وہ ان سے متأثر ہو جاتا ہے، ان کے لیے ادب سے جھک جاتا ہے، یہ روحانی ادراکات ہیں نہ کہ جسمانی علتیں، کیا آپ نہیں جانتے کہ جب شیر گزرتا ہے تو سارے درندے اپنی طبعیتوں کے مطابق اس سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں نہ کہ تجربہ کی وجہ سے، کیونکہ بظاہر یہ تجربہ ہوا ہی نہیں۔

اسی طرح باز جب اڑتا ہے تو کمزور پرندے اس سے بھاگتے ہیں، یہ سب کے سب روحانی ادراکات ہیں نہ کہ جسمانی، اسی طرح یہاں بھی ہے، اس باب میں نماز کے اندر خشوع کے اثرات کا پایا جانا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مناقب کے دوران ارشاد فرمایا کہ ان کی پیشانیوں میں نشانہائے سجدہ ہیں، اسی طرح فکر کے اثرات کا ظاہر ہونا ہے، مروی ہے کہ یہ لوگ رات کو تہجد کے لیے بیدار ہوتے تھے اور دن کے اجالے میں لوگوں سے سوال نہ کرنے کے لیے لکڑیاں چنا کرتے تھے۔

پانچویں صفت: ان لوگوں کی پانچویں صفت یہ بیان کی گئی کہ لَا يَسۡـَٔلُونَ ٱلنَّاسَ إِلۡحَافٗا یہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عفیف ہیں اور متعفف کو پسند کرتے ہیں، اور بدگو، لپٹ کر سوال کرنے والے کو ناپسند کرتے ہیں کہ اگر اسے وافر

مقدار میں دیا جائے تو تعریف وستائش کے پل باندھ دے اور اگر تھوڑا ملے تو برائیوں کے پل باندھ دے۔ حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

لَا يَفْتَحُ أَحَدٌ بَابَ مَسْأَلَةٍ إِلَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ، وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ، وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ تَعَالَى، لَأَنْ يَأْخُذَ أَحَدُكُمْ حَبْلًا يَحْتَطِبُ فَيَبِيعُهُ بِمُدٍّ مِنْ تَمْرٍ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ النَّاسَ جو شخص سوال کا دروازہ کھولتا ہے اللہ اس پر فقر کے دروازہ کھول دیتا ہے اور جو بے نیازی اختیار کرتا ہے اللہ اسے مالدار کر دیتا ہے، جو بچتا ہے اللہ اسے بچاتا ہے، تم میں کوئی شخص ایک رسی لے کر لکڑیوں کا گٹھا بنائے پھر اسے ایک مد کھجور کے بدلے میں بیچ ڈالے یہ اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے۔ (تفسیر کبیر)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا لپٹ کر سوال نہ کرو اللہ کی قسم تم میں سے کوئی ایک مجھ سے سوال نہیں کرتا کہ اس کا سوال مجھ سے کوئی چیز نکال دے اور میں اس کو ناپسند کرنے والا ہوتا ہوں تو اس کے لیے اس مال میں جو میں نے دیا برکت ڈال دی جائے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ (مسند احمد) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لپٹ کر سوال نہ کرو جو اس طریقہ پر ہم سے لے گا اس میں برکت نہ ہوگی۔ (ابو یعلیٰ)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ یہ مال ہرا بھرا اور میٹھا ہے جس شخص کو ہم اس میں سے کوئی چیز اپنے دل کی خوشی سے دیں اور اس کی طرف سے عمدہ طلب ہو لالچ کی بنا پر نہ ہو تو اس میں برکت دی جائے گی اور جس شخص کو ہم اس دنیا میں عطا کریں دل کی خوشی کے بغیر اور اس کی طرف سے اچھی طلب نہ ہو اور اس کا دل لالچ کر رہا ہو تو اس میں ان کے لیے برکت نہیں ہوگی۔ (مسند احمد، البزار)

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهِ عَلِيمٌ: اور جو بھی کچھ تم خیر میں سے خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے اس کی قدر فرمائے گا اور اس کی جزا دے گا تمہارا خرچ کیا ہوا ضائع نہ ہوگا۔

شب و روز خرچ کرنے والوں کی فضیلت

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲۷۴) البقرہ

جواب ترجمہ: جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں پوشیدہ طور پر اور علانیہ طور پر سو ان کے لیے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس، اور ان پر کوئی خوف نہیں، اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

شان نزول: یہ آیت ان گھوڑوں کے چارے کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں باندھے گئے ہوں۔ (قرطبی) نبی کریم ﷺ سے اس فرمان باری تعالیٰ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً کے بارے پوچھا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ھم اصحاب الخیل کہ ان سے مراد گھوڑوں والے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، گھوڑے پر خرچ کرنے والا صدقے کے ساتھ اپنا ہاتھ پھیلانے والے کی طرح ہے۔ (یعنی کثرت سے صدقہ دینے والے کی طرح ہے) کہ وہ اسے بند نہیں کرتا۔ ان کا پیشاب اور ان کی لید قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک کستوری کی خوشبو کی طرح ہو گی۔ (تفسیر قرطبی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ آیت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ إِنَّ عَلِيًّا رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنهُ مَا كَانَ يَمْلِكُ غَيْرَ أَرْبَعَةِ دَرَاهِمَ، فَتَصَدَّقَ بِدِرْهَمٍ لَيْلًا، وَبِدِرْهَمٍ نَهَارًا، وَبِدِرْهَمٍ سِرًّا، وَبِدِرْهَمٍ عَلَانِيَةً ان کے پاس چار دراہم تھے تو آپ رضی اللہ عنہ نے ایک درہم رات کے وقت اور ایک درہم دن کے وقت، ایک درہم چپکے سے اور ایک درہم اعلانیہ صدقہ کر دیا۔ (عبد الرزاق، کبیر)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے، یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو فضول خرچی اور کنجوسی کے بغیر خرچ کرتے ہیں اور بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ کا معنی ہے فی اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ (رات اور دن

میں)(تفسیر قرطبی)

صاحب کشاف کہتے ہیں کہ نَزَلَتْ فِي أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حِينَ تَصَدَّقَ بِأَرْبَعِينَ أَلْفَ دِينَارٍ: عَشَرَةٌ بِاللَّيْلِ، وَعَشَرَةٌ بِالنَّهَارِ، وَعَشَرَةٌ فِي السِّرِّ، وَعَشَرَةٌ فِي الْعَلَانِيَةِ یہ آیت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار دینار اللہ کی راہ میں اس طرح خرچ کئے کہ دس ہزار رات میں دس ہزار دن میں، دس ہزار خفیہ اور دس ہزار اعلانیہ۔(تفسیر کشاف)

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ: میں ان لوگوں کے اجر عظیم اور فضلیت کا بیان ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہیں تمام حالات واوقات میں رات میں اور دن میں خفیہ اور اعلانیہ ہر طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتے رہتے ہیں اس کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ صدقہ وخیرات کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں نہ رات اور دن کی کوئی تعیین ہے اس طرح خفیہ اور اعلانیہ دونوں طرح سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب ہے بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے نام ونمود مقصود نہ ہو خفیہ خرچ کرنے کی فضیلت بھی اسی حد تک ہے کہ علانیہ خرچ کرنے کے لئے کوئی ضرورت داعی نہ ہو اور جہاں ایسی ضرورت ہو وہاں علانیہ خرچ کرنا ہی افضل ہے۔(معارف القرآن)

بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً: رات کی تاریکی ہو یا دن کا اجالا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو کوئی لمحہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے جس میں وہ اپنے اللہ کو راضی نہ کرتے ہوں، رات کی تاریکی میں بھی وہ اللہ کے نام پر دیتے تھے، دن کے اجالے میں بھی اللہ کے نام پر دیتے تھے، پوشیدہ بھی دیتے تھے اور علانیہ بھی دیتے تھے، موقع اور محل کی مناسبت سے کام کرتے تھے، مگر یہاں آیت کے اس حصہ سے پتہ چلتا ہے کہ پوشیدہ طور پر صدقہ علانیہ صدقہ کرنے سے افضل وبہتر ہے، اس میں باریک اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ نے یہاں رات کو پہلے ذکر کیا اور دن کو بعد میں ذکر کیا، رات کو صدقہ کیا جائے تو دیکھنے والے لوگ زیادہ نہیں دیکھ پاتے، جب کہ دن میں صدقہ کیا جائے تو کئی لوگوں کی نگاہ پڑ سکتی

ہے، اسی طرح دوسرا اشارہ پوشیدہ طور پر صدقہ افضل ہونے کا یہ ہے کہ اللہ نے اَلسِّرّ کو عَلَانِیَۃ سے پہلے ذکر فرمایا ہے۔

فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ: رات اور دن میں، پوشیدہ اور اعلانیہ اللہ کی راہ میں اپنا مال لٹانے والے وہ خوش بخت اور خوش نصیب لوگ ہیں جنہیں اللہ اپنی بارگاہ سے اس کا صلہ عطا فرمائیں گے، دنیا میں بھی اللہ انہیں نوازے گا اور آخرت میں بھی اللہ انہیں ثواب واجر سے نوازے گا، کیونکہ اللہ نیکوکاروں کی نیکیاں ضائع نہیں کرتے، پھر جب اللہ نے مال و دولت اپنی راہ میں لٹانے کے فضائل جگہ جگہ بیان فرمائے تو انہیں کیونکر محروم فرمائے گا، جب اللہ نے فرمایا جو ایک نیکی لے کر آئے گا اسے اس کے بدلے دس ملیں گی، جب اللہ نے فرمایا جو مجھے قرض دے گا میں اسے کئی گنا زیادہ دوں گا، جب اللہ نے فرمایا کہ میرے راستے میں ایک لگانے والے کو سات سو تک ملے گا، تو یہ عدد اور گنتی تو ہو سکتا ہے انسانی دماغوں اور فہموں کو سمجھانے کے لیے ہو، اللہ تو سخیوں کا سخی ہے، اس کا ہاتھ بہت کھلا ہے وہ اپنی شایان شان عطا کرتا ہے اور کرے گا۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ: آیت کا یہ حصہ بتاتا ہے کہ کارِ ثواب میں مشغول رہنے والے لوگوں پر آخرت میں کوئی خوف طاری ہو گا اور نہ ہی وہ غم گین ہوں گے۔

سود اور تجارت میں فرق

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲۷۵)البقرہ

جواب ترجمہ: جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت میں) اٹھیں گے تو اس شخص کی طرح اٹھیں گے

جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنادیا ہو، یہ اس لیے ہو گا کہ انہوں نے کہا تھا کہ خرید و فروخت سود ہی کی طرح ہوتی ہے۔ حالانکہ اللہ نے خرید و فروخت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے، اس لیے جس شخص کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت آگئی اور وہ (سودی معاملات سے) باز آگیا تو ماضی میں جو کچھ ہوا وہ اسی کا ہے اور اس (کی باطنی کیفیت) کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جس شخص نے لوٹ کر پھر وہی کام کیا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ: سود کے احکام ذکر فرماتے ہیں جو کہ صدقات اور خیرات کی ضد اور نقیض ہے اس لیے کہ صدقہ اور خیرات سے اخلاق اور مروت اور خلق اللہ کی نفع رسانی میں ترقی ہوتی ہے اور سود میں سراسر بے مروتی اور ضرر رسانی ہے، صدقہ اور خیرات میں صلہ رحمی اور غریبوں کی امداد ہوتی ہے اور سود میں سخت دلی اور غریبوں سے زیادتی ہوتی ہے، اس لیے صدقہ کی فضیلت کے بعد سود کی مذمت اور حرمت کا بیان نہایت مناسب ہوا تاکہ سود کی مذمت اور حرمت سے صدقہ کی فضیلت اور پختہ ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ جس درجہ سود میں برائی ہے اسی درجہ خیرات میں بھلائی ہے۔

ایک ضد کی قباحت سے دوسری ضد کا حسن و جمال واضح ہوتا ہے، نیز صدقہ سے مال ظاہر میں گھٹتا ہے اور حقیقت میں بڑھتا ہے اور سود میں مال ظاہر میں تو بڑھتا ہے اور حقیقت میں گھٹتا ہے، نیز گزشتہ آیات میں صدقہ کرنے والوں کا حال بیان فرمایا کہ دنیا اور آخرت میں ان کو خیرات کا عوض اور ثواب ملے گا اور آخرت میں ان کو کسی قسم کا رنج و غم نہ ہو گا اب آئندہ آیات میں سود خواروں کا حال بیان فرماتے ہیں کہ وہ قبروں سے مدہوش اور وحشت زدہ اٹھیں گے اس لیے کہ ان لوگوں نے حلال اور حرام کو یکساں کر دیا اور سود اور خرید و فروخت کو برابر سمجھا اور ظاہر ہے کہ حلال اور حرام اور جائز اور ناجائز کو یکساں کر دینا مخبوط الحواس آدمی کا کام ہے اس لیے سود خواروں کی سزا یہ تجویز ہوئی کہ قیامت کے دن قبروں سے آسیب زدہ اور مجنوں کی طرح اٹھیں گے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

صدقہ احسان و پاکیزگی ہے، طہارت اور جوانمردی ہے، باہم تعاون اور تکافل ہے، جبکہ سود خوری میں بخل اور کنجوسی ہے، گندگی اور نجاست ہے، خود غرضی اور ذاتی مفاد ہے، صدقہ کا خلاصہ یہ ہے کہ صدقہ کرنے کے بعد بظاہر اس کا کوئی عوض یا بدلہ نہیں لیا جاتا اور ربا کا خلاصہ یہ ہے قرض روپیہ واپس لینے کے ساتھ ساتھ سود خور کچھ زیادہ بھی وصول کرتا ہے، یہ زائد دولت مدیون کی محنت یا اس کے گوشت اور خون سے لی جاتی ہے، محنت سے اس صورت میں جب مدیوں نے مال لیا، اس کے ساتھ محنت کی اور اس کی محنت کے نتیجے میں اسے منافع حاصل ہوا۔

اس صورت میں تو زائد دولت محنت کا حصہ ہو گی لیکن اگر اسے منافع نہ ہوا یا اسے خسارہ ہو گیا تو اس صورت میں اس کے خون پسینہ کا حصہ ہو گی، یا مثلاً قرض اس نے ذاتی اخراجات یا اپنے خاندان کے ضروری اخراجات کے لئے لیا ہو اور اسے نفع بخش کاروبار میں لگایا ہی نہ ہو تو اس صورت میں بھی سود کی رقم گویا، اس شخص کی ذات سے وصول ہو گی، یہی وجہ ہے کہ اگر صدقہ روشن صفحہ ہے تو ربا اس کے بالمقابل ایک تاریک صفحہ ہے، مال خرچ کرنے والے کا چہرہ اگر روشن ہے تو سود خور کا چہرہ تاریک اور سیاہ ہے، اس لئے کہ اس حسین و جمیل، پاک اور صاف چہرے کے بیان کے معاً بعد سود خور کے بدنما چہرے کو بھی پیش کر دیا گیا۔

اس چہرے کو ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ جس سے سودی کاروبار کی تمام اندرونی برائیاں اور قباحتیں اس چہرے سے عیاں ہو گئیں، افراد کا سنگدلانہ طرز عمل، ناداروں کی ہلاکت اور معاشرہ میں اس سودی نظام سے پیدا ہونے والی تمام برائیاں اور فسادات ظاہر ہو گئے، اسلام نے دور جاہلیت کی تمام برائیوں کو ختم کیا، لیکن اسلام نے جس قدر مذمت سود خوری کی کی ہے، اس قدر مذمت کسی دوسری برائی کی نہیں کی ہے، نیز اسلام نے سود خوری کے خلاف جس طرح لفظی اور معنوی دھمکی دی ہے، اس قدر کسی بھی دوسری برائی کے ارتکاب کرنے والے کو نہیں دی گئی، ان آیات میں بھی اور ان کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی اور اللہ کی ذات یقیناً دوررس حکمتوں کا احاطہ کرنے والی ہے، اس میں

شک نہیں کہ دور جاہلیت میں جو سودی نظام جاری وساری تھا اس کے اپنے مفاسد اور قباحتیں بھی تھیں ، لیکن آج ہمارے دور سرمایہ داری میں جس طرح اس کے نتائج اور فسادات کھل کر سامنے آگئے ہیں اور اس کا یہ بد نما چہرہ جس خوش اسلوبی سے بے نقاب ہو کر سامنے آگیا ہے، دور جاہلیت میں ایسا کبھی نہ تھا، اس دور میں یہ مکروہ چہرہ اس طرح بد نما، بد شکل اور پھر تیوری چڑھائے ہوئے نہ تھا، جس طرح وہ آج ہے اور ہمارے اس جدید دور میں وہ کھل کر سامنے آگیا ہے۔

اس وقت کی غالب سودی معیشت پر، اس آیت میں جو خوفناک حملہ کیا گیا ہے، اس کی حقیقی حکمت و افادیت، دور جاہلیت کے مقابلے میں آج بھی اچھی طرح ظاہر ہو رہی ہے جبکہ پوری انسانیت آج اس نظام کی چکی میں پس رہی ہے، جو شخص اسلامی نظام زندگی کی اصل حکمت، اس کی حقیقی عظمت اور اس کی جامعیت اور اس کی باریک بینی پر اچھی طرح غور و فکر اور تدبر کرنا چاہتا ہے، وہ ان آیات و نصوص پر غور کر کے وہ کچھ پا سکتا ہے، جو ان لوگوں کے لئے ممکن نہ تھا، جنہوں نے سب سے پہلے ان آیات کا مطالعہ کیا تھا۔

اس لئے کہ آج پوری انسانی معیشت ان نصوص کے ایک ایک حکم کی براہ راست تصدیق کر رہی ہے، آج کی پوری انسانیت جو سود کھلاتی ہے اور سود کھاتی ہے، اس پر مصائب و شدائد کے وہ پہاڑ ٹوٹ چکے ہیں، جنہوں نے اس کی کمر توڑ دی ہے اور اسے پیس کر رکھ دیا ہے، اس نظام نے اس کے اخلاق کو بگاڑ دیا ہے، اس کی صحت کا معیار گرا دیا ہے، اس کا اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا ہے اور سب سے بڑی خرابی یہ کہ اس کے دین کو تباہ و برباد کر دیا ہے، آج دنیا خالق حقیقی کے ساتھ برسر پیکار ہے، جس کی وجہ سے وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہے، ایک فرد ہے تو وہ بھی اس عذاب میں گرفتار ہے، کوئی قوم ہے یا امت ہے تو وہ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہے، لیکن نہ تو اس عذاب میں کمی آتی ہے اور نہ ہی کوئی قوم یا امت عبرت پکڑتی ہے۔ (فی ظلال القرآن)

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ: یہاں یَاْكُلُوْنَ بمعنی یَاْخُذُوْنَ ہے (یعنی وہ جو سود لیتے ہیں) اور اَخَذ (لینے) کو اَکل

(کھانے) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ سود کھانے کے لئے ہی لیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آیت میں سود کھانے کا ذکر ہے اور مراد مطلقاً سود لینا اور اس کا استعمال کرنا ہے خواہ کھانے میں استعمال کرے یا لباس میں یا مکان اور اس کے فرنیچر میں لیکن اس کو کھانے کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو چیز کھائی جائے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا بخلاف دوسری ضرورتوں کے استعمال کے کہ اس چیز کو واپس لیا دیا جا سکتا ہے، اس لئے مکمل قبضہ اور تصرف کو کھا جانے کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (معارف القرآن للمفتی)

یہاں ذکر سود کھانے کا ہے جب کہ اس سے مراد سودی معاملات کرنا ہے، کھانے (اَلْاَکْل) کا ذکر اس لیے کیا کہ اس سارے معاملے میں کھانا ہی اہم ہوتا ہے، بڑا کام یہی ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء آیت ۱۰ میں فرمایا کہ وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں، یہاں بھی مال کھانے کا ذکر کیا گیا ہے حالانکہ یتیموں کا مال ہتھیانا مراد ہے، چاہے اس کے بعد کھائے یا کسی اور مصرف میں لائے، جس طرح یتیم کا مال کھانا جائز نہیں ہے اسی طرح اسے ضائع کرنا، تلف کرنا اور تباہ کرنا بھی جائز نہیں ہے لیکن باقی ساری چیزوں سے ہٹ کر صرف کھانے پر متنبہ کر دیا۔

اسی طرح سورۃ البقرہ کی آیت ۱۸۸ میں فرمایا کہ تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ تو یہاں صرف کھانے کا ذکر ہے جب کہ ایک دوسرے کا مال کسی بھی شکل میں برے طریقے سے استعمال کی ممانعت ہے، اسی طرح یہاں ربا (سود) کا ذکر ہے، ربا مال میں اس زیادتی کا نام ہے جو وہ لوگ زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے، وہ مال پر مال زیادہ وصول کرتے تھے جو کہ کھایا نہیں جاتا تھا، بلکہ کھانے پینے کی چیزوں میں استعمال کیا جاتا تھا تو گویا کہ وہ کھایا ہی گیا، مراد اس میں کسی طرح کا تصرف کرنا، اسے استعمال کرنا ہے، جیسا کہ ربا (سود) میں تصرف سے منع کیا گیا ہے، بلکہ اس پر وعید بھی فرمائی گئی ہے، حضرت نبی کریم ﷺ نے لَعَنَ آکِلَ الرِّبَا وَمُوکِلَهُ وَشَاهِدَهُ وَکَاتِبَهُ وَالْمُحَلِّلَ لَهُ سود کھانے والے، کھلانے والے، اس کی گواہی دینے والے، سود لکھنے والے اور کسی کے لیے حلالہ

کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے، تو یہ بات واضح ہو گئی کہ سود کی حرمت صرف کھانے سے متعلق نہیں ہے، سود کا کسی بھی طرح کا تصرف اس کے حرام ہونے کا اشارہ دیتا ہے۔

ربا کا لغوی معنیٰ: ربا کا لغوی معنی مطلق زیادتی ہے۔ عربی میں کہا جاتا ہے: رَبَا الشَّیْءُ یَرْبُو، جب کوئی شے زیادہ ہو جائے، قرآن کریم میں بھی یہ لفظ زیادتی کے معنیٰ میں آیا ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہے اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (الحج: ۵) یعنی زیادہ ہو گئی اور بڑھ گئی، حدیث شریف میں بھی یہ لفظ زیادتی کے معنیٰ میں آیا ہے۔

حدیث میں ہے فَلَا وَاللّٰهِ مَا اَخَذْنَا مِنْ لُقْمَةٍ اِلَّا رِبًا مِّنْ تَحْتِهَا، اللہ کی قسم! ہم نے جو لقمہ بھی لیا تو وہ اپنے نیچے سے اور زیادہ ہو گیا، اس سے مراد اس کھانے کا بڑھنا ہے جس کے لیے نبی کریم ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی تھی، جب آدمی سودی کاروبار کرتا ہے تو عربی میں اس کے لیے کہا جاتا ہے أَرْبَى الرَّجُلُ اس نے سودی کاروبار کیا، اسی معنیٰ میں حدیث شریف میں آتا ہے مَنْ أَجَبَى فَقَدْ أَرْبَى یعنی جس نے کھیتی تیار ہونے سے پہلے فروخت کی اس نے سودی کام کیا، جب کہ اَلْاِجْبَاءُ کا لفظ کھیتی فروخت کرنے پر اس وقت بولا جاتا ہے جب اس کو تیار ہونے سے پہلے فروخت کیا جائے، لغوی طور پر یہی معنیٰ ربا کا ہے۔

علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ اصل مال پر زیادتی کو ربا کہتے ہیں اور زجاج نے کہا ہے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک ربا حرام ہے اور دوسرا حرام نہیں ہے، ربا حرام ہر وہ قرض ہے جس میں اصل رقم سے زیادہ وصول کیا جائے یا اصل رقم پر کوئی منفعت لی جائے اور ربا غیر حرام یہ ہے کہ کسی کو ہدیہ دے کر اس سے زیادہ لیا جائے۔ (تاج العروس شرح القاموس)

صاحب معارف القرآن فرماتے ہیں لفظ رباء عربی زبان کا معروف لفظ ہے، رسول کریم ﷺ کی بعثت اور نزول قرآن سے قبل جاہلیت عرب میں بھی یہ لفظ متعارف تھا اور نہ صرف متعارف بلکہ رباء کا لین دین عام طور پر جاری تھا بلکہ سورۃ نسآء کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رباء کا لفظ اور اس کے

معاملات زمانہ تورات میں بھی معروف تھے اور تورات میں بھی اس کو حرام قرار دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسا لفظ جو زمانہ قدیم سے عرب اور اس کے قرب وجوار میں معروف چلا آتا ہے اور اس پر لین دین کا رواج چل رہا ہے اور قرآن اس کی حرمت و ممانعت بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی خبر دیتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت پر بھی سود و رباء حرام کیا گیا تھا اس لفظ کی حقیقت کوئی ایسی مبہم چیز نہیں ہو سکتی جس کے سمجھنے سمجھانے میں دشواریاں پیش آئیں، یہی وجہ ہے کہ جب ۸ ہجری میں سورۃ بقرہ کی آیات رباء کی حرمت کے متعلق نازل ہوئیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہیں منقول نہیں کہ ان کو لفظ رباء کی حقیقت سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دوسرے معاملات کی طرح اس کی تحقیق کی نوبت آئی ہو بلکہ جس طرح شراب کی حرمت نازل ہوتے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر عمل کیا اسی طرح رباء کی حرمت نازل ہوتے ہی رباء کے سب معاملات ترک کر دیئے۔

پچھلے زمانہ کے معاملات میں مسلمانوں کا جو رباء غیر مسلموں کے ذمہ واجب الاداء تھا وہ بھی مسلمانوں نے چھوڑ دیا اور جو غیر مسلموں کا مسلمانوں کے ذمہ واجب الاداء تھا اور مسلمان نزول ممانعت کے بعد اس کو دینا نہیں چاہتے تھے اس کا جھگڑا امیر مکہ کی عدالت میں پیش ہوا انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو اس کا فیصلہ سورۃ بقرہ کی آیات میں آسمان سے نازل ہوا کہ پچھلے زمانہ کے بقایا رباء کا لین دین بھی اب جائز نہیں اور اس میں چونکہ غیر مسلموں کو یہ شکایت کا موقع مل سکتا تھا کہ ایک اسلامی حکم شرعی کی وجہ سے ہمارا روپیہ کیوں مارا جائے تو اس کے ازالہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ واضح کر دیا کہ اس حکم شرعی کا اثر صرف غیر مسلموں پر نہیں بلکہ مسلمانوں پر بھی یکساں ہے اور سب سے پہلے جو سود کی رقم چھوڑی گئی وہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی کثیر التعداد رقم تھی۔

الغرض رباء کی ممانعت ہونے کے وقت رباء کا مفہوم کچھ مخفی نہ تھا عام طور پر معروف تھا وہی رباء جس کو عرب رباء کہتے تھے اور اس کا لین دین کرتے تھے قرآن نے حرام کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس کو صرف اخلاقی انداز میں نہیں بلکہ قانون ملک کی حیثیت سے نافذ فرمایا البتہ بعض ایسی صورتوں کو بھی آپ نے رباء میں شامل قرار دیا جس کو عام طور پر رباء نہیں سمجھا جاتا تھا انہی صورتوں کی تعیین میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اشکال پیش آیا اور انہی میں ائمہ مجتہدین کے نظریات میں اختلاف ہوا ور نہ اصل رباء جس کو عرب رباء کہتے تھے نہ اس میں کسی کو اشتباہ کا موقع تھا نہ اس میں کسی کا اختلاف ہوا۔ (تفسیر معارف القرآن)

زمانہ جاہلیت میں رباء کی صورت: امام تفسیر ابوحیان عزناطی رحمہ اللہ کی تفسیر بحر محیط میں بھی جاہلیت کے رباء کی یہی صورت لکھی ہے کہ ادھار دے کر اس پر نفع لیتے اور جتنی مدت ادھار کی بڑھ جائے اتنا ہی سود اس پر بڑھا دینے کا نام رباء تھا اسی جاہلیت عرب کے لوگ یہ کہتے تھے کہ جیسے بیع وشراء میں نفع لینا جائز ہے اسی طرح اپنا روپیہ ادھار پر دے کر نفع لینا بھی جائز ہونا چاہیے قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا اور بیع ورباء کے احکام کا مختلف ہونا واضح فرمایا۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا، اَلرِّبٰوا فِي اللُّغَةِ اَلرَّبَاوَةُ وَالْمُرَادُ بِهٖ فِي الْاٰيَةِ كُلُّ زِيَادَةٍ لَا يُقَابِلُهَا عِوَضٌ یعنی رباء کے معنیٰ اصل لغت میں زیادتی کے ہیں اور آیت میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو بلکہ محض ادھار اور اس کی میعاد ہو۔ (احکام القرآن، معارف)

امام جصاص نے احکام القرآن میں رباء کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں: هُوَ الْقَرْضُ الْمَشْرُوطُ فِيهِ الْأَجَلُ وَزِيَادَةُ مَالٍ عَلَى الْمُسْتَقْرِضِ، یعنی وہ قرض ہے جس میں کسی میعاد کے لئے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرضدار اس کو اصل مال سے زائد کچھ رقم ادا کرے گا، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رباء کی تعریف یہ فرمائی ہے كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبًا، یعنی جو قرض نفع حاصل کرے وہ رباہے۔ خلاصہ: یہ ہے کہ ادھار دے کر اس پر نفع لینے کا نام رباہے جو جاہلیت عرب کے زمانہ میں رائج اور معروف تھا۔ (احکام القرآن للجصاص، معارف القرآن)

رباء کی اقسام: رباء کی دو قسمیں ہیں، ایک رباء نسئیۃ اور ایک رباء الفضل۔ رباء نسئیۃ تو وہ سود ہے جو

قرض اور ادھار میں ہو زمانہ جاہلیت میں اسی قسم کا رباء شائع تھا وہ یہ تھا کہ کوئی شخص کسی کو معین میعاد پر قرض دیتا ہے اور اس پر کچھ ماہوار مقرر کر لیتا ہے پھر جب میعاد معین پر وہ روپیہ ادا نہ ہوتا تو قرض خواہ اصل میں کچھ اور بڑھا کر اس کو مہلت دے دیتا ہے اور کبھی سود کو اصل میں جمع کر کے اس پر سود لگاتا یہاں تک کہ سود اصل قرض سے اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً دوچند اور سہ چند اور چہار چند ہو جاتا اور ربا ء فضل وہ سود ہے کہ جو ایک جنس کی چیزوں میں کمی اور زیادتی کے ساتھ مبادلہ کرنے میں ہو مثلاً ایک سیر گیہوں کو ڈیڑھ سیر گیہوں کے معاوضہ میں فروخت کیا جائے یہ رباء فضل ہے آیت قرآنی کا اصل نزول باجماع مفسرین رباء کی قسم اول میں ہوا مگر آیت اپنے عموم کی وجہ سے رباء کی قسم ثانی کو بھی شامل ہے جس کی تفصیل احادیث متواترہ سے معلوم ہوئی اور مزید تفصیل اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین سے معلوم ہوئی اور احادیث میں رباء کی جس قدر صورتیں مذکور ہیں آیت قرآنی اپنے عموم کی وجہ سے سب کو شامل ہے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

جمہور مجتہدین کے نزدیک رباء (سود) کی دونوں قسمیں حرام ہیں، پہلی قسم ازروئے قرآن کریم حرام ہے جب کہ دوسری قسم ازروئے حدیث شریف حرام ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

حرمت سود کی وجوہات: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ سود کے حرام ہونے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں، تمام عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ضرورت مند کی اعانت اور امداد عین مروّت اور کمال انسانیت ہے اور غریب اور فقیر کی ضرورت اور حاجت کو تحصیل زر اور حصول منفعت کا ذریعہ بنانا کمال دنائت اور غایت خست ہے سوائے بخیلوں اور خود غرضوں کے کسی کا اس مسئلہ میں خلاف نہیں۔

① سود خور بلا کسی عوض کے اپنے روپیہ سے نفع حاصل کرنا چاہتا ہے جب اصل روپیہ بعینہ اور بتمامہ واپس آگیا تو یہ زائد روپیہ کس چیز کا معاوضہ ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ یہ معاوضہ اس مہلت اور تاخیر کا ہے جو قرض خواہ کی طرف سے مقروض کو ملی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ زمانہ اور مدت کوئی مال نہیں

کہ جس کے معاوضہ میں روپیہ لیا جاسکے۔ ② نیز سود آدمی کو بے رحم بنادیتا ہے اور بے ایمانی اور فریب دہی کے عجیب عجیب طریقے اس کے نفس میں القاء کرتا ہے حتی کہ آدمی کو آدمیت سے خارج کر دیتا ہے۔

③ نیز سود سے ملک کی ترقی پر اثر پڑتا ہے، اس لیے کہ جب مال دار سود کے ذریعہ سے اپنا مال بڑھائیں گے تو تجارت اور زراعت اور صنعت اور حرفت پر روپیہ نہیں لگائیں گے جس پر ملک کی ترقی کا مدار ہے اس شخص کو بلا مشقت اور بلا محنت اگرچہ فائدہ ہو جائے گا مگر یہ فائدہ انفرادی اور شخصی ہو گا اجتماعی نہ ہو گا۔ ④ سود خواری سے صلہ رحمی اور انسانی ہمدردی اور مروت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

⑤ سود خواری کی وجہ سے مال دنیاوی کی محبت قلب میں اس درجہ راسخ ہو جاتی ہے کہ طمع اور حرص اس کو ہر عیب اور معصیت سے اندھا بنادیتی ہے۔

⑥ نیز تجارت کا دارومدار باہمی رضا مندی پر ہے کما اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ اور اسی رضامندی کی تکمیل کے لیے شریعت نے خرید و فروخت میں خیار عیب اور خیار شرط اور خیار رویت کو مشروع کیا۔

تجارت میں جو شخص مثلاً غلہ خریدتا ہے تو وہ اپنے کھانے کے لیے یا کاشت کے لیے یا فروخت کرنے کے لیے خریدتا ہے اور یہ سب حقیقی منافع اور واقعی فوائد ہیں جن کے حصول کے لیے روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور بائع اور مشتری کے اختیار اور ان کی رضاء ورغبت سے یہ معاملہ ہوتا ہے اور سود کا جو بھی معاملہ ہوتا ہے وہ مجبوری اور ناگواری کے ساتھ ہوتا ہے جو شخص بھی سو روپیہ لے کر ایک سو دس دینے کا معاملہ کرتا ہے وہ ہرگز ہرگز خوشی سے نہیں کرتا بلکہ مجبوراً اور لاچار ہو کر بصد تلخی اور ناگواری کرتا ہے اور دل سے یقین رکھتا ہے کہ اس سودی معاملہ سے مجھ کو حقیقی اور واقعی فوائد حاصل نہیں ہوئے آئندہ کے موہوم منافع کی امید پر سودی قرض لیتا ہے، غرض یہ کہ سود خواری انسانی ہمدردی اور ترحم کے بھی خلاف ہے اور مصلحت عامہ کے بھی خلاف ہے اور اصولِ تجارت کے بھی

خلاف ہے کہ معاملہ کی بنا پر مجبوری اور لاچاری اور تلخی اور ناگواری پر ہے، اس معاملہ میں دل بجائے شادمانی کے پریشانی محسوس کرتا ہے اور اس سودی قرض کو اپنی گردن پر ایک بوجھ سمجھتا ہے اور اس کے اِظہار سے شرماتا ہے اور اخیر میں پچھتاتا ہے اور اجتماع اور تمدن کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور روحانی اور اخلاقی مفاسد کا ذریعہ ہے جو شریعت کی نگاہ میں نہایت سخت اور بالکل ہی ناقابل درگذر ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ربا کو حرام کیا جو کمال ترحم اور کمال مصلحت پر مبنی ہے۔

⑦ نیز سودی کاروبار حکمت کے خلاف ہے اور درہم ودینار کی اصل وضع کے منافی ہے، امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ربا کی حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کی روپیہ سے تجارت کرکے نفع اٹھایا جائے اور روپیہ کی روپیہ سے تجارت کرنا اس کی اصل وضع کے خلاف ہے اس لیے کہ درہم ودینار مقصود بالذات نہیں بلکہ ضروریاتِ زندگی کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور وسیلہ اور غیر مقصود کو اس کی حد سے نکال کر اس کو مقصود بالذات تک پہنچانا یہ سراسر اس کی وضع کے خلاف ہے جب روپیہ کی روپیہ سے تجارت ہونے لگے تو وسیلہ وسیلہ نہ رہا بلکہ مقصود بن گیا، سونا اور چاندی مقصود بالذات نہیں، فقط سونے اور چاندی سے انسان کی زندگی نہیں گذر سکتی۔

جب تک سونے اور چاندی کو کھانے اور پینے اور رہنے سہنے کا ذریعہ نہ بنائے، محض سونے اور چاندی سے دنیا کی کوئی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی، سونا اور چاندی اپنی ذات سے ایک قسم کے پتھر ہیں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے سونے اور چاندی کو ایک میزان (ترازو) بنایا ہے جس سے اشیاءِ عالم کی قیمتوں کا وزن ہوتا ہے اور یہ سونا چاندی خدا کی پیدا کردہ عجیب ترازو ہے جو شخص اس کا مالک ہوگیا وہ دراصل سب چیزوں کا مالک ہوگیا، جو چاہے وہ سونے اور چاندی کے ذریعہ خرید سکتا ہے، کپڑے سے کھانے کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی اور کھانے سے کپڑے کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی مگر روپیہ سے ہر قسم کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے، مگر بایں ہمہ محض سونا اور چاندی مقصود بالذات نہیں بلکہ ضروریات مقصودہ کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، درہم ودینار، نحویوں کے حرف کی طرح ہیں کہ معنی فی نفسہ

کے لیے وضع نہیں ہوتے بلکہ معنی فی غیرہ کے لیے وضع ہوتے ہیں آئینہ کی طرح ہیں کہ جس طرح آئینہ دوسری اشیاء کے الوان (رنگتوں) کے دیکھنے کا آلہ ہے خود مقصود نہیں سونا اور چاندی ظاہر میں سب کچھ ہے مگر حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔

ضرورت کے وقت سوکھی روٹی کا ٹکڑا اور پھٹے ہوئے کپڑے کا چیتھڑا کام دے جاتا ہے مگر سونے کا ٹکڑا کام نہیں دیتا، تندرستی میں غذا مقصود ہے اور بیماری میں دوا مقصود ہے اور سونا اور چاندی اس مقصود کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنی ضروریات زندگی کو حاسل کرو پس جس شخص نے روپیہ کی روپیہ سے تجارت کر کے نفع اٹھایا اس نے اس کی اصل وضع کے بالکل خلاف کیا اور بڑا ہی ظلم کیا اور کسی شے کو بے محل رکھنا اور خلاف وضع استعمال کرنے ہی کا نام ظلم ہے۔(اتحاف شرح احیاء للزبیدی، معارف القرآن للکاندھلوی)

⑧ کاروباری زندگی میں اہل اسلام پر یہ قید لگائی گئی ہے کہ وہ اپنی کاروباری جدوجہد میں کسی کے لئے اذیت اور مضرت کا باعث نہ بنیں اور ایسا کاروبار نہ کریں جس کے نتیجے میں لوگوں تک ان کی ضروریات کی رسد میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہو، نہ ایسا کاروبار کریں جس کے نتیجے میں دولت بالا بالا چند ہاتھوں تک محدود ہو جائے اور اس کا دائرہ محدود ہو جائے كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ تاکہ وہ مال تمہارے مالداروں کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

اسلام نے معاشی جدوجہد میں فکر و عمل کی طہارت و پاکیزگی کو بھی لازم قرار دیا ہے، اس نے کاروبار میں وسائل و نتائج کی پاکیزگی پر بہت زور دیا، کاروبار کی ترقی اور دولت میں اضافہ کرنے کے بارے میں ایسے ضابطے اور قاعدے وضع کئے ہیں جن کے نتیجے میں انسانی ضمیر اور انسانی اخلاق پر برے اثرات نہیں پڑتے، نہ ان سرگرمیوں سے معاشرے کے اجتماعی وجود اور اجتماعی زندگی متاثر ہوتی ہے، یہ سب اصول اور سرگرمیاں اس سچائی کی اساس پر ہیں جو اس پوری کائنات میں جاری ہے

یعنی تصور الٰہ اور پھر اس عہد کے دائرے کے اندر موجود جو انسان اور حقیقت وجود کے درمیاں طے پایا جو خلیفہ بننے والے انسان کے تمام تصرفات اور سرگرمیوں پر حاوی ہے، جو اللہ کی مملوکہ سرزمین پر فرائض خلافت سرانجام دے رہا ہے، یہ وجوہات ہیں جن کے نتیجے میں سود خوری ایک ایسا عمل قرار پاتی ہے، جو اساسی طور پر پوری پوری طرح ایمانی تصور حیات کے ساتھ متصادم ہے، اس لئے کہ سودی نظام بالکل ایک علیحدہ تصور حیات پر مبنی ہے، ایک ایسا تصور جس میں عقیدہ توحید اور وجود باری کے لئے " تاکہ وہ مال تمہارے مالداروں کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ (العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام، فی ظلال القرآن)

⑨ سودی نظام کا اساسی تصور یہ ہے کہ انسانی زندگی اور ارادہ الٰہی کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے، انسان بتداء ہی سے کرہ ارض کا مالک ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی عہد وپیمان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جاری کردہ احکام کا سرے سے پابند ہی نہیں ہے، اسی تصور حیات کے مطابق انسان ان تمام ذرائع کے استعمال میں آزاد ہے، جن کے ذریعہ وہ دولت جمع کر سکے، وہ دولت کے بڑھانے اور ترقی دینے میں بھی کسی اصول کا پابند نہیں ہے۔

اسی طرح وہ دولت کے استعمال میں بھی کسی حد وقید کا پابند نہیں ہے، اس سلسلے میں اللہ کے ساتھ کسی عہد وپیمان کا بھی پابند نہیں ہے، نہ وہ اس بات کا پابند ہے کہ دوسرے لوگوں کی مصلحتوں کو خاطر میں لائے، اس لئے اس پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اگر اس کی ذخیرہ اندوزی اور سرمایہ میں بے پناہ اضافے کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کو تکلیف پہنچے بعض اوقات انسان کے بنائے ہوئے قوانین ایسے شخص کی آزادی پر بعض جزوی پابندیاں عائد کرکے، دولت کے لامحدود ارتکاز کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً سود کی شرح پر پابندی عائد کردی جاتی ہے، بعض اوقات انسان کے بنائے ہوئے قوانین بعض مالی چالبازیوں، ظلم وزیادتی، دھوکہ بازی اور مالی ضرر انسان پر پابندیاں عائد کردیتے ہیں، لیکن یہ پابندیاں ایک روٹین بن جاتی ہیں اور لوگ اپنی اصلی عادت کی طرف لوٹ آتے

ہیں، اس لئے وہ وہی کام کرنے لگتے ہیں جن کی خواہش ان کے دلوں میں بھی رچی بسی ہوتی ہے، یہ انسانی قوانین معاشرے میں وہ اصول رائج اور راسخ نہیں کرسکتے جو خداوند قدوس کی طرف سے نازل کردہ قوانین انسان کے دل میں پیدا کردیتے ہیں، غرض سودی نظام کی نیو ایک غلط اور فاسد اساس پر اٹھائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس جہاں میں انسان کا مقصد اعلیٰ صرف یہ ہے وہ مال و دولت جمع کرتا پھرے، چاہے اس کے لئے جو مکروہ ذریعہ اسے اختیار کرنا پڑے اور پھر وہ اس دولت سے فائدہ اٹھائے اور اسے جس طرح چاہے خرچ کرے، یہی وجہ ہے کہ ایک مادہ پرست شخص کے دل میں اس قدر لالچ پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ کتوں کی طرح دولت پر ٹوٹ پڑتا ہے اور سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس سے ہر طرح کے مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے، یوں وہ تمام اصولوں کو پامال کرکے اور تمام جہاں کے مفادات کو قربان کرکے بھی دولت جمع کرنے میں لگا رہتا ہے۔ (فی ظلال القرآن)

⑩ نظام رباء کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام بشریت کو پیس کر رکھ دیتا ہے، اس میں افراد اور معاشرے کی زندگی دُوبھر ہوجاتی ہے، اس کے نتیجے میں اقوام وملل تباہ ہوجاتی ہیں اور یہ تباہی صرف ان مٹھی بھر لوگوں کے مفاد کے لئے ہوتی ہے جو اس نظام میں روپیہ فراہم کرتے ہیں، جو اقوام اس نظام کی زد میں آجاتی ہیں وہ اخلاقی، نفسیاتی اور اعصابی اعتبار سے بھی گر جاتی ہیں۔

ان اقوام کا مالی نظام خراب ہوجاتا ہے اور انسانی اقتصادیات میں مناسب نشوونما نہیں ہوتا اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پوری انسانیت پر حقیقی اور عملی اقتدار چند ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے، جو اللہ کی اس پوری مخلوق میں ذلیل ترین لوگ ہوتے ہیں، اس کے ساتھ وہ پرلے درجے کے فسادی ہوتے ہیں، یہ ایک ایسا طبقہ ہوتا ہے جو انسانیت کے لئے اس کرہ ارض پر کسی قسم کی دوستی، ہمدردی یا ذمہ داری کا کوئی پاس نہیں رکھتا، جیسا کہ ہمارے اس جدید دور میں انسانیت کو ایسے ہی ایک گروہ سے واسطہ پڑا ہوا ہے، یہ گروہ جس طرح افراد کو روپیہ فراہم کرتا ہے اسی طرح حکومتوں اور اقوام کو بھی روپیہ فراہم کرتا ہے، اپنے وہ ممالک جہاں یہ گروہ رہائش پذیر ہوتا ہے، ان کے اندر یہ کاروبار کرتا ہے

اور بیرونی دنیا میں بھی یہ کام کرتا ہے اور تمام انسانیت کی محنت کا پھل اسے ملتا رہتا ہے اور لوگوں کی خون پسینے کی کمائی غیر محسوس طور پر ان کی تجوریوں کی طرف لوٹتی رہتی ہے اور یہ فائدہ انہیں محض اپنے اس سودی کاروبار کی وجہ سے ملتا رہتا ہے، جس میں خود ان کی محنت ومشقت کا کوئی دخل نہیں ہوتا، نہ صرف یہ کہ لوگوں کی دولت اس گروہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے بلکہ اس گروہ کو اس معاشرہ میں مکمل اثر ورسوخ بھی حاصل ہوتا ہے، اس گروہ کے پیش نظر نہ اصول ہوتے ہیں، نہ وہ کسی اخلاقی نظام کا پابند ہوتا ہے۔

نہ وہ کسی دین ومذہب پر یقین رکھتا ہے بلکہ وہ مذہب واخلاق اور اصول اور کردار کا مذاق اڑانے میں اپنا اثر ورسوخ استعمال میں لاتے ہیں، جو اس سودی معاشرے میں انہیں حاصل ہوتا ہے اور اس خوفناک اثر ورسوخ کے نتیجے میں وہ ایسے حالات پیدا کرتے ہیں اور ایسے ایسے منصوبے روبعمل لاتے ہیں اور ایسی فکری فضا پیدا کرتے ہیں جس کے اندر رہ کر وہ اس سودی نظام کی وجہ سے عوام الناس کا مزید استحصال کرتے ہیں۔

ان حالات میں ان کی خساست اور قابل نفرت لالچ کی راہ میں رکاوٹ نہیں رہتی اور ان کے تمام مقاصد پورے ہوتے ہیں، اس سلسلے میں ایسے لوگوں کا بہترین اور آسان طریقہ یہ ہوتا ہے وہ عوام کو جنسیت اور لذتیت کا خوگر بنا کر انسانی اخلاق اور عفت کو ختم کر کے انسان کو شہوات ولذتیت کے گندے نالے میں گرا دیتے ہیں اور وہ اس کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اپنی آخری کوڑی بھی اس میں صرف کر دیتے ہیں، چنانچہ ان کی دولت ان کے اقتصادی جال میں پھنستی چلی جاتی ہے۔

یہ کام یوں سر انجام دیا جاتا ہے کہ یہ سودی کاروبار کرنے والے تمام عالمی اقتصادی نظام کو اپنی محدود مصلحتوں کے موافق چلاتے ہیں، چاہے ان کے ان اقدامات کی وجہ سے عالمی اقتصادی پیداوار عوام الناس اور پورے انسانی معاشرے کے مفاد کے مقابلے میں چند سرمایہ داروں کے مفاد میں محبوس ہو جاتی ہے جو سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور جن کے ہاتھ میں عالمی سرمایہ کی باگیں آجاتی ہیں اور وہ

سب تاریں اپنے مفاد میں ہلاتے ہیں، یہ اندوہناک واقعہ ہمارے، اس جدید دور میں یوں پایہ تکمیل کو پہنچا کہ دور جاہلیت میں بھی وہ ایسی خوفناک صورت میں نہ تھا۔ (فی ظلال القرآن)

چھ چیزوں کی صراحت اور حضرت عمر کا اشکال: نبی کریم ﷺ نے رباء کے مفہوم میں بیع وشراء کی چند صورتوں کو بھی داخل فرمایا جن کو عرب رباء نہ سمجھتے تھے مثلاً چھ چیزوں کی بیع وشراء میں یہ حکم دیا کہ اگر ان کا تبادلہ کیا جائے تو برابر ہونا چاہیے اور نقد دست بدست ہونا چاہیے، اس میں کمی بیشی کی گئی یا ادھار کیا گیا تو وہ بھی رباء ہے یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گیہوں جو، کھجور اور انگور ہیں، اسی اصول کے ماتحت عرب میں معاملات کی جو چند صورتیں مزابنہ اور محاقلہ کے نام سے رائج تھیں آیات رباء نازل ہونے کے بعد رسول کریم ﷺ نے ان کو رباء میں شامل قرار دے کر منع فرمایا (ابن کثیر)

اس میں یہ بات قابل غور تھی کہ ان چھ چیزوں کی خصوصیت ہے یا ان کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں ان کے حکم میں ہیں اور اگر ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے؟ کس کس صورت کو داخل رباء سمجھا جائے؟ یہی اشکال حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو پیش آیا جس کی بناء پر فرمایا،

إِنَّ آيَةَ الرِّبَا مِنْ آخِرِ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْآنِ وَإِنَّ النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم قُبِضَ قَبْلَ أَنْ يُبَيِّنَهُ لَنَا فَدَعُوا الرِّبَا وَالرِّيبَةَ (احکام القرآن للجصاص، ابن کثیر، ابن ماجہ)

یعنی آیت رباء قرآن کی آخری آیتوں میں ہے، اس کی پوری تفصیلات بیان فرمانے سے پہلے رسول ﷺ کی وفات ہوگئی اس لئے اب احتیاط لازم ہے رباء کو تو چھوڑنا ہی ہے جس صورت میں رباء کا شبہ بھی ہو اس کو بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ (تفسیر معارف القرآن للمفتی)

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مراد معاملات بیع وشراء کی وہ صورتیں اور ان کی تفصیلات ہیں جو جاہلیت عرب میں رباء نہیں سمجھی جاتی تھیں رسول کریم ﷺ نے ان کو رباء میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا باقی اصل رباء جو تمام عرب میں معروف ومشہور تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو چھوڑا رسول کریم ﷺ نے اس کا قانون نافذ فرمایا اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس کا اعلان کیا اس میں فاروق

اعظم رضی اللہ عنہ کو کوئی اشکال یا اشتباہ ہونے کا کوئی امکان نہیں پھر جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو رباء کی جن خاص صورتوں میں اشتباہ پیش آیا تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ جن صورتوں میں رباء کا شبہ بھی ہو ان کو بھی چھوڑ دیا جائے۔ (معارف القرآن للمفتی)

لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ: یعنی سود خور اپنی اپنی قبروں سے بروز محشر اس طرح اٹھیں گے جس طرح وہ شخص ہو جسے شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو، باؤلا کر دیا ہو۔ اکثر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے قیامت کے دن اٹھنا مراد ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد قبروں سے اٹھنا ہے۔ (کبیر)

قاضی ثناء پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح اٹھیں گے جیسے جن کے جھپٹے میں آیا ہوا شخص اٹھتا ہے، شیطان سے مراد ہے جن، خبط کا معنی ہے سخت ضرب جس کے ساتھ بگاڑ بھی ہو۔ قاموس میں ہے: خَبَطَ الشَّيْطَانُ فُلَانًا یا تَخَبَّطَ الشَّيْطَانُ فُلَانًا فلاں شخص کو جن نے چھو کر دکھ پہنچا دیا۔

اَلْمَسُّ سے مراد ہے جنون یا چھو جانا۔ مِنَ الْمَسِّ کا تعلق يَقُوْمُ سے ہے یا يَتَخَبَّطُ سے مطلب اس طرح ہو گا کہ سود خور قبروں سے اس طرح ہی اٹھیں گے جیسے جن کے جھپٹے میں آیا ہوا آدمی جنون زدہ ہو کر اٹھتا ہے اور شیطان اس کی عقل خراب کر دیتا ہے یا (اگر مَسّ کا معنی لَمس لیا جائے تو) یہ معنی ہو گا کہ وہ اس طرح اٹھیں گے جیسے وہ شخص اٹھتا ہے جس کو شیطان کے چھو جانے سے دکھ پہنچ گیا ہو، یعنی جن کے چھو جانے سے اس کا دماغ خراب ہو گیا، جسمانی بیماری مرگی اور جنون کبھی جن کے چھو جانے سے پیدا ہو جاتا ہے اس لیے آیت میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جن کے چھو جانے سے مرض کا پیدا ہو جانا قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی۔

قرآن میں حضرت ایوب علیہ السلام کے قصہ میں آیا ہے: رَبِّ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَ عَذَابٍ اور حدیث میں استحاضہ کے بیان میں ہے کہ یہ شیطان کی ایک رگڑ (ایڑ) لگنے سے ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ عرب کا خیال تھا کہ جن انسان کو خبطی بنا دیتا ہے عرب ہی کے گمان کے موافق آیت میں اظہار کیا گیا (یعنی واقع میں تو جن انسان کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ یہ صرف دور جاہلیت کا مفروضہ اور مسلمہ تھا اسی مفروضہ کے ساتھ سود خور کے قیام کو تشبیہ دی) لیکن جب لمس جن سے مرض پیدا ہو جانا کتاب اللہ اور حدیث سے ثابت ہے تو اس توجیہ کی ضرورت نہیں۔ سود خوروں کے پیٹوں کو بھی بڑھا بڑھا کر اللہ ان کو ٹھڑیوں کی طرح کر دے گا جن کے اندر سانپ بھرے ہوں اس لیے وہ بوجھل ہو کر ٹھیک طرح کھڑے نہ ہو سکیں گے۔ (تفسیر مظہری)

حضرات مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سود کھانے والا قیامت کے دن اس طرح اٹھایا جائے گا کہ وہ مجنون ہو گا، یہ سود کھانے والے کی مخصوص نشانی ہو گی جس سے میدان محشر میں کھڑے لوگ اسے پہچان لیں گے کہ یہ شخص دنیا میں سود کھایا کرتا تھا، اسی بناء پر آیت کا معنیٰ ہو گا کہ وہ مجنون ہو کر کھڑے ہوں گے۔ (تفسیر کبیر)

ابن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب لوگوں کو ان کی قبروں سے اٹھایا جائے گا تو وہ جلدی جلدی اپنی قبروں سے نکلیں گے، جس طرح سورۃ المعارج آیت ۴۳ میں ارشاد ہے، مگر سود کھانے والے لوگ جب اٹھیں گے تو گر پڑیں گے جس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو کیونکہ یہ لوگ دنیا میں سود کھاتے تھے، اللہ ان کے پیٹوں کو قیامت کے دن اس قدر بوجھل کر دیں گے کہ وہ اٹھیں گے تو اٹھتے ہی گر پڑیں گے، وہ تیز چلنا چاہیں گے مگر وہ تیز نہیں چل سکیں گے، سود خوروں کے لیے تیز چلنا آسان نہیں ہو گا کیونکہ ان کا پیٹ بوجھل ہو گا، یہ اگرچہ جنون کی وجہ سے نہیں ہو گا۔

اس کی تائید معراج شریف والی وہ روایت بھی کرتی ہے کہ حضرت جبریل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں ایسے لوگوں کے پاس لے کر گئے کہ وہ سارے ہی بڑے بڑے گھروں کی طرح تھے ان میں سے کوئی اٹھنا چاہتا ہے تو پیٹ کے بوجھل ہونے کی وجہ سے ایک طرف جھک جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے جبریل سے پوچھا کہ اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے فرمایا الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطانُ مِنَ الْمَسِّ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔ (تفسیر کبیر)

ایک قول یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے جس میں ارشاد ہے إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذا مَسَّهُمْ طائِفٌ مِنَ الشَّيْطانِ تَذَكَّرُوا فَإِذا هُمْ مُبْصِرُونَ [الْأَعْرَافِ: ۲۰۱] جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے، انہیں جب شیطان کی طرف سے کوئی خیال آکر چھوتا بھی ہے تو وہ (اللہ کو) یاد کر لیتے ہیں۔ (تفسیر کبیر)

چنانچہ اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، یہ اس لیے کہ شیطان لذتیں اور شہوتیں طلب کرنے کی دعوت دیتا ہے اور غیر اللہ میں مشغول ہونے کی ترغیب دیتا ہے یہی یہاں شیطان کے چھونے سے مراد ہے تو جو شخص اس طرح ہو گا وہ دنیاوی کاموں میں مخبوط ہو گا، کبھی شیطان اسے نفس اور خواہش کی طرف کھینچتا ہے اور کبھی فرشتہ اسے دین اور تقویٰ کی طرف کھینچتا ہے تو ایسے میں اس طرح کی مضطربانہ حرکتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں اور مختلف افعال رونما ہوتے ہیں، تو یہ وہ خبط ہے جو شیطان کے فعل سے حاصل ہوا، تو سود کھانے والا شخص تو بلاشک وشبہ دنیا میں خوب گھسا ہوا ہوتا ہے، جب وہ دنیا کی اس محبت پر مرتا ہے تو یہ محبت اس کے اور اللہ کے درمیان ایک آڑ بن جاتی ہے، تو دنیوی خبط اسے مال کی محبت کے سبب ہوا جس نے اخروی خبط بھی اس پر مسلط کر دیا اور اس خبط نے اسے اس آڑ میں داخل کر دیا۔ (کبیر)

ذلِكَ بِأَنَّهُمْ قالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبا: اس حالت میں مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں تجارت بھی تو دراصل سود ہی جیسی چیز ہے، وہ جس اعتراض اور شبہ پر اعتماد کرتے تھے وہ یہ تھا کہ تجارت بھی ایک نفع بخش عمل ہے اور سود خوری بھی ایک نفع بخش عمل ہے حالانکہ یہ ایک بالکل

واہیات قسم کا استدلال تھا، اس لئے کہ تجارتی عمل میں نفع ونقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے، پھر اس میں شخصی محنت اور مہارت کا بھی دخل ہوتا ہے تجارت میں قدرتی حالات یہ فیصلہ کرتے کہ تاجر کو فائدہ یا نقصان ہو لیکن سودی کاروبار میں ہر حالت اور ہر صورت میں فائدہ اور سود متعین ہوتا ہے، یہ تجارت اور رباء میں ایک بنیادی فرق ہے اور یہی وہ بڑی علت ہے جس کی وجہ سے ایک کو حلال اور دوسری کو حرام قرار دیا گیا ہے، ہر وہ کاروبار جس میں ہر صورت اور ہر حال میں فائدہ متعین کر دیا گیا ہو وہ حرام ہے اس لئے کہ وہ رباء ہے، اس لئے کہ اس میں فائدہ محفوظ ومامون ہے اور مقرر ہے، اس میں کسی ہیر پھیر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (فی ظلال القرآن)

یہ سود خوار حلال اور حرام کو ایک کرنا چاہتے ہیں اور سود کو حلال کرنے کے لیے استدلال میں یہ کہتے ہیں کہ بیع یعنی خرید وفروخت اور سوداگری بھی تو مثل سود کے ہے جس طرح بیع میں زیادتی اور نفع ہوتا ہے اسی طرح سود میں بھی زیادتی اور نفع ہوتا ہے دونوں میں فرق نہیں پھر کیا وجہ کہ بیع تو جائز اور سود حرام ہو۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

شیخ ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل کلام اس طرح تھا کہ اِنَّمَا الرِّبَا مِثْلُ الْبَیْعِ یعنی سود مثل سوداگری کے ہے لیکن کفار نے حرمت ربوا کی نفی میں مبالغہ کرنے کے لیے اصل کلام کا عکس کر دیا اور یہ کہا کہ اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا یعنی بیع حلال ہونے میں مثل سود کے ہے گویا کہ حلت یعنی حلال ہونے میں سود اصل ہے اور بیع حلال ہونے میں مثل سود کے ہے گویا کہ حلت یعنی حلال ہونے میں سود کے مشابہ ہے غرض یہ کہ ان لوگوں نے فقط اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود ہوتا ہے دونوں کو حلال سمجھ لیا حالانکہ بیع اور ربوا میں بڑا فرق ہے جو اہل علم پر مخفی نہیں اور اگر بالفرض والتقدیر کوئی فرق بھی نہ ہوتا تو فرق کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اللہ تعالیٰ جو کہ مالک مطلق اور حاکم مطلق ہے اس نے بیع اور تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے اور جب اللہ تعالیٰ مالک مطلق ہیں تو ان کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں اور جس چیز کو چاہیں حرام کریں کسی کو دریافت کرنے

کا بھی حق نہیں لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفعَلُ وَھُمْ یُسئَلُونَ، اوست سلطاں آں چہ خواہد آں کند (معارف القرآن)

بیع اور سود میں فرق: بیع میں جو نفع اور زیادتی ہوتی ہے وہ مال کے مقابلہ اور عوض میں ہوتی ہے اور سود میں جو نفع اور زیادتی ہوتی ہے وہ بلا عوض کے ہوتی ہے مثلاً کسی نے ایک درہم کی قیمت کا کپڑا دو درہم میں فروخت کیا تو یہ دونوں درہم کپڑے کے عوض اور مقابل سمجھے جائیں گے اور اگر ایک درہم کو دو درہم کے مقابلہ میں فروخت کیا تو ایک درہم تو ایک درہم کے مقابلہ میں ہو جائے گا اور دوسرا درہم بلا عوض اور کسی مقابلہ کے ہو گا کیونکہ سب دراہم ایک جنس ہیں اور کپڑا اور درہم علیحدہ علیحدہ قسم ہیں، ہر ایک کا نفع اور ہر ایک کی غرض بھی علیحدہ علیحدہ ہے، اس لیے کپڑے اور درہم میں فی نفسہ موازنہ اور مقابلہ ناممکن اور محال ہے خرید و فروخت میں مقابلہ حاجت اور ضرورت اور رغبت کا ہوتا ہے۔

کسی کی ضرورت اور رغبت کچھ ہے اور کسی کی کچھ، کسی کو ایک درہم کی اتنی حاجت ہوتی ہے کہ دس روپیہ کا کپڑا اس کی نظر میں کچھ نہیں ہوتا اور کسی کو ایک کپڑے کی جس کی قیمت بازار میں ایک درہم ہے اتنی حاجت ہوتی ہے کہ دس درہم میں بھی خریدے تو وہ سودا نہ ہو گا یعنی یہ نفع خالی از عوض نہ ہو گا کیونکہ کپڑے اور روپیہ میں فی نفسہ تو موازنہ اور مساوات ممکن نہیں اس لیے کہ جنس مختلف ہے لہٰذا معیار اور پیمانہ اپنی اپنی ضرورت اور رغبت ہو گی اور ضرورتوں اور رغبتوں میں بے انتہا تفاوت ہے۔

پس اگر ایک روپیہ کی قیمت کا کپڑا دس روپیہ میں فروخت کیا تو مجموع قیمت کا مجموع مال سے مقابلہ کیا جائے گا اجزاء کا اجزاء سے مقابلہ نہ ہو گا اور اگر ایک درہم کو دو درہم کے مقابلہ میں فروخت کیا تو یہاں مقابلہ مجموعہ کا مجموعہ سے نہ ہو گا بلکہ اجزاء کا اجزاء سے مقابلہ ہو گا، ہم جنس ہونے کی وجہ سے اجزاء میں مساوات اور موازنہ ممکن ہے، لہٰذا ایک درہم ایک درہم کے مقابلہ میں ہو گا اور دوسرا درہم

خالی از عوض ہو کر سود ہو جائے گا، جس کو شریعت نے حرام کیا ہے۔

بیع میں قابل معاوضہ چیزوں کا مبادلہ ہوتا ہے اور رباء اصل قرض پر کچھ زیادہ لینے کو کہتے ہیں کہ جو مہلت اور تاخیر وقت کے عوض میں زیادتی کی جاتی ہے اور تاخیر وقت اور مہلت نہ عقلاً کوئی مال ہے اور نہ عرفاً کوئی ایسی چیز ہے کہ جس پر قبضہ کیا جاسکے اور عوض اور مقابل بن سکے اور جو چیز بلاعوض وبدل حاصل کی جائے وہ باطل اور ناحق ہے پس جس شخص نے بیع اور سود کو برابر قرار دیا اور اس نے مقابلہ اور معاوضہ میں خبط اور بدحواسی سے کام لیا، اس کا انجام یہ ہوا کہ سود خوار قبر سے دیوانہ اور مخبوط الحواس بنا کر اٹھایا جائے گا ہر عمل کی جزاء اس کے مناسب ہوتی ہے۔ (معارف القرآن)

وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا: سود خوروں نے سود کے حلال ہونے کی جو دلیل پیش کی وہ انتہائی بودی ہے، انہوں نے جس طرح بیع کو سامنے رکھ کر سود کو اس پر قیاس کیا یہ ایسا قیاس ہے جو شیطان نے بھی پیش کیا تھا، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا اور انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا تو شیطان نے سجدہ کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا گیا ہے جب کہ مجھے آگ سے بنایا گیا ہے، اس لیے میں مٹی سے بہتر اور افضل ہوں، لہذا میں آدم کو سجدہ نہیں کر سکتا۔

تو آیت کے اس حصہ نے واضح کر دیا کہ دین قیاس کا نام نہیں بلکہ نص پر عمل کرنے کا نام ہے، قیاس فاسد سے مسئلہ حاصل کرنا درست عمل نہیں ہے۔ سود خور کا اپنے استدلال میں یہ کہنا کہ جس طرح بیع میں نفع اور زیادتی ہوتی ہے اسی طرح سود میں بھی نفع اور زیادتی ہوتی ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں، اس استدلال کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی یہ کہے کہ جیسے بیوی عورت ہے اسی طرح ماں بھی عورت ہے پھر کیا وجہ ہے کہ بیوی تو حلال ہے اور ماں حرام ہے، یا یوں کہے کہ کتا بھی بکری کی طرح ایک جانور ہے کیا وجہ ہے کہ ایک حلال ہے اور ایک حرام ہے۔ (معارف القرآن)

ان لوگوں کا اعتراض تو عقلی طور پر تھا کہ جب دونوں معاملوں کا مقصد نفع کمانا ہے تو دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہیے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے عقلی شبہ کا جواب عقلی طور پر فرق بیان کر کے نہیں

دیا بلکہ حاکمانہ انداز میں یہ جواب دیا کہ مالک والملکوت اللہ جل شانہ ہے وہی ہر چیز کے نفع وضرر اور بھلے برے کو پوری طرح جانتا ہے جب اس نے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دے دیا تو سمجھ لو کہ جس چیز کو حرام کیا ہے اس میں ضرور کوئی نقصان وضرر اور کوئی خباثت ہے، خواہ عام انسان اس کو محسوس کرے یا نہ کرے، کیونکہ مجموعہ نظام عالم کی پوری حقیقت اور اس کے نفع وضرر کا احاطہ نہیں کر سکتے بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کسی شخص یا جماعت کے حق میں مفید نظر آتی ہیں، مگر پوری قوم یا پورے ملک کے لئے اس میں مضرت ہوتی ہے۔ (معارف القرآن للمفتی)

فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ: جس شخص کے پاس نصیحت آگئی اس کے رب کی طرف سے پھر وہ رک گیا تو جو وہ پہلے لے چکا ہے وہ اس سے واپس نہیں لیا جائے گا، جاہلیت کے زمانہ میں جو اس نے سود اکٹھا کر لیا وہ اسی کا ہے، وہ اس سے واپس نہیں لیا جائے گا وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ: اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اگر دل سے تائب ہوا ہے تو آخرت میں بھی اس کا گناہ معاف اور آخرت میں گرفت نہیں ہوگی اور اگر اوپر اوپر سے اس نے قانون کو قبول کر لیا لیکن دل اس کا صاف نہیں ہے تو اللہ کے حوالے تمہیں اس سے بحث نہیں ہے کہ دل سے تائب ہوا ہے یا نہیں۔

وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ: یعنی جن لوگوں نے حرمت سودی کو تسلیم نہ کیا اور وہی اعتراض کرتے رہے کہ بیع اور سود میں کوئی فرق نہیں، وہ کافر ہونے کی وجہ سے ابدی عذاب کے مستحق ہوں گے۔ (توضیح القرآن للعثمانی)

هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ کے بارے میں مفسرین کرامؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ سود کو حلال سمجھ کر لیتا ہے تو پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، کیونکہ حرام قطعی کو حلال سمجھنا کفر ہے اور ایسا شخص مرتد ہے اور اگر سود کو حرام سمجھتے ہوئے کھاتا ہے اور چھوڑتا نہیں ہے تو اسلامی حکومت ایسے شخص کو قید کرے تاکہ وہ توبہ کرے اور اگر ایسے افراد کا جماعت اور جتھا ہے جو باز نہیں آتے تو اسلامی حکومت

ان کے خلاف جہاد و قتال کرے، (احکام القرآن)

آخری وارننگ دیتے ہوئے فرمایا کہ سود کی حرمت کے نازل ہو جانے کے بعد اور اسلامی حکومت کی طرف سے پوری طرح اس کی تبلیغ و اشاعت کے بعد اب بھی اگر کسی نے اس حرام فعل کا اعادہ کیا اور وہ کسی نہ کسی طریقے سے سودی کاروبار میں ملوث رہا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا جہنم ہے۔ اور یہ وہ وقتی سزا نہیں بلکہ اس جرم کے نتیجے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا پڑے گا۔ جس آدمی کے دل میں ایمان کی کچھ رمق بھی باقی ہے اسے اس سزا کے سن لینے کے بعد کبھی جرم کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے۔ (تفسیر روح القرآن)

ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے اگر ہم کہیں کہ یہ آیت کافر کے بارے میں ہے تو پھر خلود (ہمیشہ رہنا) سے مراد حقیقی طور پر ہمیشہ رہنا ہے اور اگر ہم اسے گنہگار مسلمان کے بارے قرار دیں تو پھر خلود کا لفظ مجازاً مبالغہ کے معنی میں ہو گا، جیسا کہ عرب کہتے ہیں: ملک خالد یہ ایسے دوام سے عبارت ہے جو حقیقی طور پر ہمیشہ باقی نہیں رہے گا۔ (تفسیر قرطبی)

سود کی تباہی اور صدقات کا بڑھنا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ (۲۷۶) البقرہ

جواب ترجمہ: اللہ مٹاتا ہے سود کو اور بڑھاتا ہے صدقات کو، اور اللہ دوست نہیں رکھتا کسی کفر کرنے والے، گناہ کرنے والے کو۔

يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا: اللہ تعالیٰ سود کو برباد کرتا ہے یعنی یا تو اسے بالکل غارت کر دیتا ہے یا سودی کاروبار سے خیر و برکت ہٹا دیتا ہے سود خور اس مال سے نفع نہیں اٹھا سکتا، سود خور کو اللہ تعالیٰ دنیا میں سزا دے گا اور آخرت میں عذاب دے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ (المائدۃ: ۱۰۰) یعنی ناپاک اور پاک برابر نہیں ہوتا گو تمہیں ناپاک کی

زیادتی تعجب میں ڈالے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ (الانفال ۳۷) اور ایک ناپاک کو دوسرے ناپاک پر رکھ کر سب کا ایک ڈھیر بنائے اور اس ڈھیر کو جہنم میں ڈال دے۔ سورۃ الروم میں ارشاد ہے وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِنْدَ اللَّهِ (الروم ۳۹) یعنی سود دے کر جو مال تم بڑھانا چاہتے ہو وہ دراصل بڑھتا نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں صدقات وخیرات کرنے کا حکم دیا وہاں سودخوری پر سخت ناراضگی اور زجر فرمائی ہے، سودخوروں کے تمام حیلے بہانوں کا قلع قمع کر دیا، ان کے تمام قیاسات فاسدہ کے تانے بانے بکھیر کر واضح کر دیا کہ سود انتہائی بری چیز ہے، تباہی اور بربادی کا سامان ہے، اللہ تعالیٰ باوجود یکہ اس بات کو جانتے ہیں کہ صدقہ وخیرات کرنے سے مال کم ہوتا ہے، سود لینے سے مال بڑھتا ہے مگر اللہ نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت فرمایا کہ اللہ سود کو مٹاتا، گھٹاتا اور کم کرتا ہے جب کہ صدقات کو بڑھاتا اور پروان چڑھاتا ہے، سود اگرچہ فی الحال بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر فی الحقیقت وہ گھٹے گا، برباد ہوگا، صدقہ کرنے کی صورت میں صورتاً کمی دکھائی دیتی ہے مگر معنوی اعتبار سے صدقہ بڑھتا ہے، جب صورت معاملہ یہ ہے تو پھر ایک عاقل ودانا شخص کے لائق یہ ہے کہ وہ اپنی طبیعت کے گھٹیا تقاضوں کو پورا کرنے کی بجائے شریعت کی طرف سے بلند کی جانے والی آواز پر کان دھرے۔

يَمْحَقُ محق سے ہے جس کا معنیٰ ہے ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں کسی چیز کا نقصان ہونا، اسی سے محاق کا لفظ ہے جس کا معنیٰ ہلاکت ہے، اَلْمَحْقُ کا معنی النقص والذھاب، کم ہونا، گھٹنا اور ختم ہونا ہے اور اسی سے محاق القمر یعنی چاند کا گھٹنا بھی ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ سود کے مٹنے، برباد اور تباہ ہونے میں اور صدقات کے پروان چڑھنے، نمو پانے اور بڑھنے میں اس چیز کا احتمال موجود ہے کہ یہ چیز دنیا میں ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ چیز آخرت میں ہو۔

دنیا میں سود کی تباہی اور بربادی کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ مال سود کی وجہ سے کتنا ہی کیوں نہ بڑھ

جائے اس کا انجام اور نتیجہ فقر وفاقہ ہے، سود خور کے مال سے برکت اٹھ جائے گی، حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اَلرِّبَا وَاِنْ کَثُرَ فَاِلٰی قُلٍّ سود کتنا ہی کیوں نہ بڑھ جائے انجام کار اس کا قلیل ہی ہونا ہے۔ اگر سود خور کا مال کم نہ ہو تو پھر اس کا انجام ذلت ہے، نقصان ہے، سقوط عدالت ہے، زوال امانت ہے، اور کچھ نہیں تو اس سود خور پر فاسق کی پھبتی کسی جائے گی، سخت دل اور سخت گیر کی پھبتی کسی جائے گی۔

وہ فقراء اور غرباء تو اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں جن کا مال سود خور نے سود کی وجہ سے لیا تھا کہ وہ اس پر لعنتیں کرتے ہیں، اس پر غصہ کی وجہ سے دانت پیستے ہیں، اس کے خلاف جھولیاں اٹھا اٹھا کر بد دعائیں کرتے ہیں، یہی آہیں اور بد دعائیں اس کی خیر وبرکت، اس کی جان ومال کے زوال کا سبب بن جائیں گی، اسی طرح جب سود خور کے بارے میں یہ بات چہار دانگ عالم میں پھیل جائے گی کہ اس شخص نے سود کے ذریعہ بہت سا مال جمع کر لیا ہے، اپنے بینک اکاؤنٹ میں اضافہ کر لیا ہے تو پھر لالچی، مال کے حریص اور ظالم لوگ اس کی طرف رخ کریں گے، جو اسے واضح طور پر کہیں گے کہ یہ مال جسے تو نے جمع کیا ہے یہ درحقیقت اس کا مال نہیں ہے اس لیے یہ مال اس کے پاس نہیں رہنے دیا جائے گا، یوں دنیا میں اس مال کی تباہی اور بربادی ہو گی۔

دنیا میں سودی مال کی تباہی اور بربادی کسی بھی شکل میں ہو سو ہو مگر آخرت کے لحاظ سے سودی مال کی تباہی اور بربادی کا کیا منظر ہو گا جس پر اللہ نے فرمایا کہ اللہ سود کو مٹاتا ہے، حضرت سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں محق کا مطلب یہ ہے کہ أَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَا يَقْبَلُ مِنْهُ صَدَقَةً وَلَا جِهَادًا، وَلَا حَجًّا، وَلَا صِلَةَ رَحِمٍ اللہ اس سود خور کا صدقہ، جہاد، حج اور صلہ رحمی قبول نہیں فرمائیں گے۔ یہ کس قدر تباہی ہے کہ دنیا میں تو صدقے اور خیراتیں کیا کرتا تھا، جہاد کیا کرتا تھا، حج کرنے کے لیے حرمین شریفین کے سفر کیا کرتا تھا، رشتہ داروں اور عزیزوں میں رقوم تقسیم کرتا تھا، مگر یہ سب کچھ بیکار چلا گیا، اس سب کچھ کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پھر آخرت میں سودی مال کی تباہی کا یہ حال دیکھیں کہ

دنیوی مال ومتاع موت کے بعد کام نہیں آتا، وہاں تو جزا اور سزا ہو گی، تو سود خور کو مرنے کے بعد جب سزا ملنا شروع ہو جائے گی تو یہ کس قدر نقصان ہے، سود خوری نے کس قدر تباہی اور بربادی کروادی۔

ایک روایت میں ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ أَنَّ الْأَغْنِيَاءَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ بَعْدَ الْفُقَرَاءِ بِخَمْسِمِائَةِ عَامٍ مالدار لوگ فقیروں سے پانچ سو سال بعد جنت میں داخل ہوں گے، اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ حلال مال کما کر غنی اور مالدار بننے والا شخص جب پانچ سو سال فقیروں سے بعد میں جنت جائے گا تو اس شخص کے بارے میں کیا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو یقینی طور پر حرام مال کے ذریعے مالدار بنا اور ایسے مال کے ساتھ مالدار اور غنی بنا جس کو شریعت اور دین نے حرام قرار دیا، تو یہی وہ تباہی، نقصان اور بربادی ہے جس کو اس آیت کے ذیل میں سمجھا جاسکتا ہے۔

وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ: اللہ تعالی صدقات کو بڑھاتا اور پروان چڑھاتا ہے، اس میں بھی دونوں احتمال ہیں کہ صدقہ دنیا میں بڑھے گا یا آخرت میں بڑھے گا، دنیا میں صدقہ بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کا اللہ کی ذات کے ساتھ گہرا تعلق بن جاتا ہے کہ وہ باوجود فقر وحاجت مندی کے اللہ کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندے کو دنیا میں ضائع نہیں کرتا اسے بے کار نہیں چھوڑتا، جیسے حدیث شریف میں ہے کہ فرشتہ روزانہ آواز دیتا ہے کہ اللَّهُمَّ يَسِّرْ لِكُلِّ مُنْفِقٍ خَلَفًا وَلِمُمْسِكٍ تَلَفًا اے اللہ! ہر خرچ کرنے والے کے ساتھ نعم البدل عطا فرما کر آسانی کیجیے اور مال روک کر رکھنے والے کے مال کو تباہ کیجیے۔

پھر جو شخص صدقہ وخیرات کرتا رہتا ہے اس کی عزت وتوقیر میں روز ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، لوگ اسے اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں، لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہوتے ہیں، یہ شخص لوگوں کی تسکین کا سامان بن جاتا ہے، یہ سب کچھ مال ودولت سے کہیں بڑھ کر افضل ہے۔

صدقہ خیرات کرنے والے بندے کے لیے فقراء مساکین جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتے ہیں، تو یہ نیک دعائیں اس کا سرمایہ ہے، پھر لالچی حریص اور ظالم لوگ صدقہ وخیرات کرنے والے

بندے کے ساتھ الجھتے نہیں ہیں، یہ لوگ اس بندے کا مال لینا مناسب اور جائز نہیں سمجھتے، ہاں کہیں کوئی واقعہ رونما ہو جائے تو وہ نادر ہے، تو صدقہ وخیرات کرنے والے شخص کے مال کو بڑھانے کا دنیوی اعتبار سے یہ مفہوم ہے۔

صدقہ وخیرات کرنے والے شخص کا اخروی اعتبار سے صدقہ کیسے بڑھتا ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى يَقْبَلُ الصَّدَقَاتِ وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا إِلَّا الطَّيِّبَ، وَيَأْخُذُهَا بِيَمِينِهِ فَيُرَبِّيهَا كَمَا يُرَبِّي أَحَدُكُمْ مُهْرَهُ أَوْ فَلُوَّهُ حَتَّى أَنَّ اللُّقْمَةَ تَصِيرُ مِثْلَ أُحُدٍ (ترمذی) بے شک اللہ تعالیٰ صدقات قبول فرماتے ہیں اور پاکیزہ چیز ہی صدقہ میں قبول کرتے ہیں، اللہ صدقہ کو اپنے داہنے ہاتھ میں لیتے ہیں پھر اسے بڑھاوا دیتے ہیں جیسے تم میں سے کوئی شخص گھوڑی اور گائے کے بچوں کی پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن ایک لقمہ احد پہاڑ کی طرح ہو جائے گا۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ: اور اللہ محبت نہیں کرتا یعنی نفرت کرتا ہے اللہ قیوم ہے اور قیومیت کا تقاضا ہے کہ اس کو اس عالم سے محبت ہو لیکن محبت نفرت میں کسی عارض کی وجہ سے ہی بدل جاتی ہے اور ایسا عارض جو محبت کو نفرت سے بدل دینے کا سبب ہو صرف کفر ہے اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مخلوق اللہ کی عیال ہے جو اللہ کی عیال سے اچھا سلوک کرتا ہے وہی اس کو سب سے پیارا ہوتا ہے۔ (شعب الایمان، مظہری)

یہاں کفار فعال کے وزن پر ہے، یہ کفر سے ہے، کفر جس شخص کی عادت بن جائے اسے کفار کہا جاتا ہے، عرب لوگ ایسے شخص کو جو کسی چیز کا عادی ہو اسی طرح کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، فَعَّالٌ لِلْخَيْرِ اس شخص کو کہتے ہیں جو خیر کا بہت زیادہ حکم کرتا رہے، خیر کے کاموں کا عادی ہو۔ اَلْأَثِيمُ فَعِيلٌ کے وزن پر فاعل کے معنیٰ میں ہے، آثم یعنی گناہگار، اسی طرح جو شخص گناہوں پر دوام واستمرار اختیار کرتا ہے اسے اثیم کہا جاتا ہے، یہ نام اسی شخص کے زیادہ لائق

اور مناسب ہے جو سود کی حرمت کا منکر ہو، کفار وہ لوگ جو سود کو حلال سمجھتے ہیں اور اثیم وہ شخص ہے جو سود کو حرام سمجھنے کے باوجود اختیار کرتا ہے، اس لیے یہ آیت ان دونوں لوگوں کے لیے جامع ہے۔

ادائے زکوٰۃ اور سودی نظام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲۷۷) البقرہ

جواب ترجمہ: بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی سو ان کے لیے ان کا ثواب ہے ان کے رب کے پاس نہ وہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ غمگین ہوں گے۔

سود کی قباحت بیان کرنے کے بعد اہل ایمان وایقان کی خوبیوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ اولاً تو وہ صاحب ایمان ہیں، ایمان کے بعد اعمال صالحہ بجالاتے ہیں، ان اعمال صالحہ میں اہم ترین عبادات دو ہیں، میں ایک بدنی عبادت نماز ہے اور ایک مالی عبادت زکوٰۃ ہے، یہ ان دونوں عبادات کو بجالاتے ہیں، اس پر انہیں اجر وثواب ملے گا، بروز محشر جب ہر کسی کو اپنی پڑی ہوگی، پریشان ہوگا اس وقت یہ نیکوکار لوگ مطمئن ہوں گے، انہیں کسی قسم کا خوف دامن گیر ہوگا اور نہ ہی یہ لوگ غم گین ہوں گے۔

صاحب فی ظلال القرآن لکھتے ہیں کہ امت اسلامیہ کے احساس اور خود ہمارے احساسات میں زکوٰۃ کی اصل صورت پریشان اور گم ہوگئی ہے، امت مسلمہ کی بدبخت نسلوں نے صدیاں گزر گئیں کہ اسلام کے اقتصادی نظام کو عملاً چلتا ہوا نہیں دیکھا ہے، اس نے اسلامی نظام زندگی کا عملی مشاہدہ نہیں کیا کہ وہ خالص ایمانی تصور حیات، خالص نظریاتی تربیت اور نظریاتی اخلاق کی اساس پر قائم ہوا ہو اور وہ انسانیت کو اور انسانی نفسیات کو ایک خاص نہج پر ڈھال رہا ہو اور خود یہ نظام اس طرح ہو کہ اس میں اس کے صحیح تصورات زندہ ہوں، پاک اخلاق نظام رائج ہو اور اونچی اقدار حیات قائم ہوں اور اس میں اسلام کے اقتصادی نظام کا مرکزی نکتہ زکوٰۃ ہو جبکہ اس کے مقابلے میں تمام دوسرے نظام عملاً

رباء کی اساس پر قائم ہوں اور پھر امت دیکھے کہ انسانی زندگی نشو ونما پارہی ہو اور اقتصادی نظام انفرادی سعی وجدوجہد پر قائم ہو اور اگر باہم تعاون کی کوئی اجتماعی شکل ہو تو وہ رباء سے پاک ہو۔

زکوٰۃ کی اصل شکل وصورت ہمارے دور کی بدبخت اور ہدایت سے محروم نسلوں کے دل و دماغ میں مشتبہ ہوگئی ہے، اس لئے کہ ان نسلوں نے انسانیت کی وہ بلند وبرتر خوبصورت تصویر دیکھی ہی نہیں جو نظام زکوٰۃ کے نتیجے میں سامنے آتی ہے، موجودہ نسلیں جدید مادی نظام کے اندر پیدا ہوئیں اور اسی کے سائے میں پروان چڑھیں اور یہ جدید نظام خالص سودی تصور پر قائم ہے۔

ان نسلوں نے صرف بخل اور کنجوسی، حرص ولالچ اور انفرادیت اور خود غرضی ہی دیکھی ہے جو دور جدید میں ہر کسی کے دلوں پر حکمران ہے، اس دور میں دولت محتاجوں اور غریبوں تک صرف قابل نفرت سودی نظام ہی کے ذریعے پہنچ رہی ہے، لوگ بغیر کسی اجتماعی کفالتی نظام کے زندگی بسر کررہے ہیں، صرف اس صورت میں انہیں تحفظ ملتا ہے جب وہ خود سرمایہ رکھتے ہوں یا انہوں نے اپنی دولت کا ایک معتدبہ حصہ خرچ کرکے موجودہ سودی نظام کے تحت اپنے آپ کو انشور کرالیا ہو، آج صنعت اور تجارت کو صرف اس صورت میں سرمایہ دستیاب ہوتا ہے، جب وہ اسے سودی نظام کے واسطہ سے لیں، اس لئے جدید نسلوں کے دل و دماغ پر یہ بات چھاگئی ہے کہ ماسوائے سودی نظام اقتصادیات کے اور کوئی اقتصادی نظام سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور یہ کہ صرف اسی نظام کے تحت زندگی بسر ہوسکتی ہے۔

جدید دور کے انسانوں کے ذہن سے زکوٰۃ کا حقیقی تصور یوں مٹ گیا ہے کہ وہ اسے صرف ایک انفرادی احسان اور نیکی سمجھنے لگے ہیں اور یہ کہ اس کی اساس پر کوئی اجتماعی نظام استوار نہیں ہوسکتا لیکن یہ لوگ حاصلات زکوٰۃ کے عظیم حجم کا تصور بھی نہیں کرسکتے کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر واجب ہے۔

اور وہ لوگ بڑی خوشی سے یہ شرح ادا کرتے ہیں جن کی تربیت اسلام نے کی ہوئی ہوتی ہے اور

اپنے مخصوص انداز میں کی ہوئی ہوتی ہے۔ وعظ و ارشاد کے ذریعہ، قانون سازی کے ذریعہ اور ایک ایسے نظام زندگی کے ذریعے جس کا تصور ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوتا ہے اور اس شرح زکوٰۃ کو ایک اسلامی حکومت بطور ایک لازمی حق کے وصول کرتی ہے، یوں نہیں کہ کوئی چیز بطور خیرات یہ حق ادا کرے اور اس عظیم فنڈ سے ان تمام لوگوں کی کفالت ہوتی ہے، جن کے لیے اپنے ذاتی وسائل ناکافی ہو جائیں اور حالت یہ ہوتی ہے کہ معاشرے کا ہر فرد یہ ضمانت پالیتا ہے کہ اس کی زندگی اور اس کی اولاد کی زندگی محفوظ ہے اور ہر حالت میں محفوظ ہے، اس فنڈ میں سے ان لوگوں کے قرضے بھی ادا کئے جاتے ہیں جو قرضوں کے بوجھ تلے دب جائیں چاہے یہ تجارتی قرضے ہوں یا غیر تجارتی ہوں۔

اسلام میں اہمیت اس بات کو حاصل نہیں ہے کہ کسی نظام کی ظاہری شکل و صورت کیسی ہے، اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ کسی نظام کی روح کیسی ہے، اسلام اپنی تربیت اور ہدایت، اپنے قانونی نظام اور ضابطہ بندی اور اپنے پورے نظام کے ذریعہ جس قسم کی سوسائٹی وجود میں لانا چاہتا ہے، وہ سوسائٹی اس کے نظام کی شکل و صورت، اس کے اجزاء اور اداروں اور اس کی حکمت عملی کے ساتھ مکمل طور پر متناسب اور متناسق ہوتی ہے، وہ سوسائٹی اس کے قانون کا تکملہ ہوتی ہے، اس سوسائٹی کے افراد کے ضمیر کی گہرائیوں میں سے ایک اجتماعی کفالتی نظام وجود میں آتا ہے، اس کے تمام ادارے اور حکمت عملیاں ایک اجتماعی کفالت وجود میں لاتی ہیں، اس نظام میں فرد اور ادارہ باہم معاون اور باہم کفیل ہوتے ہیں۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان لوگوں کے فہم و ادراک سے بہت بلند ہے جو جدید مادی نظام زندگی میں پروان چڑھے ہیں لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم مسلمان بخوبی جانتے ہیں اور ہمارا ذوق ایمانی اس کی مٹھاس محسوس کرتا ہے جبکہ جدید دور کے باسی اپنی بد بختی اور بد ذوقی کی وجہ سے یہ مٹھاس نہیں محسوس کرتے، جدید دور کا انسان اس محرومی اور بد بختی میں اس لئے مبتلا ہے کہ اس کی باگ ڈور اس جدید مادی نظام کے ہاتھ میں ہے، خدا کرے یہ اسی طرح محروم ہوں اور یہ اس خیر سے دور ہی رہیں

جس کی خوشخبری اللہ ان الفاظ میں دیتے ہیں۔(فی ظلال القرآن)

سود، اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا اِعلان جنگ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۲۷۸) فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (۲۷۹) البقرہ

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سود میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔ اگر تم ایمان والے ہو۔ پس اگر تم نہ کرو تو جنگ کا اعلان سن لو اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے، اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے لیے اصل مال ہیں، نہ تم ظلم کروگے نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

شان نزول: ① آیت يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا عباس بن عبد المطلب اور بنو مغیرہ کے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی، زمانہ جاہلیت میں دونوں سود کے کاروبار میں شریک تھے یہ دونوں قبیلہ ثقیف بن ضمرہ کے لوگوں کو سود پر ادھار دیتے تھے، ثقیف سے مراد بنو عمرو بن عمیر ہیں (جب) اسلام آیا تو ان دونوں کا سود پر دیا ہوا مال بہت زیادہ تھا، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (ابن ابی حاتم، ابن المنذر، در منثور)

② قبیلہ ثقیف والوں نے نبی کریم ﷺ سے اس بات پر صلح کی کہ جن لوگوں نے ان کو سود دینا ہے وہ انہیں ملے گا اور جن لوگوں کا ان پر سود ہے وہ ختم ہو جائے گا، جب مکہ فتح ہوا تو عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا امیر بنایا گیا، اس وقت بنو عمرو بن عوف بنو مغیرہ سے سود لیتے تھے اور بنو مغیرہ ان کو زمانہ جاہلیت میں سود دیتے تھے جب اسلام کا دور آیا تو بنو عمرو بن عمیر کی بنی مغیرہ پر بہت زیادہ رقم تھی، تو بنو عمرو نے اپنے سود کا مطالبہ کیا بنو مغیرہ نے اسلام (کے زمانہ) میں ان کو سود دینے سے انکار کر دیا، یہ معاملہ عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کی طرف لے جایا گیا، عتاب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف لکھا تو (اس پر) یہ

دو آیات نازل ہوئیں، تو نبی کریم ﷺ نے حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کی طرف یہ دونوں آیات لکھ کر بھیج دیں اور فرمایا کہ إِن رَضُوا وَإِلَّا فَأْذِنهُم بِحَرب اگر وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی ہو جائیں تو بہتر ہے ورنہ ان کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے۔ (در منثور)

③ حضرت مقاتل رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ آیت بنو عمرو بن عمیر بن عوف ثقفی کے افراد مسعود بن عمرو بن عبد یالیل ابن عمرو، ربیعہ بن عمرو اور حبیب بن عمیر کے بارے میں نازل ہوئی یہ سب بھائی تھے اور وہ طلب کرنے والوں میں سے تھے اور مطلوب بنو مغیرہ کے لوگ تھے جو بنو مخزوم میں سے تھے، بنو مغیرہ زمانہ جاہلیت میں سود پر قرضہ لیا کرتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ نے ثقیف والوں سے صلح فرمالی اور انہوں نے اپنا سود بنو مغیرہ والوں سے طلب کیا اور وہ بہت بڑا مال تھا، بنو مغیرہ والوں نے کہا کہ وَاللهِ لَا نُعطِي الرِّبَا فِي الإِسلَامِ وَقَد وَضَعَهُ اللهُ وَرَسُولُهُ عَنِ الْمُسلِمِينَ اللہ کی قسم! ہم زمانہ اسلام میں سود نہیں دیں گے، اللہ اور اس کے رسول نے مسلمانوں پر سود کو ختم فرمادیا ہے، وہ اپنا معاملہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے اور بعض نے کہا عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے۔

تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف لکھا کہ بنو عمرو اور عمیر کے بیٹوں نے اپنا سود بنو مغیرہ سے طلب کیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ دو آیات اتاریں تو رسول اللہ ﷺ نے یہ آیات حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجیں کہ ان پر یہ آیات پیش کرو اگر وہ مان لیں تو ان کے لیے ان کے اصل مال ہیں، اگر وہ انکار کریں تو ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ (در منثور)

یہ سن کر ان لوگوں نے اعلان کیا کہ نَتُوبُ إِلَى اللهِ، وَنَذَرُ مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا، فَتَرَكُوهُ كُلُّهُمْ، ہم توبہ کرتے ہیں، بقیہ سود چھوڑنے کا اعلان کرتے ہیں چنانچہ ان سب لوگوں نے سود چھوڑنے کا اعلان کر دیا تھا۔ (ابن کثیر)

④ حضرت عطاء اور عکرمہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے

بارے میں نازل ہوئی۔(کبیر) حضرت عباس بن عبد المطلب اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما نے کچھ چھوارے بطور سلم خریدے تھے، فصل ٹوٹنے کا زمانہ آیا تو چھوارے والے نے کہا اگر آپ لوگ اپنا پورا حق لے لیں گے تو میرے بچوں کی ضرورت کے لیے کچھ نہیں بچے گا اس لیے مناسب ہے کہ آپ آدھا واجب الادا حق اس وقت لے لیجئے اور باقی کے لیے مدت مقرر کر دیجئے میں آپ کو دوگنا کر کے دے دوں گا، دونوں حضرات اس تجویز پر راضی ہوگئے جب مدت مقررہ گذری اور وقت ادا آگیا تو (حسب وعدہ) زیادتی کا مطالبہ کیا اس کی اطلاع رسول اللہ کو ہوئی تو آپ نے دونوں کو ممانعت فرمادی اور اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی فَسَمِعَا وَأَطَاعَا وَأَخَذَا رُؤُوسَ أَمْوَالِهِمَا دونوں بزرگوں نے حکم کی تعمیل کی اور اپنا اصل مال لے لیا(سود چھوڑ دیا)(بغوی)

⑤ حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔(تفسیر کبیر) ⑥ اس آیت کے مخاطب اہل مکہ ہیں، وہ سودی کاروبار کیا کرتے تھے، جب فتح مکہ کے دن مسلمان ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ اپنا راس المال (اصل زر) لے لو اور اس کے اوپر زیادتی چھوڑ دو۔(تفسیر کبیر)

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ: اس آیت میں ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے ہیں۔ اس بات سے متعلق آگاہ کر دیا گیا ہے کہ وہ اس سود کو چھوڑ دیں جو باقی رہ گیا ہے، وہ اس وقت تک صحیح مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اللہ سے ڈریں گے نہیں اور باقی ماندہ سودی رقم کو ترک نہ کر دیں گے وہ صحیح مومن نہیں ہیں اگرچہ وہ اپنے ایمان کا اعلان کرتے پھریں، اس لئے کہ اللہ کے احکام و فرامین کی اطاعت وانقیاد کے بغیر ایمان کے کیا معنی ہیں، آیت انہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھتی، نہ وہ کسی بھی شخص کو اس شبہے میں چھوڑتی ہے، جو ایمان کے اعلان کے پردے میں چھپ کر اپنی حقیقت پر پردہ ڈالتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ نہ تو وہ مطیع فرمان ہوتا ہے اور نہ راضی برضائے شریعت ہوتا ہے، وہ اپنی زندگی میں شریعت کو نافذ نہیں کرتا، وہ اپنے

معاملات میں شریعت کو حکم نہیں بناتا، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دین اسلام میں اعتقادات اور اعمال میں فرق کرتے ہیں وہ صحیح مومن نہیں ہیں اگرچہ وہ طویل و عریض دعوائے ایمان کریں، زبان سے ایمان کا اعلان کریں، یہاں تک کہ وہ دوسری عبادات میں پابند صوم وصلوٰۃ کیوں نہ ہوں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے اہل ایمان اللہ سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ جن لوگوں نے سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے لوگوں سے سود وصول کیا ہے، چونکہ اس وقت تک سود کے حرام ہونے کا اعلان نہیں ہوا تھا اس لئے وہ پچھلے معاملات معاف ہیں، اور ان کے ذریعے جو رقمیں وصول کی گئی ہیں وہ واپس کرنے کی ضرورت نہیں، یہاں یہ واضح کیا جارہا ہے کہ حرمت کے اعلان کے وقت جو سود کسی پر واجب الادا ہو وہ لینا جائز نہیں ہوگا، بلکہ اسے چھوڑنا ہوگا، اسی کو اللہ فرمارہے ہیں کہ اللہ سے ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے، جس سود پر قبضہ نہیں ہوا اسے چھوڑ دو اور جس پر حرمت کے نزول سے پہلے قبضہ ہو چکا ہے اسے فسخ کرنے کے پیچھے نہ پڑو، اصل زر (رأس المال) وصول کرو سود کو چھوڑ دو۔

اس آیت کو شروع اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو خطاب کرکے اوّل اتَّقُوا اللّٰہَ کا حکم سنایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے بعد اصل مسئلہ کا حکم سنایا گیا یہ قرآن کریم کا وہ خاص طرز ہے جس میں وہ دنیا بھر کے قانون کی کتابوں سے ممتاز ہے کہ جب کوئی ایسا قانون بنایا جاتا ہے جس پر عمل کرنے میں لوگوں کو کچھ دشواری معلوم ہو تو اس کے آگے پیچھے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش اعمال کے حساب اور آخرت کے عذاب وثواب کا ذکر کرکے مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں کو اس پر عمل کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اس کے بعد حکم سنایا جاتا ہے یہاں بھی پچھلے عائد شدہ " الربوا " کی رقم کا چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر بار ہو سکتا تھا، اس لیے پہلے اتَّقُوا اللّٰہَ فرمایا اور اس کے بعد حکم دیا کہ " جس قدر " الربوا " مقروضوں کے ذمہ لازم بنا رکھا ہے اسے چھوڑ دو۔ (العروۃ الوثقیٰ شیعہ تفسیر)

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وَهَذَا تَهْدِيدٌ شَدِيدٌ وَوَعِيدٌ أَكِيدٌ، لِمَنِ اسْتَمَرَّ عَلَى تَعَاطِي الرِّبَا بَعْدَ الْإِنْذَارِ یہ آیت سخت دھمکی اور سخت وعید ہے ان لوگوں کے لیے جو اس ڈراوے کے بعد بھی سودی معاملات کرتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ: یعنی اگر تم ایمان والے ہو اس میں اشارہ کر دیا کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ حکم خداوندی کی اطاعت کی جائے اس کی خلاف ورزی ایمان کے منافی ہے یہ حکم طبائع پر بھاری تھا، اس لئے حکم سے پہلے اتَّقُوا اللَّهَ اور حکم کے بعد إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ کے ارشادات ملا دیئے گئے۔ (معارف) علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے اگر تم اپنے ایمان میں سچے ہو کیونکہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ (جلالین)

علامہ اسماعیل حقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم حقیقی مومن ہو تو پھر یہ بات یقینی طور پر لازم ہے کہ اس حکم پر عمل کیا جائے۔ (روح البیان)

صاحب کشاف کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا ایمان درست ہے یعنی ایمان کی درستگی اور ثبات کی دلیل یہ ہے کہ جس چیز کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کرو۔ (کشاف) علامہ سراج الدین دمشقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس سے پہلے سود کے حرام ہونے کا اعتراف کرتے ہو اسی طرح يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنی زبانوں سے ایمان لائے ہو اور إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ کا مطلب ہے جو اپنے دلوں سے ایمان لائے ہو بقیہ سود کو چھوڑ دو۔ (اللباب فی علوم الکتاب)

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اللہ کی پناہ! اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان جنگ! یہ ایسی جنگ ہے، جو نفس انسانی کو درپیش ہے، خوفناک جنگ ہے، جس کا انجام بالکل سامنے ہے، جس میں بشر کو شکست سے دوچار ہونا ہی ہے، انسان فانی اور ضعیف ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی

قوت جابرہ کا کیا مقابلہ کرے گا جو آن واحد میں سب کچھ بھسم کر کے رکھ دے گی اور اس کا نام ونشان مٹادے گی۔ (فی ظلال القرآن)

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ وعید شدید ہے ان لوگوں کے لیے جو سود نہیں چھوڑتے اور لڑائی قتل کی دعوت ہوتی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قیامت کے دن سود کھانے والے کو کہا جائے گا، خُذْ سِلَاحَكَ لِلْحَرْبِ جنگ کے لئے اپنے ہتھیار لے لے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مَنْ كَانَ مُقِيمًا عَلَى الرِّبَا لَا يَنْزِعُ عَنْهُ فَحَقٌّ عَلَى إِمَامِ الْمُسْلِمِينَ أَن يَسْتَتِيبَه، فَإِنْ نَزَعَ وَإِلَّا ضَرَبَ عُنُقَهُ جو کوئی سود پر قائم رہے اور اس سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کے امام پر لازم ہے کہ وہ اس سے سود کا مال واپس لے لے پس اگر وہ باز آجائے۔ (تو فبہا) ورنہ وہ اسے قتل کر دے۔ (قرطبی)

اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أَوْعَدَ اللّٰهُ أَهْلَ الرِّبَا بِالْقَتْلِ فَجَعَلَهُمْ بَهْرَجًا أَيْنَمَا ثُقِفُوا اللہ تعالیٰ نے سود لینے والوں کو قتل کی دھمکی دی ہے اور انہیں مباح قرار دیا ہے جہاں بھی وہ پکڑے جائیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ إِنْ لَمْ تَنْتَهُوا فَأَنْتُم حَرْبٌ لله وَلِرَسُولِهِ اگر تم باز نہ آئے تو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے والے ہو یعنی تم ان کے دشمن ہو۔ (قرطبی) ابن خویز منداد فرماتے ہیں کہ اگر کسی شہر والوں نے سود پر اسے حلال سمجھتے ہوئے صلح کرلی تو وہ مرتد ہوگئے اور ان کے بارے میں حکم مرتدین کے حکم کی طرح ہوگا اور اگر وہ اسے حلال نہ سمجھیں تو امام وقت کے لئے ان سے جنگ لڑنا جائز ہے، کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اعلان فرمایا ہے۔ (قرطبی)

وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُسُ أَمْوَالِكُمْ: حضرت سلیمان بن عمرو رضی اللہ عنہ کے والد فرماتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ أَلَا إِنَّ كُلَّ رِبًا مِنْ رِبَا الجَاهِلِيَّةِ مَوضُوعٌ فَلَكُمْ رُؤُسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (ابوداؤد) خبردار سنو بیشک دور جاہلت

کے سودوں میں سے تمام سود ختم کر دیئے گئے ہیں تمہارے لئے اصل مال ہوں گے نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے گا۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء نے کہا ہے اموال حرام میں سے جو آدمی کے قبضہ میں ہو اگر وہ سود کا مال ہے تو اس سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اسے اس کے پاس واپس لوٹا دے جس پر سود لگایا تھا اور اگر وہ حاضر نہ ہو تو اسے تلاش کرے اور اگر اسے پانے سے مایوس ہو جائے تو پھر چاہیے کہ وہ اسے صدقہ کر دے اور اگر اس نے وہ مال ظلماً لیا ہو تو جس کے ساتھ اس نے ظلم کیا ہے اس کے ساتھ بھی اسے اسی طرح معاملہ کرنا چاہیے اور اگر اس پر معاملہ مشتبہ ہو جائے اور وہ یہ نہ جان سکے کہ جو مال اس کے قبضے میں ہے اس حلال میں حرام کتنا ہے تو جو مال اس کے قبضے میں ہے اس میں سے وہ مقدار تلاش کرے جس کا لوٹانا اس پر واجب ہے، یہاں تک کہ اسے اس میں کوئی شک نہ رہے کہ جو مال باقی ہے وہ خالص اس کا اپنا ہے، پس جو مال اس نے اپنے قبضے سے زائل کیا اسے وہ ان لوگوں کو واپس لوٹائے گا جن کے بارے میں یہ معروف ہو کہ اس نے اس پر ظلم کیا ہے یا اس سے بطور سود مال لیا ہے اور اگر وہ اسے آدمی کو پانے سے مایوس ہو جائے تو پھر اس کی طرف سے وہ مال صدقہ کر دے۔

اور اگر مظالم اس کے ذمہ کا احاطہ کئے ہوئے ہوں اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس پر جو کچھ واجب الادا ہے وہ اسے کثیر ہونے کے سبب کبھی بھی ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھے گا تو اس کی توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس موجود ہے وہ سب اپنی ملکیت سے زائل کر دے، چاہے مساکین کو دے دے اور چاہے تو ایسے کاموں میں خرچ کر دے جو عام مسلمانوں کی منفعت اور صلاح کے لئے ہوں، یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی شے باقی نہ رہے، سوائے اس کم سے کم لباس کے جس میں نماز جائز ہوتی ہے اور وہ اتنا کپڑا ہے جو شرمگاہ کو ڈھانپ سکے اور وہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے اور ایک دن کی خوراک (باقی رہ جائے) کیونکہ یہ وہ مقدار ہے جو اضطراری حالت میں دوسرے کے مال سے لینا واجب ہوتی ہے، اگرچہ وہ اسے ناپسند کرے جس سے وہ لے رہا ہے اور اکثر علماء کے قول کے مطابق یہاں

مفلس علیحدہ اور جدا ہو گیا، کیونکہ مفلس کے پاس لوگوں کے اموال کسی زیادتی یا ظلم کی وجہ سے نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے وہ مال اس کے حوالے کر رکھے ہوتے ہیں پس اس کے لئے اتنا مال چھوڑ دیا جائے گا جو اسے چھپالے گا اور وہ وہ ہے جو اس کے لباس کی ہئیت و کیفیت میں ہو۔ (قرطبی)

لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ: یعنی اگر تم توبہ کر لو اور آئندہ کے لئے سود کی بقایا رقم چھوڑنے کا عزم کر لو تو تمہیں تمہارے اصل رأس المال مل جائیں گے نہ تم اصل رأس المال سے زائد حاصل کر کے کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ کوئی اصل راس المال میں کمی یا دیر کر کے تم پر ظلم کرنے پائے گا اس میں اصل رأس المال دینے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ تم توبہ کر لو اور آئندہ کو سود چھوڑنے کا عزم کر لو تب اصل رأس المال ملے گا۔

اس سے بظاہر اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر سود چھوڑنے کا عزم کر کے توبہ نہ کی تو اصل رأس المال بھی نہ ملے گا سو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان ہو جانے کے باوجود سود کو حرام ہی نہ سمجھے اس لئے سود چھوڑنے کے لئے توبہ نہیں کرتا تب تو یہ شخص اسلام سے خارج اور مرتد ہو گیا جس کا حکم یہ ہے کہ مرتد کا مال اس کی ملک سے نکل جاتا ہے پھر جو زمانہ اسلام کی کمائی ہے وہ اس کے مسلمان وارثوں کو مل جاتی ہے اور جو کفر کے بعد کی کمائی ہے تو وہ بیت المال میں جمع کر دی جاتی ہے اس لئے سود سے توبہ نہ کرنا اگر حلال سمجھنے کی بناء پر ہو تو اس کو اصل راس المال بھی نہ ملے گا اور اگر حلال تو نہیں سمجھتا مگر عملاً باز نہیں آتا اور اس کے ساتھ جتھہ بنا کر حکومت اسلامیہ کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ باغی ہے اس کا بھی سب مال ضبط کر کے بیت المال میں امانت رکھا جاتا ہے کہ جب یہ توبہ کر لے تب اس کا مال اس کو واپس دے دیا جائے شاید اس قسم کی جزئیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بصورت شرط فرمایا گیا، اگر تم توبہ نہ کرو گے تو تمہارے رأس المال بھی ضبط ہو جائیں گے۔ (معارف القرآن)

تنگ دست کو مہلت دینا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر بیان کیجیے

وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۸۰﴾ البقرہ

جواب ترجمہ: اور اگر وہ تنگ دست ہے تو آسودہ حالی تک مہلت دینی چاہیے اور بخش دو تو تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

شان نزول: اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ جب آیت کریمہ فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ نازل ہوئی تو ان چار بھائیوں نے جو سودی کاروبار کرتے تھے نے کہا کہ ہم توبہ کرتے ہیں، ہمارے پاس اللہ اور رسول اللہ سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے، چنانچہ وہ رأس المال لینے پر رضامند ہو گئے اور انہوں نے بنو مغیرہ سے رأس المال کا مطالبہ کر دیا، بنو مغیرہ نے تنگ دستی کی شکایت کر دی اور کہنے لگے کہ ہمیں مہلت دیجیے، تو انہوں نے مہلت دینے سے انکار کر دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ نازل فرمائی۔ (تفسیر کبیر)

وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ: نَظِرَةٌ کا مطلب ہے تاخیر کرنا، مہلت دینا، قرآن کریم میں شیطان نے جب اللہ تعالیٰ سے جنت میں مہلت مانگی تھی تو اس کے لیے بھی أَنظِرْنِي کا لفظ استعمال ہوا کہ مجھے قیامت کے دن تک مہلت دیجیے، اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ تجھے مہلت دی گئی ہے۔ مَيْسَرَة اعسار کی ضد ہے جس کا معنیٰ آسانی کرنا ہے، جب آدمی کو مال میسر کیا جاتا ہے تو وہ میسرہ یعنی مالدار ہو جاتا ہے۔

سود خوری کی انسانیت سوز حرکت کے بالمقابل پاکیزہ اخلاق اور غریبوں اور ناداروں کے ساتھ مساہلت کے سلوک کی تعلیم دی جاتی ہے ارشاد ہوتا ہے اگر تمہارا مدیون تنگدست ہو تمہارا قرض ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک مہلت دی جائے اور اگر تم اس کو اپنا قرض معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ (معارف القرآن)

حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَن أَنظَرَ مُعسِراً أَو وَضَعَ عَنهُ أَظَلَّهُ اللهُ فِي ظِلِّهِ يَومَ

لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ، جس نے کسی تنگ دست کو مہلت دی یا اس سے کچھ کم کیا تو اللہ تعالیٰ اسے اس دن اپنا سایہ دیں گے جس دن اس کے سائے کے علاوہ کسی کا سایہ نہ ہو گا۔ حضرت ابو قتادہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو یہ بات محبوب ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کی سختیوں سے نجات دے اسے چاہیے کہ تنگدست کو مہلت دے یا پھر اسے معاف کر دے (مسلم)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کسی کا قرضہ ہو اور مقروض ادائیگی میں تاخیر کرے تو قرض خواہ کے لئے ہر دن کے عوض صدقہ ہے (احمد بحوالہ، مشکوٰۃ)

دیوالیہ اور افلاس: اور اگر مقروض تنگدست ہو اور قرض خواہ زیادہ ہوں تو اسلامی عدالت قرض خواہ یا قرض خواہوں سے مہلت دلوانے یا قرض کا کچھ حصہ معاف کرانے کی مجاز ہوتی ہے۔ (اس صورت حال کو ہمارے ہاں دیوالیہ کہتے ہیں اور عربی میں افلاس اور تفلیس) چنانچہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک شخص کو پھل کی خرید و فروخت میں نقصان ہوا اور اس کا قرضہ بہت بڑھ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا: اس پر صدقہ کرو، لوگوں نے صدقہ کیا، پھر بھی اتنی رقم نہ ہو سکی جو قرضے پورے کر سکے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہوں سے فرمایا: جو کچھ (قرضہ کی نسبت سے) تمہیں ملتا ہے لے لو اور تمہارے لئے یہی کچھ ہے (مسلم۔ کتاب المساقاۃ۔ باب وضع الجوائح)

وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ: یہاں معاف کرنے کو قرآن نے بلفظ صدقہ تعبیر فرمایا ہے جس میں اشارہ ہے کہ یہ معافی تمہارے لئے بحکم صدقہ ہو کر موجب ثواب عظیم ہو گی نیز یہ جو فرمایا کہ معاف کر دینا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے حالانکہ بظاہر تو ان کے لئے نقصان کا سبب ہے کہ سود تو چھوڑا ہی تھا اصل راس المال بھی گیا مگر قرآن نے اس کو بہتر فرمایا اس کی دو وجہ ہیں اول تو یہ کہ یہ بہتری اس دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد مشاہدہ میں آجائے گی جب کہ اس حقیر مال کے بدلہ میں جنت کی دائمی نعمتیں اس کو ملیں گی۔ دوسرے شاید اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ دنیا میں بھی تمہیں اس عمل کی بہتری کا مشاہدہ ہو جائے گا کہ تمہارے مال میں برکت ہو گی۔ (معارف القرآن) یہاں جو خیر کا لفظ استعمال

کیا گیا اس کا ایک مفہوم یہ ہے کہ ایسا کرنے سے انسان کی دنیا میں تعریف وستائش ہو گی جب کہ آخرت میں نہ ختم ہونے والا اجر وثواب ملے گا۔

إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ: اگر تم جانتے ہو یعنی اگر معاف کر دو تو تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم اس پر عمل کرو تب، یہاں عمل کو علم کے لوازمات میں سے ظاہر کیا گیا ہے، اس میں نافرمانوں کے لیے تہدید شدید ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم جانتے ہو کہ معاف کر دینے کو مہلت دینے پر فضیلت حاصل ہے۔ تیسرا یہ کہ اگر تم جانتے ہو کہ تمہارا پروردگار تمہیں جس بات کا حکم دے رہا ہے وہ تمہارے لیے ٹھیک ہے۔

اللہ کی بارگاہ میں پیشی اور اعمال کی جزا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۲۸۱) البقرہ

جواب ترجمہ: اور ڈرو تم اس دن سے جس میں لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف، پھر ہر جان کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو کچھ اس نے کسب کیا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یہ آیت مبارکہ ان بڑے لوگوں کے بارے میں ہے جو سودی کاروبار ومعاملات کرتے تھے، جو صاحب ثروت وصاحب مال تھے، صاحب جاہ وجلال تھے، لوگوں کے معین ومددگار تھے، انہیں اپنی مالداری اور ثروت کی بناء پر ہی لوگوں پر غلبہ حاصل تھا، اس لیے انہیں وعید وتہدید کی زیادہ ضرورت تھی تاکہ وہ سودی کاروبار ومعاملات سے باز آجائیں، لوگوں کے مال باطل اور ناجائز طریقہ سے ہڑپ کرنے سے رک جائیں، اس لیے اس آیت کے ذریعہ انہیں دھمکایا گیا اور انہیں خوف دلایا گیا۔

سب سے آخری آیت: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی یہ آخری آیت ہے، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا تو اس وقت سورۃ النساء کی آیت (۱۲۷) کلالہ آپ

ﷺ پر نازل ہوئی، پھر جب آپ ﷺ میدان عرفات میں جلوہ افروز تھے اس وقت سورۃ المائدہ کی آیت (۳) نازل ہوئی، جس میں اللہ تعالیٰ نے دین کی تکمیل اور نعمت اسلام کی تتمیم کا ذکر فرمایا، پھر سورۃ البقرہ کی آیت (۲۸۱) نازل ہوئی، تو جبریل امین نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ اسے ۲۸۰ ویں آیت کے بعد رکھ دیں، اس کے بعد نبی کریم ﷺ اکیاسی دن باحیات رہے، بعض کہتے ہیں اکیس دن، بعض کہتے ہیں سات دن اور بعض کہتے ہیں تین گھڑیاں باحیات رہے۔ (کبیر) امام شعبیؒ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ پر جو آخری آیت نازل ہوئی وہ آیت رباء ہے، یہ اس آیت کے آخری آیت ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ اس سے مراد یہ ہے کہ بیوع سے متعلق آیات میں آخری آیت آیت رباء ہے، یا مراد یہ ہے کہ آیت رباء آخر میں نازل ہوئی ہے اور تمام آیتوں کے لحاظ سے جو آخری آیت ہے وہ یہی آیت ہے۔ (روح المعانی)

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ: اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دن اور اس دن کے رب کی ملاقات کی تیاری کرو، اس سے ملاقات کی تیاری ان نیک اور صالح اعمال کے ساتھ ہوگی جو تم نے آگے بھیجے ہیں، سورۃ المزمل (۱۷) میں اشارہ دیا گیا ہے کہ **فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْماً يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيباً** سو اگر تم کفر کروگے تو اس دن سے کیسے بچوگے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا، قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ **اَلْيَوْمَ** ایک مخصوص زمانے کا نام ہے، اس کی شدت اور ہولناکی سے اس دن نہیں بچا جاسکتا، ہاں اس کی شدت اور ہولناکی سے بچنا دار دنیا میں ممکن ہے، جو گناہ اس ہولناکی اور خوفناکی میں شدت پیدا کریں گے ان سے دنیا میں بچا جائے، تو اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ **وَاتَّقُوا يَوْماً** اس دن سے ڈرو تو یہ تکالیف وشدت کی تمام اقسام کو شامل ہے۔

اللہ کی طرف لوٹاؤ جاؤ گے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کا کوئی مکان ہے یا کوئی جہت ہے، کیونکہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ سے محال ہیں، وہ جہت ومکان سے پاک ذات ہے، اور نہ ہی رجوع الی اللہ (اللہ کی طرف لوٹنا) سے مراد اس کے علم یا اس کی حفاظت میں لانا ہے کیونکہ وہ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں اللہ

ان کے ساتھ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو، اللہ تعالیٰ کے فرمان تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ کے دو مطلب ہیں پہلا یہ کہ انسانی احوال علی الترتیب تین طرح کے ہیں، پہلی حالت انسان کا اپنی ماں کے پیٹ میں ہونا ہے، جہاں انسان اپنے نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوتا، اس جہان میں تمام تر احوال میں ایک اللہ کی ذات ہی تصرف کرتی ہے۔

دوسری حالت انسان کا ماں کے پیٹ سے دنیا کے پیٹ میں ظاہر ہونا ہے، یہاں اس کے ابتدائی احوال کی درستگی اور اصلاح کے لیے اس کے ماں باپ کفیل ہوتے ہیں، پھر اس کے بعد ظاہری احکامات میں انسان ایک دوسرے کے احوال میں تصرف کرتے ہیں۔

تیسری حالت موت کے بعد کی ہے جہاں ظاہر ہے حقیقی طور پر اللہ ہی ان کے حالات کا متصرف ہوتا ہے، گویا کہ انسان جب دنیا سے نکلتا ہے تو اس حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے جس پر وہ دنیا میں آنے سے پہلے تھا، تو یہاں رجوع الی اللہ یعنی اللہ کی طرف لوٹنے کا مطلب یہ ہے۔ دوسرا مطلب رجوع الی اللہ کا یہ ہے یہ لوگ اس چیز کی طرف لوٹیں گے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ثواب یا عذاب کی شکل میں تیار کر رکھی ہے، یہ دونوں مطالب اور دونوں تاویلات بہتر ہیں اور لفظ کے مطابق ہیں۔

ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ: انسان اس دنیا میں ایک مقررہ وقت تک رہے گا، زندگی گزارے گا، پھر اسے دنیا چھوڑنا ہوگی، جان نکلنے کے بعد اسے سپرد پاتال کیا جائے گا، ایک عرصہ تک قبر میں رہے گا، پھر اللہ کی مرضی سے اسرافیل صور پھونکیں گے تو سب کو جو روئے زمین پر موجود ہوں گے وہ موت کے منہ میں چلے جائیں گے، پھر صور پھونکیں گے تو میدان محشر کی طرف چل پڑیں گے، پھر حساب کتاب ہوگا، نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کی جزائے خیر ملے گی، بدکاروں کو ان کی بدیوں کی جزائے بد ملے گی، لازمی طور پر ہر شخص کو اپنے کیے کا مزہ چکھنا ہوگا، اللہ کی طرف رجوع لازمی ہوگا، اللہ کی بارگاہ سے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔

سورۃ الزلزلہ میں واضح فرمایا کہ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

شَرًّا يَرَهُ (الزَّلْزَلَةِ) جو شخص ایک ذرہ برابر خیر کا کام کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا، جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا۔

سورۃ لقمان میں ارشاد فرمایا کہ إِنَّهَا إِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمَاوَاتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللَّهُ (لقمان: ۱۶) بیشک بات یہ ہے کہ اگر کوئی عمل رائی کے دانہ کے برابر ہو تو پھر وہ پتھر کے اندر ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو اللہ اس کو حاضر کر دے گا۔

سورۃ الانبیاء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حَاسِبِينَ (الْأَنْبِيَاءِ: ۴۷) اور قیامت کے دن ہم عدل والی میزان قائم کر دیں گے، سو کسی پر ذرا سا ظلم بھی نہ ہو گا اور اگر کوئی عمل رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو گا تو ہم اسے حاضر کر دیں گے۔

قرآن کریم نے یہاں ما كَسَبَتْ فرمایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نفس کو جو کچھ اس نے کمایا اس کی پوری جزا دی جائے گی، انسان تجارت کے ذریعہ جو کمائی کرتا ہے اسے مُكْتَسَب کہا جاتا ہے، تو قیامت کے دن ہر ایک کو اس کے کیے ہوئے اعمال کی جزا دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا فرمان ہے کہ وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور خود بھی اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، یہاں فرمایا کہ ہر کسی کو اس کے اعمال کی پوری پوری جزا دی جائے گی، وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ کسی کا ثواب کم کر کے اس پر ظلم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی کے برے اعمال پر سزا زیادہ دے کر ظلم کیا جائے گا۔

مداینت، کتابت اور شہادت کی اہمیت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ

يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَى أَجَلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَى أَلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۸۲) البقرہ

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم مقررہ مدت تک اُدھار لینے دینے کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، اور چاہیے کہ جو شخص تمہارے درمیان لکھنے والا ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھے، اور کوئی لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے اسے سکھایا ہے۔ سو چاہیے کہ لکھ دیا کرے، اور جس کے اوپر حق ہے اسے چاہیے کہ لکھوا دے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرے، سو اگر وہ شخص کم سمجھ ہو جس پر حق ہے یا ضعیف ہو یا املا کرانے پر قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے، اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنالیا کرو، پس اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں ان گواہوں میں سے جنہیں تم پسند کرتے ہو تاکہ ان دو عورتوں میں سے اگر ایک بھٹک جائے تو ایک دوسری کو یاد دلا دے، اور نہ انکار کریں گواہ جب ان کو بلایا جائے، اور قرضے کے معاملہ میں لکھنے سے مت اکتاؤ، چھوٹا ہو یا بڑا ہو اس کی مدت مقررہ تک یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی ہے اور اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو، مگر یہ کہ کوئی تجارت ہو جس میں لینا دینا دست بدست ہو جس کا تم آپس میں معاملہ کر رہے ہو سو تم پر اس بات کا کوئی گناہ نہیں کہ لکھا پڑھی نہ کرو، اور گواہ بنالیا کرو جب کہ تم آپس میں خرید و فروخت کا معاملہ کرو، اور نہ ضرر دیا جائے کاتب کو، اور نہ گواہ کو، اور اگر تم ایسا کرو تو بلاشبہ اس میں گناہ گاری ہے تمہارے لیے، اور اللہ سے ڈرو اللہ تمہیں سکھاتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا

جاننے والا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ: یہ آیت مبارکہ الفاظ کے لحاظ سے قرآن کریم کی سب سے بڑی آیت ہے، اس آیت کو حضرات مفسرین کرام نے آیۃ المداینہ کا نام دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے پہلے دو قسم کے احکامات دیے، ان میں سے ایک اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا مال میں کمی کا موجب ہے، دوسرا سود کو چھوڑنے کا حکم ہے، سود کو چھوڑنا بھی مال میں کمی واقع ہونے کا سبب ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں احکامات کا خاتمہ عظیم دھمکی کے ساتھ کیا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا کہ وَاتَّقُوا يَوْماً تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ اس دن سے تم لوگ ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

تقویٰ ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے لیے کمائی اور منافع کے بہت سے دروازے بند کر دیتی ہے، اس کے ساتھ ہی اس بات کا اعلان کیا کہ حلال مال کی حفاظت اور اسے تباہی و بربادی سے بچانے کی کیفیت کیا ہو گی، کیونکہ فی سبیل اللہ خرچ کرنا اور سود چھوڑنا اور تقویٰ کو لازم پکڑنا اس کی تکمیل اور اتمام مال کے حصول کے بغیر نہیں ہو سکتا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس باریک نکتے کی وجہ سے مال حلال کی حفاظت کے لیے وصیت فرمائی اور مال کے ضائع ہونے سے بچانے کا طریقہ بتایا۔

اس کی ایک مثال سورۃ النساء میں ارشاد فرمائی گئی ہے، جہاں اللہ نے فرمایا کہ وَلا تُؤْتُوا السُّفَهاءَ أَمْوالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِياماً (النساء: ۵) اور بیوقوفوں کو اپنے مال مت دو جن کو اللہ نے تمہارے لیے زندگی گزارنے کا ذریعہ بنایا ہے، اموال کے معاملے میں ایسی احتیاط کرنے کی ترغیب دی تاکہ وہ اموال معاش اور معاد کے مصالح کا سبب بن جائیں، قرآن کریم اختصار کے ساتھ اس طرح کی ترغیب دیتا چلا جا رہا ہے، مگر سورۃ البقرہ کی اس آیت میں بڑی شد و مد کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اموال کی حفاظت کا حکم دیا ہے۔

اس تاکیدی حکم کا اندازہ اس میں استعمال کیے گئے الفاظ و کلمات سے ہو رہا ہے، فرمایا کہ جب تم

ایک دوسرے کے ساتھ ایک معین مدت کے لیے لین دین کرو تو فَاكْتُبُوهُ اسے لکھ لو، یہ امر کا صیغہ ہے، پھر فرمایا کہ وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ چاہیے تمہارے درمیان ایک لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے، پھر فرمایا وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اسے اللہ نے سکھایا ہے۔

پھر امر کو دہراتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے دوبارہ فرمایا کہ فَلْيَكْتُبْ پس چاہیے کہ وہ لکھے، پھر فرمایا وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ چاہیے کہ جس پر حق واجب ہے وہ لکھوائے، اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ اور چاہیے کہ لکھے تمہارے درمیان ایک کاتب انصاف کے ساتھ، یہ اللہ کے اس فرمان وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سے کفایت کرتا ہے کیونکہ انصاف کے ساتھ لکھنے والا کاتب وہی کچھ لکھتا ہے جو اسے بولا جاتا ہے، جو اسے املاء کروایا جاتا ہے، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ اور چاہیے کہ وہ ڈرے اپنے پروردگار سے، یہ تاکیدی فرمان ہے، پھر اس کے بعد فرمایا وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئاً وہ اس میں کچھ بھی کمی نہ کرے، گویا کہ یہ اس سے پہلے والے جملے وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ سے مستفاد ہے۔

پھر اس کے بعد فرمایا وَلَا تَسْئَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيراً أَوْ كَبِيراً إِلَى أَجَلِهِ قرض کے معاملے میں لکھنے سے مت اکتاؤ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، اس کی مدت مقررہ تک، یہ بھی تاکید ہے اس حکم کی جو اس سے پہلے گزرا ہے۔

پھر اس کے بعد فرمایا کہ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَى أَلَّا تَرْتَابُوا یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت انصاف کی بات ہے اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی ہے اور اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو، گزشتہ فوائد انہی تاکیدات کے لیے بیان کیے ہیں، یہ سب اس بات پر دلالت ہے کہ پہلے دو حکموں میں جس بات کی ترغیب دی گئی ہے وہ دونوں مال میں کمی کا سبب تھے تو یہاں حلال مال کی حفاظت کی وصیت مبالغہ کے طور پر کی جارہی ہے تاکہ مال تباہی اور ضائع ہونے سے

بچ سکے تاکہ انسان انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے سے مضبوط ہو جائے اور اللہ کی ناراضگی میں مبتلا کرنے والی چیزوں سے اعراض کرے، تقویٰ پر ہمیشگی اختیار کرے، یہی بات یہاں ابتدا میں بہت ہی خوبصورت پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔

شانِ نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت گندم کی بیع سلم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ (بیع سلم یہ ہے کہ گندم کی قیمت پہلے ادا کر دی جائے اور فصل کٹنے کے بعد گندم کو وصول کیا جائے) اس میں گندم کی مقدار بھی معلوم ہو اور اس کی مدت بھی معلوم ہونی چاہیے۔ (جامع البیان)

اکثر مفسرین کرام بھی یہی فرماتے ہیں کہ مداینہ یعنی باہمی لین دین سے یہاں بیع سلم مراد ہے، اللہ تعالیٰ نے جب اس سے پہلی آیات میں سودی لین دین اور معاملات سے روکا ہے تو اس تمام آیت میں بیع سلم کی اجازت دی ہے کیونکہ جس قدر منافع اور فوائد سود سے حاصل ہوتے ہیں وہ بیع سلم سے بھی حاصل ہوتے ہیں، اسی لیے حضرات علماء کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حرام وناجائز طریقوں کے ساتھ لذت ومنفعت حاصل کرنے کو ختم کر کے منفعت ولذت حاصل کرنے کے جائز طریقے مقرر فرمائے ہیں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا ہے۔ (تفسیر کبیر)

اس آیت میں التَّدَایُنُ دَین کا باب تفاعل ہے، اس کا معنیٰ ہے تم نے ایک دوسرے کے ساتھ لین دین کیا ہے، تَدَایَنْتُمْ کا معنیٰ ہے تم نے ایک دوسرے کے ساتھ خرید وفروخت کی ہے دین کے ساتھ، اہل لغت کہتے ہیں قرض دَین کے علاوہ ہے، کیونکہ قرض اس چیز کا نام ہے کہ انسان درہم یا دینار کا قرض دے، یا دانے یا کھجور یا اس کے ساتھ ملتی جلتی چیزوں کا قرض دے، اس میں مدت مقرر کرنا جائز نہیں ہے جب کہ دین میں مدت مقرر کرنا جائز ہے، عربی زبان میں اَدَّانَ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی اپنا سودا ایک وقت مقررہ کے لیے ثمن کے بدلے میں بیچے، اور عربی میں اَدَانَ یُدِیْنُ اس وقت بولتے ہیں جب وہ قرض دے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو لوگ ایک یا دو

سال کی مدت پر کھجوروں میں بیع سلم کرتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: مَنْ أَسْلَفَ فَلْيُسْلِفْ فِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ وَوَزْنٍ مَعْلُومٍ إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ جو شخص کھجوروں میں بیع سلم کرے اس کا کیل معلوم ہو اور وزن معلوم ہو (یعنی مقدار معلوم ہو) اور اس کی مدت معلوم ہو۔ (صحیح مسلم)

پھر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو کیل (ناپ تول) وزن اور اجل (مدت) میں احتیاطی تدابیر سکھائیں، ارشاد فرمایا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ جب تم ایک دوسرے کے ساتھ ایک مقررہ وقت تک لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

بیع کی چار قسمیں: اکثر مفسرین کرام ارشاد فرماتے ہیں کہ بیوع (خرید و فروخت) چار قسم پر ہیں ایک بیع العین بالعین یعنی نقد مال کی نقد کے بدلے خرید و فروخت، یہ بیع یقینی طور پر مداینہ میں نہیں آتی، دوسری بیع الدین بالدین یعنی ادھار کی بیع ادھار کے ساتھ یہ تو باطل ہے یہ بھی اس آیت میں داخل نہیں ہے، اب یہاں دو قسمیں باقی رہ جاتی ہیں، ایک بیع العین بالدین یعنی کوئی چیز ثمن مؤجل کے ساتھ بیچے، اور چوتھی قسم بیع الدین بالعین ہے اسی کو بیع سلم کہتے ہیں، یہ دونوں اس آیت کے تحت داخل ہیں۔ نقد کو عربی میں عین کہتے ہیں اور ادھار کو دین کہتے ہیں۔

الْمُدَايَنَةُ باب مفاعلہ ہے، جس میں معاملہ جانبین سے ہوتا ہے مگر یہاں جانبین سے معاملہ مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم ایک دوسرے کے ساتھ اس چیز میں معاملہ کرو جس میں دین (ادھار) ہو۔ پھر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ تَدَايَنْتُمْ دَین پر خود دلالت کرتا ہے اس کے بعد دَین الگ کیوں ذکر کیا گیا، اس پر ابن الانباری فرماتے ہیں کہ تداین کے دو معنیٰ ہیں، ایک تداین بالمال اور دوسرا تداین بالمجازات، عربوں کا محاورہ ہے كَمَا تَدِينُ تُدَانُ جیسا کرو گے ویسا ہی کیے جاؤ گے اور الدَّيْنَ کا معنیٰ جزا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے الدَّيْنَ کو دو معنوں میں سے ایک معنیٰ کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تاکید کے لیے ذکر کیا ہے۔

أَجَلٍ مُسَمًّى: مقررہ وقت، انسانی اجل سے مراد اس کی عمر کا خاتمہ ہے، مستقبل میں معین وقت

کے لیے اجل الدین کہاجاتا ہے، عربی میں تاخیر کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے کہاجاتا ہے أَجِلَ الشَّیْءُ یَأْجِلُ أُجُولًا جب کوئی تاخیر کرے، الْآجِلُ یہ عاجل کی نقیض ہے، عاجل کا معنیٰ جلدی۔ مداینہ کہتے ہیں اس لین دین کو جو تاخیر کا تقاضا کرے، اس کے بعد الاجل (مدت) کے ذکر کا فائدہ مدت مقررہ کو ظاہر کرنا ہے، پھر مسمیٰ اس لیے ذکر کیا تاکہ پتہ چل جائے مدت کا معلوم ہونا ضروری ہے ورنہ بعد میں لڑائی کا اندیشہ رہتا ہے، اسی کو مفضی الی المنازعت کہاجاتا ہے، جب وقت مقرر کیا جائے تو صاف صاف سال کا نام لیا جائے مہینے کا نام لیا جائے، دن کا نام لیا جائے، تاریخ طے کر دی جائے، اگر کسی نے وقت مقرر کرتے وقت یوں کہا کہ میں اس دین کی ادائیگی کٹائی کے موسم میں کروں گا، بجائی کے موسم میں کروں گا، یا حجاج کی واپسی پر کروں گا تو اچھے طریقے سے طے کیے بغیر اس طرح کہنا اور کرنا جائز نہیں ہے۔

علامہ ابو بکر جصاص حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خبر دی ہے کہ بیع سلم جس میں مدت مقررہ کے بعد مبیع کی ادائیگی کی جاتی ہے وہ بھی اس آیت کے عموم میں داخل ہے، لہذا ہر وہ دین جس میں مدت مقرر ہو وہ اس آیت میں مراد ہے خواہ وہ کسی منافع کا بدل ہو یا کسی معین چیز کا عوض ہو اس لیے جس اجرت اور مہر کی میعاد مقرر ہو، اسی طرح عقد خلع، قتل عمد کی دیت اور بدل کتابت جن کی ادائیگی کی میعاد مقرر ہو وہ سب اس آیت سے مراد ہیں کیونکہ یہ وہ دیون ہیں جو کسی عقد سے ثابت ہیں اور ان میں ادائیگی کی میعاد مقرر ہے۔ (احکام القرآن)

فَاكْتُبُوهُ: اللہ تعالیٰ نے باہمی لین دین، قرض ادھار کو لکھوانے کے لیے دو باتوں کا حکم دیا ہے، ایک یہ حکم دیا کہ باہمی لین دین، قرض ادھار کو لکھ لیا کرو، دوسرا حکم دیا کہ باہمی لین دین، قرض ادھار پر اپنے مردوں میں سے دو گواہ یا دو عورتوں اور ایک مرد کو گواہ بنالیا کرو، لکھت اور شہادت کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں جو مدت مقرر ہوتی ہے اس میں مطالبہ میں تاخیر ہوتی ہے تو بندہ بھول بھی جاتا ہے، پھر اس میں لین دین کے انکار کی نوبت بھی آجاتی ہے، تو لکھت پڑھت جانبین کی طرف سے مال کی حفاظت

کا سبب بن جاتی ہے، کیونکہ صاحب دین کو جب معلوم ہو گا کہ اس کا حق کتابت میں آچکا ہے اور گواہی میں آچکا ہے تو وہ زیادہ مطالبہ کرنے سے ڈرے گا، اسی طرح وہ وقت مقررہ سے پہلے طلب کرنے سے ڈرے گا اور جس شخص پر دین ہے جب اسے لکھت پڑھت اور گواہی کا پتہ ہو گا تو وہ انکار کرنے سے ڈرے گا، اسی طرح وقت مقررہ سے پہلے وصولی کا خطرہ بھی نہیں رہے گا، لکھت پڑھت اور گواہی کی بناء پر لین دین اور قرض ادھار کے معاملے میں مضبوطی اور استحکام آئے گا، وقت مقررہ پر ادائیگی ممکن ہو جائے گی، لکھت پڑھت اور گواہی میں یقیناً یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے لکھت پڑھت اور گواہی دینے کا حکم دیا ہے، امر کا صیغہ استعمال ہوا ہے، اس میں بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ امر استحباب کے لیے ہے، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ امر وجوب کے لیے ہے، جمہور فقہاء مجتہدین کہتے ہیں کہ یہاں امر استحبابی ہے وجوبی نہیں ہے کیونکہ امر وجوبی ماننے کی صورت میں امت مسلمہ سخت مشکل میں آجاتی، جب کہ نبی کریم ﷺ تو مشکل میں ڈالنے کے لیے مبعوث نہیں ہوئے تھے بلکہ آسانی پیدا کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

لین دین کا کھرا پن: حضور ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کے ایک شخص نے دوسرے شخص سے ایک ہزار دینار ادھار مانگے، اس نے کہا گواہ لاؤ، جواب دیا کہ اللہ کی گواہی کافی ہے، کہا ضمانت لاؤ، جواب دیا اللہ کی ضمانت کافی ہے، کہا تو نے سچ کہا، ادائیگی کی معیاد مقرر ہو گئی اور اس نے اسے ایک ہزار دینار گن دیئے، اس نے تری کا سفر کیا اور اپنے کام سے فارغ ہوا، جب معیاد پوری ہونے کو آئی تو یہ سمندر کے قریب آیا کہ کوئی جہاز کشتی ملے تو اس میں بیٹھ جاؤں اور رقم ادا کر آؤں، لیکن کوئی جہاز نہ ملا، جب دیکھا کہ وقت پر نہیں پہنچ سکتا تو اس نے ایک لکڑی لی، بیچ سے کھوکھلی کر لی اور اس میں ایک ہزار دینار رکھ دیئے اور ایک پرچہ بھی رکھ دیا، پھر منہ کو بند کر دیا اور اللہ سے دعا کی کہ پروردگار تجھے خوب علم ہے کہ میں نے فلاں شخص سے ایک ہزار دینار قرض لئے اس نے مجھ سے ضمانت طلب کی، میں نے

تجھے ضامن کیا اور وہ اس پر خوش ہو گیا، گواہ مانگا، میں نے گواہ بھی تجھی کو رکھا، وہ اس پر بھی خوش ہو گیا۔

اب جبکہ میں نے ارادہ کیا کہ اپنا قرض ادا کر آؤں لیکن کوئی کشتی نہیں ملی، اب میں اس رقم کو تجھے سونپتا ہوں اور سمندر میں ڈال دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ رقم اسے پہنچا دے، پھر اس لکڑی کو سمندر میں ڈال دیا اور خود چلا گیا لیکن پھر بھی کشتی کی تلاش میں رہا کہ مل جائے تو جاؤں، یہاں تو یہ ہوا، وہاں جس شخص نے اسے قرض دیا تھا، جب اس نے دیکھا کہ وقت پورا ہوا اور آج اسے آجانا چاہیے تھا، تو وہ بھی دریا کنارے آن کھڑا ہوا کہ وہ آئے گا اور میری رقم مجھے دے دے گا یا کسی کے ہاتھ بھجوائے گا، مگر جب شام ہونے کو آئی اور کوئی کشتی اس کی طرف سے نہیں آئی تو یہ واپس لوٹا۔

کنارے پر ایک لکڑی دیکھی تو یہ سمجھ کر کہ خالی ہاتھ تو جا ہی رہا ہوں، اس لکڑی کو بھی لے چلوں، پھاڑ کر سکھالوں گا جلانے کے کام آئے گی، گھر پہنچ کر جب اسے چیرتا ہے تو کھنا کھن بجتی ہوئی اشرفیاں نکلتی ہیں، گنتا ہے تو پوری ایک ہزار ہیں، وہیں پرچہ پر نظر پڑتی ہے، اسے بھی اٹھا کر پڑھ لیتا ہے، پھر ایک دن وہی شخص آتا ہے اور ایک ہزار دینار پیش کر کے کہتا ہے یہ لیجئے آپ کی رقم، معاف کیجئے گا میں نے ہر چند کوشش کی کہ وعدہ خلافی نہ ہو لیکن کشتی کے نہ ملنے کی وجہ سے مجبور ہو گیا اور دیر لگ گئی، آج کشتی ملی، آپ کی رقم لے کر حاضر ہوا۔

اس نے پوچھا کیا میری رقم آپ نے بھجوائی بھی ہے؟ اس نے کہا میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے کشتی نہ ملی تھی، اس نے کہا آپ اپنی رقم لے کر خوش ہو کر چلے جاؤ، آپ نے جو رقم لکڑی میں ڈال کر اسے توکل علی اللہ ڈالی تھی، اسے اللہ نے مجھ تک پہنچا دیا اور میں نے اپنی رقم پوری وصول پالی۔ اس حدیث کی سند بالکل صحیح ہے۔ (بخاری، ابن کثیر)

حضرت سلیمان مرعشی رحمہ اللہ نے ایک دن اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا تم لوگ ایسے مظلوم شخص کو جانتے ہو وہ اپنے پروردگار سے دعا کرتا ہے مگر وہ اس کی دعا قبول نہیں کرتا؟ انہوں نے کہا یہ

کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا کہ رَجُلٌ بَاعَ بَيْعًا إِلَى أَجَلٍ فَلَمْ يُشْهِدْ وَلَمْ يَكْتُبْ، فَلَمَّا حَلَّ مَالُهُ جَحَدَهُ صَاحِبُهُ، فَدَعَا رَبَّهُ فَلَمْ يَسْتَجِبْ لَهُ، لِأَنَّهُ قَدْ عَصَى رَبَّهُ یہ وہ شخص ہے جس نے کوئی چیز ایک مدت کے لیے ادھار فروخت کی مگر اس پر نہ کسی کو گواہ بنایا اور نہ ہی کچھ لکھا، جب وقت مال وصولی کا آگیا تو اس شخص نے انکار کر دیا، پھر اس نے اپنے رب سے دعا کی مگر اس نے قبول نہیں کی کیونکہ اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی ہے۔ (ابن کثیر)

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ: یعنی یہ ضروری ہے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے، اس میں ایک تو اس طرف ہدایت کی گئی کہ کاتب کسی فریق کا مخصوص آدمی نہ ہو بلکہ غیر جانبدار ہو تاکہ کسی کو شبہ اور خلجان نہ رہے، دوسرے کاتب کو ہدایت کی گئی کہ انصاف کے ساتھ لکھے دوسرے کے فانی نفع کے لئے اپنا دائمی نقصان نہ کرے اس کے بعد کاتب کو اس کی ہدایت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ ہنر دیا ہے کہ وہ لکھ سکتا ہے اس کا شکرانہ یہ ہے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے کاتب کے ساتھ عدل کا ذکر فرمایا ہے، اس کی توجیہ یہ ہے کہ کاتب انصاف کے ساتھ لکھے، اس طرح دستاویز نہ لکھے کہ دین میں زیادہ لکھ دے اور نہ ہی کوئی چیز کم لکھے، اس طرح لکھے کی بوقت ضرورت یہ تحریر دلیل بننے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اگر لکھنے والا فقیہ ہو تو اس طرح لکھے کہ دونوں فریقوں میں سے کسی کی طرف جھکاؤ نہ ہو، اس طرح لکھے کہ دونوں فریق مطمئن ہوں، تحریر میں جانب داری کی وجہ سے کوئی دوسرے کے حق کو باطل نہ کر سکے۔۔

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ: آیت کے اس حصہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے جو شخص کاتب ہو اسے کتابت سے باز نہیں رہنا چاہیے، جو شخص لکھنا جانتا ہے اس پر لکھنا واجب ہے، جب کہ اس کی توجیہ یہ ہے کہ یہ حکم علی سبیل الارشاد ہے نہ کہ علی سبیل الایجاب، مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے لکھنے کا فن سکھایا ہے اور اس کے ذریعہ اسے شرعی احکام کی معرفت کے ساتھ مشرف فرمایا ہے اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کی اس اہم ضرورت کو پورا

کرنے کے لیے اوراس نعمت کے شکرانہ کے طور پر لکھنا چاہیے، یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی اسی طرح احسان کر، لوگ اس کی کتابت سے اس طرح فائدہ اٹھائیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے کتابت کی تعلیم دے کر اسے نفع پہنچایا ہے، کتابت سیکھنا فرض کفایہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرض وغیرہ کے معاملات لکھنے کا حکم دیا ہے اور یہ کام کتابت سیکھے بغیر نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر السعدی)

وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا: یعنی جس شخص کے ذمہ حق ہے وہ املا کرائے اور کاتب کو بتائے کہ یہ لکھ دو اور عبارت لکھوانے میں اللہ سے ڈرے، صحیح بات لکھوائے، پورا حق لکھوائے، حق واجب میں سے ذرا سی کمی بھی نہ کرے۔ تحریر کرانے میں اس کو خطاب فرمایا جس پر حق ہے کیونکہ جس پر حق ہے اس کا لکھوانا ایک قسم کا اقرار بھی ہے اور چونکہ اسی کو ادا کرنا ہے اس لیے حق واجب سے زیادہ تو لکھوا ہی نہیں سکتا، البتہ صاحب حق کی غفلت یا کم سمجھی یا محاورات نہ جاننے یا کاتبوں کی اصطلاحات نہ سمجھنے کے باعث اصل حق سے کم نہ لکھوا دے۔ (انوار)

فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهاً أَوْ ضَعِيفاً أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ: اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ وہ کم سمجھ اور خفیف العقل ہے یا کسی بھی اعتبار سے ضعیف ہے (جس میں کم سن نابالغ بچہ ہونا اور بہت زیادہ بوڑھا ہونا بھی شامل ہے جو کاتب تک نہیں پہنچ سکتا یا اس پر خطاء ونسیان غالب ہے) یا املاء کرانے لکھوانے پر قدرت نہیں رکھتا (مثلاً غیر ملکی ہے یا گونگا ہے یا بے پڑھا ہے۔ عبارت بنانے اور بولنے پر قدرت نہیں رکھتا یا جو عبارت دستاویز میں لکھی جاتی ہے وہ نہیں جانتا بات کے الٹ پلٹ ہونے کا اندیشہ ہے) تو اس کا ولی (جس کے ذمہ اس کے اعمال واموال کی دیکھ بھال ہے) انصاف کے ساتھ املا کرا دے۔ (انوار البیان)

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ: لین دین اور قرض ادھار کی صورت میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے لکھت پڑھت کا حکم دیا ہے اسی طرح اس پر گواہ بنالینے کا بھی حکم دیا ہے کہ اپنے مردوں میں

سے دو گواہ بنالو، اپنے مردوں سے مراد اپنے دین والوں میں سے دو مسلمانوں کو گواہ کرلو، اس کا فائدہ اس وقت ہوتا ہے جب لین دین اور ادھار کے بعد انکار کیا جاتا ہے، اس صورت میں جس شخص کا مال گیا ہوتا ہے اس کا نقصان ہوتا ہے، تو لکھت پڑھت اور گواہوں کی گواہی کی بناء پر اس کا مال ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔

فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ: اگر دو مرد نہ ملیں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنالی جائیں، ان لوگوں میں سے جو تم میں پسندیدہ ہوں۔ حضرات فقہاء کرام نے شہادت قبول کرنے کی جو شرائط لکھی ہیں، ان میں کوئی بھی آزاد، بالغ، مسلمان، عادل شخص گواہی دے سکتا ہے۔

أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى: یہاں ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی دینے کی حکمت بیان کی جارہی ہے، قرآن کریم کہتا ہے کہ دو عورتیں جب گواہی دے رہی ہوں، ان میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلادے، مطلب یہ ہے کہ بھول پن، نسیان عورتوں کی طبیعتوں پر غالب ہوتا ہے، کیونکہ ان کے مزاجوں میں برودت اور رطوبت زیادہ ہوتی ہے، جب کہ دو عورتوں کے یکجا ہونے کی صورت میں نسیان اور بھول پن کا وقوع نہیں ہوتا اگر ایک سے ہو جائے تو دوسری یاد دلادیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک مرد کی گواہی کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی رکھی گئی ہے۔ ضلال کے دو معنیٰ ہیں، ایک معنیٰ نسیان (بھول پن) دوسرا معنیٰ راستہ بھٹک جانا، جب کہ ابو عمرو کہتے ہیں کہ لغت میں ضلال کا معنیٰ ہوتا ہے چھپ جانا، غائب ہونا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ ضلال کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، شہادت میں ضلال یہ ہے کہ ایک چیز یاد رہے اور دوسری یاد نہ رہے اور انسان سرگشتہ و حیران ہو۔ (الجامع الاحکام القرآن) وکلاء بیان کرتے ہیں کہ پچانوے فی صد مقدمات میں جب عورتیں گواہی کے لیے پیش ہوتی ہیں تو یا رو پڑتی ہیں یا گھبرا کر اول فول باتیں کرتی ہیں یا کوسنا شروع کردیتی ہیں، اس کے مقابلہ میں مرد فطرۃ قوی، جرأت

مند اور دلیر ہوتا ہے اور فریق مخالف کے دباؤ سے مرعوب اور متاثر نہیں ہوتا، اس لیے وہ عدالت میں حوصلہ ہارے بغیر ٹھیک ٹھیک گواہی پیش کرتا ہے۔

اسلام نے جو نظام حیات پیش کیا ہے وہ چونکہ فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے، اس وجہ سے اس نے ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی رکھی ہے تاکہ گواہی کے موقع پر ان دونوں عورتوں کو ایک دوسری سے طمانیت خاطر رہے اور ڈھارس بندھی رہے اور جب کوئی عورت بوکھلا جائے اور گھبراہٹ میں کچھ کا کچھ کہنے لگے تو دوسری عورت اس کو صحیح بات یاد دلا دے۔

ایک مرد کی گواہی کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی کو مقرر کرنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ تجارتی مال کی پیچیدگیوں، لین دین کی باریکیوں اور قرض کی ضروری شرائط اور قیود سے عام طور پر مرد پوری طرح واقف ہوتے ہیں، اس کے برخلاف عورت چونکہ فطری اور شرعی طور پر صرف امور خانہ داری کی ماہر ہوتی ہے اور عام دنیاوی معاملات میں وہ براہ راست ملوث نہیں ہوتی اور اس کی باریکیوں سے کماحقہ واقف ہوتی ہے۔

اس وجہ سے کسی لین دین اور معاہدہ کے وقت فریق مخالف یہ چاہتا ہے کہ اس کے معاملہ پر زیادہ سے زیادہ تجربہ کار اور اہل شخص گواہی دے، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اولین مرحلہ میں دو مردوں کو گواہ بنایا جائے اور اگر دو مرد میسر نہ آسکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا دیا جائے تاکہ اس کے معاہدہ پر زیادہ سے زیادہ بہتر گواہی پیش کی جاسکے اور اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اس نے انسانی فطرت کے قریب گواہی کا یہ ضابطہ مقرر کیا ہے۔ تبیان القرآن)

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا: جب گواہوں کو گواہی کے لیے بلایا جائے تو گواہی دینے سے انکار نہ کریں، صاحب حق کو جب گواہی کی ضرورت پیش آئے تو گواہ پس وپیش سے کام نہ لے، جان نہ چھڑائے، اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے جس طرح کاتب (لکھنے والے) کو لین دین کی کتابت کے انکار سے منع کیا ہے اسی طرح گواہ کو گواہی نہ دینے سے روکا ہے، اس لیے ان میں

سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ متعلق ہے، کتابت اور گواہی سے انکار کی وجہ سے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔

شہادت کا لغوی اور اصطلاحی معنی: جس چیز کا مشاہدہ کیا ہو یا جس پر کوئی شخص حاضر ہو اس کی خبر دینا لغت میں شہادت ہے۔ (نہایہ، ابن اثیر جزری)۔ بصیرت سے یا آنکھوں کے ساتھ دیکھنے سے جس چیز کا علم حاصل ہو اس کی خبر دینے کو شہادت کہتے ہیں۔ (المفردات للاصفہانی)۔ جو شخص کسی جگہ حاضر ہو یا اس نے کبھی کسی چیز کو دیکھا ہو اس کی یقینی خبر دینے کو شہادت کہتے ہیں اور کبھی اس چیز کی خبر کو شہادت کہتے ہیں جس کا اس کو یقین ہو یا وہ چیز مشہور ہو۔ (شرح المہذب للبویطی الشافعی)

کسی حق کو ثابت کرنے کے لیے اَشْھَدُ میں گواہی دیتا ہوں کے الفاظ کے ساتھ مجلس قضاء میں سچی خبر دینا شہادت ہے۔ (فتح القدیر لابن الہمام الحنفی)۔ اَشْھَدُ کا لفظ اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ قسم کو شامل ہے گویا کہ گواہ یہ کہتا ہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے یہ واقعہ اسی طرح دیکھا ہے اور اب میں اس کی خبر دے رہا ہوں۔ (ابن نجیم الحنفی)

شہادت کی اقسام: (الف) **عینی شہادت**: یعنی گواہ آنکھوں سے دیکھے ہوئے کسی واقعہ کو بیان کرے، یہی شہادت فیصلہ کن ہوتی ہے (ہدایہ اخیرین)۔ (ب) **سمعی شہادت**: یعنی گواہ کسی چیز کو سن کر اس کی شہادت دے، جن امور کا تعلق مسموعات سے ہو، ان میں سمعی شہادت اتنی ہی معتبر ہوتی ہے جتنی عینی شہادت ہے۔ (ہدایہ اخیرین) (ج) **شہادت علی الشہادت**: اصل گواہ کسی شخص کو اپنی شہادت پر شاہد بنائے تب یہ گواہ اصل کی شہادت دے سکتا ہے۔ (ہدایہ اخیرین، تبیان القرآن)

قرآن مجید کی روشنی میں شہادت کا بیان: شہادت کے ساتھ دو حکم متعلق ہوتے ہیں ایک تحمل شہادت ہے اور دوسرا اداء شہادت۔ تحمل شہادت کا مطلب کسی وقوعہ کا معائنہ کرکے اس کو سمجھ کر منضبط کرنا۔ (الفقہ الاسلامی) اور اداء شہادت کا مطلب اس شہادت کو قاضی کے سامنے ادا کرنا۔

تحمل شہادت کے متعلق قرآنی آیات: وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا

رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ (البقرہ: ۲۸۲) اور اپنے مردوں سے دو گواہ بناؤ پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں، ان گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔ وَاَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ (البقرہ: ۲۸۲) ترجمہ: اور جب تم خرید و فروخت کرو تو گواہ بنالو۔ وَاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (الطلاق: ۲) اور اپنوں میں دو عادل (نیک) شخصوں کو گواہ بنالو۔

اور اداء شہادت کے متعلق قران مجید کی یہ آیات ہیں: وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق: ۲) اور اللہ کی خاطر شہادت ادا کرو وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا (البقرۃ: ۲۸۲) اور جب گواہوں کو (گواہی کے لیے) بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ. وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (البقرۃ: ۲۸۲) اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو گواہی چھپاتا ہے تو بیشک اس کا دل گنہ گار ہے۔ (تبیان القرآن)

شہادت کا حکم: علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تحمل شہادت اور اداء شہادت دونوں فرض کفایہ ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور جب گواہوں کو گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں، نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور گواہی نہ چھپاؤ اور جو گواہی چھپائے تو بے شک اس کا دل گناہ گار ہے۔ (البقرۃ: ۲۸۲) نیز اس لیے کہ شہادت ایک امانت ہے اور باقی امانتوں کی طرح اس کا ادا ہونا لازم ہے۔ (المغنی)

علامہ ابوالحسن مرغینانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں شہادت کا ادا کرنا واجب ہے، اور جب مدعی شاہد کو بلائے تو شہادت کو چھپانا جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب گواہوں کو بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ (البقرہ ۲۸۲) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور گواہی کو نہ چھپاؤ۔ (البقرہ ۲۸۲)

اور مدعی کا گواہ کو طلب کرنا اس لیے شرط ہے کہ یہ مدعی کا حق ہے، سو باقی حقوق کی طرح یہ بھی موقوف ہے اور حدود میں شہادت دینے پر گواہ کو اختیار ہے کہ خواہ ستر کرے خواہ اظہار کرے کیونکہ دونوں چیزوں میں ثواب ہے پردہ پوشی میں بھی اور اقامت حدود میں بھی اور ستر افضل ہے کیونکہ

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ہزال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کاش تم اپنے کپڑے سے اس کا ستر کر لیتے۔ (سنن ابو داؤد) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ س کی دنیا اور آخرت میں پردہ پوشی کرے گا۔ (بخاری) اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے حدود ساقط کرنے کے بارے میں جو روایات منقول ہیں ان سے ستر کا افضل ہونا صراحتاً معلوم ہوتا ہے۔ (ہدایہ)

علامہ مرغینانی کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطلقاً ستر افضل ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے، اگر کوئی شخص گناہ کرنے کے بعد اس پر نادم ہو تو اس کی پردہ پوشی کرنا افضل ہے اور جو شخص علی الاعلان بدکاری کرتا ہو جس سے حدود الٰہیہ کا احترام مجروح ہوتا ہو تو پھر اس کے خلاف شہادت دینا افضل ہے۔ (تبیان القرآن)

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تحمل شہادت میں مسلمان کے حق کا تحفظ ہے اور مسلمان کے حق کا تحفظ کرنا اَولی ہے اور تحمل شہادت سے انکار کرنا خلاف اَولی یا مکروہ تنزیہی ہے اور قرآن مجید کی جن آیات میں شہداء کا لفظ آیا ہے اس سے مراد اداءِ شہادت کرنے والا ہے کیونکہ شہادت تحمل کرنے والے کو شاہد مجازاً کہا جاتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جب شاہد کو مدعی بلائے تو شہادت ادا کرنا فرض ہے اور تحمل شہادت کرنا مستحب ہے (فتح القدیر، تبیان)

تحمل شہادت کی شرائط: شہادت کی شرائط دو قسم کی ہیں، تحمل شہادت (حصول شہادت) کی شرائط اور ادائیگی شہادت کی شرائط، تحمل شہادت کی شرائط یہ ہیں کہ جس وقت گواہ کسی وقوعہ کو دیکھ رہا ہے اور گواہی کو حاصل کر رہا ہے تو وہ شخص مجنون نہ ہو، ناسمجھ بچہ نہ ہو اور یہ شخص بصیر ہو، لہٰذا اندھے کا تحمل شہادت کرنا جائز نہیں ہے، نیز مشہود بہ (جس چیز کی گواہی دینی ہے) کا وہ خود مشاہدہ کرے کسی اور کے مشاہدہ کا تحمل نہ کرے، البتہ بعض اشیاء میں لوگوں سے سن کر تحمل شہادت کرنا بھی جائز ہے۔ (بدائع الصنائع) تحمل شہادت کے لیے بلوغ، حریت، اسلام اور عدالت (نیک چلنی) شرط نہیں ہے حتی

کہ اگر تحمل شہادت کے وقت وہ سمجھ دار بچہ ہو یا غلام ہو یا کافر ہو یا فاسق ہو پھر بچہ بالغ ہو جائے یا غلام آزاد ہو جائے یا کافر مسلمان ہو جائے یا فاسق توبہ کرلے اور پھر وہ قاضی کے پاس شہادت دیں تو ان کی شہادت قبول کی جائے گی۔ (البحر الرائق)

بلحاظ شاہد ادائیگی شہادت کی شرائط: شہادت ادا کرنے کے لیے شاہد میں عقل، بلوغ، بصر اور نطق (گویائی) کی شرط ہے اور یہ کہ اس کو حد قذف نہ لگی ہو (یہ شرط احناف کے نزدیک ہے) اور یہ کہ وہ محض اللہ کے لیے شہادت دے، اس کا مقصد نہ کسی نفع کو حاصل کرنا ہو اور نہ کسی ضرر کو دور کرنا ہو اور یہ کہ اس مقدمہ میں وہ شخص خود فریق نہ ہو اور یہ کہ اداء شہادت کے وقت اس کو مشہود بہ کا علم ہو اور وہ اس کو یاد ہو (یہ شرط امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہے صاحبین کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے) (بدائع الصنائع)

عدالت کی تعریف: گواہوں کا عادل (نیک) ہونا قاضی پر وجوب قبول کے لیے شرط ہے، نفس شہادت کے جواز کے لیے گواہوں کا عادل ہونا شرط نہیں ہے۔ (البحر الرائق) امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک عدالت ظاہر یہ شرط ہے اور عدالت حقیقیہ جو تزکیہ شہود اور تعدیل سے ثابت ہوتی ہے وہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک شرط نہیں ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک عدالت حقیقیہ شرط ہے۔ (البدائع الصنائع) اس زمانہ میں فتوی صاحبین کے قول پر ہے۔ (کافی) امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے جو عدالت کی تفسیر منقول ہے وہ یہ ہے کہ شہادت میں عدل یہ ہے کہ شاہد کبائر (بڑے گناہ) سے مجتنب (بچتا) ہو اور صغائر (چھوٹے گناہ) پر اصرار کرنے والا نہ ہو اور اس کی نیکیاں اس کی برائیوں سے زیادہ ہوں اور اس کی درست باتیں اس کی غلط باتوں سے زیادہ ہوں، یہ عدالت کی سب سے بہترین تفسیر ہے۔ (نہایہ)

عورت کی شہادت کے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات: ① زنا کے اثبات کے لیے چار آزاد مسلمان مردوں کی گواہی ضروری ہے اور اس میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں ہے۔ علامہ ابن قدامہ

حنبلی لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہی نظریہ ہے۔(المغنی ج ۱۰)اور علامہ ابن رشد مالکی نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔(بدایۃ المجتہد)

② بقیہ حدود اور قصاص میں کم از کم دو آزاد اور مسلمان مردوں کی گواہی ضروری ہے اور عورتوں کی گواہی جائز نہیں ہے۔(مغنی)

③ عطاء اور حماد سے منقول ہے کہ تین مردوں کی گواہی بقیہ حدود اور قصاص کے اثبات کے لیے کافی ہے، یہ حضرات حدود اور قصاص کو بھی اموال پر قیاس کرتے ہیں۔ (المغنی) ④ شیخ ابن حزم نے فقہاء اربعہ کے اجماع کی مخالفت کی ہے،وہ کہتے ہیں کہ حدود اور قصاص میں عورت کی شہادت مطلقاً مقبول ہے چنانچہ آٹھ عورتوں کی گواہی سے زنا ثابت ہو جائے گا اور بقیہ حدود اور قصاص میں عورت ایک مرد اور دو عورتیں یا چار عورتیں گواہی دیں تو وہ ثابت ہو جائیں گے۔(المحلی)

⑤ تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ قرض اور کاروباری معاملات میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت جائز ہے۔(المغنی)

علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ فقہاء احناف کے نزدیک مالی حقوق کے علاوہ میں مثلاً نکاح، طلاق وصیت، عدت، حوالہ، وقف اور صلح وغیرہ میں بھی ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت جائز ہے یعنی حدود اور قصاص کے سوا تمام معاملات میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنانا جائز ہے اور امام مالک رحمہ اللہ اور شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ان معاملات میں عورت کو گواہ بنانا جائز نہیں ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کے اس میں دو قول ہیں(فتح القدیر)

⑥ وہ تمام امور جن پر مرد مطلع نہیں ہوتے مثلاً حیض، عدت، رضاعت، ولادت، بکارت اور عورتوں کے عیوب وغیرہ ان میں صرف ایک عورت کی گواہی بھی جائز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جن چیزوں کو دیکھنے کی مرد استطاعت نہیں رکھتے ان میں عورتوں کی گواہی جائز ہے۔(مصنف)

جھوٹی گواہی: حضور و نے جھوٹی گواہی (شہادت زور) کو شرک کے برابر قرار دیا ہے خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ فرقان میں عباد الرحمن کی صفات بیان فرمائی ہیں، ان میں یہ بھی ہے۔ والذین لا یشھدون الزور کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے، جھوٹی گواہی دینا سخت گناہ کی بات ہے، اس کی وجہ سے ہی جھوٹ کا سچ اور سچ کا جھوٹ بن جاتا ہے۔ (معالم العرفان)

بچوں کی گواہی: بچوں کی گواہی کے متعلق فقہاء کے مابین اختلاف رائے ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف امام محمد اور زفر کا قول ہے کہ بچوں کی گواہی کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ یہی ابن شبرمہ، سفیان ثوری اور امام شافعی کا قول ہے ابن ابی لیلیٰ کا قول ہے کہ بچوں کی بچوں پر گواہی جائز ہے۔

امام مالک کا قول ہے کہ زخموں کے سلسلے میں بچوں کی آپس میں ایک دوسرے پر گواہی جائز ہے (شاید صورت یہ ہو کہ بچے اکٹھے ہوں پھر وہ جھگڑ پڑیں اور مار پیٹ کی نوبت آجائے جس کے نتیجے میں انہیں زخم آئیں) دوسرے بچوں پر جو اس جگہ موجود نہ ہوں ان کی گواہی جائز نہیں ہوگی۔ آپس میں ایک دوسرے پر ان کی یہ گواہی صرف زخموں کے متعلق جائز ہوگی بشرطیکہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے اور جوش میں آنے نیز سکھائے پڑھانے جانے سے پہلے پہلے وہ یہ گواہی دے دیں۔ اگر علیحدہ ہونے کے بعد گواہی دیں تو یہ گواہی معتبر نہیں ہوگی، ہاں اگر علیحدہ ہونے سے قبل انہوں نے اپنی دی ہوئی گواہی پر اور گواہ بنا لیے ہوں تو بعد میں بھی ان کی یہ گواہی معتبر ہوگی، صرف آزاد بچوں کی گواہی جائز ہوگی آزاد بچیوں کی گواہی جائز نہیں ہوگی۔ (احکام القرآن للجصاص)

وَلَا تَسْئَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيراً أَوْ كَبِيراً إِلَى أَجَلِهِ: یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ادھار لین دین کے معاملات میں اولاً یہ حکم دیا کہ لکھت پڑھت کی جائے، ثانیاً یہ حکم دیا کہ گواہ بنا لیا جائے، پھر تاکیدی طور پر اس بات کو دہرایا گیا ہے اور فرمایا وَلَا تَسْئَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيراً أَوْ كَبِيراً إِلَى أَجَلِهِ اور قرضے کے معاملہ میں لکھنے سے مت اکتاؤ، چھوٹا ہو یا بڑا ہو اس کی مدت مقررہ تک، واضح کر دیا گیا کہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ احتیاط اسی میں ہے کہ لکھت پڑھت کی جائے اور گواہ

بنالیا جائے۔

اس احتیاطی تدبیر میں زیادہ اور تھوڑا مال ایک ہی حکم رکھتا ہے، کیونکہ فریقین کے درمیان تھوڑا مال ہی بہت دفعہ بڑی لڑائی اور فساد کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت تھوڑے یا زیادہ ادھار لین دین کی لکھت پڑھت کا حکم دیا ہے فرمایا ہ اکتاؤ نہیں، سستی کا مظاہرہ نہ کرو، سستی، کاہلی اور اکتاہٹ کے باعث اس حکم کو ترک کرنے سے کہیں ندامت و شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ذٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنٰى أَلَّا تَرْتَابُوا: یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی ہے اور اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو، ادھار لین دین کی لکھت، پڑھت اور گواہی میں ایک فائدہ یہ بیان کیا گیا کہ یہ اللہ کے نزدیک بہت ہی انصاف کی بات ہے، علامہ قفال فرماتے ہیں کہ یہاں ذٰلکم سے مراد یہ ہے کہ جس لکھت پڑھت اور اپنے پسندیدہ لوگوں کو گواہ بنانے کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے یہ اللہ کے نزدیک بہت ہی زیادہ انصاف کی بات ہے، اقسط اسم تفضیل کا صیغہ ہے، اللہ تعالیٰ کے جب یہ انصاف کی بات ہے تو انصاف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بہت پسند کرتے ہیں۔ أَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ یعنی استقامت میں بہت زیادہ بلیغ، یہ اعوجاج (ٹیڑھاپن) کی ضد ہے۔ ادھار لین دین کے لیے لکھت پڑھت سے اللہ تعالیٰ کی رضا ملتی ہے جب کہ گواہ بنانا دنیاوی مصلحت ہے، اسی لیے کتابت کو پہلے ذکر کیا اور گواہی کو بعد میں تاکہ پتہ چل جائے کہ دین کو دنیا سے مقدم رکھنا ضروری ہے۔

وَأَدْنٰى أَلَّا تَرْتَابُوا اور اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم لوگ شک میں نہ پڑو، اس کا مطلب یہ ہے کہ ادھار لین دین کرنے والے دونوں فریقوں کے دلوں سے شک وشبہ کو ختم کرنے کے زیادہ قریب ہے کہ لین دین تھوڑا ہو یا زیادہ اسے لکھا جائے اور اس کا گواہ بنایا جائے، یہاں دو چیزیں پہلے بیان کی گئیں اور اب یہاں تیسری چیز بیان کی گئی ہے پہلی میں دینی مصلحت کے حصول کی طرف اشارہ تھا، دوسری

میں دنیوی مصلحت کے حصول کی طرف اشارہ تھا اور اب یہاں اپنی جان سے نقصان دور کرنے اور دوسرے کی جان سے نقصان دور کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

اپنی جان سے نقصان اس طرح دور کیا جاتا ہے کہ انسان کی یہ فکر باقی نہیں رہتی کہ یہ کام کیسے ہو گا؟ کیونکر ہو گا؟ اور دوسرے سے نقصان اس طرح دور کرنا ہے کہ بسا اوقات کسی کی طرف جھوٹ اور کمی بیشی کی نسبت کر دی جاتی ہے، غیبت اور بہتان تراشی میں وقت و ایمان ضائع کیا جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے بہت ہی پیارے اور احسن انداز میں یہاں ترتیب وار ان چیزوں کو ذکر کیا ہے۔

إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ: مگر یہ کہ کوئی تجارت ہو جس میں لینا دینا دست بدست ہو جس کا تم آپس میں معاملہ کر رہے ہو سو تم پر اس بات کا کوئی گناہ نہیں کہ لکھت پڑھت نہ کرو۔ عربی گرائمر میں الا حرف استثناء ہے، جو حکم پہلے دیا گیا کہ ادھار لین دین پر لکھت پڑھت اور گواہ بنالیا کرو، یہاں تجارت کی ایک صورت ایسی بیان کی جارہی ہے جس میں ادھار لین دین نہیں ہوتا بلکہ دست بدست ہوتا ہے، ایک ہاتھ سے بیچنے والے نے مال دیا اور دوسرے ہاتھ سے رقم وصول کی، یعنی نقدی لین دین کیا گیا، اس میں ادھار نہیں کیا گیا، اس صورت میں قرآن کریم بتاتا ہے کہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر بعض اوقات ادھار لین دین مختصر مدت کے لیے ہوتا ہے اور بعض اوقات لمبی مدت کے لیے ہوتا ہے، تو یہاں اجازت دی جارہی ہے کہ مختصر مدت کے لیے جو لین دین ادھار کیا جارہا ہے اسے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، مختصر مدت یا مدت قریب ہی کو قرآن کریم نے یہاں تِجَارَةً حَاضِرَةً فرمایا ہے، تجارت اور لین دین کی اس قسم میں اللہ تعالیٰ نے لکھت پڑھت اور گواہی کو اس لیے ضروری نہیں قرار دیا کیونکہ یہ طریقہ لوگوں میں عام رواج پذیر ہوتا ہے، اگر اس طریقہ تجارت میں بھی لکھنے اور گواہی کا حکم دیا جاتا تو یہ صورت اللہ کی مخلوق کے لیے تکلیف و مشقت کا باعث بنتی، پھر

جب بائع اور مشتری دونوں نے اپنا اپنا حق لے لیا، مشتری نے سامان لے لیا اور بائع نے سامان کی قیمت لے لی تو اب انکار کا خوف جاتا رہا، اس لیے یہاں لکھت اور گواہ کی ضرورت نہ رہی۔

تجارت: تجارت مال میں تصرف کرنے کا نام ہے، خواہ وہ دست بدست ہو یا نفع طلبی کے لیے کسی کے ذمہ ہو، خواہ یہ خرید و فروخت ادھار ہو یا نقدی، سب پر تجارت کا لفظ بولا جاتا ہے، مگر قرآنی اسلوب نگارش سے پتہ چلتا ہے کہ تجارت وہی ہے جو دست بدست اور نقد ہو۔

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ: سے معلوم ہوا کہ جب تجارت اور خرید و فروخت دست بدست، نقدی ہو تو اس صورت میں نہ لکھنے کی اجازت تو ہے، ہاں اگر لکھ لیا جائے تو بھی کوئی پابندی نہیں ہے، آج کل خرید و فروخت کرتے وقت رسید وغیرہ جاری کی جاتی ہے جو ثبوت کے لیے بہترین چیز ہے، اس رسید پر خریدار کا نام لکھا جاتا ہے اور فروخت کرنے والے کا نام اور پتہ بھی درج ہوتا ہے، جو اطمینان کے لیے کافی ہے۔ یہاں کتابت کی چھوٹ تو دی گئی ہے مگر گواہی کی چھوٹ نہیں دی گئی، کیونکہ گواہی لکھت پڑھت کے بغیر کوئی زیادہ پریشان کن بات نہیں ہوتی، جب اس کی ضرورت پیش آجائے تو بھول چوک کا خوف بھی نہیں ہوتا، یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سب علی سبیل الاحتیاط کرنے کا فرمایا جارہا ہے۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ: اس میں اس بات کا احتمال ہے کہ یہ ممانعت کاتب اور شہید دونوں کے لیے ہو کہ وہ صاحب حق کو ضرر نہ پہنچائیں، کاتب کی طرف سے صاحب حق کو نقصان پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہیں زیادہ نہ لکھ دے، کہیں کم نہ لکھ دے یا احتیاط کو ترک نہ کر دے، گواہ کی طرف سے صاحب حق کو نقصان پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ گواہی سے انکار نہ کر دے یا گواہی تو دے مگر اس طرح دے کہ جو مفید مطلب نہ ہو، اور اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نہی صاحب حق کے لیے ہو کہ وہ کاتب اور گواہ کو کہیں نقصان نہ پہنچائے، وہ اس طرح کہ کاتب کی اجرت نہ دے اور گواہ کو شہادت کے لیے ایسی حالت میں طلب کرے کہ وہ اپنے کام میں مشغول ہو یا بیمار ہو یا کمزور ہو

اور شہادت کا اس پر حصر بھی نہ ہو بلکہ دوسرے گواہان واقعہ موجود ہوں۔

وَإِنْ تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ: اگر تم ایسا کروگے تو یہ تمہارے گناہ گار ہونے کی بات ہے۔ گناہ گار اس شخص کا نام پڑے گا جو کتابت میں تحریف کرے اور اس شخص کا نام پڑے گا جو گواہی سے روکے یہاں تک کہ حق کو مکمل طور پر باطل کر دے، تو یہ بات کاتب اور گواہ کو نقصان پہنچانے سے زیادہ نقصان دہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گواہی سے باز رہنے والے اور گواہی کو چھپانے والے کے بارے میں فرمایا کہ ان کا دل گناہ گار ہے، قرآن کریم میں گناہ کے لیے آثم اور فاسق کا لفظ استعمال ہوا ہے اور یہ دونوں لفظ معنیٰ کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ ایک مطلب اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم وہ کرو (نقصان پہنچاؤ) جس سے میں نے تمہیں روکا ہے یا تم اسے چھوڑ دو جس کے کرنے کا تمہیں حکم دیا ہے تو پھر تم گناہ گار ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کے امر سے نکلنے والے اور اس کی نافرمانی کرنے والے ہو۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ: قرآن کریم کی یہ عادت ہے کہ وہ ہر وقت انسان کے ضمیر کو جگاتا ہے، انسان کے دل میں یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار شخصیت ہے تاکہ اطاعت قانون کا جذبہ خود نفس انسانی کے اندر سے پیدا ہو، اسلام صرف دفعات قانون کے دباؤ پر اکتفاء نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ قرآن اہل ایمان کو خدا خوفی کی دعوت دیتا ہے اور یہ بات تقریباً ہر مضمون کے خاتمہ پر کی جاتی ہے، قرآن کریم اہل ایمان کو یاد دلاتا ہے کہ یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے تم پر اپنا فضل و کرم کیا، وہی ہے جو تمہیں تعلیم دیتا ہے اور تمہاری راہ نمائی کرتا ہے، خدا خوفی سے ان کے دلوں کے دروازے معرفت الٰہیہ کے لئے کھل جاتے ہیں، ان کی روح علم حاصل کرنے کے لئے متوجہ ہوتی ہے اور یہ سب کچھ محض اس لئے ہے کہ وہ اس کے فضل و کرم کا شکرانہ ادا کرتے ہوئے اس کی اطاعت کریں، اس سے راضی ہوں اور اس کی ذات پر مکمل بھروسہ کریں۔ (فی ظلال القرآن)

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے تمام اوامر و نواہی میں اس سے ڈرو، پھر فرمایا

کہ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وہ تمہیں سکھاتا ہے جس میں تمہاری راہنمائی ہوتی ہے اور جس میں دنیوی معاملات میں تمہارے لیے احتیاط ہوتی ہے، جس طرح اس نے دینی معاملات میں تمہاری راہنمائی کی ہے۔

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ: اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمام دنیوی اور اخروی مصالح کو جانتا ہے اور خوب جانتا ہے۔

رہن، تحریر اور گواہی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (۲۸۳) البقرہ

جواب ترجمہ: اور اگر تم سفر پر ہو اور تمہیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو (ادائیگی کی ضمانت کے طور پر) رہن قبضے میں رکھ لیے جائیں۔ ہاں اگر تم ایک دوسرے پر بھروسہ کرو تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے وہ اپنی امانت ٹھیک ٹھیک ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے۔ اور گواہی کو مت چھپاؤ، اور جو گواہی کو چھپائے وہ گنہگار دل کا حامل ہے، اور جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ: اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لئے کوئی کاتب نہ ملے تو رہن بالقبض پر معاملہ کرو، جب تمہیں دستاویز اور گواہی کے ذریعے اطمینان حاصل کرنے اور بات پختہ کرنے کی صورت حاصل نہ ہو تو ایسی حالت میں رہن بالقبض اطمینان اور وثوق کا ذریعہ بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت میں جہاں دستاویز اور گواہوں کے ذریعے اطمینان اور توثق حاصل نہ ہو سکتا ہو، وہاں اس کے لئے رہن کو دستاویز اور گواہی کو قائم مقام بنادیا، اللہ تعالیٰ نے آیت میں سفر کی حالت کا ذکر کیا ہے، اس لئے کہ سفر کے اندر عام حالات میں دستاویز اور گواہ مہیا نہیں ہوتے۔ (احکام القرآن للجصاص)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَهَنَ النَّبِی صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دِرعًا عِنْدَ يَهُودِيٍّ بِالْمَدِينَةِ وَأَخَذَ مِنْهُ شَعِيرًا لِأَهْلِهِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک زرہ مدینے کے ایک یہودی کے پاس گروی رکھ دی تھی اور اس سے اپنے اہل خانہ کے لئے جو ادھار لئے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے حالت قیام میں رہن کا جواز ثابت ہو گیا۔ (احکام القرآن للجصاص)

فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ یہ اس بات پر دو طرح سے دلالت کرتا ہے کہ قبضہ کے بغیر رہن درست نہیں ہوتا، ایک تو یہ کہ اس سے ماقبل کے قول پر عطف کیا گیا ہے جو یہ ہے وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ جب گواہوں کے لئے تعداد اور صفت کی شرطوں کا پورا ہونا واجب ہے تو یہ بھی واجب ہے کہ رہن کا حکم بھی صفت کی شرط کے لحاظ سے ایسا ہی ہو اور رہن صرف اس صفت کی بنا پر اس طرح درست ہو جس طرح گواہوں کی گواہی مذکورہ اوصاف کی بنا پر درست ہوتی ہے، اس لئے کہ ابتداء سے ان کی طرف خطاب کا رخ امر کے صیغے کے ساتھ ہوا جو ایجاب کا مقتضی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ رہن کا حکم آیت سے ماخوذ ہے اور آیت نے اس صفت یعنی قبضے کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے، اس لئے اس کے سوا کسی اور صورت کے تحت اس کی اجازت ناجائز ہو گی، اس لئے کہ رہن کے جواز کے لئے آیت کے سوا اور کوئی اصل یا بنیاد موجود نہیں ہے۔ (احکام القرآن)

رہن کی تعریف: لغت میں رَهْنٌ کا معنی ہے کسی چیز کو روک لینا اللہ نے فرمایا: كُلُّ نفس بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ہر شخص اپنے اعمال سے وابستہ ہے۔ (مظہری)

شریعت کی اصطلاح میں رہن وہ چیز ہوتی ہے جو قرض کے بدلے میں کسی شخص کے پاس رکھی جاتی ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر قرضہ کی رقم مقررہ مدت میں ادا نہ کی جائے تو قرض خواہ اس چیز کو فروخت کر کے اپنی رقم پوری کرے اور جو کچھ باقی بچے وہ مقروض کو لوٹا دے اس اصطلاح میں مقروض یا مدلون کو راہن کہتے ہیں کہ اس نے کوئی چیز رہن رکھی ہے اور جس کے پاس رہن رکھی

جاوے وہ مرتہن کہلاتا ہے، رہن میں چیز پر قبضہ ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر رہن مکمل نہیں ہوتا، فرھن مقبوضۃ میں اسی طرف اشارہ ہے رہن میں منقولہ یا غیر منقولہ کوئی بھی جائیداد رکھی جاسکتی ہے ،مثلاً مکان، زمین، باغ، جانور، زیور، گاڑی وغیرہ وغیرہ۔(معالم العرفان)

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ: اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کرکے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ امانت ادا کر دے، اللہ تعالیٰ نے امانت کے ذکر کو رہن پر عطف کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ رہن امانت نہیں ہے اور جب امانت نہیں ہے تو اس کا تاوان بھرنا پڑے گا، اس لئے کہ رہن اگر امانت ہوتا تو اس پر امانت کو عطف نہ کیا جاتا کیونکہ ایک چیز کو اس کی اپنی ذات پر عطف نہیں کیا جاتا ہے بلکہ دوسری چیز پر عطف کیا جاتا ہے۔

رہن کے حکم کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد رحمہ اللہ، امام زفر رحمہ اللہ، ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ اور حسن بن صالح رحمہ اللہ کا قول ہے کہ رہن کا تاوان ہوتا ہے، یہ تاوان اس کی قیمت اور قرض کی رقم میں سے جو چیز کم ہوگی، اس کی صورت میں ادا کیا جائے گا، ثقفی نے عثمان البتی سے یہ نقل کیا ہے کہ اگر رہن سونے، چاندی یا کپڑوں کی صورت میں ہو تو ضائع ہو جانے کی صورت میں اس کا تاوان بھرنا پڑے گا اور جو زائد مقدار ہوگی اسے راہن اور مرتہن آپس میں ایک دوسرے کو لوٹا دیں گے، اگر رہن زمین یا جانور کی صورت میں ہو اور پھر ہلاک ہو جائے تو وہ راہن کے مال سے ہلاک ہوگا اور مرتہن کا حق باقی رہے گا، البتہ اگر راہن نے تاوان کی شرط لگائی ہو تو اس کی شرط کے مطابق معاملہ طے ہوگا۔

وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ: اور اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اس بارے میں کہ وہ حق میں سے کوئی شے نہ چھپائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مدیون کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور انکار نہ کرے کیونکہ دائن نے جب اس سے معاملہ کیا تھا عمدہ طریقہ سے کیا تھا وہ اس طرح

کہ اس کی امانت داری پر بھروسہ کیا تھا اور اس سے کوئی وثیقہ یا دستاویز نہیں مانگی تھی، کتابت، گواہ اور رہن کا مطالبہ نہیں کیا تھا تو مدیون کے لیے بھی مناسب یہی ہے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور اس کے ساتھ بھی عمدہ معاملہ کرے، مدت مقررہ آجانے پر اس حق کا انکار نہ کرے۔ (تفسیر کبیر)

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ: یعنی اے گواہو! قرضداروں کے خلاف گواہی کو نہ چھپاؤ اگر وہ خیانت کریں اور اداء امانت نہ کریں اور واجب الاداء حق کے منکر ہو جائیں یا یہ مراد ہے کہ اے قرضدارو! تم پر جو حقوق واجب ہیں ان کی شہادت کو نہ چھپاؤ اور اپنے خلاف حق کا اقرار کرلو اور جو شہادت حق کو چھپائے گا، تو بلاشبہ اس کا دل گناہگار ہے۔ (مظہری) شہادت کو چھپانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ سے متعلق جو اسے معلومات ہیں ان کا انکار کر دے۔ (تفسیر کبیر)

سورۃ البقرہ میں دوسرے مقام پر گواہی چھپانے والے کو بڑا ظالم قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب گواہ بلائے جائیں تو انہیں آنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے صاحب حق کی حق تلفی ہوتی ہے، گواہی نہ دینا مسلمان کے حق کو ضائع کرنا ہے تو مسلمان کا مال اس کی عزت و حرمت کی طرح ہوتا ہے، اس لیے واضح فرمایا کہ گواہی کو مت چھپاؤ، ایک روایت کے مطابق بہترین گواہ وہ ہے جو گواہی طلب کرنے سے پہلے گواہی دے۔ (تفسیر کبیر)

قَلْبُهُ آثِمٌ کا فاعل ہے یا آثِمٌ خبر مقدم اور قَلْبُهُ مبتدا مؤخر ہے اور پورا جملہ اِنَّ کی خبر ہے، گناہ کی نسبت قلب کی طرف اس لیے کی کہ چھپانا دل ہی کا فعل ہے اصل فاعل کی طرف فعل کی نسبت کرنے سے فعل میں شدت اور قوت پیدا ہو گئی جیسے کہتے ہیں میں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اپنے کانوں سے سنا، اپنے دل سے یاد رکھا، یا دل کی طرف نسبت کرنے کی یہ وجہ ہے کہ دل تمام اعضاء کا سردار ہے اس کے افعال کا مرتبہ بھی سب افعال سے بڑا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بنی آدم کے بدن میں ایک بوٹی ایسی ہے کہ جب وہ ٹھیک ہوتی ہے تو سارا بدن ٹھیک ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتی ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے سن لو وہ بوٹی دل ہے۔ (بخاری و مسلم، بحوالہ تفسیر مظہری) بعض

علماء نے کہا کہ دل کے گناہ گار ہونے سے مراد ہے دل کا مسخ ہو جانا۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ: یہاں گواہی چھپانے والوں کو دھمکایا گیا ہے، کیونکہ انسان کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ اور اوجھل نہیں رہ سکتی، اللہ انسانی دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ اور مخفی چیزوں سے باخبر ہے، اس لیے عاقل ودانا لوگ، دین کو سمجھنے اور اللہ کی وحدانیت کو جاننے والے لوگ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کی کوئی نقل وحرکت اللہ سے چھپ نہیں سکتی، وہ جو کچھ کریں گے اللہ کو اچھی طرح پتہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا محاسبہ کرے گا، ان کے تمام افعال کو اللہ جانتا ہے، وہ ان کے تمام اچھے برے کاموں پر انہیں بدلہ دے گا، اچھے کاموں کا اچھا بدلہ اور برے کاموں کا برا بدلہ دے گا۔

دل میں اٹھنے والے خیالات پر محاسبہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَاللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ {۲۸۴} البقرۃ

جواب ترجمہ: جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے اور اگر تم اپنے دل کی بات ظاہر کرو گے یا چھپاؤ گے اللہ تم سے اس کا حساب لے گا پھر جس کو چاہے بخشے گا اور جسے چاہے عذاب کرے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت سے مراد عموم ہے، لیکن یہ حکم دوسری آیت لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا سے منسوخ ہو گیا ہے، بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ حکم اپنی جگہ باقی ہے منسوخ نہیں ہوا، اس لیے کہ یہ خبر ہے نہ کہ امر و نہی، البتہ عموم مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ چیز ہے جس سے بچنا انسان کے لیے ممکن ہو اور وہ ہے اعتقاد جازم اور عزم قاطع، محض حدیث النفس اور وسوسہ مراد نہیں ہے، کیونکہ اس سے بچنا ناممکن ہے، پھر یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے محاسبہ کا ذکر فرمایا ہے، معاقبہ کا ذکر نہیں فرمایا تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اپنا علمی احاطہ بتانے کے لیے بندوں کو ان کی وہ تمام باتیں جو انہوں نے ظاہر کی تھیں یا پوشیدہ رکھی تھیں بتلادیں گے، پھر جس کی چاہیں گے فضل فرماتے ہوئے بخشش فرمادیں گے اور جسے چاہیں گے عدل کرتے ہوئے عذاب دیں گے۔ (مسائل الرازی لعبد القادر الرازی الحنفی)

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ایمان اور اہل ایمان کا ایمان

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ (۲۸۵) البقرہ

جواب ترجمہ: یہ رسول (یعنی حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور (ان کے ساتھ) تمام مسلمان بھی، یہ سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان لائیں، کسی پر نہ لائیں) اور وہ یہ کہتے ہیں کہ: ہم نے (اللہ اور رسول کے احکام کو توجہ سے) سن لیا ہے، اور ہم خوشی سے (ان کی) تعمیل کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم آپ کی مغفرت کے طلبگار ہیں، اور آپ ہی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔

فضیلت آخری آیات سورۃ البقرہ: روایات میں سورۃ البقرہ کی ابتدائی اور آخری دو آیات کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، حضرت نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا مَنْ قَرَأَ بِالْآيَتَيْنِ مِنْ آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ فِي لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ جو شخص ان دونوں آیتوں کو رات کو پڑھ لے اسے یہ دونوں کافی ہیں۔ (بخاری)

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا أُعْطِيتُ خَوَاتِيمَ سُورَةِ الْبَقَرَةِ مِنْ كَنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ، لَمْ يُعْطَهُنَّ نَبِيٌّ قَبْلِي سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں عرش تلے کے خزانہ سے دیا گیا ہوں مجھ سے پہلے کسی

نبی کو یہ نہیں دی گئیں۔(احمد) جب حضور ﷺ کو معراج کرائی گئی اور آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے جو ساتویں آسمان میں ہے، جو چیز آسمان کی طرف چڑھتی ہے وہ یہیں تک ہی پہنچتی ہے اور یہاں سے ہی لے جائی جاتی ہے اور جو چیز اوپر سے نازل ہوتی ہے وہ بھی یہیں تک پہنچتی ہے، پھر یہاں سے آگے لے جائی جاتی ہے اور اسے سونے کی ٹڈیاں ڈھکے ہوئے تھیں، وہاں حضور ﷺ کو تین چیزیں دی گئیں۔ أُعْطِيَ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ، وأُعْطِيَ خَوَاتِيمَ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، وَغُفِرَ لِمَنْ لَمْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ مِنْ أُمَّتِهِ شَيْئًا الْمُقْحَمَاتُ پانچ وقت کی نمازیں، سورۃ بقرہ کے خاتمہ کی آیتیں اور توحید والوں کے تمام گناہوں کی بخشش۔(مسلم)

حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا اقْرَأْ الْآيَتَيْنِ مِنْ آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ فَإِنِّي أُعْطِيتُهُمَا مِنْ تَحْتِ الْعَرْشِ سورۃ بقرہ کی ان دونوں آخری آیتوں کو پڑھتے رہا کرو، میں انہیں عرش کے نیچے کے خزانوں سے دیا گیا ہوں۔(مسند احمد) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا فُضِّلْنَا عَلَى النَّاسِ بِثَلَاثٍ، أُوتِيتُ هَؤُلَاءِ الْآيَاتِ مِنْ آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ مِن بَيت كنز تحت الْعَرْشِ، لَمْ يُعْطَهَا أَحَدٌ قَبْلِي، وَلَا يُعْطَاهَا أَحَدٌ بَعْدِي ہمیں لوگوں پر تین فضیلتیں دی گئی ہیں، میں سورۃ بقرہ کی یہ آخری آیتیں عرش تلے کے خزانوں سے دیا گیا ہوں، جو نہ میرے پہلے کسی کو دی گئیں نہ میرے بعد کسی کو دی جائیں گی۔(ابن مردویہ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں لَا أَرَى أَحَدًا عَقِلَ الْإِسْلَامَ يَنَامُ حَتَّى يَقْرَأَ خَوَاتِيمَ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، فَإِنَّهَا كَنْزٌ أُعْطِيَهُ نَبِيُّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ تَحْتِ الْعَرْشِ میں نہیں جانتا کہ اسلام کے جاننے والوں میں سے کوئی شخص آیت الکرسی اور سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں پڑھے بغیر سو جائے، یہ وہ خزانہ ہے جو تمہارے نبی ﷺ عرش تلے کے خزانہ سے دیئے گئے ہیں(ابن مردویہ)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ كِتَابًا قَبْلَ أَنْ يخلق السموات وَالْأَرْضَ بِأَلْفَيْ عَامٍ، أَنْزَلَ مِنْهُ آيَتَيْنِ خَتَمَ بِهِمَا سُورَةَ الْبَقَرَةِ، وَلَا

يُقْرَأُنَ فِي دَارٍ ثَلَاثَ لَيَالٍ فَيَقْرَبُهَا شَيْطَانٌ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کے پیدا کرنے سے دو ہزار برس پہلے تک ایک کتاب لکھی جس میں سے دو آیتیں اتار کر سورۃ بقرہ ختم کی، جس گھر میں یہ تین راتوں تک پڑھی جائیں اس گھر کے قریب بھی شیطان نہیں جا سکتا۔ (ترمذی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سورۃ بقرہ کا خاتمہ اور آیت الکرسی پڑھتے تو ہنس دیتے اور فرماتے یہ دونوں رحمٰن کے عرش تلے کا خزانہ ہیں اور جب آیت وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا النسآء: ۱۱۰) اور آیت (وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۳۹) وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (۴۰) ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى (۴۱) (النجم) پڑھتے تو زبان سے انا للہ نکل جاتا اور سست ہو جاتے۔ (ابن مردویہ) حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أُعْطِيتُ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ، وَخَوَاتِيمَ سُورَةِ البقرة مِن تَحتَ العَرشِ، والمُفَصَّل نَافِلَةً مجھے سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقر کی آخری آیتیں عرش کے نیچے سے دی گئی ہیں، اور مزید مفصل کی سورتیں بھی وہاں سے ہی دی گئی ہیں۔ (ابن مردویہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جہاں حضرت جبریل بھی تھے کہ اچانک ایک دہشت ناک بہت بڑے دھماکے کی آواز کے ساتھ آسمان کا وہ دروازہ کھلا جو آج تک کبھی نہیں کھلا تھا، اس سے ایک فرشتہ اترا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ کو خوشی مبارک ہو، أَبْشِر بنُورَينِ قَد أُوتِيتَهُمَا لَم يُؤتَهُمَا نَبِيٌّ قَبلَكَ: فَاتِحَةُ الكِتَابِ، وَخَوَاتِيمَ سُورَةِ الْبَقَرَةِ لَنْ تَقْرَأَ حَرْفًا مِنْهُمَا إِلَّا أُوتِيتَهُ آپ کو وہ دو نور دیئے جاتے ہیں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں۔ ان کے ایک ایک حرف پر آپ کو نور دیا جائے گا۔ (مسلم)

حضرت الیفع بن عبد اللہ کلاعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے عرض کیا، یا رسول اللہ! أَيُّ آيَةٍ فِي كِتَابِ اللّٰهِ أَعْظَمُ؟ کتاب اللہ کی کونسی آیت سب سے بڑی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آیت

الکرسی اللّٰہُ لَا إِلٰہَ إِلا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّومُ ہے، اس نے پوچھا کہ فَأَیُّ آیَۃٍ فِی کِتَابِ اللّٰہِ تُحِبُّ أَنْ تُصِیبَکَ وَأُمَّتَکَ؟ کتاب اللہ کی کون سی آیت کو آپ ﷺ پسند فرماتے ہیں وہ آپ کے اور آپ ﷺ کی امت کے حصے میں ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا سورۃ البقرہ کی آخری آیات، دنیا اور آخرت کی کوئی خیر ایسی نہیں ہے جو اس میں موجود نہ ہو۔ (دارمی)

شانِ نزول: مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِی أَنْفُسِکُمْ أَوْ تُخْفُوہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ نازل ہوئی تو یہ حکم صحابہ کرامؓ پر بھاری ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ! ہم اپنے دلوں میں کوئی ایسی بات سوچتے ہیں اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ مخلوق میں سے کوئی اس بات پر مطلع نہ ہو تو بلاشبہ ہمارے لیے اس طرح اور اس طرح (گناہ) ہوگا آپ نے فرمایا کیا تم اسی حالت سے ملے ہو (یعنی تمہیں ایسی صورت پیش آئی ہے) اور یہ تو صریح ایمان (کی نشانی) ہے تو (اس پر) اللہ تعالیٰ نے آیت آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَیْہِ مِنْ رَبِّہِ وَالْمُؤْمِنُونَ نازل فرمائی۔ (درمنثور)

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَیْہِ مِنْ رَبِّہِ: سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایمان والوں نے فرمایا ہم ایمان لائے اللہ پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے اپنے ملک، اپنے علم اور اپنی قدرت کا کمال بیان فرمایا، یہ صفات اس کی ربوبیت کو ظاہر کرتی ہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے انتہائی انقیاد، اطاعت اور اللہ کے لیے ان کی عاجزی کو بیان کیا ہے، پہلے اپنے کمال ربوبیت کو ظاہر کیا تو اب ہمارے کمال عبودیت (کمال بندگی) کو ظاہر فرمایا ہے، ہمیں اس کی عالی اور عظیم ذات سے یہ امید رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس نے کمال ربوبیت اور ہمارے کمال عبودیت کو ظاہر کیا اسی طرح بروز محشر اپنے عمیم احسان اور کمال فضل واحسان سے ہمارے حق میں کمال عنایت، کمال رحمت اور کمال احسان ظاہر فرما دے گا۔

اللہ تعالیٰ نے عجیب اسلوب نگارش اختیار فرمایا، ارشاد ہوتا ہے تم اگر اپنے دلوں کی چیزیں

ظاہر کرو یا انہیں پوشیدہ رکھو تو وہ تمہارا محاسبہ کرے گا، اس نے واضح کر دیا کہ اپنی مخلوق کے ظاہر وباطن کی ہر چیز سے یقینی طور پر اللہ آگاہ ہے، پھر اس کے بعد اللہ نے ایسا کلام ذکر فرمایا جس میں ہماری مدح وثناء کی گئی ہے اور فرمایا کہ میرے رسول اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم نے اتاری اور اہل ایمان بھی اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں، اللہ واضح فرمارہے ہیں کہ میرے بندے اگرچہ میں تیرے تمام احوال سے واقف ہوں، مگر میں تیرے حالات کو ظاہر نہیں کرتا، ان حالات میں سے میں انہی کو ذکر کرتا ہوں جن میں تیری مدح وستائش ہوتی ہے، تجھے پتہ ہے کہ میں کامل ملک اور کامل علم اور کمال قدرت کا مالک ہوں، میں نیکیوں کے اظہار اور بدیوں کی پردہ پوشی کرنے میں کامل جود اور رحمت والا ہوں۔

وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ: اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ کے آغاز میں اہل ایمان کی تعریف وستائش کی تھی کہ وہ ایمان بالغیب رکھتے ہیں، وہ نمازیں قائم کرتے ہیں، وہ اللہ کے دیے میں سے خرچ کرتے ہیں، وہ آسمانی کتابوں پر اور قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں، وہ قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، یہاں سورۃ کے اخیر میں بھی انہی اہل ایمان وایقان کی تعریف وستائش کی جارہی ہے کہ یہ لوگ امت محمدیہ ﷺ کے خوش نصیب ہیں، جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اللہ کے فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں، اللہ کی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، اللہ کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ایسے باادب لوگ ہیں جو انبیاء ورسل علیہم السلام کی فضیلت اور بزرگی میں کوئی تفریق اور امتیاز نہیں کرتے، سبھی کو اللہ کا فرستادہ سمجھ کر ان کا حترام وادب بجالاتے ہیں۔

وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ: اور انہوں نے کہا سَمِعْنَا: ہم نے آپ کا فرمان سنا۔ وَأَطَعْنَا: اور ہم نے آپ کا حکم مانا۔ بغوی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ بن حکیم کا قول نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت جبریل امین علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا، اللہ نے آپ کی اور آپ کی امت کی ثنا کی ہے، آپ اللہ سے کچھ سوال کیجئے آپ کا سوال پورا کیا جائے گا پس اللہ

کی تلقین سے آپ ﷺ نے سوال کیا۔ غُفْرَانَكَ : یعنی اپنی مغفرت عطا فرما، یا ہم تجھ سے تیری مغفرت مانگتے ہیں۔ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ : اے ہمارے رب! اور مرنے کے بعد تیری ہی طرف لوٹنا ہے یہ آخری فقرہ حشر کا اقرار ہے اس لیے ایمان میں داخل ہے۔ (مظہری)

طاقت اور گنجائش کے مطابق وزن ڈالا جاتا ہے

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

لاَ يُكَلِّفُ اللهُ نَفْساً إِلاَّ وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لاَ تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلاَ تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْراً كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلاَ تُحَمِّلْنَا مَا لاَ طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنتَ مَوْلاَنَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ{۲۸۶} البقرة.

جواب ترجمہ: اللہ کسی کو اس کی طاقت کے سوا تکلیف نہیں دیتا، نیکی کا فائدہ بھی اسی کو ہو گا اور برائی کی زد بھی اسی پر پڑے گی، اے رب ہمارے! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کریں تو ہمیں نہ پکڑ، اے رب ہمارے! اور ہم پر بھاری بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر رکھا تھا، اے رب ہمارے! اور ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھوا جس کی ہمیں طاقت نہیں اور ہمیں معاف کر دے اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر تو ہی ہمارا کارساز ہے کافروں کے مقابلہ میں تو ہماری مدد کر۔

شان نزول: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ نے اپنے رسول پر وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللهُ والی آیت نازل کی تو یہ بات صحابہ پر بڑی سخت گزری اس کے بعد صحابہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم پر ایسے اعمال لاگو کیے گئے جن کی ادائیگی ہم کر سکتے ہیں یعنی نماز روزہ جہاد زکوۃ۔ اب آپ ﷺ پر یہ آیت نازل کی گئی ہے یعنی یہ حکم نازل کیا گیا ہے جسے ہم بجا نہیں لا سکتے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم بھی وہی کہنا چاہتے ہو جو تم سے پہلے دو کتابوں یعنی تورات اور انجیل کے حامل لوگوں نے کہا، انہوں نے کہا تھا کہ

سَمِعنَا وَعَصَينَا یعنی ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی، تم کہو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ، یعنی ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ہم تیری بخشش مانگتے ہیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔

جب لوگوں نے اس آیت کو پڑھا، تو ان کی زبانیں لڑکھڑا گئیں اس کے بعد اللہ نے یہ آیت نازل کی اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ ، آخر تک اور اس آیت کا حکم منسوخ کر دیا اور یہ آیت نازل کی لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (اسباب النزول، مسلم)

یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی کمی بیشی کے ساتھ مروی ہے، جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو اس وقت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور انصاری صحابہ میں سے کچھ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائے تھے اور ان لوگوں نے گھٹنوں کے بل جھک کر باادب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی تھی۔ (اسباب النزول)

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا: اللہ تعالیٰ کسی کی گنجائش اور طاقت سے زیادہ کسی پر بوجھ نہیں ڈالتے، اپنے احکامات کا پشتارہ ان لوگوں کے کاندھوں پر نہیں لادتے جو اسے اٹھا نہیں سکتے، اللہ تعالیٰ کا دین بہت ہی آسان ہے، جگہ جگہ اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا اشارہ دیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے پیروکاروں کو یہ بات سمجھائی، بتائی اور تلقین فرمائی ہے کہ آسانی پیدا کرو، مشکل پیدا نہ کرو۔

شیخ کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام کا کسی کو مکلف اور پابند نہیں بناتے مگر بقدر اس کی طاقت اور گنجائش کے، اس لیے کہ جس چیز کا مادہ ہی مکلف میں نہ ہو اس کی تکلیف اللہ کی طرف سے متصور نہیں ورنہ پھر انسان معذور تھا۔

کون نہیں جانتا کہ کان سے آنکھ کا کام نہیں ہو سکتا، اس لیے ہر نفس کو ثواب اور عذاب، نفع اور ضرر اس کے مطابق ہو گا، جو اس نے اپنی قدرت اور اختیار سے کیا اور کمایا ہے، لہٰذا جو باتیں تمہارے دلوں میں بے اختیار گزرتی ہیں ان پر مواخذہ اور محاسبہ نہ ہو گا، اس لیے کہ جس چیز کے ساتھ قصد اور ارادہ متعلق نہیں اس پر نہ ثواب ہے اور نہ عذاب، البتہ وہ امور ذیلہ جو تم نے اپنے دلوں میں اپنے

اختیار سے چھپائے رکھے ہیں جیسے تکبر، حسد، کینہ، حرص، طمع، ریاء اور نفاق ان پر محاسبہ اور مواخذہ ہو گا اور جو اخلاق پسندیدہ ہیں مثلاً اخلاص، صبر، توکل، شکر اور قناعت وغیرہ وغیرہ قیامت کے دن ان پر اجر ملے گا۔ (تفسیر معارف القرآن للکاندھلویؒ)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زائد کام کا حکم نہیں دیتے، اس لئے غیر اختیاری طور پر جو خیالات ووسوسے دل میں آجائیں اور پھر ان پر کوئی عمل نہ ہو تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاف ہیں، حساب اور مؤاخذہ صرف ان افعال پر ہو گا جو اختیار اور ارادہ سے کئے جائیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اعمال وافعال جو ہاتھ، سر، آنکھ اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کو اعمال ظاہرہ کہا جاتا ہے ان کی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری جو ارادہ اور اختیار سے کئے جائیں جیسے ارادہ سے بولنا ارادہ سے کسی کو مارنا دوسرے غیر اختیاری جو بلا ارادہ سرزد ہو جائیں جیسے زبان سے کہنا چاہتا تھا کچھ اور نکل گیا کچھ، یا رعشہ سے بلا اختیار ہاتھ کی حرکت ہوئی اس سے کسی کو تکلیف پہنچ گئی ان میں سب کو معلوم ہے کہ حساب وکتاب اور جزاء وسزا افعال اختیاریہ کے ساتھ مخصوص ہیں افعال غیر اختیاریہ کا نہ انسان مکلف ہے نہ ان پر اس کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ افعال جن کا تعلق باطن یعنی دل کے ساتھ ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری جیسے کفر وشرک کا عقیدہ جس کو قصد واختیار کے ساتھ دل میں جمایا ہے یا سوچ سمجھ کر ارادہ کے ساتھ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جس کو تکبر کہا جاتا ہے یا پختہ ارادہ کرنا کہ شراب پیوں گا، اور دوسرے غیر اختیاری مثلاً بغیر قصد وارادہ کے دل میں کسی برے خیال کا آجانا ان میں بھی حساب وکتاب اور مؤاخذہ صرف اختیاری افعال پر ہے غیر اختیاری پر نہیں۔ (معارف القرآن)

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ: ہر شخص نے جو نیکی کمائی اس کا پھل اسی کے لئے ہے اور جو برائی سمیٹی اس کا وبال اسی پر ہے، ہر فرد اپنے کئے کا ذمہ دار ہے، اس لئے اسے وہی کچھ ملے گا جو اس

نے خود کمایا، نیز سزا بھی کسی کو صرف اس کے جرم کی ملے گی جو وہ خود کرے گا، ہر کوئی اپنے کئے کا ذمہ دار خود ہو گا، ہر شخص اپنے رب کے سامنے خود اپنا اعمال نامہ لے کر جائے گا اور اس میں وہی کچھ ہو گا جو اس نے کمایا، جس کا اس نے ارتکاب کیا، کوئی شخص وہاں حیلہ بہانہ نہ کر سکے گا، نہ وہاں کسی کو کسی کی امداد یا سفارش کی امید ہو گی۔

انسان بحیثیت فرد اپنے رب کے سامنے ہو گا، جب انفرادی مسئولیت کا یہ تصور کسی مومن کے قلب میں جاگزین ہو جاتا ہے، تو ہر فرد اپنے اللہ کے جو حقوق اس کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، ان کا ذمہ دار بن جاتا ہے، وہ دوسرے انسانوں کی وجہ سے کسی صورت میں بھی ان حقوق الٰہیہ سے دست بردار نہیں ہوتا، الّا یہ کہ شریعت کے مطابق یہ دست برداری ہو، اب ہر انسان مومن کی ذات کے ساتھ جو حقوق اللہ وابستہ ہوتے ہیں وہ اس بارے میں ہر دھوکے، ہر حدود شکنی، ہر گمراہی اور ہر فساد کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ اپنے نفس اور اس کے ساتھ وابستہ حقوق اللہ کے بارے میں ذاتی طور پر خود جوابدہ ہے اور ہر نفس کے ساتھ اللہ کے جو حقوق وابستہ ہیں وہ صرف وہی ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے یا جن سے اس نے منع فرمایا ہے۔ (فی ظلال القرآن)

یہاں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں کسبت اور اکتسبت، حضرات مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جس کام کو انسان قصد اور ارادہ سے کرے اس کو کسب اور اکتساب کہتے ہیں، اور خواطر اور وساوس میں انسان کے قصد اور ارادہ کا دخل نہیں ہوتا اس لیے ان پر گرفت نہیں ہو گی، اسی طرح جو کام انسان سے نسیاناً اور خطاءً ہو جائے یا جو کام اضطراری طور پر صادر ہو، اس پر بھی گرفت نہیں ہو گی۔ (تبیان القرآن)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان کاموں کو معاف کر دیا جو خطاءً ہوں، نسیاناً ہوں یا جن کاموں پر انہیں مجبور کیا گیا ہو۔ (سنن ابن ماجہ)

اہل لغت کے نزدیک کسب اور اکتساب کا معنی ایک ہی ہے اور بعض نے کسب اور اکتساب میں

فرق بیان کیا ہے، کسب عام ہے خواہ انسان وہ کام صرف اپنے لیے کرے یا دوسرے کے لیے اور اِلاِکْتِسَابَ أَخَصُّ مِنَ الْکَسْبِ اکتساب کسب سے خاص ہے، اس کام کو کہتے ہیں جو صرف اپنے لیے کیا جائے۔ (تفسیر کبیر) علامہ زمخشری نے بیان کیا ہے کہ إِنَّمَا خُصَّ الْخَيْرُ بِالْكَسْبِ، وَالشَّرُّ بِالِاكْتِسَابِ اللہ تعالیٰ نے خیر کے لیے کسب اور شر کے لیے اکتساب کو استعمال کیا ہے، کیونکہ باب افتعال کا خاصہ ہے کسی چیز کو زیادہ محنت اور کوشش سے حاصل کرنا اور جب انسان کسی برے کام کی خواہش کرتا ہے تو اس کی تحصیل میں زیادہ عمل کرتا ہے اس کے لیے اکتساب فرمایا۔ (کشاف، تبیان)

اور بعض نے کہا: نیکی کے کام انسان کی فطرت کے مطابق ہوتے ہیں اس لیے ان کو کرنے کے لیے زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑتی اور برائی کے کام چونکہ انسان کی فطرت کے خلاف ہوتے ہیں اس لیے ان کو کرتے وقت انسان کا نفس بوجھل ہوتا ہے اور ان کے لیے زیادہ عمل کرنا پڑتا ہے، اس لیے ان کے لیے اکتساب فرمایا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس کی سرشت میں خیر اور نیکی ہو وہ اگر برا کام کسی وجہ سے کرے گا تو اس کا ضمیر مزاحمت کرے گا اور اسے برائی کے لیے زیادہ دشواری ہو گی اور جس کی سرشت میں شر اور برائی ہو وہ برے کام کو زیادہ دلچسپی اور زیادہ کوشش سے کرے گا، اس طرح ہر صورت میں برے کام میں زیادہ عمل ہو گا، اس لیے برے کام کے لیے اکتساب کا لفظ فرمایا جس میں زیادہ عمل ہے کیونکہ زیادتی لفظ زیادتی معنی پر دلالت کرتی ہے۔ (تبیان القرآن)

سورۃ البقرہ کا اختتام اور دعاء: اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ کے اختتام پر اہل ایمان کی ایک دعاء ذکر فرمائی ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے دعاء کو عبادت کا مغز اور نچوڑ قرار دیا ہے، اسی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ جب میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو انہیں بتائیے کہ میں قریب ہوں، دعاء کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے مانگتا ہے، کیونکہ دعاء کرنے والا اپنے آپ کو مقام فقر، مقام حاجت، مقام ذلت و مسکنت میں دیکھتا ہے، جب کہ وہ اپنے پروردگار جل شانہ کے جلال، کرم، عزت، عظمت کا مشاہدہ کرتا ہے کہ وہ ذات عالی شان

کس قدر بلند اور کس قدر بے پروا و بے نیاز ہے، اسے کسی کی پروا نہیں ہے، تمام عبادات وطاعات سے مقصود بھی یہی ہے، اسی بناء پر اس سورۃ مبارکہ کا اختتام ایک ایسی دعا پر کیا جارہا ہے جو ان عظیم علوم کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے جن میں زاری، عاجزی، تضرع اور اللہ کی طرف لجاجت کرنے سے بھرپور ہے۔

اہل ایمان کی دعاء: اللہ تعالیٰ نے یہاں پر اہل ایمان کی ایسی دعاء ذکر فرمائی ہے جس کی چار قسموں میں سے پہلی تین قسموں کے شروع میں رَبَّنا کے الفاظ لائے گئے ہیں، چوتھی قسم کی دعا کے ابتدا میں وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنا ہے رَبَّنا شروع میں نہیں ہے۔

دعا کی پہلی قسم: رَبَّنا لَا تُؤَاخِذْنا إِنْ نَسِينا أَوْ أَخْطَأْنا، اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو ہماری گرفت نہ فرمایئے۔ یہاں لَا تُؤَاخِذْنَا ہے جو باب مفاعلہ کا صیغہ ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ مواخذہ دونوں جانب سے ہو مگر ایسا نہیں ہے بلکہ یہاں مفاعلہ فعل واحد ہے، بندے کا مواخذہ مراد ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ بندے کا مواخذہ سزا دے کر کرتا ہے جب کہ بندہ اللہ کا مواخذہ اس کے عفو وکرم کا مطالبہ کرکے کرتا ہے کیونکہ بندہ کسی اور ہستی کو نہیں پاتا جو اللہ کے عذاب سے اسے بچائے، اس لیے بندہ بوقت خوف اسی سے چمٹتا ہے، جب ہر ایک ان دونوں میں دوسرے کو پکڑتا ہے تو اسی کو لفظ مواخذہ کے ساتھ تعبیر فرمایا۔

نَسِينَا یہ نسیان سے ہے، نسیان کا معنیٰ ہے بھولنا، بندہ اللہ سے عرض کرتا ہے کہ اگر ہم بھول جائیں تو ہمارا مواخذہ نہ کرنا، جب کہ بھول چوک والے کا فعل ایسا ہے جو قابل معافی ودرگزر ہے، بھولنے والے کا مواخذہ وہ تکلیف ہے جسے برداشت کرنے کی بندہ میں طاقت نہیں ہے، پھر نبی کریم ﷺ کا فرمان بھی ہے کہ میری امت کی خطاء اور نسیان (بھول چوک) معاف ہے، جب بندہ کی بھول چوک محل عفوودرگزر ہے تو پھر دعا میں معافی مانگنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے ایک نسیان (بھول چوک) وہ ہے جس میں بھولنے والا معذور ہے، جب کہ ایک نسیان وہ ہے جس میں

بندے کا عذر قبول نہیں ہے، جیسے ایک شخص اپنے کپڑوں پر خون دیکھتا ہے، اس کو صاف نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ اسی خون آلود کپڑے میں نماز پڑھ لیتا ہے تو یہ اس کا قصور شمار کیا جائے گا کیونکہ اسے چاہیے تھا کہ وہ پہلے اس خون کو کپڑے سے دور کرتا پھر نماز پڑھتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا ہاں اگر وہ اس خون کو اپنے کپڑے پر نہ دیکھتا تو اس صورت میں وہ معذور تھا۔

اسی طرح اگر ایک شخص نے شکار کو ایسے مقام پر تیر مارا کہ وہ کسی انسان کو جالگا، تیر انداز نہیں جانتا تھا کہ وہ شکار کو لگے گا یا کسی اور کو، جب اس نے تیر اندازی کی اور اس نے اس پر غور و فکر نہیں کیا تو یہ شخص قابل ملامت ہے، ہاں جب غلطی کی نشانیاں ظاہر نہیں تھیں پھر اس نے تیر اندازی کی اور کسی انسان کو جالگا تو اس صورت میں وہ معذور ہو گا، اسی طرح ایک انسان درس اور تکرار سے غفلت برتتا ہے یہاں تک کہ وہ قرآن کریم بھول جاتا ہے تو یہ شخص قابل ملامت ہے، ہاں اگر وہ قرآن کریم کی ہمیشہ تلاوت کرتا رہتا ہے لیکن پھر بھی قرآن کریم اسے بھول جاتا ہے تو یہ شخص اس صورت میں معذور ہو گا، تو یہ بات یہاں ثابت ہو گئی کہ نسیان دو طرح کا ہے ایک وہ جس پر انسان معذور ہے اور دوسرا وہ نسیان جس کی صورت میں انسان معذور نہیں ہو گا۔

ایک روایت میں ہے کہ أَنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَذْكُرَ حَاجَتَهُ شَدَّ خَيْطًا فِي أُصْبُعِهِ حضرت نبی کریم ﷺ جب کسی ضروری کام کو یاد رکھنا چاہتے تو اپنی انگلی میں دھاگہ باندھ لیتے تھے, تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ بھولنے والا کبھی معذور نہیں بھی ہوتا، یہ اس وقت جب وہ احتیاط کا دامن چھوڑ دیتا ہے، یاد دلانے والے اسباب و وسائل سے روگردانی کرتا ہے، جب یہ صورت بن جائے تو ایسی صورت میں دعا کے اندر اللہ تعالیٰ سے عفو، درگزر اور بخشش کا سوال کرنا درست ہے۔ (تفسیر کبیر)

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ دعا علی سبیل التقدیر ہے، اس لیے کہ جن اہل ایمان نے اس دعا کا ذکر کیا وہ اللہ سے اس طرح ڈرنے والے تھے جس طرح اس کی ذات سے ڈرنے کا حق ہے، ان سے

نامناسب بات کا صدور ہو ہی نہیں سکتا ہاں اگر ہو سکتا ہے تو نسیاناً (بھول چوک) اور خطاءً (غلطی) سے، اس دعا کے ذریعہ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر ان سے کوئی بات نسیانا صادر ہو جائے تو اس پر مواخذہ نہیں بنتا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ دعا سے مقصود اللہ تعالیٰ کے لیے عاجزی اور انکساری کا اظہار کرنا ہوتا ہے کوئی کام مطلوب نہیں ہوتا، اسی لیے دعا کرنے والا بہت دفعہ ایسی چیزوں کی دعا مانگتا ہے جو قطعی ہوتی ہیں اگر انسان دعا مانگے تو اللہ نے وہ کام کر ہی دینا ہوتا ہے، اسی طرح اس آیت میں اس علم کے باوجود کہ نسیان قابل معافی ہے، دعا میں حسن طلب سے منع نہیں کیا گیا۔ (کبیر)

چوتھا جواب یہ ہے کہ ناسی (بھولنے والے) کے مواخذہ میں عقلاً ممانعت نہیں ہے، اس لیے کہ انسان کو جب پتہ چل جائے کہ نسیان کے بعد اس کا مواخذہ کیا جائے گا تو پھر وہ مواخذہ کے ڈر کی وجہ سے ہمیشہ ذکر میں مشغول رہے گا، اس وقت نفس پر شاق گزرنے والا ذکر ہی ہمیشہ ہوتا رہے گا، جب عقلاً یہ جائز ہے تو پھر یقیناً طلب مغفرت کی دعا کرنا اس کے لیے اچھا عمل ہے۔ (تفسیر کبیر)

دعا کی دوسری قسم: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا، اے ہمارے پروردگار ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالیے جیسا آپ نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ یہ دعا کی دوسری قسم ہے، إِصْرًا کا معنیٰ لغت میں بوجھ اور شدت کے آتے ہیں، اسی معنیٰ میں نابغہ شاعر کا شعر بھی ہے

يَا مَانِعَ الضَّيْمِ أَنْ يُغْشَى سَرَاتُهُمُ ... وَالْحَامِلَ الْإِصْرَ عَنْهُمْ بَعْدَمَا عَرَفُوا

عہد وپیمان کو بھی اصر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی بوجھل اور ثقیل ہوتا ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذَلِكُمْ إِصْرِي [آلِ عِمْرَانَ: ۸۱] اس کا معنیٰ میرا عہد وپیمان اور میرا میثاق ہے۔

ارباب تفسیر فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری تکالیف میں اس طرح سختی نہ کیجیے جس طرح آپ نے ہم سے پہلے یہود کی تکالیف میں سختی کی تھی، مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان پر پچاس نمازیں لازم کی تھیں، اپنے مالوں میں سے چوتھائی مال کی زکوٰۃ کا حکم دیا

تھا، جس کے کپڑے کو نجاست لگ جاتی اسے وہ کپڑا کاٹ ڈالنے کا حکم دیا گیا تھا، جب وہ کوئی چیز بھول جاتے تھے تو ان پر دنیا میں ہی جلدی عذاب آجاتا تھا، جب ان سے کسی خطاء کا صدور ہو جاتا تو حلال کھانا بھی ان پر حرام کر دیا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا کہ فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ كَثِيرًا [النِّسَاءِ: ۱۶۰] غرض یہودیوں کی سنگین زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال کی گئی تھیں اور اس لیے کہ وہ بہت زیادہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ [النِّسَاءِ: ۶۶] اور اگر ہم ان کے لیے یہ فرض قرار دیتے کہ تم اپنے آپ کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا کوئی اس پر عمل نہ کرتا۔

قوم طالوت کے مسافروں پر نہری پانی پینا حرام قرار دیا گیا تھا، انہیں دنیا میں ہی جلد عذاب دیا گیا تھا، جیسا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ (النساء ۴۷) قبل اس کے کہ ہم کچھ چہروں کو مٹا کر انہیں گُدّی جیسا بنا دیں، یا ان پر ایسی پھٹکار ڈال دیں جیسی پھٹکار ہم نے سبت والوں پر ڈالی تھی۔

نافرمانیوں، شیطانیوں اور روگردانیوں پر ان لوگوں کو ذلیل بندر بنا دیا گیا تھا، ان لوگوں کی شکلیں خنزیر کی شکلوں کی طرح بنا دی گئی تھیں، تورات کی پانچویں کتاب پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ان لوگوں پر عہد و پیمان توڑنے کی وجہ سے سختیاں کی گئیں، جب اہل ایمان نے ان سختیوں کا مطالعہ کیا تو اپنے پروردگار کی بارگاہ میں عرض کرنے لگے کہ ان جیسی سختیوں سے ان کی حفاظت کی جائے، انہیں بچایا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور احسان عظیم کے ساتھ ان سختیوں کو اہل ایمان سے دور ہی رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف میں واضح کر دیا کہ اس نے ان سے سختی ہائے طوق

وسلاسل کو دور کر دیا جو ان پر تھی۔ نبی مہربان ﷺ نے فرمایا کہ رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْمَسْخُ وَالْخَسْفُ وَالْغَرَقُ میری امت سے شکلوں کی تبدیلی، دھنسنا اور غرقاب ہونا ہٹا دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی برکت سے اس امت پر کس قدر مہربانی فرمائی ہے، ارشاد فرمایا وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ [الأنفال: ۳۳] جب تک آپ ﷺ ان لوگوں میں موجود ہیں اللہ انہیں عذاب نہیں دے گا، جب تک یہ استغفار کرتے رہیں گے انہیں اللہ عذاب نہیں دے گا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں سہل ترین اور چشم پوشی کرنے والا دین دے کر مبعوث کیا گیا ہوں، اہل ایمان اللہ تعالیٰ سے اسی تخفیف اور سہل انگاری کی درخواست کرتے ہیں، کیونکہ شدت اور سختی کی وجہ سے کوتاہی کا امکان واندیشہ ہوتا ہے، جب کوتاہی ہو جاتی ہے تو وہ سزا کا موجب بن جاتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب اور اس کی سزا کو کوئی برداشت نہیں کر سکتا، اس لیے یقینی طور پر اہل ایمان نے تکالیف میں سہولت اور آسانی کی درخواست کی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب عقلی اور سمعی دلائل اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ سب مہربانوں سے بڑا مہربان ہے، سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والی ہستی ہے تو پھر یہودیوں پر اس طرح کی سختیاں اور تکالیف ڈالنے کی وجہ کیا تھی کہ یہود سرکشی اور تمرد پر اتر آئے تھے اور احکامات خداوندی کی مخالفت شروع کر دی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہود کی طبیعتوں پر سختی اور شدت غالب تھی، وہ تکالیف شدیدہ اور شاقہ کے بغیر اصلاح کو قبول ہی نہیں کر سکتے تھے جب کہ نبی کریم ﷺ کی امت نرم دل اور مہربان ہے، عمدہ اخلاق وطبیعت والی ہے اس لیے ان کے لیے مصلحت یہی تھی کہ ان پر سختی نہ کی جائے۔

یہاں انسانی اذہان میں ایک اور سوال انگڑائیاں لیتا ہے کہ یہود کو سخت طبیعتوں، سنگدلی اور دون ہمتی کے ساتھ خاص کیوں کیا گیا؟ کہ انہیں ان سختیوں اور تکالیف کی ضرورت پڑ گئی اور اس امت

مرحومہ کو طبیعتوں کی لطافت، کریمانہ اخلاق اور بلند ہمتی کے ساتھ مخصوص کیا کہ ان کے لیے تھوڑی تھوڑی مشکلات بھی ان کی مصلحتوں کے حصول کے لیے آسان ہو گئیں، اس کا آسان اور سادہ سا جواب ہے کہ جب عاقل و دانا لوگ معمولی سا غور و حوض کریں تو انہیں پتہ چل جائے گا کہ یہ تمام تعلیلات محض علتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بہت بڑی ذات اور ہستی ہے، اس کی ذات و ہستی کو کسی ترازو اور کسی میزان کے پلڑے میں تولا نہیں جاسکتا، وہ پاک ذات جو چاہتی ہے کرتی ہے، جو چاہتی ہے فیصلے صادر کرتی ہے، جو کاریگری اور صناعی اللہ تعالیٰ کرتا ہے اس کے بارے میں کسی کو سوال کرنے اور پوچھنے کی مجال نہیں ہے، جب کہ انسانی کارکردگیوں اور کاریگریوں پر سوال کیا جاسکتا ہے، قرآن کریم میں بھی اس طرف واضح اشارہ موجود ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس بارے میں اس سے نہیں پوچھا جاسکتا، جب کہ انسان جو کچھ کرتے ہیں اس بارے میں وہ پوچھے جائیں گے۔

دعا کی تیسری قسم: رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ، اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیے جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ یہ دعائے مومنین کی تیسری قسم ہے، اَلطَّاقَةُ یہ اَلْإِطَاقَةُ سے اسم ہے، جس طرح طاعت اطاعت سے، جابت اجابت سے اسم ہے، یہ مصدر کی جگہ پر ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی تعلیمات عالیہ میں آقاؤں کو اپنے ماتحتوں پر ایسی مشقت ڈالنے سے منع فرمایا ہے جو ان کے لیے باعث مشقت ہو، آپ ﷺ نے نماز جیسی عبادت کی ادائیگی کے لیے بیماری کی حالت میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم دیا اور اگر بیٹھ کر بھی نماز نہیں پڑھی جاسکتی تو اپنے پہلو کے بال لیٹ کر نماز پڑھنے کا حکم صادر فرمایا ہے، یہاں بیٹھنے میں جب سخت مشقت کا سامنا کرنا پڑے تو پھر پہلو کے بل بیٹھنے کو کہا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ فرمایا ہے لَا تُكَلِّفْنَا نہیں فرمایا، تحمیل کا معنیٰ ایسا بوجھ لادنا

جس کو اٹھانے کی اس میں طاقت نہ ہو، اس سے مراد عذاب ہے، مطلب یہ ہے کہ اپنا ایسا عذاب ہم پر نہ ڈالنا جسے اٹھانے کی ہم طاقت نہیں رکھتے، اگر ہم آیت میں تحمیل سے مراد عذاب لیں تو پھر یہ حقیقی معنیٰ ہے اور اگر تحمیل سے تکلیف مراد لیں تو یہ مجازی معنیٰ ہے۔

یہاں ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل ایمان کی ان دعاؤں میں جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب اجتماعی دعا کی جاتی ہے تو اس میں قبولیت کی امید زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، جب ارواح اور دواعی کسی چیز پر یکجائی اختیار کر لیتے ہیں تو اس چیز کا حصول اکمل طریقہ سے ہوتا ہے۔

دعا کی چوتھی قسم: وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ، یہ دعا کی چوتھی قسم ہے، دعا کی پہلی تین اقسام میں ربنا شروع میں تھا، یہاں شروع میں ربنا نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ندا میں جب دوری ہو تو وہاں حرف ندا کی ضرورت پڑتی ہے اور جہاں قرب ہو وہاں حرف ندا کی ضرورت نہیں پیش آتی، یہ بات بتلانے کے لیے کہ جب بندہ تضرع، عاجزی اور انکساری پر ہمیشگی اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ قریب ہو جاتا ہے، یہ بہت بڑا راز ہے جو دوسرے بہت سے رازوں پر مطلع کرتا ہے۔

عفو، مغفرت اور رحمت میں فرق: الْعَفْوَ کا مطلب یہ ہے کہ اس سے عذاب کو ساقط کر دیا جائے، الْمَغْفِرَةَ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے جرائم کی پردہ پوشی کی جائے، خجالت، فضیحت اور رسوائی کے عذاب سے بچنے کے لیے گویا کہ بندہ یوں کہتا ہے میں تجھ سے عفو و درگزر کا طلب گار ہوں، جب تو مجھے معاف کر دے تو اس کے بعد میری پردہ پوشی بھی فرمالے، کیونکہ فضیحت و خجالت کے عذاب سے بچنے کے بعد قبر کے عذاب سے خلاصی تب ہی اچھی ہو گی، جب اس کی پردہ پوشی کی جائے، عفو و درگزر میں جسمانی عذاب سے خلاصی مراد ہے اور مغفرت میں روحانی عذاب سے خلاصی مراد ہے، بندہ جب ان دونوں سے خلاصی پا جائے گا تو ثواب کے حصول کی طرف متوجہ ہو گا۔

تو حصول ثواب کی بھی دو قسمیں ہوئیں ایک ثواب جسمانی جو کہ جنت کی نعمتیں، اس کی لذتیں اور اس کی پاکیزگیاں ہیں اور روحانی ثواب اور اس کی انتہاء یہ ہے کہ بندہ جلال الٰہی کے نور سے آراستہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی کبریائی بقدر طاقت اس پر کھل جائے اور یہ اس لیے کہ یہ تمام ماسوا اللہ سے چھپ جائے، مکمل طور پر جلال الٰہی کے نور میں مستغرق ہو جائے۔ ارْحَمْنَا میں ثواب جسمانی کی طلب ہے، اس کے بعد أَنْتَ مَوْلَانَا میں روحانی ثواب کی طلب ہے وہ اس لیے کہ بندہ مکمل طور پر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے، کیونکہ أَنْتَ مَوْلَانَا میں حاضرین کا خطاب ہے، ہو سکتا ہے۔ أَنْتَ مَوْلَانَا میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ کلمہ انتہائی خضوع اور تذلل پر دلالت کرتا ہے، اس میں اس بات کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ جن نعمتوں تک ان کی رسائی ہے ان کی اللہ تعالیٰ کی ذات ہی مالک ہے، وہی ذات اپنی نعمتوں سے سرفراز کرتی ہے اور وہ لوگ کامرانی پاتے ہیں، تو لازمی طور پر انہیں دعا کے وقت ان چیزوں کو ظاہر کرنا چاہیے۔

فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ: یعنی ہمارے اور کافروں کے درمیان ہونے والی لڑائی میں ہماری مدد کیجیے، جب ان سے ہمارا مناظرہ ہو تو ہماری مدد کیجیے، اسلامی مملکت کی سربلندی کے لیے ہماری مدد کیجیے، محققین کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جسمانی قوتیں جو ماسوا اللہ کی طرف انسان کو دعوت دیتی ہیں ان کے قہر و غلبہ کے خلاف قوت روحانیہ ملکیہ کے ساتھ اللہ کی اعانت و مدد مراد ہے۔

تحفہ معراج: جب نبی کریم ﷺ کو معراج کرائی گئی تو آپ ﷺ کو سورۃ البقرہ کی آخری آیات دی گئیں، پھر فرشتوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حسن تعریف و ستائش کے ساتھ اعزاز و افتخار بخشا ہے کہ اللہ نے آمَنَ الرَّسُولُ فرمایا، اس لیے آپ ﷺ اللہ سے مانگیں، چنانچہ جبریل امین نے آپ ﷺ کو دعا کا طریقہ بتایا تو آپ ﷺ نے عرض کی غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ اے ہمارے پروردگار! تیری بخشش کا سوال ہے، اور تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ میں نے آپ کو بخش دیا ہے، آپ ﷺ نے عرض کی ہمارا مواخذہ نہ

فرمایئے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَا أُؤَاخِذُكُمْ میں آپ کا مواخذہ نہیں کروں گا۔

آپ ﷺ نے عرض کی کہ وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا ہمارے اوپر بوجھ نہ لادیے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر کوئی سختی نہیں کروں گا، آپ ﷺ نے عرض کی کہ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ہماری طاقت وبساط سے زیادہ ہمارے اوپر وزن نہ ڈالیے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا أُحَمِّلُكُمْ ذَلِكَ میں آپ پر بوجھ نہیں ڈالوں گا، آپ ﷺ نے عرض کی کہ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ہمیں معاف کر دیجیے، ہمیں بخش دیجیے اور ہم پر رحم فرمایئے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَدْ عَفَوْتُ عَنْكُمْ وَغَفَرْتُ لَكُمْ وَرَحِمْتُكُمْ وَأَنْصُرُكُمْ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ میں نے آپ کو معاف کر دیا، آپ کی بخشش کر دی، میں نے آپ پر رحم کیا اور آپ کی کافروں پر مدد کروں گا۔ بعض روایات میں یہاں تک آتا ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ یہ دعائیں مانگتے جاتے تھے اور فرشتے آمین کہے جاتے تھے۔ (کبیر)

الحمد للہ ثم الحمد للہ آج سورۃ البقرہ کی تفسیر میں اضافات کی تکمیل ہوئی ہے، آج سے چند سال پہلے بندہ نے اپنی تفسیر کا کام اگرچہ کسی حد تک مکمل کر لیا تھا مگر کچھ مقامات پہلی بار چھوٹ گئے تھے، جنہیں اب مکمل کرنے کی سعادت مل رہی ہے، جسے آپ نظر ثانی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَسَلَّمَ

خادم اسلام، **محمود الرشید حدوٹی**

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

۱۵ اکتوبر ۲۰۱۵ء یکم محرم الحرام ۱۴۳۷ھ بروز جمعرات شب گیارہ بج کر بارہ منٹ

(نظر ثانی و تحریر بار دیگر) ۱۵ جون ۲۰۲۲ء بروز بدھ سہ پہر

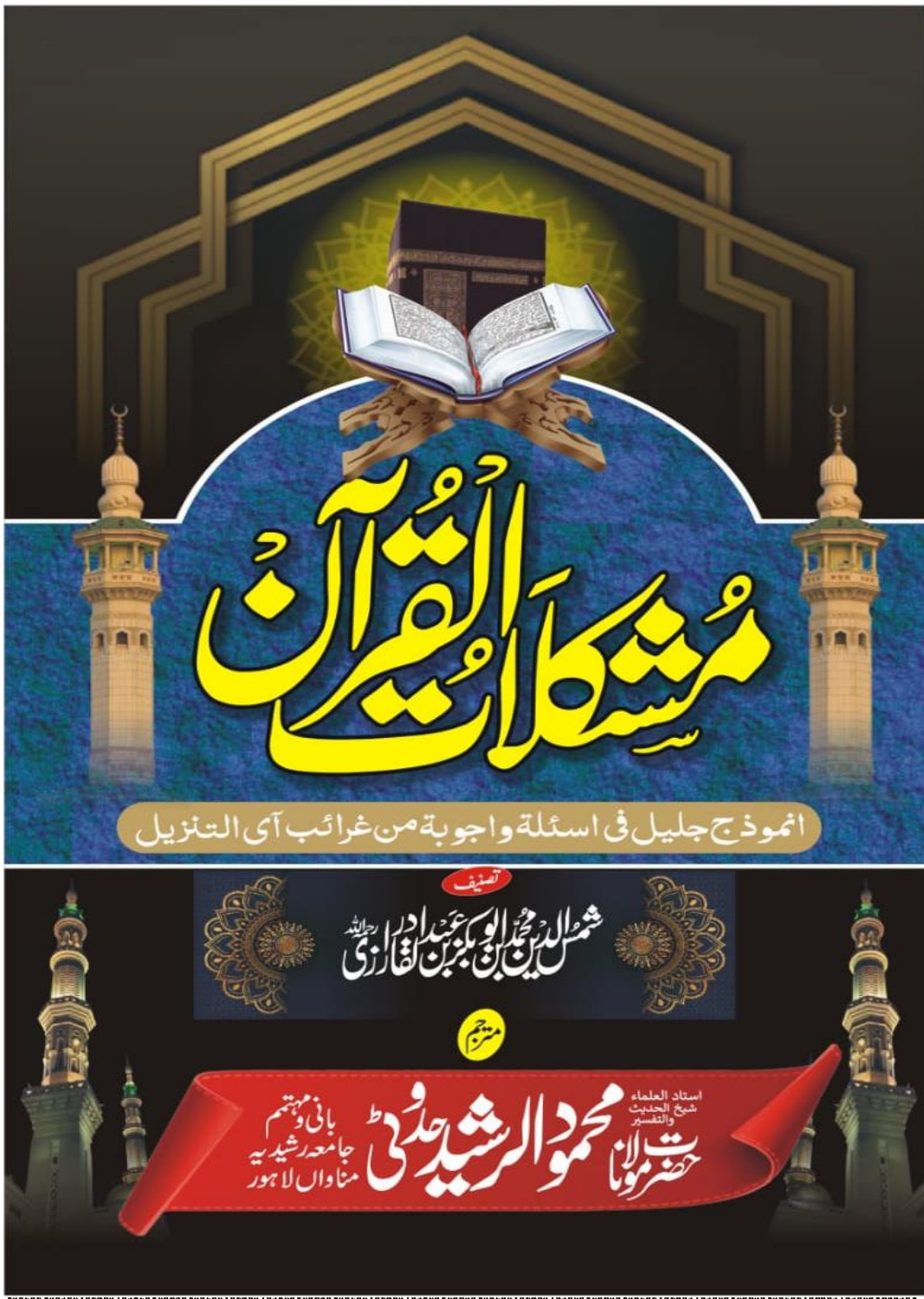
مشکلات القرآن
انموذج جلیل فی اسئلة واجوبة من غرائب آی التنزیل
تصنیف
شمس الدین محمد ابو بکر بن عبد القادر رازی رحمہ اللہ
مترجم
استاد العلماء شیخ الحدیث والتفسیر
حضرت مولانا محمود الرشید حدوٹی
بانی و مہتمم جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور